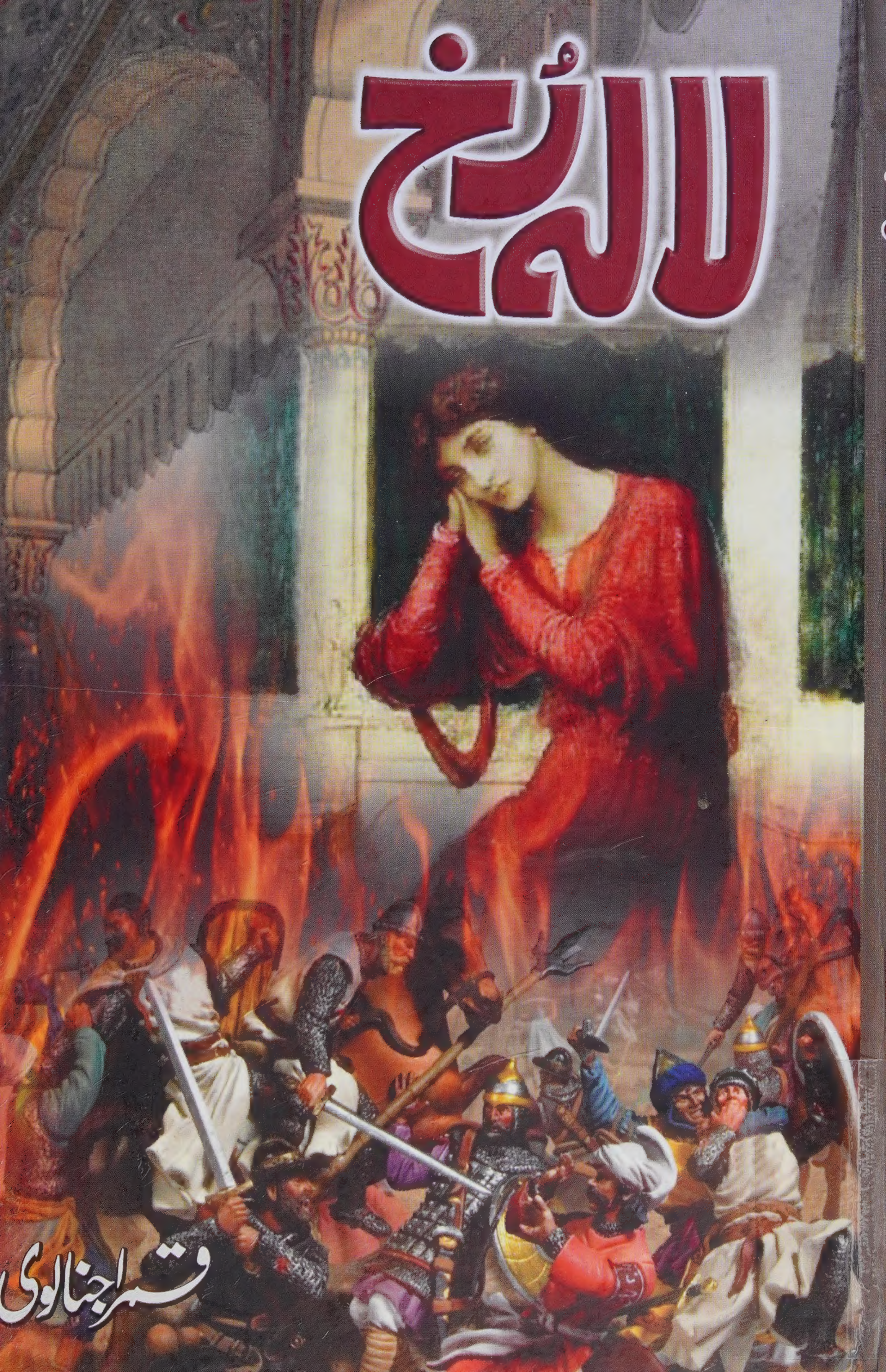

لالہ رُخ
قمر اجنالوی

ISBN: 9789693803372

لالہ رُخ

قمر اجنالوی

مکتبہ القریش
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37652546 042-37668958

پیش لفظ

مشہور انگریز شاعر طامس مور نے پہلی ''لالہ رُخ'' لکھی۔ وہ ایک مثنوی تھی جس میں شعر و تخیل کی زبان میں ایک مغل شہزادہ اور مغل حرم سراؤں کی ایک شعلہ بہ رخ کنیز لالہ رخ کی مفروضہ داستانِ محبت لکھی گئی اور مغل شہنشاہ کے جبر و قہر کی خیالی منظر کشی سے سماں باندھا گیا۔ انگریز کے قدم ہندوستان کی سرزمین پر پہنچ چکے تھے اور طامس مور اہلِ انگلستان کو مغلوں کی عشرت کوشیوں کی فرضی کہانی سنا رہا تھا۔

دوسری ''لالہ رُخ'' اُردو کے منفرد اور صاحبِ طرز ادیب قمر اجنالوی کا ایک ادبی اعجاز سمجھنا چاہیے۔ یہ معرکۂ آرا تصنیف کسی کنیز اور شہزادے کی مفروضہ داستان پر مشتمل نہیں بلکہ مغلوں کے آخری دور کی وہ لرزہ خیز اور خونیں حکایت ہے، جس میں انگریز نے وِلن کا رول ادا کیا اور برصغیر سے مغل تہذیب کا خاتمہ کرنے اور مغل شہزادوں کو پھانسیوں پر لٹکا کر انگریز شہنشاہیت کے لیے میدان ہموار کر لیا۔ جو ایک صدی تک ہمارے سروں پر تلوار بن کر لٹکتی رہی۔

شہزادی لالہ رُخ اس کہانی کا محور و مرکز ہے۔ جس میں جدوجہدِ آزادی کی کشمکش، ظالم و مظلوم کی آویزش اور گردشِ حالات کی زد میں آئی ہوئی تیموری حسینہ کی داستانِ محبت بیان کرنے کے لیے ایک نیا اور انوکھا اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ اُردو ادب میں یہ کوشش ہمیشہ تحسین و تبریک کی مستحق سمجھی جائے گی۔

عبدالرحیم شبلی ایم کام (مرحوم)

لالہ رخ .... قمر اجنالوی
ناشر .... محمد علی قریشی
باہتمام .... فہد حسن قریشی
ایڈیشن 2016ء
قیمت .... 500/- روپے

☆☆☆

ISBN: 978969380337X
www.alquraish.com
email: info@alquraish.com
Join us: alquraishpublications

Printed by: Nayyar Asad Press, Lahore.

مقدمہ

جناب قمر اجنالوی دریا کو کوزے میں بند کرنے کے بجائے کوزے میں سے دریا نکالتے اور تاریخ کے سینے سے ایسی ایسی داستانیں کشید کرتے ہیں جنہیں اگر ایک دفعہ آپ پڑھنا شروع کر دیں تو ختم کیے بغیر آپ کو چین نہیں آ سکتا۔ کم از کم میرا تو یہی حال ان کی ہر تصنیف کے سلسلے میں رہا ہے۔ ان کا تاریخی شاہکار ''چاہِ بابل'' دنیا کی سب سے بڑی داستانِ عشق ہے اور ''مقدس مورتی'' مہاتما بدھ کی کرامات اور تعلیم پر ان کی تحقیق اور تخلیق۔ ایسے ہی دو ضخیم ناول ۔۔ نظر سے گزرے ہیں۔

بابل و نینوا کی تہذیب پر ان کا مشہور و معروف ناول ''چاہِ بابل'' پڑھ کر آپ انگریزی کے سب سے رنگین اور سنگین ناول ''افرودائتی'' کو بھول جائیں گے اور اسی طرح گوتم بدھ پر اب تک جتنی تحقیق اور تنقید یا توصیف ہوئی ہے اس سب کا نچوڑ ''مقدس مورتی'' نام کے ناول میں ایسے والہانہ پیرائے میں بیان ہوا ہے کہ باید و شاید۔

اصل میں جناب قمر اجنالوی قلم ہی ایسے موضوع پر اٹھاتے ہیں جس میں ڈوب کر اور اس کی تہہ میں پہنچ کر یہ آپ کے لیے موتی رول سکیں اور بقول غالب ؎

''موتیوں کا ہر طرف زیور کھلا''

اس کی ایک اور درخشاں اور تابندہ مثال اب میرے سامنے ''لالہ رخ'' کی صورت میں موجود ہے۔ یہ اُس ''لالہ رخ'' سے بالکل مختلف ہے جس کا ترجمہ اب سے کوئی ساٹھ ستر برس پہلے احمد اکبر آبادی نے کیا تھا۔ یہ لالہ رخ ہے تو ایک شہزادی ہی لیکن اس سے بالکل مختلف اور متضاد جس کا تذکرہ سر ٹامس مور نے کیا تھا۔ یہ لالہ رخ ایک مغل شہزادی ہے جو داستانِ غدر یا جنگ آزادی 1857ء کی راوی ہے۔ جو غدر کے اسباب یا جنگ آزادی 1857ء کا پس منظر بیان کرتی ہے اور کیا بیان کرتی ہے، جسے سن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور دل خون کے آنسو روتا ہے۔ یہ بقول لکھنؤ کی بیگم واجد علی شاہ حضرت محل نصیبوں جلی اور فلک کی ستائی ہوئی ہے ؎

لکھا ہو گا حضرت محل کی لحد پر
نصیبوں جلی تھی ، فلک کی ستائی

یہ شہزادی یعنی لالہ رخ زندہ درگور ہے اور دلی کی خاک میں ایک ایسا الاؤ ہے جس میں سے یوں چنگاریاں پھوٹتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں جیسے 1937ء میں ''آوارہ'' کے عنوان سے نظم اسرار الحق مجاز نے لکھی تھی جس کا ایک بند اس طرح سے ہے ؎

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اُس کنارے نوچ لوں
ایک دو کا ذکر کیا ، سارے کے سارے نوچ لوں
اے غمِ دل کیا کروں ، اے وحشتِ دل کیا کروں

لال قلعے کی ایک شہزادی سے مجھے بھی بچپن میں نسبت رہی ہے اور وہ یوں کہ ہماری دادی کے والد لال قلعے میں شہزادیوں کو فارسی پڑھاتے تھے۔ جب دلی میں غدر مچا، 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو ہماری دادی سناتی تھیں کہ ابھی ہم گھر میں آ کر اُترے ہی تھے کہ دروازے پر نامانوس اور منحوس سی دستک ہوئی اور والد صاحب

کرے۔ مرتی کیا نہ کرتی، وہ بیوی بہ مشکل قلعے میں جانے پر آمادہ ہوئی لیکن اس نے رو رو کر سب حال رئیس زادے کی قربانی کا شہزادے سے بیان کر دیا۔ اس پر شہزادے نے اُس رئیس زادے سے کہا کہ تم میری محبوبہ تو لے آئے لیکن اس پر تو کسی جن کا سایہ ہے کہ جب میں اس ماہ پارہ کو ہاتھ لگانا چاہتا ہوں تو ایک ہاتھ غیب سے آتا ہے اور مجھے پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ تم نے تو دوستی کا حق ادا کر دیا مگر اس دستِ غیب کا کیا علاج؟

رئیس زادے نے کہا، اس کا بھی علاج میں دوست کی خاطر کروں گا۔ میں بھی تو دیکھوں کہ وہ کیسا جن ہے۔
چنانچہ رئیس زادہ تلوار سونت کر کھڑا ہو گیا اور شہزادے سے کہا۔ اب میرے سامنے چھپر کھٹ کے قریب جائیے۔

شہزادے نے کہا۔ پہلے تم جا کر دکھاؤ۔ مجھے تو اب جنات سے ڈر لگنے لگا ہے۔ اور جیسے ہی وہ رئیس زادہ چھپر کھٹ کے قریب پہنچا، ایک ہاتھ نکلا اور رئیس زادہ کا راستہ روک دیا۔ رئیس زادے نے فوراً ہی تلوار کا وار کیا اور بازو کٹ کر زمین پر تڑپنے لگا اور پلک جھپکتے میں شہزادہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ اور جب شہزادے کو ہوش میں لایا گیا تو اس نے اپنا کٹا ہوا ہاتھ رئیس زادے کو دکھا کر کہا کہ جو ہاتھ دوست کی منکوحہ کی طرف بڑھا ہو اس کا یہی حشر ہونا چاہئے تھا۔

اشرف صبوحی صاحب بھی بچوں کے ساتھ یہ کہانی کان لگا کر سن رہے تھے۔ انہوں نے ان بزرگ خاتون سے کہا کہ آپ نے تو یہ کہانی بچوں کو اس طرح سنائی ہے جیسے آپ خود وہاں موجود تھیں۔ وہ خاتون آنکھوں میں آنسو بھر کر بولیں۔ ہاں میاں! وہ دکھیاری میں خود ہی ہوں اور یہ میری ہی آپ بیتی ہے۔

تو ایسے بھی شہزادے تھے اور ایسے بھی کہ شاید احمد دہلوی مدیر ماہنامہ ''ساقی'' سناتے تھے کہ ابا کہتے تھے۔ قلعے میں شہزادوں کا یہ نیل بگڑ گیا تھا کہ ایک شہزادے نے کسی طبلچی سے کہا۔ ''ہمیں طبلہ سناؤ۔'' اس نے طبلے پر بلبل ہزار داستان سے لے کر کبوتروں کی غٹرغوں اور قمریوں کی ہوک اور کوئل کی کوک تک سنائی۔ طبلہ سن کر شہزادے نے اس بے مثل طبلچی کے ہاتھ کچلوا دیئے کہ جیسا طبلہ ہم نے سنا ہے، کوئی اور نہ سنے۔ پھر عمر بھر کے لیے اس کا وظیفہ مقرر کر دیا لیکن ہاتھوں سے معذور کر دیا۔

مغلیہ سلطنت کے زوال اور غدر کے اسباب کے ان سے بھی زیادہ عجب قصے ''لالہ رخ'' نام کی اس کتاب میں قمر اجنالوی نے بیان کیے ہیں۔ لیکن بہادر شاہ ظفر کی ایک پوتی لالہ رخ کی زبانی۔ اور اس پوتی کو یہ مواد اور ذخیرہ ملتا ہے ایک 95 سالہ بزرگ سید برہان الدین سے، جو اورنگ زیب عالمگیر کے بعد کی طوائف الملوکی اور افراتفری کے نہ صرف چشم دید گواہ ہیں بلکہ اس ساری حکایت خوں چکاں کا خود ایک اہم کردار ہیں۔

اصل میں جناب قمر اجنالوی کی تحریر میں وہ گرفت ہے جو آپ کو پکڑ کر بٹھا لیتی ہے۔ یہ اگر افسانہ لکھیں تو حقیقت کا گمان ہوتا ہے۔ حقیقت تو پھر حقیقت ہے اور تاریخی حقائق، بقول ڈاکٹر عندلیب شادانی ؎

سب واقعات ہیں مگر اللہ رے انقلاب
اب ان پہ ہے گمان کسی رنگیں خواب کا

مگر یہ رنگینی رومانی نہیں۔ خون میں انگلیاں ڈبو کر جو تصویریں بنائی جائیں ایسا مرقع ہیں۔ ایک ایک اینٹ اور روڑے کے لیے جیسی جیسی تحقیق و جستجو قمر اجنالوی صاحب نے کی ہے وہ جگر مراد آبادی کے الفاظ میں ؎

اللہ اگر توفیق نہ دے، انسان کے بس کا کام نہیں

مولانا حالی نے کیا خوب فرمایا تھا ؎

دروازے پر گئے۔ کچھ فوجی جوتوں کی آواز آئی اور تھوڑی دیر بعد گولی چلنے کی...... اب جو ہم لوگوں نے ڈیوڑھی میں جا کر دیکھا تو ابا جان کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی اور گورے فوجی اپنا کام کر کے جا چکے تھے۔ ہمیں پتہ نہیں اُن گوروں سے ابا جان کی کیا گفتگو ہوئی اور کیوں انہوں نے ابا جان کو گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ بہر حال وہ شہزادی جو بہادر شاہ ظفر کی پوتی تھیں، مرتے دم تک ہمارے گھر میں رہیں اور ''بیگم صاحبہ'' کہلائیں۔

میں نے جب ہوش سنبھالا تو ان کی پلکیں تک سفید ہو چکی تھیں اور ہر آنے والے سے یہ بیگم صاحبہ فرماتی تھیں کہ میں اس بچے کی ''ددا'' ہوں۔ ''ددا'' تو شاید اس وقت میرے منہ سے ادا نہیں ہوتا تھا جس کے معنی اُردو میں ''کھلائی'' یا انگریزی میں سمجھ لیجئے کہ ''گورنس'' کے ہوتے ہیں۔ لیے میں انہیں ''دادا'' کہتا تھا۔ کیونکہ جب تین برس کا تھا تو میری والدہ کا انتقال ہو چکا تھا اور ان بیگم صاحبہ نے میری دادی اور نانی کی منشاء و مرضی سے مجھے ایک طرح سے گود میں لے لیا تھا اور اپنا لے پالک بنا لیا تھا۔ اس قلعے کی شہزادی کا ذکر میں نے یہاں اس لیے ضروری گردانا ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے جو داستانِ غدر ترتیب دی، اس کا بہت سا حصہ ان بیگم صاحبہ کے قلعے کے بیان بلکہ بین کا بھی ہے جو رو رو کر وہ خواجہ صاحب کے کریدنے پر سناتی تھیں۔

بہادر شاہ ظفر کی ان پوتی کی وجہ سے ہمارے گھر میں خواجہ حسن نظامی ہی نہیں، حکیم محمد اجمل خاں (جن کے پوتے حکیم محمد نبی خاں جمال سویدا کا 2 جولائی 1990ء کی رات کو لاہور میں انتقال ہوا)، مولانا محمد علی، مولانا شوکت علی، آصف علی بیرسٹر (جو ہمارے مکان کے سامنے ہی رہتے تھے)، مولوی عبدالسلام، مولانا راشد الخیری، ملا واحدی، آغا طاہر، نبیرہ آزاد، مولانا عبدالکلام آزاد جب آصف علی بیرسٹر کے ہاں، ہمارے گھر ضرور آتے اور یہ سب حضرات بہت احترام سے ان ''بیگم صاحبہ'' سے محوِ گفتگو رہتے۔ لیکن خواجہ حسن نظامی کرید کرید کر اور خاص طور پر ان سے دلی کے لال قلعے کی باتیں سنتے۔ شہزادوں اور شہزادیوں کی باتیں، بہادر شاہ ظفر کی داستانِ غم، وہاں کے خرچ و اخراجات، کنیزوں اور خواجہ سراؤں کے قصے۔ اور یوں خواجہ حسن نظامی کو داستانِ غدر رقم کرنے میں خاصی مدد ملی جس کا عطر جناب قمر اجنالوی نے بھی استعمال کیا ہے۔

ایک بہت ہی دلچسپ قلعے کی کسی شہزادی کی تو نہیں، ایک شہزادے کی کہانی اشرف صبوحی صاحب نے بھی بیان کی ہے کہ ان کے گھر میں ایک بزرگ اور پُر اسرار خاتون بہادر شفاہ ظفر کی ان پوتی کی طرح پناہ گزیں تھیں۔ ایک دن گھر کے بچوں نے ان سے کہانی سنانے کا اصرار کیا اور ان بزرگ خاتون نے لال قلعے کے ایک شہزادے کی یہ داستان سنائی کہ دلی کے ایک رئیس زادے تھے جو قلعے میں کسی شہزادے کے ساتھ چوسر اور گنجفہ کھیلنے جایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ شہزادہ برسات میں سیر کے لیے ''قطب صاحب'' یعنی مہر ولی گیا۔ جو دلی کے مضافات میں مصنوعی کشمیر کا نقشہ اُس زمانے میں پیش کرتا تھا اور وہاں کسی ایسی مہ جبیں کو دیکھا، جس پر دیکھتے ہی وہ ہزار جان سے عاشق ہو گیا اور واپس قلعے میں پہنچ کر اٹوائی کھٹوائی لے کر پڑ گیا۔ نہ منہ سے بولتا تھا نہ سر سے کھیلتا تھا۔

دلی کے وہ رئیس زادے جو اس شہزادے کے ساتھ قلعے میں چوسر اور گنجفہ کھیلنے جاتے تھے جب حسب معمول شہزادے کے پاس پہنچے اور شہزادے کا یہ حال دیکھ کر ماجرا جانا اور مذکورہ مہ جبین نازنین کے حلیے اور صورت وشکل سے خوب آگاہی حاصل کر لی تو دوسرے ہی دن مطلوبہ پری پیکر کو لے کر شہزادے کی خدمت میں پہنچ گئے تاکہ حق دوستی ادا ہو سکے۔ کیونکہ جو ناک نقشہ اور وضع قطع شہزادے نے اُس قتالہ کی بتائی تھی، وہ اس رئیس زادے کی اپنی بیوی تھی۔ رئیس زادے نے بہ ہزار دقت اپنی منکوحہ کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ طلاق لے اور شہزادے کی دل جوئی

دفترِ اوّل

لالہ رُخ کا بیان

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح!
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

اور وہی جناب قمر اجنالوی کے ساتھ ہوا کہ دلی کے ان کھنڈرات میں اور سالم و منہدم مقبروں کی چشمِ تصور سے جب آپ کو سیر کراتے ہیں تو آپ کی انگلی پکڑ کر آپ کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ اور کیا دلی کے پرانے روٹ ان واقعات کو بیان کریں گے جیسا یہ بیان کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اپنے خونِ دل کی سرخی سے اس عجیب و سادہ و رنگین داستان کو روشن اور رنگین کرتے چلے جاتے ہیں اور آپ کے سامنے اورنگ زیب عالمگیر کے بعد کے دور سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک اور پھر ان کی ایک پوتی لالہ رخ اور ان سے ایک بزرگ کرم فرما سید برہان الدین تک ساری حکایاتِ خون چکاں آئینہ کر کے رکھ دیتے ہیں۔ اس طرح کہ آپ کہیں انگلی نہیں رکھ سکتے۔ نہ ان پر انگلی اٹھا سکتے ہیں۔ کیونکہ جناب قمر اجنالوی ایک معتبر محقق اور مؤرخ ہیں اور آلِ تیمور کے صحیح قدر دان۔ اسی لیے مغلیہ سلطنت کے زوال کا جیسا مرثیہ اپنی معرکۃ الآراء نثر میں انہوں نے رقم کر دیا ہے کوئی نظم میں کیا قلم بند کرے گا۔

اس ساری حکایت سے اب صرف عبرت ہی حاصل کی جا سکتی ہے۔ لیکن دنیا نے آج تک عبرت حاصل نہیں کی۔ نہ تاریخ سے، نہ مذہب سے، نہ کسی فلسفے سے۔ ورنہ دنیا یوں آج کل بارود کے ڈھیر پر نہ بیٹھی ہوتی اور ایٹم کی ایجاد، دریافت یا تخلیق کو امن کے بجائے جنگ کا آلہ کار نہ بناتی۔ خیر قمر اجنالوی صاحب کا پیغام تو محبت ہے جہاں تک پہنچے۔

انہوں نے کوئی موضوع ایسا نہیں چھوڑا جس پر لکھا جا سکتا ہو اور انہوں نے نہ لکھا ہو۔ یہ ایک گوشہ نشیں درویش صفت انسان ہیں اور خاموشی سے ایک گوشے میں بیٹھ کر اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔ نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا۔ ان کے ہر موضوع پر، ہر تحریر کی ہر سطر کے نیچے دس دس کتابیں آپ کو رکھی ہوئی ملیں گی چاہے وہ موضوع فلسفے کا ہو، تاریخ کا یا سیاست کا ہو۔ یہ اپنی طرف سے نیکی کر کے دریا میں ڈالے جا رہے ہیں اور انسان اور انسانیت کی بھلائی کے لیے کام کیے جا رہے ہیں۔

جگر مراد آبادی کہہ گئے ہیں ۔

محبت صلح بھی ، پیکار بھی ہے
یہ شاخِ گل بھی ہے ، تلوار بھی ہے

جناب قمر اجنالوی کا مشن بھی محبت ہے۔ انسان اور انسانیت سے محبت۔ یہ فلسفہ، تاریخ اور مذہب کا عطر کشید کر کے آپ کے سامنے رکھے جا رہے ہیں۔ اب چاہے آپ اس فلسفہ و محبت کو ایٹم کی طرح انسان کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کریں یا دنیا کی تباہی اور بربادی کے لیے۔

اپنی ضخیم تصانیف کے ذریعے اور ہر اعتبار سے وزنی کتابوں کی تصنیف اور تخلیق کے لیے جس طرح پتہ مار کر بیٹھنا پڑتا ہے، وہ انہی کا دل گردہ ہے اور یہ ادبی اور فکری اعتکاف ہر کسی کے بس کا روگ نہیں۔

1857ء کی جنگ آزادی یا داستانِ غدر ''لالہ رخ'' کے عنوان سے جس طرح انہوں نے ترتیب دی ہے وہ جناب قمر اجنالوی ہی کا حصہ ہے۔ کوئی اور ہوتا تو خون تھوک دیتا۔ پھر جتنا اور جس طرح ان کا لکھنے کا تجربہ ہے کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ بقول میر تقی میر۔

درد و غم جمع کیے کتنے تو دیوان کیا

اخلاق احمد دہلوی مرحوم

ساتھ ہی جنگ ختم ہوگئی ہے مگر بجھی راکھ میں ایک چنگاری ابھی تک سلگ رہی ہے اور جب تک وہ چنگاری سلگتی رہے گی، جنگ ختم نہیں ہوسکتی۔

مغلوں کی بجھی راکھ میں وہ سلگتی چنگاری میں ہوں...... لالہ رخ! جس نے انگریزی طاقت کے مقابلے میں تو شکست تسلیم کر لی ہے لیکن ابھی اپنی قسمت سے ہار نہیں مانی۔ جب تک میں اپنی قسمت سے لڑتی رہوں گی، وہ چنگاری میرے وجود میں روشن رہے گی۔ ایک دبی آگ میرے علاوہ کچھ اور لوگوں کے اندر بھی سلگ رہی ہے اور اس کے سلگنے کا مطلب تُو اچھی طرح جانتا ہے۔

بجھی ہوئی راکھ میں سلگنے والی چنگاری کتنی ہی کمزور کیوں نہ ہو، اگر کسی وقت بھڑک اُٹھی تو پورے گھر اور سارے شہر کو پھونک سکتی ہے، اس لیے میں نے مناسب نہیں سمجھا تھا کہ تجھے اپنے اندر کے زخم دکھاؤں اور سرنہاں کھول دوں، جس پر میری اور میرے ساتھ کئی دوسری زندگیوں کا انحصار ہے۔ مگر تُو نے کائنات کی خالق و مالک اور لایزال ہستی کا نام لے کر قسم کھائی اور یقین دلایا کہ تُو وہ اسرارِ نہاں، جو میری داستان کا حصہ اور میرے علاوہ کچھ اور لوگوں سے بھی وابستہ ہیں، وقت سے پہلے معرضِ تحریر میں نہیں لائے گا اور صرف آلِ تیمور کی شکست و بربادی کے واقعات لکھنے پر اکتفا کرے گا جو میں تجھے سناؤں گی۔

میں نے تیرے عہد و پیمان پر یقین کرلیا ہے لیکن خبردار کرتی ہوں کہ اگر تُو نے پیمان شکنی کی اور کسی تحریص، کسی ترغیب، کسی دھمکی یا دہشت سے خوف زدہ ہوکر وہ رازِ سربستہ فاش کر دیا، جس کے اخفا کی قسم کھائی ہے تو تجھ پر اسی لایزال ہستی کا قہر وعذاب نازل ہوگا، جسے تُو نے اپنے قول وقرار کا ضامن ٹھہرایا ہے۔

میں اور وہ لوگ جو باہم کئی رازوں میں شریک ہیں، اپنی زندگیاں لال قلعے ہی میں چھوڑ آئے اور وہاں سے صرف موت کا ہاتھ تھام کر نکلے تھے۔ اس وقت بھی میں ایک شکستہ مقبرے میں ہوں جس پر موت نے اپنا سایہ ڈال رکھا ہے۔ اس لیے اگر تیری وعدہ خلافی کے نتیجے میں کمپنی سرکار کے درندے موت کی صورت ہم پر جھپٹ پڑے تو یہ کوئی عجیب واقعہ نہیں ہوگا۔ میں اور میرے ساتھی آزادی کی جنگ لڑنے والے بدنصیب مغلوں اور فرنگی کے زخم کھانے والے مجاہدوں کی طرح اپنے گڑھوں میں دفن ہو جائیں گے۔ شاید کسی کی زبان پر لالہ رخ کا نام بھی نہ آئے۔ لیکن عجیب واقعہ یہ ہوگا کہ عہد شکنی کی پاداش میں تیری ہلاکت دنیا بھر کے دانش وروں اور وقائع نویسوں کے لیے درسِ عبرت بن جائے گی۔ تُو خدا کے عذاب سے ڈر کے بھاگے گا جو تیرا پیچھا کرے گا مگر اس کا قہرمانی ہاتھ تجھے پکڑ لے گا اور سرکار انگلشیہ بھی تیری مدد نہ کر سکے گی کیونکہ وہ سرکار جو تجھے عہد شکنی کی ہولناک سزا دے گی، دنیا کی تمام سرکاروں سے بالا اور زبردست ہے اور اپنے مجرم کو بھاگنے نہیں دیتی۔

آدمی، آدمی سے لڑتا ہے تو کوئی زخم اپنے حریف کو بھی لگاتا ہے مگر جو شخص خدا کے نام پر کھائی ہوئی قسم توڑتا ہے، وہ دراصل خدا سے لڑتا، ہر وار خود پر کرتا اور ہر زخم اپنے وجود کو لگاتا ہے، اسی لیے تجھے یہ انتباہ ضروری تھا جو میں نے کیا ہے۔ وقائع نویس اور حوادث بیان کرنے والا فرد (جو اپنا راز اس کے سپرد کرتا ہے) باہمی اعتماد کی رسی میں بندھے ہوتے ہیں۔ اگر وہ رسی ٹوٹ جائے تو کچھ باقی نہیں رہتا اور وقائع وحوادث رقم کرنے والے اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں۔

اے ہندوستان کے مسافر!

(1)

لال قلعہ

اے ارضِ دہلی کے مسافر!

میرے وقائع نویس مہمان!

تُو میری کہانی سننے کے لیے بہت دور سے آیا اور علی گونج کے اس ویرانے میں میرے خفیہ مسکن تک اس طرح پہنچ گیا ہے جیسے کوئی بھولا بھٹکا راہی خوبیٔ قسمت سے اپنی منزل پر پہنچ جاتا ہے۔

میں جانتی ہوں وہ پراسرار ہاتھ کس کا ہے، جس نے اس پوشیدہ مقام کی طرف انگلی اٹھائی اور تیری رہنمائی کی کہ اس شکستہ کھنڈر میں ایک برگشتہ بخت مغل شہزادی لالہ رخ رہتی ہے جسے حوادثِ زمانہ، گردشِ ایام اور مغلوں کی تیرہ بختی نے دھکے دے کر لال قلعے کی محل سراؤں سے نکال دیا تھا اور وہ دنیا کی ٹھوکریں کھاتی، اپنی قسمت سے لڑتی، اپنے آپ کو زمانے کی نظروں سے چھپاتی علی گنج کے ایک ٹوٹے پھوٹے مقبرے میں آ گئی ہے کیونکہ زندگی کے سفر کا انجام بہرحال وہ گڑھا اور قبر ہے جس پر کسی کے نام کی لوح لگتی ہے اور کسی کے نام کی لوح نہیں لگتی۔ آخر کار گزرتا وقت ہر بے نام ڈھیری کو پیوندِ زمین کر دیتا ہے اور اس کا نشان تک مٹا دیتا ہے۔

موت، اندھیرے کا نام ہے اور میری زندگی میں بھی کوئی اُجالا نہیں مگر تُو ہوا کے ایک آوارہ اور تھکے ماندے جھونکے کی طرح اچانک اس شکستہ مقبرے میں داخل ہوا اور میرے لیے پیغامِ حیات لے کر آیا ہے۔ اس مقامِ مرگ میں کسی اجنبی آدمی سے ملنا گویا زندگی سے ملاقات کرنا ہے۔

اے میرے اجنبی مسافر!

تُو نے ایک طویل سفر اس لیے کیا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار کے خلاف ہندوستان کی جنگ آزادی اور خاندانِ مغلیہ کی شکست و بربادی کی روداد میری زبانی سن سکے۔ میں نے تجھے اپنی داستانِ حسرت سنانے کا وعدہ کر لیا ہے لیکن یہ داستان میری قسمت کی طرح بکھری ہوئی اور طویل ہے، جسے میں اپنی زندگی کے حصے بخروں کے مانند قسط در قسط بیان کروں گی۔

اس داستان میں کچھ ایسے واقعات، ایسے اسرار پوشیدہ ہیں جنہیں قبل از وقت افشا کرنا خلافِ مصلحت ہوگا۔ کمپنی سرکار نے دہلی کے علاوہ اگرچہ پورے ہندوستان پر قبضہ کر لیا اور سمجھتی ہے کہ مغلوں کی تباہی و بربادی کے

باغات اور ان کے درمیان بہتی نہروں، پھیلی روشوں اور محلوں کو ایک دوسرے سے جدا کرتی سڑکوں کے اعتبار سے کسی عروس البلاد کا منظر پیش کرتا تھا۔

تجھے یہ بھی بتاتی چلوں کہ مغلیہ خاندان اس قلعے میں جس کا محیط دو میل اسّی گز ہے، کسی بڑے قبیلے کی طرح رہتا تھا کیونکہ دورِ زوال میں مغل سلطنت اگرچہ بالکل گھٹ گئی اور دہلی تک محدود ہو گئی لیکن خاندان کے افراد کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ آخری مغل بادشاہ، ان کے بھائیوں، بہنوں، بیٹے، بیٹیوں، بھتیجے، بھتیجیوں، بھانجے، بھانجیوں، پوتے، پوتیوں، نواسے، نواسیوں اور سلاطین (وہ شہزادے جو بادشاہ کے تایاؤں اور چچاؤں کی اولاد تھے، ''سلاطین'' کہلاتے تھے) نیز جدی رشتے کے دیگر مغلوں اور مغلانیوں کے علاوہ غیر مغل بیویوں، خواصوں (وہ خوب صورت لونڈیاں جن سے مغل شہزادوں کی اولادیں تھیں) ان کے لواحقوں، پھر خواجہ سراؤں، لونڈیوں، باندیوں، مہریوں اور کہاریوں کی ایک فوج قلعے میں آباد تھی۔ لال قلعہ ایک مغل شہر میں تبدیل ہو گیا تھا جہاں ان کی تاریخ تھی، عظمتِ رفتہ تھی، دکھاوے کی شان و شوکت تھی اور گنگا جمنی تہذیب تھی جو شہنشاہ اکبر، جہانگیر اور شاہ جہان کے عہد میں مغلوں، راجپوتوں اور جاٹ سرداروں کے ملاپ سے پروان چڑھی تھی۔

تُو اس بات پر حیران ہے کہ آلِ تیمور دو صدیوں اور ایک دہائی سے لال قلعے میں آباد تھی اور خاندان کی بڑھتی ہوئی آبادی سے وہ ایک مغل شہر کی صورت اختیار کر گیا تھا پھر بھی مغلوں نے اس کی حفاظت کا بندوبست نہ کیا۔ 1857ء میں جب انگریزی فوجیوں نے دہلی پر حملہ کیا اور ان کی توپیں قلعہ پر گولہ باری کرنے لگیں، مغلوں کو اپنا آبائی مسکن چھوڑ دینا پڑا اور وہ راتوں رات قلعہ خالی کر کے مقبرہ ہمایوں میں چلے گئے جو بالکل غیر محفوظ تھا۔

میں تسلیم کرتی ہوں کہ قلعے کی دیواریں تو بے شک مضبوط تھیں لیکن مغل مدافعت کی دیواریں کمزور تھیں۔ انہوں نے کمپنی سرکار کے خلاف (جس سے وہ وظیفے حاصل کرتے رہتے تھے) جنگ ضرور لڑی مگر اپنے اردگرد وہ فوجی حصار قائم نہ کر سکے جو انہیں انگریز کے حملوں سے بچا سکتا تھا۔ ان کی لڑائی اور مدافعت کا انحصار میرٹھ کے باغیوں اور ان تلنگوں پر تھا جنہوں نے اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کو پورے ہندوستان کا شہنشاہ اس لیے تسلیم کر لیا تھا کہ انگریز سے بغاوت کرنے والی ہندوستانی فوجیں اور ہندوستانی ریاستیں کسی غیر مغل حکمران پر متفق نہیں ہو سکتی تھیں۔ باغی اکثر من مانی کیا کرتے تھے۔ اعلیٰ حضرت تو صرف نام کے ''شہنشاہ'' تھے ورنہ باغی ان کا حکم بھی نہیں مانتے تھے۔

تلنگے باغیوں میں کوئی بڑے پائے کا تجربہ کار جرنیل نہیں تھا جو تربیت یافتہ انگریزی فوجیوں کا مقابلہ کر سکتا۔ کچھ دیسی فوجیں بدستور کمپنی سرکار کا ساتھ دے رہی تھیں۔ اس نے پنجاب کے سکھوں اور مسلمانوں کے علاوہ جموں، پٹیالہ اور دیگر ریاستوں کی فوجوں کو بھی اپنے حملے میں شامل کر لیا تھا۔ پھر لال قلعے کے کچھ داخلی معاملات بھی ایسے تھے جو ہماری شکست کا باعث بن گئے۔ میں وہ معاملات وضاحت کے ساتھ بیان کروں گی اور تُو خود جان لے گا کہ 1857ء میں مغلوں پر قیامت کیوں نازل ہوئی؟

دہلی میں انگریزی فوجوں کے ساتھ جنہوں نے پہاڑی پر قبضہ کر لیا تھا، تقریباً چار مہینے جنگ لڑی گئی اور ستمبر میں دہلی کے ساتھ مغلوں کی قسمت کا بھی فیصلہ ہو گیا۔ شہر اور قلعے پر انگریز کا دباؤ بڑھ گیا اور باغی فوجیں ان کا دباؤ توڑنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔

اے اجنبی وقائع نویس!

میرے مہمانِ عزیز!

جو کچھ مجھے ازراہِ احتیاط کہنا تھا، وہ میں نے کہہ دیا اور تُو نے سن لیا۔ اب مجھے گزرنے والے حالات وحوادث اور مغلوں کی بجھی راکھ میں سلگنے والے کچھ اسرار بیان کرنا ہیں، جو میں بیان کروں گی اور مجھے یقین ہے، تُو ان رازوں کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرے گا جو تیرے سپرد کیے جائیں گے اور جن پر میری اور میرے ساتھیوں کی زندگی موقوف ہے۔

تُو نے بغداد کی ہولناک تباہی اور اسپین (اُندلس) سے عربوں کی لرزہ خیز واپسی کے حالات سنا کر مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں دہلی کے سقوط اور مغلوں پر ٹوٹنے والی قیامت کی روداد تجھے سناؤں۔ بغداد پر ہلاکو کے تاتاری لشکروں کی یلغار اور اس مدینۃ الاسلام کے ساتھ آلِ عباس کی بربادی تاریخ کا ایک المناک سانحہ ہے جس پر مؤرخوں نے خون کے آنسو بہائے اور شاعروں نے دلوں کو گھائل کر دینے والے مرثیے لکھے ہیں۔ لیکن ایشیا کے اس خطے میں مغل جو کبھی تاتار ہی کا ایک قبیلہ کہلاتے تھے اور قبولِ اسلام کے بعد عظیم کامیابیوں سے ہمکنار ہوئے تھے، اس طرح نیست و نابود کر دیئے گئے کہ زمین کانپ اُٹھی اور آسمان دہل گیا۔

ہندوستان میں آلِ تیمور کو پیش آنے والا بھیانک سانحہ، عباسیوں کی تباہی اور اُندلس کے مور خاندان کی بربادی سے کم لرزہ خیز نہیں، جسے سن کر بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

آہ! وہ عظیم مغل جن کی عظمت اور ہیبت سے کبھی پہاڑوں کے جگر بھی کانپ اُٹھتے تھے، جن کے گھوڑوں کی دھمک سے زمین کی چھاتی ہل جاتی تھی، جن کی تلواروں کی دہشت سے سورما مہابیروں اور بڑے بڑے سرکش بہادروں کا زہرہ آب ہوتا تھا، جن کے نام شجاعت کے آسمانوں پر ستاروں کی طرح درخشاں اور تاریخ کے صفحات میں عزت کے ساتھ محفوظ ہیں، جن کا پرچمِ اقبال کبھی کابل سے بنگال تک لہراتا تھا، جن کے محلوں کی ڈیوڑھی میں عدل کی زنجیر لٹکتی تھی اور مظلوموں کی فریاد اور دُہائی سن کر شہنشاہ خود شاہی جھروکوں میں نمودار ہوتے تھے، جن کے فیصلے شکستہ دلوں کو سہارا دیتے تھے اور جن کے ماتھے کی شکن ظالموں کے لیے پیغامِ اجل بن جاتی تھی، اپنے نام کے ڈنکے بجا کر دنیا سے رخصت ہو گئے۔ مگر جن مغلوں کی رُوداد میں تجھے سناؤں گی، وہ صرف اپنے اجداد کی عظمتوں کا سایہ بن کر رہ گئے تھے۔

جس طرح وجود اور اس کے سائے میں فرق ہوتا ہے، اسی طرح اُن مغلوں اور ان مغلوں میں بھی بڑا فرق تھا۔ ایک وہ تھے، جو بھیڑیوں سے بھیڑوں کی حفاظت کرتے تھے۔ ایک یہ تھے، جنہوں نے اپنی بھیڑیں خود ذبح کر کے بھیڑیوں کو کھلائیں اور جب ان کے منہ کو خون لگ گیا تو اپنی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ انہوں نے اپنی حفاظت کے لے تلوار اس وقت اٹھائی جب زمانہ تلوار کو چھوڑ کر بندوق اٹھا چکا تھا اور دشمن گولی بارود کی زبان سے بات کرتے تھے۔

تُو نے دہلی کا لال قلعہ دیکھا ہے جو مغل فنِ تعمیر کا شاہکار ہے۔ اس میں مغلوں کی عظمت وسطوت کے پتھر آج بھی اسی طرح نصب ہیں جس طرح کل نصب تھے۔ یہ صرف قلعہ نہیں بلکہ ایک شہرِ فردوس تھا جو شاہی محلات، تاریخی ایوانوں، عالی شان قصروں، نیرنگ زمانہ محل سراؤں، حسین کوشکوں، حلقہ در حلقہ پھیلی عمارتوں، دل کش

اے ہندوستان کے سیاح!

ارضِ دہلی کے مسافر!

میرے وقائع نویس مہمان!

میں شہزادی لالہ رخ جو ایک مغل شہزادے کے صلب اور ایک مغلانی کے بطن سے پیدا ہوئی، تجھ سے مخاطب ہوں۔ مغلیہ خاندان سے میرا جو رشتہ و تعلق ہے، وہ میں نے اپنے صلبی ناتے سے مختصر لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ لیکن اس اجمال کی تفصیل تجھے آگے چل کر خود بخود معلوم ہو جائے گی۔ کیونکہ یہ رودادِ غم جو میں بیان کر رہی ہوں، صرف مغلوں کی شکست و بربادی کا افسانہ ہیں بلکہ میری زندگی کی ایک عجیب وغریب اور ہوش رُبا داستان بھی ہے جس کے اوراق بتدریج تیرے سامنے کھلتے جائیں گے۔

''لالہ رخ'' مغلوں اور ترکوں میں بڑا مقبول نام ہے اور کیوں مقبول ہے؟ یہ میں نہیں جانتی۔ مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ اس نام میں ایک جادو ہے، ایک انوکھا حُسن ہے، ایک ماورائی کشش ہے۔ جس لڑکی کا نام لالہ رُخ ہو، وہ خوش نصیب ہوتی ہے لیکن میری تیرہ بختی کا حال تُو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا اور کانوں سے سن رہا ہے۔ اس نام میں اگر کوئی ماورائی کشش ہے بھی تو نہ جانے وہ میری ذات سے خارج کیوں ہوگئی ہے؟

یہ بھی بتا دوں کہ اعلیٰ حضرت کے فرزند مرزا ظہیر الدین مغل (جو مرزا مغل) کے نام سے مشہور اور شاہی فوجوں کے کمانڈر اِن چیف تھے) کی ایک لڑکی کا نام بھی لالہ رُخ ہے، وہ ان کی ایک منظورِ نظر لونڈی کے بطن سے پیدا ہوئی مگر وہ لالہ رُخ 1857ء میں صرف آٹھ برس کی بچی تھی اور ایک مغل شہزادے کی اولاد ہونا ہی اس کے لیے مصیبت بن گیا جیسا کہ میں آگے چل کر تجھے بتاؤں گی۔

مرزا مغل سے میرا بھی ایک تعلق رہا ہے۔ انہیں لالہ رخ نام بہت پسند تھا اور مجھ سے اسی نام کے باعث بڑا اُنس رکھتے تھے۔ ان کی شفقت کا ایک اور سبب بھی تھا۔ اس سبب کا نام صفدر پیا ہے۔ جو ایک مغل رجمنٹ کے افسر اور میری وجہ سے انہیں بہت عزیز تھے۔

صفدر پیا کا نام کل بھی میری زندگی کا مرکز تھا اور آج بھی میری حیات کا ہر لمحہ اسی پر گردش کر رہا ہے۔ میری طرح ابھی صفدر پیا کا تعارف بھی ادھورا ہے۔ مگر اس داستان میں بہت سی ایسی تفصیلات آئیں گی، جن کے بعد یہ تعارف ادھورا نہیں رہے گا، پھر بھی میں ان الفاظ کے ساتھ اسے ابھی پورا کرتی ہوں کہ میرے دل کی دھڑکنوں، میرے خون کی روانی، میرے خوابوں کی تعبیر اور بچی کھچی خوشیوں کا نام صفدر پیا ہے۔ میں ان کے بارے میں کوئی بات پوشیدہ نہیں رکھوں گی۔

اب میں اپنی کہانی کی ابتدا وہاں سے کرتی ہوں، جہاں کہانی ختم ہوئی ہے۔ اور انجام سے آغاز کرنے میں مصلحت یہ ہے کہ اس کہانی کا انجام کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ 1857ء میں مغلیہ خاندان پر کیا بیت گئی تھی لیکن لوگ یہ نہیں جانتے کہ مغلوں پر وہ قیامت کی گھڑی کس طرح آئی اور اس کے اسباب کیا تھے؟ جب میں انجام کے بعد اس کہانی کے آغاز کی طرف آؤں گی تو وہ تمام اسرار اور پوشیدہ باتیں بیان کروں گی، جن میں سے اکثر ابھی تک دنیا کی نظروں سے اوجھل ہیں۔

تُو ایک سیاح اور وقائع نویس ہے۔ تجھے علم ہو گا کہ جب کسی ملک میں دو حریف اور دو گروہ برسرِ پیکار ہوتے

14 ستمبر کی لڑائی میں باغی کابلی دروازے اور اجمیری دروازے میں اپنی توپیں اور میگزین چھوڑ کر بھاگ آئے جن پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا۔ اس طرح وہ قدم بہ قدم شہر میں داخل ہونے لگے۔ حالات کی یہ خطرناک صورت دیکھ کر بادشاہ نے کہا کہ وہ خود مقابلے پر نکلیں گے۔ شہزادوں کو حکم ہوا کہ باغیوں کو تیار رکھیں۔ تمام فوج ہم رکاب رہے اور ان کی مدد کرے۔ اعلیٰ حضرت سوار ہو کر لال ڈگی تک گئے مگر فوج نے جو زیادہ تر میرٹھ اور گرد و نواح کے تلنگوں پر مشتمل تھی، لڑنے سے انکار کر دیا۔ حتیٰ کہ کمانڈر اِن چیف شہزادہ ظہیر الدین مغل مرزا کا بھی حکم نہ مانا۔

تلنگوں نے عذر نکالا کہ انہیں رسد اور خوراک نہیں ملتی۔ اس کے ساتھ ہی شہر میں دکانیں لوٹنا شروع کر دیں اور لوٹ مار کر کے بھاگنے لگے جس سے ایک عجیب افراتفری اور بھگدڑ مچ گئی۔ انہیں بھاگتے دیکھ کر بقیہ فوج بھی فرار ہو گئی۔ اعلیٰ حضرت پر حیرت کا سکتہ گزر گیا۔ جیسے تقدیر انہیں فریب دے کر نکل گئی ہو۔

فوج کی حکم عدولی، اپنے ہی شہر میں لوٹ مار اور فرار...... یہ ایسا دل ہلا دینے والا منظر تھا جس نے آخری مغل بادشاہ تاج دار کو ایک طرف اپنے ماضی سے، دوسری جانب مستقبل سے کاٹ کر مایوسی اور نا اُمیدی کے اندھیروں میں دھکیل دیا۔ انہوں نے پہلی بار محسوس کیا کہ نہ صرف دہلی کا تخت بلکہ دہلی کی زمین بھی ان کے قدموں سے نکل گئی ہے اور اب وہ اپنے آباء واجداد کی ہڈیوں پر کھڑے ہیں۔

میں بتا چکی ہوں کہ لال قلعہ مغلوں کی تاریخ اور مغلوں کی تہذیب کا نام تھا مگر جب حالات بالکل بگڑ گئے اور مدافعت کی کوئی صورت نہ رہی کیونکہ باغی فوج شہر[1] سے چلی گئی تھی۔ اور صرف قلیل سے وفادار باقی رہ گئے تھے۔ تب بادشاہ نے قلعہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ تمام مرشد زادوں اور بیگمات کو قلعے سے باہر بھیج دیا۔ خود بھی سوار ہو کر درگاہ نظام الدین اولیاؒ میں پہنچے اور وہاں سے مقبرہ ہمایوں چلے گئے۔

جس رات مغلوں نے قلعہ خالی کیا، وہ اپنی تاریخ اور عظمتِ رفتہ وہیں چھوڑ آئے اور ادبار کے سائے میں صرف اپنی تہذیب لے کر باہر نکلے۔ مگر لال قلعے سے نکلنا تھا کہ اس تہذیب کی گردن پر بھی چھری چل گئی۔ گویا قلعے کے ساتھ سب کچھ ختم ہو گیا۔

19 ستمبر 1857ء کی تاریخ میرے حافظے پر رقم ہی نہیں بلکہ کھدی ہوئی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے سنگ ساز کسی مزار کا کتبہ تیار کرتے وقت مرنے والے کی تاریخ وفات اس پر جلی حرفوں میں کھودتے ہیں۔ 19 ستمبر 1857ء دلی میں خاندانِ مغلیہ کی تاریخِ انتقال ہے۔ وہ ہفتے کا دن تھا اور اس دن کے اُجالے میں اعلیٰ حضرت سراج الدین بہادر شاہ ظفر موت کے ساحل پر کھڑے مغل سلطنت کو گردابِ فنا میں غرق ہوتے دیکھ رہے تھے۔ لیکن لال قلعہ سے انتقال کا عمل 19 ستمبر کی رات کو شروع ہوا تھا۔

وہ خوفناک اور اجل کی طرح سانس لیتی ہوئی بھیانک رات مجھے آج بھی یاد ہے، جب ہم نے لال قلعہ خالی کر دیا تھا۔ اس لیے میں اپنی داستانِ حسرت کا آغاز اپنے انجام سے کرتی ہوں۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

---

[1] مرزا غالب نے اپنی فارسی تاریخ ''دستنبوہ'' میں وضاحت کی ہے کہ 18 ستمبر بروز جمعہ گورے شہر پر قابض ہونے لگے اور کالے اسی روز شہر سے بھاگ گئے تھے۔

ہندوؤں پر کوئی سختی، کوئی پابندی، کوئی باز پرس نہیں تھی۔ مغلوں کے حوالے سے موت اور تباہی و بربادی کے دروازے صرف مسلمانوں کے لیے کھولے گئے تھے۔

میں اس بات پر حیران ہوں کہ جب انگریز کا مقابلہ کرنے والی باغی فوج شہر کو بچانے کے بجائے دکانیں لوٹ کر بھاگ گئی تھی اور گورے، سکھ، گورکھے، ڈوگرے سنگینیں تانے شہر میں داخل ہو رہے تھے، (یہ 18 ستمبر کا واقعہ ہے) تو قلعہ اسی روز کیوں نہ خالی کر دیا گیا؟

قلعہ چھوڑنے کا فیصلہ 19 ستمبر کی رات کو کیا گیا جب انگریزی فوج کچھ اور قریب آ گئی تھی۔

قلعے کے اندر شاہی محلات، مغل شہزادوں کے کوشکوں، امرائے خاص کی عمارتوں اور بادشاہ کے عسکری اور غیر عسکری کارخانوں[1] کے علاوہ نومحلّہ کی آبادی سب سے بڑی تھی۔ ہماری حویلی نومحلّہ سے کسی قدر ہٹ کر واقع تھی۔ یہی وجہ ہے کہ رات کے وقت جب قلعہ خالی کرنے کا اعلان ہوا تو ہمیں اس کی خبر نہ ہو سکی۔

حویلی بے شک بڑی تھی لیکن ہمارا کنبہ چھوٹا تھا۔ بیمار والدہ، ماموں اورنگ مرزا اور میرے علاوہ صرف دو خادمائیں مہرو اور عنبری گھر کا کام کاج کرتی تھیں۔ کوئی مرد ملازم نہیں تھا۔

میری والدہ کئی روز سے بیماری اور نقاہت کے مارے چلنے پھرنے سے بھی معذور تھی۔ فرنگی توپیں پہاڑی سے قلعے پر گولہ باری کرتی تھیں اور جب گولے پھٹتے تو ان کے دھماکوں سے ماں کے دل کو بڑا اخلجان ہوتا تھا۔ اسی لیے عنبری دروازے اور دریچے اکثر بند رکھتی تھی جس پر دبیز پردے ڈالے گئے تھے تاکہ گولے پھٹنے سے جو دھماکے ہوتے تھے، ان کی شدت کچھ کم ہو جائے۔ لیکن یہی احتیاط 19 ستمبر کی رات کو ہمارے لیے ایک نئی پریشانی اور مصیبت کا سبب بن گئی۔

اُس روز ماں کی طبیعت زیادہ ناساز تھی۔ میں مہرو اور عنبری کے ساتھ اس کی دیکھ بھال میں مصروف تھی۔ اس مصروفیت میں یہ بھی نہ پتہ چلا کہ قلعہ چھوڑنے کا اعلان کب ہوا اور لوگ وہاں سے کس وقت نکلنے لگے۔

میرے ماموں اورنگ مرزا عموماً سویرے ہی حویلی سے نکل جاتے اور شام کے قریب لوٹتے تھے۔ شام کا کھانا کھا کر وہ پھر چلے جاتے اور رات گئے واپس آتے تھے۔ اس روز بھی دستور کے مطابق وہ شام کے وقت حویلی سے نکل گئے اور آدھی رات تک لوٹ کر نہیں آئے تھے۔

دہلی کے حالات اگرچہ بگڑ گئے اور تلنگوں کے بھاگ جانے سے کمپنی سرکار کے گورے اور دیسی سپاہی شہر میں مار دھاڑ کرتے پھر رہے تھے جن کی گولیوں کی آوازیں قلعے میں سنائی دیتی تھیں اور دہلی کے سقوط کی خبر کسی وقت بھی متوقع تھی۔ لیکن ماموں مرزا نے بتایا تھا کہ جنرل بخت خان روہیلہ جسے اعلیٰ حضرت نے ''وقار الملک'' اور ''لارڈ گورنر بہادر'' کے خطابات دے کر فوجی امور کا ناظمِ اعلیٰ مقرر کر رکھا تھا، فرنگی کے خلاف آخری دم تک لڑنے کا

---

[1] بہادر شاہ ظفر کے کارخانوں کی فہرست درج ذیل ہے۔ (۱) خاصہ کلاں (۲) خاصہ خورد (۳) آب دار خانہ (۴) دوا خانہ، (۵) توشہ خانہ (۶) جواہر خانہ (۷) سلح خانہ (۸) فیل خانہ (۹) اصطبل بگھی گھر (۱۰) توپ خانہ (۱۱) شتر خانہ (۱۲) رتھ خانہ (۱۳) جلوسِ ماہی مراتب کا کارخانہ (۱۴) بخشی خانہ فوج (۱۵) کتب خانہ (۱۶) داروغہ نذر و نیاز (۱۸) داروغہ فراش خانہ (۱۹) پالکی خانہ (۲۰) داروغہ کہاراں (۲۱) داروغہ خاص برداراں (۲۲) افسر خواجہ سرایان۔

ہیں یا کسی غاصب حکومت کے خلاف انقلاب کا دھارا پھوٹتا ہے تو سرکاری اصطلاح میں بغاوت کرنے والے گروہ اور اس کے قائد کو باغی، غدار اور امن دشمنوں کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگر تبدیلی لانے اور بغاوت کرنے والا فریق حکومت کا تختہ اُلٹ دے تو اس کا باغی قائد، صدرِ اعظم یا شاہِ معظم کہلاتا ہے۔ لوگ اس فاتح کے سامنے ادب سے جھک جاتے ہیں۔ اس کے ساتھیوں کو آزادی کے ہیرو قرار دیتے اور ان کے گلے میں پھولوں کے ہار ڈالتے ہیں۔ اگر باغی گروہ اور اس کا قائد جنگ ہار جائے تو اس کے لیے گرفتاری، پھانسی، قید و بند اور ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ حکومت اسے غدار، عہد شکن، فتنہ پرور اور ظالم کے خطابات سے نوازتی اور اس کے نام پر ملک دشمنی کی مہریں ثبت کرتی ہے۔ گویا جنگ میں عظمت کا انحصار صرف کامیابی پر ہے۔ ناکامی کی صورت میں ملک کا اصل اور جائز حکمران بھی پھانسی یا قید خانے میں ڈال دیا جاتا ہے۔

یہاں بھی یہی کچھ ہوا ہے۔ مغلیہ خاندان جو صدیوں سے ہندوستان پر حکومت کرتا آرہا تھا اور جس کے دورِ زوال میں بھی لوگ کسی دوسرے حکمران کی اطاعت پسند نہیں تھے۔ حتیٰ کہ جب کمپنی سرکار کی ہندوستانی فوجوں نے انگریز کے خلاف بغاوت کر دی تو انہوں نے دہلی کا رخ کیا اور بوڑھے مغل بادشاہ ہی کو اپنا حکمرانِ اعلیٰ تسلیم کر کے آزادی کی جنگ لڑی لیکن مغل یہ جنگ ہار گئے اور اس شکست کا نتیجہ بھی مغلوں کی تباہی و بربادی کی صورت میں نکلا۔

اس جنگ کو جو ہندوستان کی آزادی کے لیے سمندر پار کے بدیسی اور اجنبی حاکموں کے خلاف لڑی گئی، غدر، فساد، بلوہ، بدامنی اور نہ جانے کن کن ناموں سے یاد کیا جاتا ہے لیکن اس جنگ یا غدر کے دونوں فریق میرے سامنے ہیں اور میں نے ان کی مرحلہ وار کارروائیوں کے گوشے تیار کیے ہیں۔ جب وہ گوشوارے کھلیں گے، دنیا جان لے گی کہ غاصب کون اور مظلوم کون تھا؟

کسی قوم کے عروج و زوال میں تقدیر کے نوشتے اور اس کے اپنے اعمال بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ مغلوں کو بھی پیش آیا۔ میں نے ان کا عروج نہیں دیکھا، زوال دیکھا ہے۔ شکست و بربادی دیکھی ہے۔ اور اسی شکست سے اپنی داستان کا آغاز کرتی ہوں۔

اے میرے وقائع نویس مہمان!

میں تجھے بتا چکی ہوں، وہ 19 ستمبر 1857ء کی تاریخ اور ہفتے کی ہولناک رات تھی، جب بادشاہ نے لال قلعہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ فرنگی گورے، پنجاب کے سکھ، جموں کے ڈوگرے اور نیپال کے گورکھے دہلی میں داخل ہو چکے تھے۔ شہر میں قتل عام شروع ہو گیا تھا۔ گھروں کے دروازے توڑے جا رہے تھے۔ مسلمان شہریوں کو گولیوں اور سنگینوں سے ہلاک کیا جا رہا تھا۔ دہلی پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی اور اس قیامت میں لوگ گٹھڑیاں اٹھائے اور بال بچوں کو لے کر شہر سے بھاگ رہے تھے۔ خواتین کو اپنے پردے کا بھی ہوش نہیں تھا۔ فرنگی بھیڑیئے، سکھ، گورکھے، ڈوگرے ان پر ناگہاں جھپٹ پڑے تھے اور جب موت زندگی کا پیچھا کر رہی ہو، برقع اوڑھنے یا سر ڈھانپنے کا چارہ کون کرتا ہے؟ بھاگ دوڑ میں صرف زندگی عزیز ہوتی ہے۔

اس قیامت کا نقشہ یہ تھا کہ بوڑھی، جوان عورتیں اور نوجوان لڑکیاں، کوئی برقعہ اوڑھے، کوئی کھلے منہ اور ننگے سر شہر سے بھاگ رہی تھیں۔ یہ مہیب اور دل میں ہول ڈال دینے والی قیامت صرف مسلمان شہریوں پر ٹوٹی تھی۔

رہی تھی؟ اب یاد نہیں رہا۔ عنبری سیدھی ماں کے پاس پہنچی اور بدحواسی کے عالم میں کہنے لگی۔

''مغلانی بیگم! قلعہ تو کب کا خالی ہو گیا۔ سب لوگ چلے گئے۔ محل سرائیں اور حویلیاں سنسان پڑی ہیں۔ چار کھونٹ ایسی چپ لگی ہے کہ مارے ڈر کے میرا کلیجہ اُچھلنے لگا۔ وہ تو جب میں نو محلے سے بھاگی تو اتفاق سے کبوتر خانے کا منشی لوٹن مل گیا جو ایک ڈھابلی اُٹھائے، ڈر نگے لگا تا اکیلا چلا جا رہا تھا۔ اُسے آواز دی تو رُکا اور حیرت سے مجھے دیکھنے لگا۔ میں نے پوچھا۔ ''قلعے پر کیا بلا نازل ہوئی؟ لوگ کہاں چلے گئے؟''

وہ بولا۔ ''لو تمہیں تو کچھ خبر ہی نہیں۔ رات گئے اعلیٰ حضرت نے اعلان کرایا تھا کہ قلعہ خالی کر دیا جائے اور لوگ ہمایوں کے مقبرے میں چلے جائیں۔ اعلان ہوتے ہی بیگمات، بیویاں، شہزادیاں، ان کی لونڈیاں، باندیاں، اردا بیگنیاں، ترکنیاں، جسولنیاں، مہریاں، کہاریاں سب چلی گئیں اور تم ابھی تک یہیں پھر رہی ہو۔ اے بی! اگر اپنی سلامتی عزیز ہے تو بھاگو یہاں سے۔ کوئی دم میں فرنگی فوج آیا چاہتی ہے۔''

ماں تو قلعہ خالی ہونے کی خبر سنتے ہی تڑپ کر اُٹھی اور میں بھاگ کر وہاں پہنچی تو عنبری کے چہرے پر ہوائیں اُڑ رہی تھیں۔ مہرو دم بخود کھڑی تھی۔ مغلانی ماں پر حیرت کا سکتہ طاری تھا۔ میں نے جاتے ہی پوچھا۔ ''یہ سب کچھ کب ہوا؟ کیسے ہوا؟''

''میں صدقے واری! یہ وقت باتوں میں ضائع کرنے کا نہیں ہے۔ یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے۔''

وقت کی نزاکت کا مجھے احساس تھا۔ عنبری اور مہرو سے کہا کہ وہ کچھ ضروری اشیاء باندھ لیں، زیورات کی صندوقچی اُٹھا لیں اور نکلنے والی بات کریں۔ اس وقت حویلی میں ہم صرف چار عورتیں تھیں اور جیسا عنبری نے آ کر بتایا تھا، قلعے میں غالباً ہمارے سوا اور کوئی متنفس موجود نہ تھا۔ اب ہمیں قلعے کی بھائیں بھائیں کرتی خاموشی، رات کی وحشت اور خطرے کی سنگینی کا احساس ہوا۔ پہلے تو یہ حوصلہ تھا کہ اگر خطرے کی کوئی بات ہوئی تو ماموں مرزا فوراً آ کر اطلاع دیں گے لیکن وہ نہ آئے۔ نہ کسی نے ہماری حویلی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ مجھے خیال آیا، شاید ماموں مرزا سمجھ رہے ہوں گے کہ قلعہ خالی کرنے کی منادی سن کر ہم حویلی سے نکل گئی ہوں گی مگر وہ خود کہاں رہ گئے؟ مار دھاڑ، قتل و خوں ریزی اور افراتفری کے دن تھے۔ دل کو دھڑکا لگا، کہیں انہیں کوئی حادثہ پیش نہ آ گیا ہو۔ ٹھیک اسی لمحے ماموں اورنگ مرزا افتاں خیزاں حویلی میں داخل ہوئے، لپکتے جھپکتے سیدھے اپنی بہن کے پاس آئے اور گھبرائے ہوئے بولے۔

''غضب خدا کا مغلانی! سب لوگ قلعہ خالی کر گئے اور تم یہیں بیٹھی ہو۔''

بھائی کو دیکھ کر بیمار بہن کو کچھ حوصلہ ہوا تاہم ماموں مرزا کو جواب میں نے دیا۔ ''قلعہ خالی کرنے کا اعلان کب ہوا، ہمیں کچھ خبر نہیں۔ ماں کی طبیعت خراب تھی۔ آپ کا انتظار تھا۔ ابھی ابھی عنبری باہر نکلی تو پتہ چلا کہ نو محلّہ سے لے کر شاہی کارخانوں تک قلعہ سنسان پڑا ہے۔''

اس اثناء میں دونوں خادماؤں نے کچھ ضروری سامان باندھ لیا اور زیورات کی صندوقچی بھی سنبھال لی تھی۔ ماموں مرزا مجھ سے کہنے لگے۔

''لالہ رُخ! تم مغلانی کو سنبھالو۔ میں مہرو اور عنبری کو لے کر تمہارے پیچھے آتا ہوں۔''

پھر وہ اپنے کمرے کی طرف بھاگے۔ میں بیمار ماں کو لے کر ان کے کمرے کے سامنے سے گزری تو

ارادہ رکھتا تھا اور اس کے افغان سپاہی بڑی مستعدی سے قلعے کی حفاظت کر رہے تھے۔

شہر کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال اور اپنوں کی بے وفائی نے اگرچہ بادشاہ کو افسردہ خاطر کر دیا تھا، وہ گوشہ نشین ہو گئے تھے اور کسی سے ملتے بھی نہیں تھے تاہم اہلِ قلعہ کو جنرل بخت خاں اور اس کے روہیلے سپاہیوں پر بھروسہ تاکہ فرنگی فوج کو قلعے کے قریب بھی نہ پھٹکنے دیں گے اس لیے وہ اطمینان سے اپنے محلے دو محلوں میں بیٹھے تھے کہ 19 ستمبر کی رات کو اعلیٰ حضرت نے اچانک قلعہ خالی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اعلان سنتے ہی مغل افراتفری میں بھاگ نکلے اور قلعے کی عمارتیں خالی ہونے لگیں۔

یہ اعلان کافی رات گئے ہوا مگر ہم اس لیے نہ سن سکے کہ اول تو ہماری حویلی نو محلہ سے کچھ فاصلے پر تھی، دوسرے ماں کی طبیعت اچانک بگڑ جانے سے میں، مہرو اور عنبری اس کی تیمارداری میں لگی ہوئی تھیں اور کچھ خبر نہ تھی کہ باہر کیا ہو رہا ہے۔

ماں حکیم محمود خاں کے زیرِ علاج تھی، جو میرے ماموں اورنگ مرزا کے ذاتی دوست اور مشہور شریفی خاندان کے فرزند تھے۔ ان کا قلعے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ شاہ عالم کے دور ہی میں یہ شریفی حکماء لال قلعے سے اپنا رابطہ منقطع کر چکے تھے مگر حکیم محمود خان جو بڑے پائے کے حکیم اور ماموں مرزا سے دوستی کا پیوند رکھتے تھے، میری ماں کو ایک ستم رسیدہ مغلانی سمجھ کر توجہ دیتے تھے۔ ماں کی دوا ختم ہو چکی تھی اور شہر میں جو قیامت مچی تھی، اس کے پیشِ نظر نہ تو ماموں مرزا ان کے مطب جا سکتے تھے، نہ مہرو یا عنبری میں سے کسی کو بھیجنا مناسب تھا۔

ماں کا دل ڈوب ڈوب جاتا تھا۔ میں ماموں مرزا کے انتظار میں تھی۔ جب وہ آدھی رات تک نہ آئے تو عنبری کو نواب شوکت محل بیگم کی طرف بھیجا کہ ان سے کوئی مفرح قلب دوا لے آئے۔ انہیں بھی اختلاجِ قلب کا عارضہ تھا اور کوئی نہ کوئی دوا اپنے پاس ضرور رکھتی تھیں۔ پہلے وہ نواب شمس[1] الدین خاں لوہارو کی بیگم تھیں جن سے ان کے فرزند مرزا داغ (دہلوی) بڑے اچھے شاعر ہیں۔ نواب صاحب کی وفات کے بعد وہ اپنے کم سن بیٹے کو لے کر قلعہ معلیٰ میں آ گئیں اور یہاں بادشاہ کے ولی عہد فرزند مرزا فخر الدین فتح الملک سے عقدِ ثانی کر لیا۔ انہیں ''شوکت محل'' کا خطاب اسی دوسری شادی پر دیا گیا تھا۔

جب کبھی مرزا فخر الدین فتح الملک بہادر کا ذکر آتا ہے، میرے دل میں غم کا بھنور پڑ جاتا ہے۔ وہ 1856ء میں انتقال کر گئے تھے اور جس طرح ان کی رحلت شوکت محل بیگم کے لیے اندوہناک تھی، اسی طرح میری ماں اور میرے لیے بھی سوہانِ روح ثابت ہوئی۔ ان سے ہمارا کیا ناتہ اور نواب شوکت محل سے کیا تعلق ہے؟ اس کی نوعیت اور اہمیت تجھے آگے چل کر معلوم ہو جائے گی۔ کیونکہ اس ناتے اور اس تعلق کے بغیر میری کہانی آگے نہیں بڑھتی۔

نواب شوکت محل بیگم کے ساتھ مجھے اور میری ماں کو جو نسبت ہے، اسی کے پیشِ نظر عنبری کو بھیجا تھا کہ انہیں ماں کی حالت سے آگاہ کرے اور دل کو تقویت دینے والی کوئی دوا لیتی آئے۔ لیکن ابھی تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ عنبری ہانپتی کانپتی، ہائے وائے کرتی لوٹ آئی۔ میں اس وقت اپنے کمرے میں کوئی چیز ڈھونڈ رہی تھی اور کیا ڈھونڈ

---

[1] نواب شمس الدین خاں لوہارو والئ فیروز پور کو فریزر صاحب کے قتل کے الزام میں کمپنی گورنمنٹ نے پھانسی دے دی تھی۔ (مصنف)

یہ تاریخی قلعہ، مغل شہنشاہ شاہ جہان فردوس آرام گاہ کے عہد میں تعمیر ہوا اور مغلیہ تہذیب کا مرکز ہی نہیں بلکہ ''عروسِ دہلی'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا جہاں شب و روز زندگی کے قہقہے گونجتے اور گھوڑوں، اونٹوں، ہاتھیوں کے ہمہمے سنائی دیتے تھے، اس رات کسی شہرِ خاموشاں کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ہر طرف موت کی سی چپ اور ہر جانب اجل کی سی تاریکی چھائی تھی۔ شاہی محلات، قصر و ایوان، کوشک، حویلیاں، محل دو محلے، دیوانِ خاص، دیوانِ عام، قلعے کی فصیلیں، گنبد، برج، دروازے، عسکری و غیر عسکری کارخانے، خورد و جہاں محل، نو محلّہ کی عمارتیں، باغ حیات بخش، نہر بہشت، موتی محل، جل محل، ہیرا محل، موتی مسجد اور اس کے مینار سب اندھیرے میں مہر بہ لب اور بہ زبانِ خاموشی مغلیہ خاندان کی تیرہ بختی پر نوحہ کناں تھے۔

اس تاریکی، خاموشی اور ویرانی کو دیکھ کر میرا دل بھر آیا۔ پلکوں سے آنسو ٹوٹ کر گر پڑے اور بدن پر کپکپی طاری ہو گئی۔ وہ لال قلعہ جس نے مغلوں کے عروج و اقبال کے منظر دیکھے تھے اور ان کی شان و شوکت کا امین تھا، آج ان سے خالی ہو چکا تھا اور غریب الدیار مغل وہاں سے رخصت ہو گئے تھے۔

میں نے ایک ہاتھ سے ماں کو سنبھال رکھا تھا، دوسرا ہاتھ ماموں مرزا کے ہاتھ میں تھا، جو ہمیں ایک جانب لیے جا رہے تھے۔ چلتے چلتے مجھے یوں لگا جیسے ان کا ہاتھ کانپ رہا ہے۔ غالباً وہ بھی انہی جذبات سے دوچار تھے جو میرے دل سے گزر رہے تھے۔ اپنی اس مصیبت میں مجھے صفدر پیا کا خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ نہ جانے وہ کہاں اور کس حال میں ہوں گے۔ آخر ماموں مرزا سے پوچھ ہی لیا۔ ''کچھ صفدر مرزا کا بھی پتہ ہے آپ کو؟''

''وہ بادشاہ کی تام جھام (پالکی) کے ہمراہ حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں پہنچ گئے ہیں۔''

صفدر پیا کی طرف سے فکر دور ہوئی تو میں نے دوسرا سوال کیا۔ ''جب جنرل بخت خاں اور اس کی روہیل فوج نے قلعے کی حفاظت کرنے کا یقین دلایا تھا، پھر اعلیٰ حضرت نے ایکا ایکی قلعہ خالی کرنے کا فیصلہ کیوں کیا؟''

''یہ فیصلہ بادشاہ نے خود نہیں کیا، ان سے کروایا گیا ہے۔'' پھر ماموں مرزا بتانے لگے۔ ''آج رات نواب مرزا الٰہی بخش ان سے ملنے آیا تھا۔ اسی نے بادشاہ کے کانوں میں کوئی پھونک ماری، جنرل بخت خان پر بداعتمادی کا اظہار کیا اور انگریز کا پیغام دیا کہ بادشاہ از خود قلعہ خالی کر دیں گے تو ان کے ساتھ پاس خاطر سے پیش آ جائیں گے۔ بصورت دیگر وہ کوئی ضمانت نہیں دے سکتے۔ تم جانتی ہو، مرزا الٰہی بخش انگریز کا وفادار ہے۔ اسی نے پٹی پڑھائی کہ قلعہ خالی کر دینے ہی میں عافیت ہے مگر بادشاہ نے جنرل بخت خاں کو کل مقبرہ ہمایوں میں ملاقات کے لیے بلایا ہے اور کل ہی معلوم ہو سکے گا کہ وہ کیا فیصلہ کرتے ہیں۔''

''مرزا الٰہی بخش[1] بادشاہ کا رشتہ دار تھا۔ وہ انگریز کا وفادار ہی نہیں بلکہ خبر رساں بھی تھا۔ اس کے ذریعے قلعے کی ایک ایک بات فرنگی کیمپ میں پہنچ جاتی تھی۔ مگر بادشاہ کو اس پر اعتماد تھا کہ سمدھی ہے اور اس ناتے ان کی خیر خواہی کرے گا۔ مگر مرزا الٰہی بخش نے جو کچھ کیا، اس کا ذکر اس کہانی میں جگہ جگہ آئے گا۔ میری دانست میں اگر اعلیٰ حضرت نے جنرل بخت خاں پر بھروسہ کیا ہوتا اور اپنوں کی سازش کا شکار نہ ہو جاتے تو حالات کی صورت کچھ مختلف ہوتی۔

1۔ نواب مرزا الٰہی بخش بادشاہ کے سمدھی تھے اور ان کی لڑکی ولی عہد مرزا فخر الدین فتح الملک سے بیاہی ہوئی تھی۔ جسے ''شوکت محل'' کا خطاب دیا گیا تھا اور جو نواب شمس الدین خاں لوہارو کی بیوہ تھیں۔

دروازے سے ایک اچٹتی سی نظر اندر ڈالی کہ وہ کیا سامان اٹھاتے ہیں۔ مگر انہوں نے سب قیمتی اشیاء وہیں چھوڑ دیں۔ الماری کھول کر نکس کی قسم کی ایک آہنی سلاخ نکالی اور انگر کھے کے نیچے پٹی میں اُڑس لی۔ سلاخ غالباً ہتھیار کا کام دے سکتی تھی۔ تین چار مومی شمعیں جیب میں ڈالیں، پھر چرمی جلد والا روزنامچہ اُٹھایا۔ ایک ولایتی طمنچہ سنبھالا اور لوٹ آئے۔

وہ روزنامہ انہیں سارے مال واسباب سے زیادہ عزیز تھا، جسے انہوں نے شہزادہ ظہیرالدین مغل مرزا کے ایما پر لکھنا شروع کیا تھا۔ بعض باتیں مرزا مغل خود لکھوایا کرتے تھے۔ اس میں غدر کے حالات کے علاوہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیاسی ریشہ دوانیوں، مغل سلطنت کے خلاف سازشوں اور ہندوستان کے والیانِ ریاست سے کی گئی وعدہ خلافیوں اور عہد شکنیوں کی داستان رقم ہے۔ پھر تیموری خاندان کے کئی اہم راز، اعلیٰ حضرت سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے درباریوں، بعض وزراء اور ان کے خاص اہلِ خانہ کی بھی کچھ ایسی باتیں تحریر ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ بادشاہ کن لوگوں میں گھرے ہوئے تھے۔

ماموں اورنگ مرزا خاندان کے بعض داخلی جھگڑے اور کچھ گفتنی و ناگفتنی معاملے بھی اپنی یادداشتوں کے دور پر روزنامچے میں لکھ لیا کرتے تھے جن کے اندراج کا مرزا مغل کو علم نہیں تھا۔ جبھی وہ روزنامچے کی حفاظت اپنی جان سے بڑھ کر کرتے تھے اور اسے ہر شے سے زیادہ قیمتی سمجھتے تھے۔ 19 ستمبر کی رات کو جب ہم بڑی افراتفری میں حویلی سے نکلے، انہوں نے صرف اپنا روزنامچہ سنبھالنا ضروری سمجھا، اس کا کسی غیر کے ہاتھ لگ جانا یا کسی انگریز افسر تک پہنچ جانا یقیناً خطرناک ہوتا۔

وہ روزنامچہ تاریخی حالات، گزرے واقعات، فرنگیوں کی سازشوں اور لال قلعے کے بارے میں بہت سی خفیہ معلومات کا ایک گنجینۂ اسرار ہے اور اس وقت بھی علی گنج کے ویرانے میں جوں کا توں میرے پاس محفوظ ہے۔

اے وقائع نویس مسافر!

میرے مہمانِ عزیز!

1857ء میں مغلوں پر جو قیامت ٹوٹی، اگرچہ وقت اسے چند سال پیچھے چھوڑ آیا ہے اور میں تباہ و برباد ہو کر علی گنج کے اس ویرانے میں آ بیٹھی ہوں لیکن مغلیہ ادبار کے جو حالات بیان کروں گی، وہ میرے اپنے دیدہ وشنیدہ ہیں۔ میں نے ایسے ہولناک اور لرزہ خیز مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں جنہیں شاید کسی کو سننے کا یارا بھی نہ ہو۔ تاہم بعض واقعات جن کا مجھے ذاتی طور پر علم نہ تھا، ماموں مرزا سے سنے یا ان کے روزنامچے سے اخذ کیے جو میرے پاس ان کی سب سے قیمتی امانت ہے۔

19 ستمبر کی اجل گرفتہ رات کو انہوں نے اپنی تمام قیمتی اشیاء حویلی میں چھوڑ دیں اور صرف روزنامہ اٹھا کر ہمارے ساتھ باہر نکلے۔

❀......❀......❀

باہر موت کا سا بھیانک سناٹا طاری تھا۔ وہ قلعہ معلیٰ جہاں دن رات چہل پہل رہتی تھی، رات کے اندھیرے میں ویران، سنسان، لب بستہ و خاموش کھڑا تھا جیسے کسی قہرمانی قوت نے گویائی چھین کر اسے کسی وادیٔ حیرت کے گونگے بہرے پتھروں میں تبدیل کر دیا ہو۔

خاص کمرے کے دروازے پر ایک سایہ نظر آیا جو بڑی بے قراری کی حالت میں پھر اندر لوٹ گیا۔ میں نے اس سائے کو پہچان لیا۔ وہ نرگس نظر کا سایہ تھا۔ وہ خود نرگس نظر تھی۔

اس نے ہمیں دیکھ لیا مگر پہچان نہ سکی اور یہ سوچ کر کہ نہ جانے کون لوگ جل محل میں آ گئے ہیں، خوف کے مارے ایک کونے میں دبک گئی تھی۔ دوسرے لمحے ہم دونوں دروازے پر پہنچ گئے۔ وہ بڑی سہمی ہوئی اور بدحواس تھی۔ میں نے آواز دی۔

''نرگس نظر!''

اس نے میری آواز سے مجھے پہچان لیا اور پریشانی کے لہجے میں پوچھا۔ ''لالہ رخ! تمہارے ساتھ کون ہے؟''

''ماموں اورنگ مرزا۔''

اسے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں ماموں مرزا کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو نرگس نظر کونے سے نکل کر ہمارے سامنے آ گئی مگر شمع کی روشنی میں چہرے کی زردی اور آنکھوں کی ویرانی نے ہمیں بھی پریشان کر دیا۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''نرگس نظر! قلعہ کب کا خالی ہو چکا۔ رات آدھی سے زیادہ بیت گئی۔ تم اکیلی یہاں کیا کر رہی ہو؟''

''ہمیں مرزا بھائی کا انتظار ہے۔'' نرگس نظر، مرزا عبداللہ کو ''مرزا بھائی'' کہتی تھی۔ ''وہ ہمارے لیے رتھ کا بندوبست کرنے گئے ہیں۔''

''آج رتھ کہاں سے ملے گا؟ وہ بھی اتنی رات گئے۔''

''شاید مل جائے۔''

''اے زناخی[1]! کہیں دُور جانے کا ارادہ ہے کیا؟''

''ہم غازی نگر[2] جائیں گے۔''

''مگر تمہاری مہریاں باندیاں کہاں گئیں؟''

''سب بھاگ گئیں۔'' نرگس نظر خود ہی بتانے لگی۔ ''مرزا بھائی چاہتے تھے ہم اعلیٰ حضرت کے ہمراہ مقبرۂ ہمایوں میں چلے جائیں۔ ہم نے انہیں منع کر دیا کہ بادشاہ کے ساتھ نہ جائیں۔ فرنگی ضرور وعدہ خلافی کریں گے اور جو بھی ان کے ساتھ ہوگا، پکڑ لیں گے۔ وہ سمجھ گئے ہیں کہ اعلیٰ حضرت کی ہمراہی میں خطرہ ہے اور اب ہمارے لیے سواری کا بندوبست کرنے گئے ہیں۔ اگر سواری مل گئی تو ہم رات کے پچھلے پہر غازی نگر روانہ ہو جائیں گے۔''

اس کی باتوں سے ظاہر تھا کہ وہ خطرے کی نوعیت کو پوری طرح سمجھتی ہے اور اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں کہ دہلی فتح کر لینے کے بعد انگریز مغل بادشاہ سے کوئی رعایت کریں گے، اسی لیے مقبرۂ ہمایوں میں نہیں گئی۔

میں نے پوچھا۔ ''سارا قلعہ خالی ہو چکا۔ تمہاری مہریاں باندیاں بھاگ گئیں۔ تم یہاں تنہا ہو۔ کیا اس تنہائی سے تمہیں ہول نہیں آتا؟''

نرگس نظر نے ایک حیرت انگیز انکشاف کیا۔ ''قلعہ تمہیں خالی نظر آتا ہے لالہ رخ! نہیں نہیں۔ کچھ بیگمات، بیویاں، مرشد زادے اپنی محل سراؤں اور حویلیوں میں بوڑھے نوکروں اور ضعیف العمر خادماؤں کو سامان کی حفاظت

---

1. قلعہ معلیٰ کی زبان میں ''زناخی'' کا لفظ سہیلی اور جانِ من کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔

2. غازی نگر آج کل غازی آباد کہلاتا ہے۔ (قمر اجنالوی)

میرا دل اس سازش کے خلاف پیچ وتاب کھا رہا تھا کہ اچانک ماموں مرزا نے میرے خیالات کا سلسلہ توڑ دیا اور بولے۔ ''لالہ رخ! بہادر شاہ ظفر ان حکمرانوں میں سے نہیں جن کے اشارے اور حکم پر تقدیر عمل کرتی ہے۔ بلکہ انہیں تو خود تقدیر کا حکم بجالانا ہے جو بچھو بن کر ان کے آس پاس گھوم رہی ہے۔''

غالباً انہوں نے ''بچھو'' کا لفظ بادشاہ کے بعض رشتہ داروں کے لیے استعمال کیا تھا، جن میں سے ایک مرزا الٰہی بخش بھی ہے اور جس کے مشورے پر بادشاہ نے قلعہ خالی کر دیا تھا۔ ہم اندھیرے میں، جس میں ہماری قسمت کی سیاہی بھی گھل مل گئی تھی، دیوانِ خاص کے سامنے باغِ حیات بخش کے قریب سے گزر رہے تھے کہ ماموں اورنگ مرزا اچانک ٹھٹک گئے۔

باغ حیات بخش میں نہر بہشت کی طرف روشنی کی ایک مدھم سی کرن جھلملا رہی تھی اور ماموں مرزا روشنی کی اسی کرن کو دیکھ کر رک گئے تھے۔ کچھ سوچ کر انہوں نے یک لخت راستہ تبدیل کیا اور نہر بہشت کی جانب ہو لیے۔ باغ حیات بخش کے بیچوں بیچ جل محل کی سرخ عمارت اندھیرے میں دم سادھے کھڑی تھی۔ عمارت کے اردگرد جھالر کی طرح پھیلی غلام گردشیں بھی تاریکی میں ڈوبی تھیں۔ اچانک مشرقی دیوار پر آخری راتوں کے اُبھرتے چاند کی روشنی تھرتھرائی، پھر دیوار سے اُتر کر چاندنی کی کرن ایک غرفے سے اندر دوڑ گئی، جہاں پہلے ہی ایک شمع روشن تھی۔

جل محل کی یہ عمارت (جسے ''ظفر محل[1]'' بھی کہتے تھے کیونکہ اس عمارت کی تاریخ ''ظفر محل'' نکلی اور سنگ مرمر کی لوح کندہ کر کے دروازے کے اوپر نصب کر دی گئی تھی) سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے 1849ء میں باغ حیات بخش کے وسیع و عریض حوض[2] کے اندر تعمیر کرائی تھی جس میں نہر بہشت کا پانی آتا تھا۔ عمارت کے چاروں اطراف سنگ سرخ کی غلام گردشوں کا حاشیہ تھا۔ ہر کنارے پر ایک حجرہ اور ہر ضلعے میں ایک شہ نشین تھی جہاں اعلیٰ حضرت سیر کے وقت بیٹھتے اور باغ حیات بخش کا نظارہ کرتے تھے۔ حوض کی مشرقی جانب ایک پل تھا جسے عبور کر کے آدمی جل محل میں پہنچ سکتا تھا۔

مرزا محمد شاہ رخ، بادشاہ کے چہیتے فرزند تھے۔ شہزادے کی خواہش پر جل محل انہی کو دے دیا تھا۔ مرزا شاہ رخ اور ان کی بیگم دونوں فوت ہو چکے تھے اور ان کے تین بیٹے غضنفر الدولہ مرزا محمد عبداللہ، رفیع الدولہ مرزا محمد بخت، مغیث الدولہ مرزا محمد خرم تھے۔ ایک لڑکی نرگس نظر جس کی عمر اس وقت سترہ برس تھی، بڑے بھائی مرزا عبداللہ شاہ رخ کے ساتھ جل محل میں رہتی تھی۔

غدر میں جب شہزادوں کو فوجی عہدے تفویض کیے گئے تو مرزا شاہ رخ مرحوم کے حصے میں جالیہ پلٹن کی کرنیلی آئی اور ان کے بڑے بیٹے مرزا عبداللہ کو دے دی گئی تھی۔ اس وقت جل محل پر ہو کا عالم طاری تھا اور اس پر کسی مقبرے کا گمان ہوتا تھا مگر اندر ایک شمع جل رہی تھی جیسے کسی مزار پر دیا ٹمٹما رہا ہو۔

ماموں مرزا کو اسی شمع کی روشنی نے حیران کر دیا تھا کہ شاید کوئی اندر موجود ہے۔ انہوں نے مغلانی، مہرو اور عنبری کو باغ میں چھوڑا، مجھے اپنے ساتھ لے کر حوض کا پل عبور کیا اور جل محل کی غلام گردش میں آ گئے۔ اسی لمحے

---

1. ظفر محل کے نام سے بہادر شاہ ظفر نے ایک اور محل درگاہ قطب صاحبؒ کے قریب تعمیر کرایا تھا۔

2. حوض 180 سے 186 فٹ تک چوڑا اور چوکور تھا۔ (مصنف)

''کس کی بات کر رہے ہو؟''

''اے حضور! اپنے صاحب عالم مرحوم کے فرزند مرزا عبداللہ کی زندگی خطرے میں ہے۔''

''کیا ہوا؟''

''سنا ہے فرنگی ان کی تلاش میں ہیں۔ شہزادہ عالی پر انگریزوں کو قتل کرنے کا الزام ہے۔''

''مگر وہ تو نرگس نظر کے لیے سواری کا انتظام کرنے گئے تھے۔''

خواجہ سرا کہنے لگا۔ ''کیا بتاؤں حضور! جل محل سے نکلے تو اسی لیے تھے کہ شہزادی صاحبہ کے لیے کوئی رتھ لے جائیں۔ رتھ کا بندوبست بھی ہو گیا۔ لیکن کانوں میں اپنی تلاش کی بھنک پڑی اور یہ بھی سنا کہ قلعے سے باہر جاسوس ان کی تاک میں ہیں کہ نکلتے ہی گرفتار کر لیں تو پریشان ہو گئے۔ اب ان کا شہزادی نرگس نظر کے ساتھ قلعے سے نکلنا خطرناک تھا کہ فوراً پہچان لیے جائیں گے۔ انہوں نے یہ خدمت میرے سپرد کی کہ میں شہزادی صاحبہ کو رتھ میں لے کر نکلوں اور جہاں وہ کہتی ہیں انہیں لے جاؤں۔ وہ خود بھیس بدل کر قلعے سے نکلنے کی کوشش کریں گے اور اگر قسمت نے یاوری کی تو پھر آملیں گے۔ فی الحال وہ شہزادی صاحبہ کے ساتھ نہیں جا سکتے۔''

اس کی باتیں سن کر ہمارا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ قلعے کے باہر انگریز کے جاسوسوں کی نگرانی بے حد پریشان کُن تھی۔ کیا معلوم انہوں نے کس کس کو پکڑا، کس کس کا کھوج لگایا ہو گا کہ کہاں جا رہا ہے۔ شہر فتح ہو چکا تھا۔ قلعے کے باہر فرنگی کے جاسوسوں، گماشتوں اور فوجیوں کی حکومت تھی اور کسی وقت قلعے میں بھی داخل ہو سکتے تھے۔ اندیشہ تھا کہ شاید ہمیں بھی روکیں یا کوئی چھپ کر ہمارا پیچھا کرے۔ قلعہ بھی اگرچہ محفوظ نہ تھا لیکن باہر تو ہول، وحشت اور دہشت کی حکمرانی تھی۔ فرنگی فوجیوں نے شہر میں قیامت بپا کر رکھی تھی۔ مسلمانوں کو دیکھتے ہی گولی کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔

ماموں مرزا، خواجہ سرا کی گفتگو سن کر مرزا شاہ رخ مرحوم کے بیٹے مرزا عبداللہ کے لیے فکرمند ہو گئے تھے۔ جب جاسوس ان کی تلاش میں تھے تو ان کا شہزادی نرگس نظر کے ساتھ رتھ میں سوار ہو کر قلعے سے نکلنا یقیناً مناسب نہ تھا۔ باہر زندگی کی کوئی ضمانت نہ تھی اور اب تو قلعے کے اندر بھی خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ماموں مرزا، خواجہ سرا سے پوچھنے لگے۔

''کیا مرزا عبداللہ ابھی تک قلعے کے اندر ہیں؟''

''نہیں سرکار!''

''تو پھر کہاں چلے گئے؟''

خواجہ سرا نے بتایا۔ ''میں اُنہیں بگھی گھر (اصطبل) میں لے گیا تھا۔ جہاں ایک سائیس سے جان پہچان تھی۔ شہزادہ صاحب نے اپنا شاہی لباس اُتار کر سائیس کو دے دیا اور اس کے کپڑے خود پہن لیے۔ چہرے پر کچھ دھول بھی ملی۔ اس طرح وہ سائیس کا روپ بدل کر میرے ساتھ ہی قلعے کے دروازے پر آ گئے۔ پھر مجھے نرگس نظر کے بارے میں تاکید کر کے کہ میں کسی حالت میں ان کا ساتھ نہ چھوڑوں اور ان کی حفاظت کروں، وہ قلعے کے دروازے کی جانب ہو لیے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے انہیں سائیس کے بھیس میں باہر جاتے دیکھا اور رتھ لے کر شہزادی صاحبہ کو لینے آیا ہوں۔''

کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ ان کا خیال ہے، جب قتل و غارت کا ہنگامہ تھم جائے گا، وہ قلعے میں لوٹ آئیں گے لیکن یہ ایسا خواب ہے جس کی کوئی تعبیر نہیں۔''

میں یہ سن کر حیران رہ گئی کہ کچھ بوڑھے بوڑھیاں مال و اسباب کی دیکھ بھال کے لیے محل سراؤں اور حویلیوں میں موجود ہیں مگر کسی عمارت میں روشنی نہیں ہو رہی تھی جس سے یہی گمان ہوتا تھا کہ سب لوگ قلعے سے جا چکے ہیں۔ مزید پتہ چلا کہ شاہی فوج دروازوں پر قلعے کی نگرانی کر رہی ہے تاکہ سب لوگ بحفاظت نکل جائیں۔ لیکن یہ دھڑکا تو پھر بھی لگا ہوا تھا کہ نہ جانے فرنگی قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے کب دھاوا کر دیں۔ باہر ان کے دیسی جاسوس قلعے سے نکلنے والوں کی ٹوہ میں تھے کہ کون، کہاں جاتا ہے۔

اچانک ماموں مرزا نے خیال ظاہر کیا۔ ''کیوں نہ ہم بھی نرگس نظر کے ساتھ غازی نگر چلیں؟''

میں نے ان کی تجویز مسترد کر دی۔ ''ماموں مرزا! ہم مقبرۂ ہمایوں میں جائیں گے۔ شاخ اپنے درخت کے ساتھ بھلی لگتی ہے۔ ہری ہو تب بھی، سوکھ جائے تب بھی۔'' پھر نگر نظر سے مخاطب ہوئی۔ ''میری مانو تو تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔''

اس نے انکار کر دیا۔

''نہیں لالہ رخ! ہم غازی نگر جائیں گے۔ وہاں انا رہتی ہے۔ اسی کے ہاں قیام کریں گے۔''

اب کچھ کہنا سننا بے کار تھا۔ میں نے ماموں مرزا کو چلنے کا اشارہ کیا مگر اس سے پہلے کہ ہم جل محل سے نکلتے، نرگس نظر مجھ سے لپٹ گئی۔ اس نے مجھے، میں نے اسے بانہوں میں بھینچ لیا اور آنکھوں میں تیرتا پانی پلکوں سے ٹپک پڑا۔ ہم دونوں ایک دو لمحے مغلیہ خاندان کی بربادی اور اپنی مصیبت پر جو ہمیں درپیش تھی، روتی رہیں۔ پھر آنسو پونچھتی ایک دوسرے سے الگ ہو گئیں۔ یہ رونا تو اب عمر بھر کا تھا۔

میری طرح نرگس نظر بھی بڑی غمگین، اُداس اور بے چین تھی۔ میں یہ کہہ کر پلٹی۔ ''اچھا زناخی! زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔''

لیکن پھر ملنے کی بات قطعی غلط ثابت ہوئی۔ وقت اور حوادث نے ہمارے درمیان ہمیشہ کی جدائی ڈال دی۔ یہ ہماری آخری ملاقات تھی۔ 19 ستمبر کی ہول، صدمے اور مصیبت میں لپٹی ہوئی رات کے بعد میں نرگس نظر سے پھر کبھی نہ مل سکی۔ اسے جل محل میں چھوڑ کر ماموں مرزا کے ساتھ باہر نکلی اور آکر ماں کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ تڑپ کر بولی۔

''اے ہائے! لڑکی کہیں پاگل تو نہیں ہو گئی؟ اسے یہاں اکیلی چھوڑ کر جانا مناسب نہیں۔ نہ جانے دم بھر میں کیا سے کیا ہو جائے؟ اورنگ مرزا! خدا کے لیے جاؤ اور اسے زبردستی گھسیٹ لاؤ۔''

''لالہ رخ نے بہت سمجھایا۔ وہ نہیں آئے گی۔'' یہ کہہ کر ماموں مرزا ایک روش پر ہو لیے۔

ابھی ہم باغ حیات بخش سے نکل رہے تھے کہ ایک رتھ اسی جانب آتا دکھائی دیا اور باغ کے قریب آکر رک گیا۔ اس سے ایک خواجہ سرا اُترا اور جل محل کی طرف بڑھا۔ اس نے ہمیں حوض کا مشرقی پل عبور کرتے دیکھ لیا تھا۔ ہمارے قریب آکر ٹھٹکا۔ ماموں اورنگ مرزا کو پہچان کر تسلیم بجا لایا اور پریشانی میں بولا۔ ''کیا وقت آ گیا ہے سرکار! شہزادے فرنگیوں سے چھپتے اور اپنی جان بچاتے پھر رہے ہیں۔''

(2)
ویرانۂ دہلی

ہم گرتے پڑتے، تیز تیز چلے جا رہے تھے کہ ناگہاں قلعے کے دروازے پر شور وغل سن کر ہمارے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ پھر بندوقیں داغنے کی دہشت ناک آوازیں اُبھریں اور ان کے دھماکوں میں کچھ مرنے والوں کی دم توڑتی چیخیں اور کچھ زخمیوں کی سسکیاں بھی سنائی دیں۔ ایک دم خیال گزرا، شاید فرنگی فوج قلعے پر قبضہ کرنے آ گئی ہے۔

ماموں مرزا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانِ عام کا راستہ چھوڑ کر ہاتھی والے درّے کی طرف بھاگے۔ میرا دوسرا ہاتھ بیمار ماں کے ہاتھ میں تھا، اپنے ساتھ میں اسے بھی گھسیٹتی اور سنبھالتی آ رہی تھی۔ مہرو اور عنبری ہمارے پیچھے پیچھے دوڑنے لگیں۔ ہم سبھی گھبرائے ہوئے تھے لیکن مغلانی زیادہ پریشان ہو رہی تھی۔ اپنی ہمت کے مطابق جو خطرے کی گھڑی میں ہر انسان کے جسم میں عود کر آتی ہے، وہ بھی بھاگ رہی تھی اور اپنی پریشانی کا اظہار بھی کر رہی تھی۔

''اورنگ مرزا! لگتا ہے موئے فرنگیوں نے قلعے کو گھیر لیا ہے۔ ہم باہر نکل بھی سکیں گے یا نہیں؟ اور وہ نرگس نظر، اُس کا کیا ہو گا؟''

اپنی پریشانی کے ساتھ ماں کو سترہ برس کی جوان اور حسین شہزادی نرگس نظر کا خیال بھی ستا رہا تھا مگر حیرانی کی بات یہ تھی کہ نہ دوبارہ بندوقیں داغی گئیں، نہ کوئی شور وغل سنائی دیا۔ ماموں مرزا نے اپنی بیمار بہن کو تسلی دی۔

''بی مغلانی! گھبراؤ نہیں۔ قلعے سے تو میں تمہیں نکال لے جاؤں گا۔ لیکن باہر کیا ہو گا، یہ نہیں جانتا۔''

قلعے کا ہاتھی دروازہ ''ہاتھی والے درّے'' سے ملحق ہے جو شاہی محلات کے عقب میں واقع ہے۔ اس درے میں لکھوری اینٹوں کا سلامی فرش اوپر سے نیچے کو اُترتا اور ہاتھی دروازے کی طرف جاتا ہے۔ جب مغل شہنشاہ قلعے سے ہاتھی پر سوار ہو کر نکلتے تھے تو اس درے سے گزرتے تھے۔ ماموں مرزا ہمیں اسی درے کی طرف لیے جا رہے تھے۔ میرا خیال تھا ہاتھی دروازے کا راستہ ہر حال میں ابھی تک محفوظ ہو گا جبھی ماموں مرزا نے قلعے سے نکلنے کے لیے وہی راستہ اختیار کیا ہے۔

اس بھیانک رات میں جب کوئی شخص یقینی طور پر کسی کے تحفظ کی ضمانت نہیں دے سکتا تھا کیونکہ موت دہلی

میرے دل پر جیسے کسی نے گھونسا مار دیا۔ بہادر شاہ ظفر کے پوتے کو، ایک مغل شہزادے کو اپنی جان بچانے کے لیے سائیس کا بھیس بدلنا پڑا۔ یہ تھی حالات کی گردش۔ مگر اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ گردشِ زمانہ ہمیں اور کیا کچھ دکھانے والی ہے۔

ماموں مرزا نے خواجہ سرا سے دریافت کیا۔ ''تمہیں علم ہے کہ مرزا، سائیس کے بھیس میں کس طرف گئے ہیں؟''

''نہیں حضور! میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ قلعے سے نکلنے کے بعد ان پر کیا بیتی؟ اگر مخبروں کی نظروں سے بچ نکلے تو کسی گھسیارے گھوسی کے ہاں پناہ لیں گے۔'' پھر اس نے مہرو اور عنبری پر نظر ڈالی جو سامان کی گٹھڑیاں اور زیورات کی صندوقچی اُٹھائے ہمارے عقب میں کھڑی تھیں اور تشویش کے لہجے میں بولا۔ ''حضور! آپ بھی ذرا بچ کر جائیو۔ باہر مار دھاڑ ہو رہی ہے۔ اچھا، آداب بجالاتا ہوں۔ مجھے جلدی ہے۔''

یہ کہہ کر آداب کرتا ہوا وہ جل محل کی طرف چل دیا اور ہم ماموں مرزا کے ساتھ ہو لیے۔ ان کا رخ دیوانِ عام کی جانب تھا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے اور مغلوں کی بدبختی بھیڑیوں کے رُوپ میں قلعہ معلّٰی کے اردگرد چکر لگا رہی تھی۔

❀......❀......❀

تھا کہ فرنگی فوج کو آگے بڑھنے سے روکنے کی تیاری میں ہیں یا کوئی اور بات تھی۔

نہ جانے باہر کیا ہو رہا تھا؟ ان کی توجہ اسی طرف تھی۔ کسی نے ہمیں درّے کا ترچھا نشیب اُترتے اور درّے میں داخل ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ حالانکہ ہلکی چاندنی پھیل رہی تھی اور فصیل سے ہم اس وقت با آسانی نظر آ سکتے تھے جب درّے میں اُتر رہے تھے۔ البتہ درّے میں اُترنے کے بعد جس کی دیواریں ہاتھی کے قد سے اونچی تھیں اور جہاں چاندنی نہیں تھی، ہمارا نظر آنا مشکل تھا۔

کوئی پچاس پچپن قدم چلنے کے بعد ماموں مرزا درّے کی بائیں دیوار کا جائزہ لینے لگے۔ پھر پانچ چھ قدم مزید آگے بڑھے اور رک گئے۔ نہ صرف رک گئے بلکہ فرش پر بیٹھ گئے اور کمر کی پیٹی سے وہ انکس جیسی آہنی سلاخ نکال لی جو انہوں نے حویلی سے نکلتے وقت انگرکھے کے نیچے اُڑس لی تھی۔ ابھی میں اسی بات پر حیران ہو رہی تھی کہ وہ درّے میں چلتے چلتے اچانک رُک کیوں گئے ہیں؟ کہ انہوں نے انکس نما سلاخ کی ترچھی نوک پتھر کی ایک مستطیل سل کی نچلی دراز میں گھسیڑ دی اور اسے ہلانے لگے۔ سل دو فٹ چوڑی اور تین فٹ لمبی تھی۔ اس پر ''ہاتھی درّے'' کی عمر کے متعلق فارسی زبان میں چند سطور کندہ تھیں۔ گویا وہ اس درّے کی لوحِ تاریخ تھی۔ ماموں مرزا نے آہنی سلاخ کو ایک خاص ترکیب سے جھٹکا دیا تو بھاری سل پر لی طرف ڈھے گئی اور دیوار میں تین فٹ لمبا، دو فٹ چوڑا شگاف یا دریچہ کھل گیا جو دراصل ایک سرنگ کا دہانہ تھا اور جس میں ایک آدمی بخوبی داخل ہو سکتا تھا۔

میں، مغلانی، مہرو، عنبری حیرت پاش نظروں سے سرنگ کا وہ دہانہ دیکھنے لگیں جو کسی طلسم کی طرح نمودار ہوا تھا۔ اس شگاف سے ایک ترچھا نشیب سرنگ میں اُترتا تھا جس کے اندر قبر کی سی تاریکی تھی۔

ماموں مرزا نے بتایا۔

''یہ سرنگ قلعے سے دور ایک ویرانے میں جا نکلتی ہے اور ہم اسی راستے باہر جائیں گے۔''

ان کے اشارے پر سب سے پہلے مہرو سرنگ کے دہانے میں داخل ہوئی، پھر زیورات کی صندوقچی اور دونوں گٹھڑیاں اندر پہنچائی گئیں۔ بعد ازاں عنبری شگاف سے گزری، پھر میں اور مغلانی یکے بعد دیگرے سرنگ میں اُتریں۔ سب کے بعد ماموں مرزا داخل ہوئے۔ سرنگ میں اگرچہ اندھیرا تھا لیکن شگاف کے آس پاس مدھم سا اُجالا ہو رہا تھا۔ ماموں مرزا نے اندر آتے ہی بھاری سل اٹھا کر کھڑی کر دی اور ''کڑک'' کی آواز کے ساتھ پھر شگاف میں جما دی۔

سرنگ کا دہانہ بند ہوتے ہی گھپ اندھیرا ہو گیا تھا۔ جیسے ہم سچ مچ کسی تاریک قبر میں اُتر گئے ہوں۔ مگر فوراً ماموں مرزا نے مومی شمع روشن کر دی، جس سے سرنگ میں زرد اُجالا پھیل گیا اور اس زرد اُجالے میں وہ ہمیں لے کر آگے بڑھے۔

مجھے بعد میں پتہ چلا کہ پتھر کی سل کے نیچے، جو دراصل ''ہاتھی درّے'' کی ایک نمائشی لوح تھی، لوہے کی کمانی لگی ہوئی تھی جسے خاص ترکیب سے دبانے اور جھٹکا دینے پر سل نیچے ڈھے جاتی اور دوبارہ جوں کی توں شگاف میں جمائی جا سکتی تھی۔

حویلی میں جب میں نے انہیں آہنی سلاخ پیٹی میں اُڑستے دیکھا تو یہی سمجھا تھا کہ سلاخ انہوں نے ہتھیار کے طور پر لی ہے جو خطرے کے وقت کام آئے گی۔ میں بھول گئی تھی کہ ان کے پاس ایک ولایتی طمنچہ بھی تھا جس

کے گرد اپنا حلقہ تنگ کرتی لال قلعے کی جانب بڑھ رہی تھی، ہمیں کسی محفوظ راستے کی تلاش تھی۔ میرے خیال میں وہ راستہ صرف ہاتھی دروازے سے نکلتا تھا، جدھر آمد و رفت نہیں تھی۔ ماموں مرزا ہمیں اسی جانب لیے جا رہے تھے۔

ابھی ہم ''ہاتھی والے درے'' سے نصف فرلانگ دور تھے کہ قلعے کے باہر پھر شور اُٹھا اور ہماری بدنصیبی کہ اس مرتبہ شور ہاتھی دروازے کی طرف بلند ہوا جس کا مطلب تھا کہ اس دروازے سے نکلنا بھی خالی از خطرہ نہیں۔ تقدیر نے ہمارا یہ راستہ بھی روک لیا تھا۔ مارے دہشت کے میرے قدم خود بخود رک گئے۔ ہانپتی کانپتی مغلانی مجھ سے ہاتھ چھڑا کر وہیں پیروں کے بل زمین پر بیٹھ گئی اور ماموں مرزا ہمیں حیرت سے دیکھنے لگے۔

''تم رُک کیوں گئیں لالہ رخ؟''

''اب ہاتھی دروازے کا راستہ بھی محفوظ نہیں رہا۔''

بیمار ماں نے بڑی مایوسی سے ماتھے پر ہاتھ مارا اور اپنے بھائی سے مخاطب ہوئی۔ ''ہم نے قلعہ چھوڑنے میں دیر کر دی اورنگ مرزا! اب تو شاید چاروں طرف فرنگیوں کا گھیرا ہے۔ کدھر سے نکلو گے؟ میں گرفتاری اور ذلت کے بجائے یہیں مر جانا بہتر سمجھتی ہوں۔''

ماموں مرزا بولے۔ ''میں نے کہا تھا کہ تمہیں قلعے سے نکال لے جاؤں۔ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں؟''

''کدھر سے نکال لے جاؤ گے؟''

''ہاتھی درّے سے۔''

''مگر ہاتھی دروازے کے باہر تو قیامت کے آثار ہیں۔''

''باہر خطرہ بے شک ہے لیکن میں کچھ باتیں اپنی قسمت پر چھوڑ دیتا ہوں۔''

میں ان کا جواب سن کر دنگ رہ گئی۔ ''ماموں مرزا! ایسے وقت میں جب مغلوں کی تیرہ بختی ان پر بلائے آسمانی بن کر جھپٹ پڑی ہے، آپ قسمت پر بھروسہ کرتے ہیں؟''

انہوں نے خشمگیں لہجے میں کہا۔ ''لالہ رخ! اگر قسمت نے ہمارا ساتھ نہ دیا تو ہم اس سے لڑیں گے مگر یہاں رُکنا آگے بڑھنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ مغلانی کو اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔''

ان کے الفاظ میں، لہجے میں کوئی ایسی بات تھی جس نے مجھے حوصلہ دیا۔ میں نے ماں کو اٹھایا اور ماموں مرزا کے ساتھ ہو لی۔ باہر کیسا ہنگامہ تھا، میں کچھ نہیں جانتی تھی مگر قیاس کہہ رہا تھا کہ باہر کے حالات مخدوش ہو چکے ہیں اور اب قلعے سے نکلنا دشوار ہو گیا ہے۔ پھر بھی ہم تن بہ تقدیر چلتے رہے اور ہاتھی درّے کے پاس پہنچ گئے۔ ماموں مرزا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا کیونکہ ہمیں ترچھے نشیب میں اُترنا تھا اور درّے کا سلامی فرش قدم بہ قدم اُترنے لگے۔

ہاتھی درّے سے صرف ہاتھی گزرتے تھے۔ لوگوں کا آنا جانا نہیں تھا۔ درّہ گیارہ بارہ فٹ چوڑا اور اتنا ہی کھلا تھا۔ جس میں پہلو بہ پہلو دو ہاتھی دو دو برجوں والی عماریوں سمیت جنہیں ''ہیکٹمز'' کہتے ہیں، باآسانی گزر سکتے تھے۔ میں نے درّہ پہلی بار دیکھا۔ کبھی ادھر آنے کا اتفاق ہی نہیں ہوا تھا۔ لکھوری اینٹوں کا سلامی فرش جوں جوں نیچے اُترتا گیا، درّے کی دیواریں اوپر اُٹھتی چلی گئیں۔ حتیٰ کہ درّہ ہاتھی کے قد سے بھی گہرا ہو گیا جو سیدھا ہاتھی دروازے کو جاتا تھا۔ مگر دروازے کے باہر جو ہنگامہ برپا تھا، وہ دل میں ہول پیدا کر رہا تھا۔ دروازے کے تمام محافظ سپاہی اوپر برج میں تھے یا فصیل پر بندوقیں سنبھالے کنگوروں کی اوٹ میں بیٹھے تھے جس سے اندازہ ہوتا

"بادشاہوں کی زندگی عموماً خطرے میں ہوتی ہے۔ کبھی باغیوں کا دھڑکا، کبھی کسی دشمن کا خوف۔ اگر شاہی فوج کو میدانِ جنگ میں شکست ہو جائے تو بادشاہ قلعہ بند ہو کر غنیم سے نمٹنے کی تیاری کرتا ہے لیکن فتح یاب دشمن قلعے کا محاصرہ کر لیتا اور محصور بادشاہ کو قتل یا گرفتار کرنے کا منصوبہ بناتا ہے جیسے فرنگی فوجوں نے پہاڑی پر قبضہ کر کے دہلی کو ایک طرف سے محاصرے میں لے لیا تھا۔ قلعوں میں خفیہ سرنگیں اسی لیے تعمیر کی جاتی ہیں کہ خطرے کے وقت بادشاہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ بہ حفاظت نکل جائے اور اپنی پراگندہ جمعیت پھر اکٹھی کر کے دشمن کا مقابلہ کرے۔ مغلوں نے جتنے بھی قلعے تیار کرائے، ان سب میں خفیہ راستے بنوائے تھے۔ لال قلعہ، آگرہ کے قلعے سے دُگنا اور لاہور کے قلعے سے بھی بڑا ہے۔ جس طرح لاہور کے قلعے سے ایک سرنگ شالامار باغ تک اور دوسری شاہدرہ کی طرف جاتی ہے، اسی طرح لال قلعے سے دہلی کی مختلف اطراف میں سرنگیں نکلتی ہیں۔ مگر بہادر شاہ ظفر نے نہ تو جنرل بخت خان کا مشورہ قبول کیا، نہ ہی سرنگ استعمال کی بلکہ مرزا الٰہی بخش کی باتوں اور انگریز کے وعدوں پر اعتبار کر لیا اور قلعے کے دروازے سے باہر نکل گئے۔ اگر سرنگ کے راستے باہر جاتے تو بات کچھ اور ہوتی۔ مغل سلطنت کو بچانے کا چارہ کیا جاتا۔ لیکن اب تو وہ اپنی بادشاہت کے ساتھ اپنا مستقبل بھی لال قلعے میں چھوڑ گئے ہیں۔"

ماموں مرزا کی باتیں حیران کر دینے والی تھیں، جنہیں میں غور سے سنتی رہی۔ اور جب وہ خاموش ہوئے تو بولی۔ "بادشاہ کرتے بھی کیا؟ سپاہ کا پیٹ بھرنے کے لیے خوراک اور لڑنے کے لیے ہتھیار کہاں سے لاتے؟ خاندان والوں کو وظیفے اور ملازموں کو تنخواہیں کہاں سے دیتے؟ دولت کے بغیر نہ جنگ لڑی جا سکتی ہے نہ بادشاہت قائم رہتی ہے اور یہی چیز ان کے پاس نہیں تھی۔ پہلے سرکار انگلشیہ سے لاکھ سوا لاکھ روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا۔ کچھ عرصے سے وہ بھی جاتا رہا۔ میں نے سنا ہے، مہاجنوں نے بھی قرض دینے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔"

"جب وصولی کی کوئی صورت نہ ہو تو قرض کون دیتا ہے؟ سب کچھ تو پہلے ہی سرکار انگلشیہ[1] کے قبضے میں ہے۔" انہوں نے یہ کہہ کر اچانک بات ختم کر دی۔ "پھر بھی میں سمجھتا ہوں، ذلت کی زندگی قبول کرنے سے عزت کی موت مر جانا بہتر تھا۔"

ان کے الفاظ سادہ اور عام تھے جو ذلت اور عزت کو حالات کے پلڑوں میں تولتے وقت اکثر لوگ استعمال کرتے ہیں لیکن وہی الفاظ میرے دل میں تلاطم بپا کر گئے اور میں نے محسوس کیا کہ ماموں مرزا کے نزدیک بوڑھے بادشاہ نے مرزا الٰہی بخش کا مشورہ قبول کر کے ایسی سنگین غلطی کی ہے جس کی تلافی نہیں ہو سکتی۔

19 ستمبر کی رات کو بادشاہ کے بجائے وہ سرنگ ہم استعمال کر رہے تھے۔ باتوں ہی باتوں میں اڑھائی تین میل کا فاصلہ طے کر لیا تھا مگر زمین کے پیٹ میں اُتری ہوئی سرنگ ختم ہونے میں نہ آتی تھی۔ بیمار مغلانی چلتے چلتے تھک گئی اور اُلجھن محسوس کر رہی تھی کہ سرنگ کب ختم ہو گی؟ کہاں ختم ہو گی؟

---

[1] غدر سے تقریباً دس برس قبل بہادر شاہ ظفر نے ایسٹ انڈین کمپنی سرکار سے درخواست کی تھی کہ ایک لاکھ روپے وظیفہ کم ہے۔ اس میں پچاس ہزار روپے کا اضافہ کیا جائے اور بادشاہ کے قرضے کمپنی سرکار ادا کرے۔ انگریز ایجنٹ سر طامس مٹکاف نے جواب بھیجا تھا کہ اس کے عوض وہ دیہات، کنوئیں اور باغات جو شاہی ملکیت میں ہیں، سرکار انگلشیہ کے حوالے کر دیئے جائیں۔ بادشاہ نے یہ شرط مان لی تھی۔ (بحوالہ "سر طامس مٹکاف کی ڈائری)

کی موجودگی میں ایک فولادی سلاخ کی کیا اہمیت تھی خواہ برچھی کی طرح تیز ہوتی۔ وہ تو کسی اور ہی مقصد کے لیے تھی۔ پھر انہوں نے تین چار مومی شمعیں بھی تو جیب میں ڈال لی تھیں۔ گویا حویلی سے تیار ہو کر نکلے تھے۔

وہ جامع مسجد کے سامنے والے دروازے سے باہر جانا چاہتے تھے۔ قلعے کا وہی دروازہ عموماً استعمال ہوتا تھا لیکن کسی خطرے کی صورت میں (کیونکہ رات بہت گزر چکی تھی اور اندیشہ تھا کہیں فرنگی فوج قلعے پر قبضہ کرنے نہ آ جائے) انہوں نے سرنگ کے راستے نکلنے کی ترکیب پہلے ہی سوچ لی تھی۔ لیکن ہمارے لیے کسی عجوبے سے کم نہ تھی۔

میں نے چلتے چلتے پوچھا۔ ''آپ کو سرنگ کا علم کیسے ہوا؟''

ماموں مرزا بتانے لگے۔ ''14 ستمبر کی لڑائی کے بعد جب باغی فوج کو شکست اُٹھانا پڑی اور فرنگی دستے سکھوں اور ڈوگروں کو لے کر شہر کے کابلی اور اجمیری دروازے میں گھس آئے تھے، بادشاہ بڑے افسردہ خاطر اور مایوس ہو گئے تھے۔ انہیں یہ خطرہ لاحق ہو گیا تھا کہ کمپنی سرکار کی فوجیں کسی وقت بھی شہر اور قلعے پر قبضہ کر لیں گی اور ان کا قلعے سے نکلنا مشکل ہو جائے گا۔ بادشاہ نے اسی وقت مرزا ظہیرالدین مغل کو خلوت میں طلب کیا۔ دارا بخت اور مرزا فخرو کے بعد مرزا قوباش[1] اگرچہ ولی عہد ہیں لیکن اعلیٰ حضرت ان سے ناراض ہیں لہٰذا انہیں سرنگ کے راز میں شریک نہیں کیا کہ سرکار انگلشیہ کے بنائے ہوئے ولی عہد ہیں۔ بادشاہ کے علاوہ صرف مرزا مغل سرنگ کے بارے میں جانتے ہیں۔ انہیں بلا کر آنے والے خطرے سے آگاہ کیا کہ ہو سکتا ہے قلعے سے اچانک فرار ہونا پڑے اس لیے وہ قبل از وقت سرنگ کا معائنہ کر لیں تاکہ خطرے کی حالت میں اسی راستے سے نکل سکیں۔

مرزا مغل کو اس مقصد کے لیے ایک قابل اعتماد شخص کی ضرورت تھی جو ان کے ساتھ سرنگ میں جا سکے۔ اتفاق کی بات ہے، جب وہ بادشاہ سے مل کر اپنے کوشک میں آئے، میں ان کی ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے معاملے کی صورت سے آگاہ کیا۔ ایک آنکس نما فولادی سلاخ سنبھالی، جس سے سرنگ کے دہانے کا خفیہ پتھر ہٹایا جا سکتا ہے۔ مجھے لے کر پوشیدہ راستے کا معائنہ کرنے نکلے۔ اس طرح سرنگ کا علم ہوا اور پتہ چلا کہ اس کا دہانہ کھولنے کی ترکیب کیا ہے۔ دوسرے دن میں قلعے کی شمالی فصیل کی جانب گیا جدھر بادشاہ کے کارخانے ہیں۔ وہاں پانچویں کارخانے میں آہن گر کام کرتے ہیں۔ میں نے ایک انکس نما آہنی سلاخ تیار کرائی اور لا کر اپنے کمرے کی الماری میں محفوظ کر لی کہ شاید کسی وقت کام آئے۔''

میرے لیے یہ انکشاف بڑا حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا کہ جب لال قلعہ تعمیر کیا گیا تھا تو وہ خفیہ سرنگ بھی جس میں ہم چل رہے تھے، زیر زمین تیار کی گئی تاکہ کسی خطرے کے وقت کام آ سکے۔ یہ بات بھی خاصی اہم تھی کہ اعلیٰ حضرت سرنگ کے راستے فرنگیوں کے ہاتھ سے دور نکل جانا چاہتے تھے مگر تقدیر نے انہیں گھیر لیا۔

ماموں مرزا نے بتایا۔

---

[1] مرزا قوباش سے ناراضگی کی وجہ یہ تھی کہ بادشاہ اپنی لاڈلی بیگم زینت محل کے لڑکے جواں بخت کو جو سب سے چھوٹا تھا، ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر سرکار انگلشیہ نے مرزا فخرو کی وفات کے بعد بہ لحاظ عمر بڑے لڑکے مرزا قوباش کو ولی عہد تسلیم کر لیا تھا اور بادشاہ کی ایک نہ مانی تھی۔ ولی عہدی کے جھگڑے کی رُوداد آگے بیان ہو گی۔ (قمر اجنالوی)

چڑھنے لگے۔ ان کے پیچھے پیچھے مغلانی، پھر میں اور میرے عقب میں مہرو اور عنبری تھیں۔ ایک شمع میرے پاس تھی جس سے میں مہرو اور عنبری کو راستہ دکھا رہی تھی جنھوں نے سامان کی گٹھڑیاں اُٹھا رکھی تھیں۔ دو شمعوں کی روشنی میں ہم آگے پیچھے بڑی احتیاط سے زینہ عبور کر کے کنوئیں سے نکلے۔

باہر چاند کی روشنی تھی اور اس روشنی میں ہم ایک کھنڈر میں کھڑے تھے جس کی دیواریں پیوندِ زمین ہو چکی تھیں۔ کھنڈر پتھروں کی ایک ایسی عمارت کا نقشہ پیش کرتا تھا جو صدیوں قبل ڈھے گئی اور ملبے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ قریب ہی ایک اور کھنڈر کے آثار تھے بلکہ یہ ویرانہ دور تک پھیلا تھا۔ جگہ جگہ زمین کٹی پھٹی تھی اور زمین میں دھنسے ہوئے کئی گڑھے تھے۔ اب جو غور کیا تو ہم دہلی کے جنوب میں کئی میل دُور تھے۔ یہ علاقہ قدیم شہر کے کھنڈرات اور ملبے پر مشتمل ہے جو کسی زمانے میں اِندر پرست کہلاتا تھا۔ ہر طرف ٹوٹی پھوٹی عمارتوں کے ڈھیر یا گڑھے ایک ویرانی کی تصویر پیش کرتے اور ایک ایسے شہر کی یاد دلاتے ہیں، جسے زمانے نے پامال کر دیا اور اس کی کوئی شے سلامت نہ چھوڑی۔

❀......❀......❀

اے ارضِ دہلی کے مسافر!

میرے وقائع نویس مہمان!

تُو نے دہلی کو دیکھا اور اس کے اردگرد بیس بیس میل تک بکھرے ایسے ہی کھنڈرات اور ویرانے تیری حیرت کا باعث بنے ہوں گے۔ تُو نے دل ہی دل میں اس بات پر تعجب کا اظہار بھی کیا ہو گا کہ یہ شہر ماضی قدیم میں کئی بار اُجڑا اور کئی بار آباد ہوا لیکن اسی پُر فضا رقبے میں جو دریائے جمنا کے مغرب میں پھیلا ہے، نیا شہر ہمیشہ نئی جگہ آباد کیا گیا اور برباد شدہ شہر کے ملبے اور کھنڈروں کو جوں کا توں چھوڑ دیا گیا جس سے دہلی کے چاروں طرف ویرانے اور کھنڈر پھیلتے رہے۔

فی الواقع یہ ایک عجیب بات ہے کہ اس رقبے میں کوئی بھی نیا شہر پرانے خرابے پر تعمیر نہیں کیا گیا۔ تاریخ کے مختلف ادوار میں یہاں پرانے شہر اُجڑتے اور نئے شہر بنتے رہے مگر ان کی بنیاد پرانے کھنڈر اور ویرانے چھوڑ کر نئی جگہ رکھی جاتی رہی۔ میں تمہیں اس کی وجہ بتاتی ہوں۔

عہدِ عتیق میں یہ رقبہ جو جمنا کے ساتھ ساتھ پھیلا ہے، ہندوؤں کے بزرگ راجوں مہاراجوں کی راجدھانی رہا ہے، جنہیں وہ بھگوان کا اوتار مانتے تھے۔ اس مقام سے انہیں ایک مذہبی عقیدت ہو گئی تھی۔ لیکن ہندو دھرم میں اپنے اسلاف کی شکستہ عمارتوں کی اصلاح و درستی یا مرمت کرانا کوئی پسندیدہ کام نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وہ انہیں اسی حالت میں رہنے دیتے جس حالت میں تعمیر ہوتی تھیں۔ اگر پرانی عمارتیں امتدادِ زمانہ یا کسی زلزلے یا کسی فاتح کی غارت گری کے نتیجے میں پامال ہو جاتیں اور ڈھے جاتی تھیں تو پرانے دھارمک وچار کے لوگ دوسری جگہ نئی عمارتیں کھڑی کر کے نیا شہر بسا لیتے تھے۔ ملبے کے ڈھیر، کھنڈر، ویرانے اسی طرح چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ ہو سکتا ہے اس کا سبب ویرانی اور بدشگونی بھی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ دہلی کے چاروں طرف دُور دُور تک پرانی آبادیوں کے آثار، کھنڈر اور خرابے بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں۔ پراچین بھارت میں یہاں اِندر پت یا اِندر پرست کا شہر آباد تھا جو دھارمک عقیدت کا مرکز رہا۔

قلعہ معلّٰی میں مقیم بیگمات، شہزادیوں، شاہی خواتین اور مغلانیوں کو پیدل چلنے کی عادت ہی نہیں تھی۔ ایک محل سے دوسرے محل تک جانے کے لیے بھی پالکی منگوائی جاتی تھی جسے کہاریاں اُٹھا کر چلتی تھیں۔ مگر مغلوں پر آنے والی مصیبت نے ہمیں پیدل چلنے پر مجبور کر دیا تھا۔ پھر ماں تو کئی دن سے بیمار تھی۔ بار بار پوچھتی۔ ''اورنگ مرزا! یہ سرنگ ختم بھی ہوگی یا نہیں؟''

وہ ہر مرتبہ ایک ہی جواب دیتے۔ ''مغلانی! چلتی رہو۔''

اب جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، گھٹن بھی بڑھتی جا رہی تھی ورنہ اڑھائی تین میل تک کوئی گھٹن نہیں تھی۔ اس کے باوجود وہی سرنگ ہمارے بچاؤ کی علامت اور ہمیں زندگی کے ساحل پر اُتارنے والی تھی۔ شمع کی زرد روشنی میں ہم دیکھ بھال کے چلتے اور آگے بڑھتے رہے۔ گھٹن میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ صرف سرنگ میں نہیں، ہم اپنے اندر بھی ایک گھٹن محسوس کر رہے تھے۔ مغلیہ خاندان پر گھٹتی کا پہرہ تھا۔ زوال کی رات تھی اور زوال سرنگ میں بھی ہمارے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ سرنگ چھوٹی اینٹوں سے تعمیر کی گئی تھی لیکن جگہ جگہ پتھر بھی استعمال کیے گئے تھے۔ آخر ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں سرنگ ختم ہوتی تھی۔

سامنے ایک دیوار تھی جس نے راستہ بند کر دیا تھا۔ ماموں مرزا نے شمع مجھے پکڑائی پھر اس دیوار سے جہاں سرنگ بند ہو گئی تھی، پورے سات قدم پیچھے چلے اور ایک پتھر کے قریب رُکے، جو بنیاد کے اوپر تھا۔ بنیاد کے اوپر دونوں جانب جگہ جگہ پتھر نصب تھے اور وہ پتھر ان سے مختلف نہ تھا۔ البتہ سرنگ کے خاتمے سے ٹھیک ساتویں قدم پر نصب تھا۔ اور وہی مطلوبہ پتھر تھا۔

انہوں نے لکھوری اینٹوں کے فرش پر بیٹھ کر پتھر کی نچلی درز میں انکس نما فولادی سلاخ پھنسائی اور وہی ترکیب آزمائی جو ''ہاتھی درّے'' کی سل یا لوحِ تاریخ پر استعمال کر چکے تھے۔ چند جھٹکوں کے بعد مطلوبہ پتھر جو ڈیڑھ فٹ چوڑا اور دو فٹ اونچا تھا، پرلی سمت ڈھے گیا۔ اس کے گرتے ہی دیوار میں شگاف نمودار ہوا جو سرنگ سے نکلنے کا دہانہ تھا۔

شمع کی روشنی میں دیکھا تو پرلی طرف ایک مدور کنواں نظر آیا جو امتدادِ زمانہ سے خود بخود بند ہو گیا یا بند کر دیا گیا تھا۔ وہاں اینٹ، روڑے، پتھر اور مٹی کی ڈھیریاں پڑی تھیں۔ ماموں مرزا کے پیچھے پیچھے میں اس کنوئیں میں داخل ہوئی تو اٹھارہ بیس فٹ اوپر اس کے دائرے سے کھلا آسمان دکھائی دیا جو آخری رات کے چاند سے روشن تھا۔

مغلانی، مہرو اور عنبری بھی سرنگ کے دہانے سے گزر کر کنوئیں میں آ گئیں تو ماموں مرزا نے پتھر اٹھا کر اس دہانے میں رکھا اور خاص ترکیب سے اسے پھر بند کر دیا۔ اب ہم سب اٹھارہ بیس فٹ گہرے مدور کنوئیں میں کھڑے تھے اور ہمارے سروں پر کھلا آسمان تھا جس کی گردش ہمیں یہاں تک لے آئی تھی۔

پتھروں سے تعمیر کیا ہوا کنواں بڑا پرانا اور مغل دور بلکہ خلجی عہد سے بھی بہت پہلے کا تھا۔ مدور دیوار کے ساتھ ساتھ پتھروں کا ایک زینہ اوپر جاتا اور اس کے فنِ تعمیر سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس ہندو دور کی یادگار ہے، جب دریائے جمنا کے کنارے دیو مالائی شہر ''اندر پرست'' آباد تھا۔ زینے کی دو تین سیڑھیوں کے پتھر کناروں سے ٹوٹ چکے تھے مگر اپنی جگہ پر جمے ہوئے تھے۔ البتہ کنوئیں کی منڈیر کے کئی پتھر اُکھڑ کر نیچے گر چکے تھے۔

ماموں مرزا نے نئی شمع روشن کر لی اور ہمارے آگے آگے کنوئیں کی گول دیوار کا سہارا لے کر قدم قدم سیڑھیاں

التمش، ناصرالدین محمود، علاء الدین خلجی، غیاث الدین خلجی، اودھم خاں، عبدالرحیم خان خاناں اور شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ دہلی کے نواح میں اپنے وقت کے کئی مشہور لوگوں کے مقابر بھی ہیں، جو آج گمنامی کی چادر لپیٹے ہوئے یا مرمت نہ ہونے کی وجہ سے شکستہ ہو رہے ہیں۔ مہرولی کا علاقہ تو قدیم کھنڈرات، ماضی کے خرابوں اور مقبروں کی دنیا ہے۔ اسی علاقے میں اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کے والد اکبر شاہ اور دادا شاہ عالم ثانی کے مدفن یا کنوئیں بھی ہیں۔ قطب مینار اس پورے علاقے پر اپنی نیرنگ زمانہ بلندی سے نظر ڈالتا ہے اور اس تماشا گاہِ ہست و بود کا نظارہ کرتا ہے۔

دہلی کے اردگرد پھیلے ویرانوں، کھنڈروں، خرابوں اور مقبروں کا تذکرہ میں نے اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ تُو ان ویرانوں کی تاریخی اہمیت کو سمجھ سکے۔

ایک طویل سرنگ کو عبور کر کے اور ایک قدیم الایام شکستہ کنوئیں سے نکل کر ہم مہرولی کے قریب ایک ایسے ہی ویرانے میں نمودار ہوئے تھے، جو قدیم دیو مالائی شہر اِندر پرست کے قریب راجہ اننگ پال ترنور کے بسائے ہوئے شہر ڈلی کا خرابہ تھا جو صدیوں پہلے پیوندِ زمین ہو گیا تھا۔

شاید وہ کنواں بھی جس میں سرنگ کا خفیہ دہانہ کھلا تھا، مٹی کے ڈھیر میں دفن ہو گا اور اس کی منڈیر کے چند پتھر نظر آتے ہوں گے۔ لیکن جب شاہ جہان کے عہد میں لال قلعے کی تعمیر کا نقشہ تیار ہوا اور خفیہ سرنگ کا رخ اسی ویرانے کی طرف متعین کیا گیا ہو گا، تب زمین کی کھدائی کر کے کنوئیں کی دریافت عمل میں آئی ہو گی جو لوگوں کے نزدیک ماضی کی ایک بے مصرف یادگار کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ لیکن اس کا مصرف انتہائی پوشیدہ تھا جس سے عام لوگ حتیٰ کہ مغلیہ خاندان کے افراد بھی آگاہ نہ تھے۔ یہ بھید صرف خاندان کا وارث حکمراں یا اس کا ولی عہد ہی جان سکتا تھا۔

ماموں اورنگ مرزا، ہندوستان کی قدیم اور جدید تاریخ سے خوب آگاہ تھے۔ جس کا ثبوت ان کے روزنامچے سے بھی ملتا ہے۔ روزنامچہ بجائے خود ایک تاریخ ہے۔ ان کا یہی خیال تھا کہ وہ کنواں اگر اِندر پرست نہیں تو 440 بکرمی میں اننگ پال ترنور کے بسائے ہوئے شہر کی یاد ضرور دلاتا ہے۔ کیونکہ اس زمانے میں راج محل، کسی بڑے مندر یا راجہ کی سی شان رکھنے والے کسی راجپوت سردار کی گڑھی میں ایسے کنوئیں تعمیر کیے جاتے تھے جن کی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک زینہ اس کی تھاہ میں اُترتا تھا۔ برسات کے دنوں میں کنوئیں کے اندر جل شاین کی پوجا ہوتی تھی۔

''جل شاین'' ہندوؤں کے وشنو بھگوان کا ایک صفاتی نام ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنسار کے انت (ختم) ہونے پر یا پھر برسات میں وشنو جی شیش ناگ کے بستر پر پانی کے اوپر سوتے ہیں اور شیش ناگ زمین کی پاتال کے اندر پانی میں رہتا ہے۔ اس لیے موسم برسات میں کنوئیں کی تھاہ میں نصب لکڑی کی بھاری چوکھٹ جو پانی کے اوپر بچھی ہوتی تھی، پر دِیے روشن کر کے جل شاین کی پوجا ہوتی اور آرتی اُتاری جاتی تھی۔ اسی لیے کنوئیں میں اُترنے کے لیے زینہ تعمیر کیا جاتا تھا۔ ماموں مرزا کا خیال تھا کہ وہ کنواں جس کا زینہ عبور کر کے ہم باہر نکلے قدیم ہندو شہر کی نشانی ہے۔

دہلی کے اردگرد پھیلے کھنڈروں، خرابوں کے علاوہ کنوئیں کے حوالے سے ''جل شاین'' سے متعلق جملہ معلومات

کورو پانڈو کے باہمی اختلافات کے نتیجے میں پانڈوؤں نے اصل راج دھانی ہستنا پور کو چھوڑ کر جو دریائے گنگا کے کنارے آباد تھی، جمنا کے پار اِندر پرست کو اپنی راج دھانی قرار دیا تھا جس سے اس شہر کی اہمیت بہت بڑھ گئی تھی۔ تاریخ میں وہ دور ''مہا بھارت'' کہلاتا ہے مگر اس کے بعد بھی اس شہر یا مقام کی اہمیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ 440 بکرمی میں راجہ اننگ پال ترنور نے اِندر پرست کے قریب جو شہر آباد کیا، اس کا نام ''ڈلی'' رکھا تھا۔ مگر بعد ازاں دہلی شہر کا نام راجہ دہلور کے نام پر مشہور ہوا۔

رائے پتھورا نے بھی یہاں اپنے نام سے ایک شہر اور قلعہ آباد کیا تھا مگر جمنا کنارے شہر اور آبادیاں تعمیر کرنے میں صرف ہندوؤں کا ہی حصہ نہیں بلکہ مسلمان فاتحین کا نام بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ محل وقوع کے اعتبار سے یہ ہمیشہ ہندوستان کا دارالحکومت سمجھا گیا ہے۔ لہٰذا مسلمان حکمرانوں نے بھی یہاں شہر اور آبادیاں بسانے کی طرف خاصی توجہ دی۔

معز الدین کیقباد نے 1286ء میں جمنا کنارے ایک خوب صورت شہر ''کیلوکھری'' کے نام سے آباد کیا تھا۔ جلال الدین خلجی نے ''کوشک لعل'' اور علاء الدین خلجی نے ''کوشک سیری'' آباد کر کے اپنے دارالحکومت بنائے تھے۔ فیروز شاہ تغلق نے یہاں ''فیروز آباد'' کا شہر آباد کیا۔ 1538ء میں مغل شہنشاہ مرزا نصیرالدین ہمایوں نے اِندرپت کے قلعے کی مرمت کرائی اور ''دین پناہ'' کے نام سے اپنا تخت گاہ قرار دیا۔ شیر شاہ سوری نے ''کوشک سیری'' کو برباد اور مسمار کر کے اس کی جگہ ایک نیا شہر بسایا۔ اس کے بیٹے سلیم شاہ نے تسلیم گڑھ کا قلعہ تعمیر کرایا۔

موجودہ شہر مغل شہنشاہ مرزا شہاب الدین شاہجہاں کا آباد کیا ہوا ہے جس کی داغ بیل 1631ء میں ڈالی گئی اور نام ''شاہجہاں آباد'' رکھا گیا۔ لیکن تعمیر کے بعد وقت کے ساتھ ساتھ یہ شہر بیک وقت ''دہلی'' اور ''شاہجہاں آباد'' کے ناموں سے یاد کیا جاتا رہا۔ نیا شہر دس میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی تین جانب اونچی فصیل تعمیر ہوئی تھی۔ آمدورفت کے لیے سات دروازے رکھے گئے۔ (۱) لاہوری دروازہ (۲) دِلّی دروازہ (۳) اجمیری دروازہ (۴) ترکمان دروازہ (۵) موری دروازہ (۶) کابلی دروازہ (۷) کشمیری دروازہ۔ یہ سب دروازے پتھر سے تعمیر کیے گئے جن کی محرابیں بڑی دیدہ زیب ہیں۔ ہر دروازے میں پہرہ دینے والوں کے لیے کمرے یا حجرے بھی بنائے گئے تھے۔

اب تُو نے اندازہ لگا لیا ہو گا کہ اس علاقے میں اگر ہندوؤں نے کئی شہر آباد کیے تو مسلمانوں نے بھی یہاں بنیاد کے کئی پتھر رکھے اور کئی آبادیاں بسائیں۔ یہ کہنا مناسب ہو گا کہ مسلمان اولیاء کی وجہ سے جن کی خانقاہیں، درس گاہیں اور قبریں تک یہاں موجود ہیں، یہ شہر مسلمانوں کے لیے بھی عقیدت کا مرکز بن گیا۔ چنانچہ مشہور اولیاء کے مقابر میں سے حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت امیر خسروؒ، حضرت نصیرالدین چراغ دہلیؒ، حضرت بختیار کاکیؒ کے مقبروں پر عقیدت مندوں کی بھیڑ رہتی ہے۔ علاوہ ازیں اور بھی درجنوں بزرگوں کے مزار ہیں، جہاں لوگ حاضری دیتے ہیں۔ پھر یہاں بڑی بڑی عالی شان مسجدیں ہیں۔ جامع مسجد تو اپنی خوبی اور خوبصورتی کے ساتھ دہلی کا سنگھار سمجھی جاتی ہے جو شاہجہانی عہد میں تعمیر ہوئی تھی۔

اولیاء کے مزاروں، خانقاہوں اور مسجدوں کے علاوہ یہاں مشہور سلاطین کے مقبرے بھی ہیں جن میں سلطان

میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ ''ہمیں یہاں سے مقبرۂ ہمایوں میں جانا اور صفدر مرزا سے ملنا ہے۔ ان سے پوچھے اور انہیں ساتھ لیے بغیر میں کہیں نہیں جاؤں گی۔''

ماموں مرزا نے فوراً مجھ سے اتفاق کر لیا۔ دراصل اس بھاگ دوڑ اور پریشانی میں وہ صفدر مرزا کو بھول گئے تھے جن کے ساتھ میری زندگی کی ڈور بندھی تھی۔ معذرت کے ساتھ کہنے لگے۔

''لالہ رخ! مجھے افسوس ہے۔ صفدر مرزا میرے دھیان سے اُتر گئے تھے۔ وہ تمہارا مستقبل ہیں اور میں تمہارے مستقبل کو مقبرۂ ہمایوں میں چھوڑ کر کسی دوسری طرف جانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ہم لوگ جہاں بھی جائیں گے، صفدر مرزا کے ساتھ جائیں گے۔''

وہ جانتے تھے کہ دنیا میں بعض چیزیں زندگی کی ضرورت بن جاتی ہیں۔ ''صفدر پیا'' صرف ضرورت نہیں بلکہ میری زندگی بن چکے تھے۔ لال قلعہ تسخیر ہو چکا اور مغلوں نے اسے خالی کر دیا تھا۔ لیکن میں جانتی تھی، صفدر مرزا ایک ایسا قلعہ ہیں جنہیں کوئی تسخیر نہیں کر سکتا اور مجھے اپنی زندگی اسی قلعے کے اندر بسر کرنا تھی۔ ماموں مرزا بھی انہیں بہت چاہتے اور مجھے ان کے آسمان کا ستارہ بنا دینے کی تمنا رکھتے تھے۔ اچانک وہ کہنے لگے۔

''لالہ رخ! میں نہیں جانتا، صفدر مرزا کسی دوسرے شہر میں جانے کا ارادہ رکھتے بھی ہیں یا نہیں لیکن ان کا بادشاہ اور مرزا مغل کے ساتھ مقبرۂ ہمایوں میں رہنا بے حد خطرناک ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ اس جگہ کو چھوڑ دیں۔ تم کہو گی تو انکار نہیں کریں گے۔''

''اگر مرزا مغل نے اُنہیں اجازت نہ دی؟''

''اب اُنہیں مرزا مغل سے نہیں، صرف اپنے آپ سے اجازت لینا ہے۔''

''میں ان سے بات کروں گی لیکن پہلے مجھے خود اپنے خاندان کو چھوڑنے کے لیے تیار ہونا پڑے گا۔''

اب اس ویرانے سے مقبرۂ ہمایوں کا سفر درپیش تھا۔ پہلے اگرچہ میں نے اتنا طویل سفر کبھی نہ کیا تھا مگر اصل معاملہ بیمار ماں کا تھا جو سرنگ میں چلتے چلتے نڈھال ہو گئی اور بار بار اپنی تھکاوٹ کا اظہار کرتی تھی۔ ماموں مرزا نے کہا۔ ''لالہ رخ! ہمیں یہاں سے فوراً چل دینا چاہئے۔ دن کا اُجالا پھیل گیا تو خطرہ بڑھ جائے گا۔ گنوار لوگ غریب الدیار شہریوں کو لوٹتے پھرتے ہیں۔ مغلانی سے پوچھو، چند میل اور چل سکتی ہے یا نہیں؟''

میں نے فوراً جواب دیا۔ ''میری فکر نہ کرو۔ جیسے بنے، میں مقبرۂ ہمایوں تک سفر کر لوں گی۔''

یہ جواب خلافِ توقع اور بڑا خوش کُن تھا۔ دراصل قلعے سے نکلتے اور سرنگ سے باہر آتے ہی اس کی حالت کچھ سنبھل گئی تھی۔ مصیبت اور پریشانی بے شک تھی مگر قلعے کے اندر دل کو جو خلجان ہوتا تھا، وہ اب نہیں تھا۔ جس کا سبب قلعے سے سر ہونے والی توپوں کی ضربیں یا پھر قلعے کے آس پاس اور اندر پھٹنے والے فرنگی گولوں کے رعد آفریں دھماکے تھے جن کی ہیبت اور دہشت سے دل ڈوبنے لگتا تھا۔ لڑائی فرنگی کے حق میں ختم ہو گئی اور وہ خود بھی قلعے سے نکل آئی تھی۔ اس لیے اب دل کو دھکے نہیں لگتے تھے، اختلاج نہیں ہوتا تھا۔ صرف مغلوں کی شکست و بربادی کا دکھ رہ گیا تھا اور وہ سب کو تھا۔

مغلانی کو آمادۂ سفر دیکھ کر ماموں مرزا فوراً اُٹھے، مہرو اور عنبری نے گٹھڑیاں پھر سروں پر اُٹھا لیں۔ میں نے ماں کا ہاتھ پکڑا اور ماموں مرزا کے پیچھے ہو لی۔ وہی ہمارے خضرِ راہ تھے۔ میں بتا چکی ہوں اس ویرانے میں زمین

مجھے ماموں مرزا سے حاصل ہوئی تھیں۔

❀......❀......❀

جب ہم کنوئیں سے نکل کر اس خرابے میں داخل ہوئے جہاں ماضی کا ایک قدیم شہر زیر زمین مدفون تھا، ماموں مرزا نے شمع فوراً گل کر دی اور مجھے بھی شمع بجھا دینے کی ہدایت کی تھی۔

ہم ایک ایسے ویرانے اور اُجاڑ مقام پر تھے جہاں شمع کا شعلہ بہت دُور سے نظر آ سکتا تھا۔ وہ رات مغلوں کے زوال، ادبار اور قلعے سے فرار کی رات تھی۔ دشمن شہر پر قبضہ کر چکا تھا اور دیسی جاسوس ان لوگوں کی نگرانی کر رہے تھے جنھوں نے غدر میں حصہ لیا یا کسی انگریز کو قتل کیا تھا۔ انگریز کی ڈکشنری میں ان کے سپاہی، جاسوس یا آس پاس کے لٹیرے شمع کا شعلہ دیکھ کر ادھر نہ آ نکلیں۔ اس رات موت اور ہر مصیبت مغلوں کے تعاقب میں تھی اور ہمیں اپنے آپ کو اس سے بچانا تھا۔

فرنگی فوج اور اس کے دیسی سپاہی تو شہر میں لوگوں کو قتل کرنے اور لوٹنے میں مصروف تھے مگر دہلی سے بھاگنے والوں پر ایک اور مصیبت بھی ٹوٹ پڑی تھی۔ شکست و بربادی کے اس خوف ناک ہنگامے میں گرد و نواح کے جاٹ، تلنگے، گھوسی، پاسی، کاچھی بھی شہر سے نکلنے والے آفت زدوں کو لوٹتے پھرتے اور قتل تک کر دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ خاص طور پر جوان لڑکیوں اور عورتوں کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اسی خطرے کے پیشِ نظر ہم نے شمعیں گل کر دی تھیں۔ پھر آسمان پر پچھلی راتوں کا چاند روشن تھا اور اس کی چاندنی میں روشنی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

قلعے کی بیگمات، بیویاں، شہزادیاں بادشاہ اور شہزادوں کے ساتھ مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزیں ہوئی تھیں لیکن بعض شہزادوں، سلاطین اور افرادِ خاندان نے اپنی بیویوں اور لڑکیوں کو قریبی شہروں کی طرف روانہ کر دیا تھا تاکہ وہ دشمنوں کی پکڑ دھکڑ سے محفوظ رہ سکیں لیکن انہیں راستوں میں گنوار جاٹوں، تلنگوں، گھوسیوں، پاسیوں، کاچھیوں نے لوٹا بلکہ گہنوں اور زیورات کے ساتھ ان کی عزت بھی لوٹی۔ 1857ء کی قیامت میں مغلوں کا سب کچھ لٹ گیا تھا اور کوئی شے باقی نہیں بچی تھی۔

چند لمحوں کے لیے ہم کنوئیں کے پاس ہی بیٹھ گئے تاکہ دم لے سکیں۔ اب ماموں مرزا اپنی بہن سے کہنے لگے۔ ''مغلانی! میں تمہیں قلعے سے نکال لایا ہوں مگر مقبرۂ ہمایوں کوئی محفوظ جگہ نہیں ہے۔ جنگ ختم ہو چکی ہے۔ اب پکڑ دھکڑ ہو گی۔ اگر مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ سے کوئی وعدہ کیا ہے تو وہ پورا نہیں ہو گا۔ انگلستان کی تاریخ بہادر شاہ ظفر کے انجام کی منتظر ہے جس کے ساتھ ہی ہندوستان سے مغلیہ خاندان ختم ہو جائے گا اور انگریزی شہنشاہیت کا دور شروع ہو گا۔ میرا خیال ہے کمپنی سرکار، بادشاہ کے ساتھ مرشد زادوں کو بھی نہیں چھوڑے گی تاکہ مغلوں کا کوئی وارث باقی نہ رہ جائے۔ اسی لیے جہاں پکڑ دھکڑ کا خطرہ ہو، وہاں جانا مناسب نہیں۔ اگر تم کہو تو ہم غازی نگر (غازی آباد)، مراد آباد، فیض آباد یا رام پور کا رخ کریں۔''

ماں نے حیرت اور تعجب سے پوچھا۔ ''سواری تو کوئی ہے نہیں۔ کیا اتنی دُور پیدل جاؤ گے؟''

''کسی گاؤں سے بیل گاڑی کا بندوبست ہو جائے گا۔''

وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ''پھر بھی، لالہ رخ سے پوچھو۔ یہ کہاں جانے کا مشورہ دیتی ہے۔''

ماموں مرزا کی دلیری، ہوشیاری اور صحیح نشانہ لگانے پر میں عش عش کر اُٹھی۔ مہرو اور عنبری کے حواس بھی بحال ہوئے۔ مغلانی تو اپنے بھائی کی جرأت پر واری صدقے ہو رہی تھی۔ ''اورنگ مرزا! آفرین ہے تم پر۔ گولی ٹھیک نشانے پر لگائی اور ان چاروں کا حوصلہ توڑ دیا۔''

چاروں گنوار مہرولی کی طرف بھاگے تھے۔ صبح کی روشنی میں جب چاندنی ہولے ہولے ماند پڑ رہی تھی، ان کے ہیولے دور تک نظر آتے رہے پھر اچانک نظروں سے غائب ہو گئے۔ ہم ماموں مرزا کے ہمراہ اس راستے پر ہو لیے جو مقبرۂ ہمایوں کی طرف جاتا تھا۔ مغلانی کے قدم بھی تیز تیز اُٹھنے لگے تھے۔

جوں جوں ہم آگے بڑھے، مقبرۂ ہمایوں کے چاروں مینار پھٹتی پو میں واضح ہوتے گئے اور دور ہی سے نظر آنے لگے۔ آہستہ آہستہ صبح کا اُجالا پھیلتا چلا گیا اور ہماری مسافت کم ہوتی گئی۔ جب اُفق پر شفق کی لالی پھوٹ رہی تھی، ہم مقبرۂ ہمایوں کے مغربی دروازے پر پہنچ گئے تھے۔

❁......❁......❁

کٹی پھٹی اور جگہ جگہ خطرناک گڑھے تھے یا پھر مٹی کی ڈھیریاں، سنگ ریزے اور اونچے نیچے ٹیلے تھے۔ چاند کی روشنی میں ٹیلوں اور گڑھوں سے بچتے ہم جنوب مشرق کی جانب چلنے لگے۔

آسمان پر چاند کسی بیوہ کی طرح اُداس نظر آ رہا تھا یا ہم خود مصیبت زدہ اور پریشان تھے اور ہماری اپنی اُداسیاں چاندنی کے غبار میں ڈھل گئی تھیں۔ رات کی آغوش میں صبح کی کروٹ لیتی روشنی میں اس راستے کی طرف بڑھ رہے تھے جو مقبرۂ ہمایوں کو جاتا تھا کہ ناگہاں کچھ آدمی ایک ٹیلے کی اوٹ سے نکلے اور موت کی طرح ہمارا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے۔ مغلانی کے حلق سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ مہرو اور عنبری بدحواس ہو گئیں۔ میری اپنی حالت غیر ہوتی جا رہی تھی۔

ان میں تین گنوار جاٹ تلواروں سے مسلح تھے۔ چوتھا شکل سے گھوسی نظر آتا اور اس کے ہاتھ میں بلم تھا۔ ان چاروں نے ہمارا راستہ اس لیے کاٹا تھا کہ ہم چار عورتوں کی حفاظت کے لیے صرف ایک مرد تھا۔ انہوں نے ہماری حیثیت سے یہ اندازہ بھی لگا لیا تھا کہ ہمارا تعلق کسی بڑے گھرانے سے ہے اور باندیوں نے جو گٹھڑیاں اُٹھا رکھی ہیں، ان میں نقدی کے ساتھ زیورات بھی ہوں گے۔

بڑے جاٹ نے جو اُن کا مکھیا اور سرغنہ معلوم ہوتا تھا، یک لخت میان سے تلوار کھینچ لی اور کہنے لگا۔

''تم لوگ دُکھیارے جان پڑتے ہو اس لیے تمہیں جان سے نہیں ماریں گے۔ بس گٹھڑیاں بھوم پر رکھ دو اور چلے جاؤ۔ اگر نہیں گئے تو مرد اور جورو (وہ ماموں مرزا اور مغلانی کو میاں بیوی سمجھ رہے تھے) دونوں مارے جائیں گے۔ جوان چھوکری اور دونوں باندیوں کو ہم ساتھ لے جائیں گے۔ اگر جان پیاری ہے تو گٹھڑیاں رکھ کر جھٹ پٹ بھاگ جاؤ۔''

اس اثنا میں دوسری دو تلواریں بھی باہر آ گئیں اور گھوسی نے اپنا بلم سیدھا کر لیا۔ ہمارے ان کے درمیان صرف سات آٹھ گز کا فاصلہ تھا مگر یوں لگتا تھا ان کی تلواریں ہم سے بہت قریب بلکہ ہماری گردنوں پر رکھی ہیں۔ مرزا ماموں نے پلٹ کر مہرو اور عنبری کی طرف دیکھا، جیسے انہیں گٹھڑیاں رکھ دینے کی ہدایت کرنے والے ہوں اور پلٹتے ہی کسی تاخیر کے بغیر اپنے انگرکھے سے ولایتی طمنچہ نکال لیا۔ پھر اسی تیزی سے مڑے اور طمنچہ گھوسی پر داغ دیا جو اپنے ساتھیوں سے تین چار قدم آگے بڑھ آیا تھا۔ گولی اُس کے کندھے میں لگی اور گولی لگنے کا جو نتیجہ ہوا کرتا ہے، وہ ہوا۔ بلم ہاتھ سے چھوٹ کر گرا اور خود تڑپ کر پیچھے ہٹا۔ کندھے سے خون بہہ رہا تھا۔

یہ سب کچھ اس طرح آناً فاناً ہو گیا کہ تینوں جاٹ جو تلواریں سونتے کھڑے تھے، مارے حیرت اور خوف کے ہکا بکا رہ گئے۔ جب ماموں مرزا نے طمنچہ اُن کے سرغنہ پر چھتیانے کے لیے سیدھا کیا تو تینوں بھاگ نکلے۔ زخمی گھوسی بھی اپنا خون آلود کندھا تھامے پیچھے بھاگا۔ انہوں نے دوسری گولی نہیں چلی۔ آگے بڑھ کر بلم اُٹھا لیا جسے اُٹھانے کا گھوسی کو موقع ہی نہ مل سکا تھا۔

صبح کے سناٹے میں جب کائنات کروٹ بدل رہی تھی، طمنچے کا دھماکہ بڑا لرزہ خیز تھا مگر آس پاس کوئی آبادی نہیں تھی۔ اس ویرانے میں کسی نے گولی کی آواز بھی نہیں سنی ہو گی سوائے ان گنوار لٹیروں کے جو بھاگ گئے تھے۔ ماموں مرزا نے ان سے تکرار مناسب نہیں سمجھی تھی۔ بڑی ہوشیاری سے کام لے کر ان پر طمنچہ داغ دیا تھا اور وہ چاروں بدحواس ہو کر بھاگ گئے تھے۔

لٹیرے ٹولیوں اور جتھوں کی صورت لوٹ مار کرتے پھر رہے تھے۔ ایسے افراتفری اور نفسانفسی کے عالم میں معقول حفاظتی انتظامات کے بغیر سفر کرنا زندگی سے جواء کھیلنا تھا۔

اسی پریشانی میں وہ رات بھر جاگتے اور ہماری راہ دیکھتے رہے تھے۔ بار بار دروازے پر آتے اور گرد و پیش پر نظر ڈال کر مایوس لوٹ جاتے تھے۔ اس وقت بھی جب مشرقی آسمان پر شفق پھیل رہی تھی، وہ دن کے اُجالے میں صرف ہمیں دیکھنے کے لیے دروازے سے نکل رہے تھے کہ ہماری ان سے ملاقات ہوگئی۔

انہوں نے اتنی تاخیر سے آنے کا سبب پوچھا تو ماموں مرزا نے بڑے مختصر لفظوں میں قلعے سے نکلنے کا واقعہ بیان کیا اور صفدر مرزا یہ سن کر نقشِ حیرت بن گئے کہ ہم کسی دروازے کے بجائے سرنگ کے راستے باہر آئے۔ یہ راز کی بات صرف انہی کو بتائی جا سکتی تھی۔ انہوں نے مقبرے کا ایک حجرہ ہمارے لیے پہلے ہی مخصوص کر لیا تھا۔ وہ ہمیں اسی حجرے میں لے گئے۔

مقبرے میں خلقت کا ایک ہجوم تھا جس میں مغلیہ خاندان کے علاوہ قلعے کے ملازمین اور دوسرے لوگ بھی شامل تھے۔ حفاظت کی خاطر کچھ فوج بھی موجود تھی۔ اندازے کے مطابق چھ سات ہزار[1] کے لگ بھگ اژدھام ہو گا۔ مقبرۂ ہمایوں ایک وسیع رقبے پر تعمیر کیا گیا تھا۔ لیکن صبح کی روشنی میں جب ہم دروازے سے گزر کر حجرے تک آئے تو دیکھا کہ مقبرہ ایک بڑے محلے یا گھنی بستی کی شکل اختیار کر گیا تھا اور وہاں خاصی بھیڑ تھی۔

حجرے میں آتے ہی مغلانی نقاہت کے مارے فرشی دری پر ڈھیر ہو گئی۔ مہرو اور عنبری نے بھی سامان کی گٹھڑیاں ایک طرف رکھیں اور اونگھنے لگیں۔ ہمارے ساتھ وہ بے چاریاں بھی رات بھر جاگتی اور سفر کرتی رہی تھیں۔ صفدر مرزا جنہیں میں ''صفدر پیا'' کہتی ہوں، مجھے اور ماموں مرزا کو بادشاہ کے درگاہ حضرت نظام الدین اولیاؒ میں جانے کا واقعہ سنانے لگے۔ انہوں نے کہا۔

''جب بادشاہ قلعے سے نکلے، ان کی پالکی (تام جھام) کے ہمراہ چند خواجہ سراؤں اور کہاروں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ مرزا مغل نے مجھے بطور احتیاط ساتھ جانے کی ہدایت کی تھی کہ حفاظت کا خیال رکھوں۔ گویا میں ان کا واحد محافظ تھا۔ جب درگاہ کے دروازے پر پالکی اُتری، اعلیٰ حضرت ایک صندوقچہ لیے جو خواجہ سرا نے اُٹھا رکھا تھا، درگاہ میں داخل ہوئے۔ میں بھی کچھ فاصلے سے ان کے پیچھے تھا۔ رات کا وقت تھا۔ درگاہ کا متولّی (غلام شاہ حسن) جو اپنے گھر میں تھا، اطلاع ملنے پر فوراً حاضر ہو گیا۔ بادشاہ نے وہ صندوقچہ جو محل سے لے کر آئے تھے، اس کی طرف بڑھایا اور کہا۔ ''اس میں حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ریشِ مبارکہ کے چند بال ہیں۔ یہ مبارک دولت ہمارے جد امجد امیر تیمور صاحب قران کو استنبول (قسطنطنیہ) فتح کرنے کے بعد ترک سلطان بایزید یلدرم کے خزانے سے ملی تھی۔ اُس وقت سے دودمانِ تیموری نسل در نسل اس کی حفاظت کرتا چلا آیا ہے۔ لیکن اب آلِ تیمور کی سلطنت اُجڑ گئی، حکومت جاتی رہی ہے اور ہم بھی گھر سے بے گھر ہو گئے ہیں۔ کوئی ٹھکانہ نہیں رہا اور شاید ہم اس دولت کی حفاظت نہ کر سکیں۔ لہٰذا اسے درگاہ کے حوالے کرتے ہیں۔''

---

[1] ''ہسٹورین ہسٹری آف دی ورلڈ'' میں لیفٹیننٹ میکڈانلڈ کا بیان نقل کیا گیا ہے کہ مقبرۂ ہمایوں میں اس وقت تین ہزار مسلمان پناہ گزین اور تین ہزار مسلح سپاہی تھے۔ لیفٹیننٹ میکڈانلڈ، میجر ہڈسن کے ساتھ مغل شہزادوں کی گرفتاری کے لیے آیا تھا۔ (مصنف)

(3)

مقبرۂ ہمایوں

ہمارا قلعے سے آدھی رات کے بعد سرنگ کے راستے نکلنا، جب باہر کے حالات انتہائی مخدوش ہو گئے تھے اور جاسوس اہم افراد کی تاک میں آس پاس ہی پھر رہے تھے کہ کون کہاں جاتا ہے، پھر سرنگ سے نکل کر ویرانے سے گزرتے وقت گنوار اور وحشی جاٹوں سے بچ جانا، ایسے واقعات تھے، جن کے پیچھے پُراسرار قدرت کا ہاتھ تھا۔

مصیبت اور نحوست کی اس گھڑی میں جب بدبختی مغلوں پر چیل کوّوں کی طرح منڈلا رہی تھی، قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور ہم بہ حفاظت مقبرۂ ہمایوں تک پہنچ گئے جہاں انجانی طاقت مغلوں کو گھیر لائی تھی۔ مگر وہاں ایک حیرت انگیز واقعہ پیش آیا جس نے ہماری رات بھر کی ساری کوفت دور کر دی۔ ہم مقبرے کے مغربی دروازے کی طرف بڑھ رہے تھے کہ صفدر مرزا کو دروازے سے نکلتے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ وہ بھی ہمیں دیکھ کر مارے حیرت اور مسرت کے وہیں ٹھٹک گئے۔ یہ ایک ایسا انوکھا اتفاق ہوا تھا جیسے گزرے زمانوں میں معجزے ظہور میں آتے ہیں۔ ہم نے صفدر مرزا کی خاطر مقبرۂ ہمایوں کا سفر کیا تھا اور وہ ہمیں مغربی دروازے پر مل گئے تھے۔

ماموں مرزا کو دیکھتے ہی جو آگے آگے تھے، وہ لپک کر آگے بڑھے اور بے اختیار ان سے لپٹ گئے۔ ماموں مرزا نے بھی اُنہیں گلے سے لگا لیا اور پھر اُن کے اس طرح ایکا ایکی مل جانے پر خوشی کا اظہار کیا۔ میری آنکھوں میں آنسو تیر گئے۔ کبھی کبھی خوشی بھی آنسو بن کر آنکھوں میں تیر جاتی ہے مگر یہاں تو رونا اس بات کا تھا کہ سب کچھ برباد ہو گیا اور دودمانِ تیموری لال قلعے کو چھوڑ کر مقبرۂ ہمایوں میں آ بیٹھا تھا جس کی دیواریں، دروازے، مینارے اس کی زبوں حالی پر ماتم کر رہے تھے۔

صفدر مرزا نے بتایا کہ وہ آدھی رات سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ ان کا خیال تھا ہم قلعے کی بیگمات، بیویوں، شہزادیوں اور سلاطین کے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ جائیں گے۔ مگر جب رات کا تیسرا پہر گزر جانے کے بعد بھی ہم نہ آئے تو وہ بے حد پریشان ہو گئے۔ انہیں پتہ چلا کہ بعض شہزادوں، سلاطین اور امیروں نے اپنی بیویوں، بیٹیوں کو قرب و جوار کے شہروں کی طرف روانہ کر دیا ہے۔ کچھ لوگ مقبرۂ ہمایوں میں آنے کے بجائے پہاڑ گنج کی جانب چلے گئے ہیں جس سے ان کی پریشانی بڑھی کہ کہیں ہم نے بھی کسی شہر یا مضافاتی قصبے کا رخ نہ کر لیا ہو اور یہ پریشانی اس لیے تھی کہ ہر طرف طوائف الملوکی پھیلی تھی۔ یہ راستے محفوظ تھے نہ کسی کی جان کی ضمانت تھی۔

ہندوستان سے نکال دیں گے۔ آج بھی وہ بادشاہ سے یہی کہتا رہا کہ آپ کے آباء واجداد پر اس سے بھی بڑی مصیبتیں آئیں مگر انہوں نے حوصلہ نہ ہارا اور مردانہ وار ان کا مقابلہ کیا جس سے ان کی حکومت پھر قائم اور سلطنت مضبوط ہوگئی۔ آپ بھی میرے ساتھ چلیں۔ پورا ہندوستان آپ کو اپنا حکمران تسلیم کرنے پر تیار ہے۔

بخت خان، بادشاہ کو اپنے ساتھ لے جانا اور فرنگی سے جنگ جاری رکھنا چاہتا تھا۔ وہ بھی جانے پر تیار ہو گئے تھے۔ مگر بدنصیبی سے مرزا الٰہی بخش بھی کمرے میں موجود تھا۔ اس نے پھر حجت نکالی اور کہا۔ ''یہ جنگ انگریز اور بادشاہ کے درمیان نہیں بلکہ کمپنی سرکار اور اس کی باغی فوجوں کے درمیان ہے جو چھاؤنیوں میں بغاوت کر کے دہلی میں آ گئی تھیں اور بادشاہ نے مجبوراً ان کا ساتھ دیا۔ انگریز افسر بھی جانتے ہیں کہ اعلیٰ حضرت مجبور و بے بس تھے۔ آپ کو کس بات کا خطرہ ہے؟ اور اس ضعیفی میں پردہ نشیں بیگمات اور شہزادیوں کو لے کر کہاں بھٹکتے پھریں گے؟ پھر انگریز فوج پورے ملک میں موجود ہے، وہ باغیوں کا پیچھا کرے گی۔ آپ کو کہیں جانے کی ضرورت نہیں۔ میں انگریزوں سے مل کر تمام معاملات کی صفائی کرا دوں گا۔ آپ پر کوئی حرف آئے گا نہ آپ کی اولاد پر۔''

بادشاہ خاموش ہو گئے۔ پھر بخت خان اور الٰہی بخش میں دیر تک حجت ہوتی رہی حتیٰ کہ مرزا الٰہی بخش نے جنرل بخت خاں پر الزام دھرا کہ تم اعلیٰ حضرت کو اس لیے ساتھ لے جانا چاہتے ہو کہ ان کے نام پر خود حکومت کرو اور مغلوں سے پرانا بدلہ لو جنہوں نے ہندوستان کی سلطنت افغانوں سے چھین لی تھی۔ تم روہیلے پٹھان اُنہی کی اولاد ہو اور پٹھان صدیوں بعد بھی نہ کینہ چھوڑتا ہے نہ بدلہ لینا بھولتا ہے۔

یہ بے ہودہ الزام سن کر جنرل بخت خاں کو طیش آ گیا اور کچھ بعید نہ تھا کہ اسے وہیں ڈھیر کر دے مگر اعلیٰ حضرت آڑے آ گئے اور بخت خاں سے بولے۔

''بہادر! ہمیں تمہاری ہر بات پر اعتماد اور رائے پسند ہے۔ مگر ہماری جسمانی قوت جواب دے چکی ہے اس لیے ہم اپنا معاملہ تقدیر کے حوالے کرتے ہیں۔ ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دو۔ تم جاؤ اور کوئی کام کر کے دکھاؤ۔ اگر ہم یا ہمارا خاندان نہیں تو تم یا کوئی اور ہندوستان کی لاج رکھے۔''

بخت خاں یہ جواب سن کر مایوس ہوا اور سمجھ گیا کہ بادشاہ پر مرزا الٰہی بخش[1] کا جادو چل گیا ہے۔ افسردہ خاطر اُٹھا۔ وہ اپنی فوج دریائے جمنا کی ریتی میں چھوڑ آیا تھا۔ مقبرۂ ہمایوں کے مشرقی دروازے سے نکلا (جو جمنا کے رُخ ہے)، گھوڑے پر سوار ہوا اور اپنے محافظ سواروں کے ہمراہ واپس چلا گیا۔ اس طرح مصیبت سے نکلنے، دہلی کی شکست کا بدلہ لینے اور مغل سلطنت کو بچانے کا آخری ذریعہ بھی ہاتھ سے جاتا رہا۔ بادشاہ نے بخت خاں کو نہیں، اپنی تقدیر کو رخصت کر دیا۔ اسے گئے ابھی تھوڑی دیر ہوئی تھی کہ میجر ہڈسن اپنے سواروں سمیت مغربی دروازے کی جانب نمودار ہوا۔ مگر دور جھاڑیوں کے درمیان ایک شکستہ عمارت میں رُک گیا۔ اس نے پیغام بھیجا کہ بادشاہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دے۔

1۔ بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرنے کی باقاعدہ سازش کی گئی تھی۔ انگریز نے اس مقصد کے لیے اپنے ایجنٹ اور دہلی میں مخبروں کے سربراہ منشی رجب علی نیز مرزا الٰہی بخش کا استعمال کیا تھا۔ مرزا الٰہی بخش کا کام یہ تھا کہ وہ بادشاہ کو جنرل بخت خاں کے ساتھ نہ جانے دے اور جب بخت خاں مایوس ہو کر چلا جائے تو بادشاہ کو گرفتار کر لیا جائے۔ (مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ عہد انگلشیہ)

اعلیٰ حضرت تین وقت کے فاقے سے تھے۔ باغیوں کی شکست اور مغلوں پر آنے والی تباہی و بربادی کے صدمے سے دن بھر کچھ کھا پی نہ سکے تھے۔ متولی اپنے گھر سے بیسنی روٹی لے کر آیا جو سرکہ سے کھائی اور وہاں سے مقبرۂ ہمایوں میں آ گئے۔''

یہ واقعہ سنا کر وہ کہنے لگے۔ ''اورنگ مرزا! میں لالہ رخ اور آپ سے ایک اہم معاملے پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں مگر اس وقت آپ تھکے ماندے اور رات بھر کے جاگے ہوئے ہیں۔ کچھ دیر آرام کر لیں تو پھر بات چیت ہوگی۔''

یہ کہہ کر وہ اُٹھے اور باہر نکل گئے۔ ان کے جاتے ہی ہم بھی لیٹ گئے۔ چونکہ ساری رات جاگتے اور بھاگتے دوڑتے کٹی تھی اس لیے بے سدھ ہو کر سوئے۔ لیکن سونے سے قبل صفدر پیا کے یہ الفاظ کہ وہ ایک اہم مسئلے پر گفتگو کرنا چاہتے ہیں، نیند کے جھونکے کی طرح میرے ذہن کی کھلتی اور بند ہوتی کھڑکیوں سے گزرتے رہے اور میں سوچتی رہی کہ ''وہ ہم سے کس مسئلے پر بات چیت کرنا چاہتے ہیں؟'' میری ساری سمجھ حالات کے کانٹوں اور تمام تر عقل مستقبل کے خطروں میں اُلجھ گئی تھی۔ اس لیے فیصلہ نہ کر سکی کہ کون سا ''اہم مسئلہ'' ان کے پیشِ نظر ہے۔ مگر الفاظ اس طرح دل میں اُتر گئے اور ذہن میں کھب گئے تھے کہ نیند میں انہوں نے خواب کا رُوپ اختیار کر لیا۔ وہ خواب ایک بھیانک تہہ خانے یا سرنگ کا تھا جس میں صفدر پیا کو اُترتے دیکھا اور میں بھی ان کے پیچھے پیچھے اس تاریک سرنگ یا تہہ خانے میں اُتر رہی تھی۔

نہ جانے کب تک سوئی رہی۔ آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ بھوک محسوس ہونے لگی تھی۔ ماموں مرزا پہلے ہی بیدار ہو چکے تھے اور حجرے میں موجود نہیں تھے۔ اپنے خواب پر حیران ہو رہی تھی اور سوچ رہی تھی کہ رات ہم لوگ ایک اندھیری اور موت کی طرح خاموش سرنگ سے گزرے تھے لہٰذا اس کا خیال ذہن پر مسلط رہا اور صفدر پیا کے ''اہم مسئلے'' نے بھی خواب میں سرنگ کا رُوپ دھار لیا۔ مگر وہ خواب میری پریشان خیالی کا نتیجہ نہ تھا۔ فی الواقع ہم ایک خوف ناک تہہ خانے میں اُترنے والے تھے۔

اس اثنا میں ماموں مرزا ایک طباق اُٹھائے داخل ہوئے جس میں تنوری روٹیاں اور دال کے دو کٹورے تھے۔ پتہ چلا کہ بادشاہ کے حکم سے یہاں لنگر لگا دیا گیا ہے۔ دونوں وقت کھانا تقسیم ہوا کرے گا۔ انہوں نے مغلانی کو بیدار کیا۔ ہماری باتیں سن کر مہرو اور عنبری بھی جاگ گئیں۔ روٹیوں کے ساتھ دال کا ایک کٹورا اُنہیں دے دیا گیا۔ دوسرا کٹورا ہم تینوں کے حصے میں آیا۔ بھوک لگ رہی تھی۔ دال روٹی نے پلاؤ کی رکابی سے زیادہ مزہ دیا۔

ابھی ہم کھانے میں مصروف تھے کہ صفدر پیا بڑے گھبرائے ہوئے، پریشان حال داخل ہوئے اور ماموں مرزا کے پاس ہی چوکڑی مار کر بیٹھ گئے۔ میں اُنہیں اس حال میں دیکھ کر پریشان ہوگئی۔ ماموں مرزا نے بھی ان کی طرف حیرت سے دیکھا تو وہ بولے۔ ''بھولا پنچھی جال میں پھنس گیا۔''

ماموں مرزا نے لقمہ چھوڑ دیا۔ ''کیا ہوا؟''

وہ بتانے لگے۔ ''تھوڑی دیر پہلے جنرل بخت خاں روہیلہ، اعلیٰ حضرت سے ملنے آیا تھا۔ اس نے رات بھی ان سے یہی کہا تھا کہ اگر دہلی میں شکست ہوگئی تو کیا ہوا؟ ہندوستان بڑا وسیع ملک ہے۔ میرے ساتھ لکھنؤ یا کسی دوسرے شہر میں چلیے، جہاں ہم منتشر فوج کا شیرازہ پھر سے مرتب کر کے انگریز سے جنگ لڑیں گے اور اسے

مانگی ہے۔ اس صورت میں پورا تیموری گھرانہ پھانسی کے تختے پر کھڑا ہے۔ اب آپ کو اپنی سلامتی کی فکر ہونی چاہئے۔ رہی یہ بات کہ میجر ہڈسن نے بادشاہ کی شرط تسلیم کی ہے یا نہیں تو ماموں مرزا جا کر معلوم کر لیں گے۔ آپ کا جانا اس لیے مناسب نہیں ہوگا کہ آپ انگریز کے خلاف شریکِ جنگ رہ چکے اور ایک پلٹن کی افسری کرتے رہے ہیں۔ کسی مخبر کو یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے کہ آپ مقبرۂ ہمایوں میں موجود ہیں۔''

انہوں نے میری رائے تسلیم کر لی اور اس جگہ بیٹھ گئے جہاں سے ماموں مرزا کھڑے ہوئے تھے۔ وہ بے حد پریشان اور مضطرب تھے۔ جیسے دہلی اور لال قلعہ چھن جانے سے بھی کوئی بڑا دھچکا لگا ہو۔ ان کے بیٹھتے ہی ماموں مرزا حجرے سے نکل گئے۔ مغلانی بادشاہ کی جاں بخشی اور گرفتاری کے بارے میں ہونے والی گفتگو سن کر حیرت اور صدمے سے تھر کی طرح بے جان اور گم صم ہو گئی تھیں۔ میری یہ حالت تھی کہ چہرے پر غموں کی دھول اور دل میں صدیوں کی چبھن کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ زمین پاؤں تلے سے کھسک گئی تھی اور زندگی کا ہر خیال ٹوٹتا بکھرتا جا رہا تھا۔ قلعے سے نکلتے وقت ہی اگرچہ یہ صدمہ دل کو گھائل کیے دیتا تھا کہ مغلوں کی بچی کھچی سلطنت بھی ہاتھ سے جاتی رہی لیکن مقبرۂ ہمایوں میں پہنچ کر تو یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہو گئی کہ ہندوستان کی تاریخ سے مغلیہ دور مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ اب انگریز کا زمانہ ہے اور ہر شخص زمانے کے ساتھ چلنے کی کوشش کرتا ہے لیکن زمانہ کسی کے ساتھ نہیں چلتا۔

نہ جانے میں بیٹھی کیا کیا سوچ رہی تھی۔ صفدر پیا بھی چپ تھے۔ کوئی بول نہیں رہا تھا۔ مہرو اور عنبری نے برتن سمیٹ لیے تھے اور دونوں دیوار سے لگ کر بیٹھی تھیں، جیسے مٹی کی پتلیاں ہوں۔ حجرے میں کسی اُجاڑ مقبرے کی سی خاموشی تھی کہ اچانک اس خاموشی کو مرزا مغل کے پیروں کی چاپ نے توڑ دیا جو بڑے تیز تیز چلتے حجرے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آتے ہی یہ اندوہ ناک خبر سنائی۔

''میجر ہڈسن نے جاں بخشی کی شرط منظور کر لی ہے اور بادشاہ نے خود کو انگریز کے حوالے کر دیا ہے۔ اب ان کے لیے پالکیاں تیار ہو رہی ہیں۔''

گم صم مغلانی کے حلق سے ایک مدھم سی چیخ نکل گئی۔ میرے اندر بھی ایک تڑاکا ہوا جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو۔ اور ماموں مرزا بتانے لگے۔

''تمام شہزادے، سلاطین، بادشاہ کے پوتے، نواسے بے حد افسردہ و غمگین ہیں۔ ہر شخص تصویر حسرت بنا ہوا ہے کہ نہ جانے اب اور کیا ہوگا؟ ابھی چند لمحوں میں گرفتار بادشاہ کی سواری جانے والی ہے۔''

ہمارا حجرہ مغربی دروازے ہی کی جانب تھا جہاں سے دروازے تک صحن کا پورا منظر دکھائی دیتا تھا۔ صفدر پیا بڑے بے چین ہو کر اُٹھے اور باہر نکلے مگر ماموں مرزا نے انہیں پکڑ کر اندر کھینچ لیا اور بولے۔

''صفدر مرزا! نہ صرف اپنی بے چینی کو بلکہ خود کو بھی چھپانے کی کوشش کرو۔ اس وقت مرزا جواں بخت کے علاوہ بادشاہ کے چار فرزند مرزا ظہیر الدین مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان، مرزا مدو یہاں موجود ہیں لیکن جواں بخت کے علاوہ کسی نے بھی خود کو ظاہر نہیں کیا۔''

وہ چپ چاپ ایک طرف ہٹ گئے۔ اسی اثنا میں باہر ایک نقیب نے جس کے بدن پر خاص وردی اور ہاتھ میں عصا تھا، آواز لگائی۔

یہ پیغام سن کر اعلیٰ حضرت دنگ رہ گئے اور مرزا الٰہی بخش سے پوچھا۔ ''تم تو کہتے تھے کہ انگریزوں کو ہم سے کوئی سروکار نہیں۔ پھر وہ ہمیں گرفتار کرنے کیوں آئے ہیں؟ تم نے ہمیں بخت خاں کے ساتھ بھی نہیں جانے دیا۔''

مرزا الٰہی بخش سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ وہ سر جھکائے خاموش کھڑا رہا۔ بادشاہ چاہتے تھے کہ کسی کو بخت خاں کے پیچھے روانہ کریں اور اسے واپس بلا لیں مگر عین اس وقت ملکہ زینت محل کمرے میں داخل ہوئیں اور اعلیٰ حضرت سے کہنے لگیں۔

''بخت خاں کو بلانا بے کار ہے۔ شاید وہ واپس بھی نہیں آئے گا۔ آپ میجر ہڈسن سے اپنی، ہماری اور جواں بخت کی جاں بخشی کا وعدہ لیں، پھر اپنے تئیں اس کے حوالے کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔''

صفدر پیا یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد ایک پل کے لیے رک گئے تو ماموں مرزا نے بے چینی سے پوچھا۔

''پھر بادشاہ نے کیا فیصلہ کیا؟''

''وہ شش و پنج میں پڑ گئے تھے۔ ملکہ نے انہیں بخت خاں کو بلانے سے روک دیا اور انگریز کے ساتھ تعاون کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ آخر انہوں نے رضامندی ظاہر کر دی اور میجر ہڈسن کو پیغام بھیج دیا کہ شہزادہ جواں بخت، ملکہ زینت محل اور ان کی اپنی جاں بخشی کی ضمانت دی جائے تو خود کو اس کے سپرد کر دیں گے۔''

ماموں مرزا غصے میں بڑبڑائے۔ ''میں پہلے ہی جانتا تھا کہ زینت محل[1] اور مرزا الٰہی بخش ضرور کوئی گل کھلائیں گے۔ کیا میجر ہڈسن نے بادشاہ کی شرط منظور کر لی؟''

''ابھی تو نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہے۔ میجر ہڈسن کوئی ضمانت دینے سے کترا رہا ہے۔ اعلیٰ حضرت ضمانت پر اصرار کر رہے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ کھڑے ہو گئے اور بولے۔ ''اب میں جا کر معلوم کرتا ہوں کہ کوئی فیصلہ ہوا یا نہیں؟''

ماموں مرزا نے انہیں جانے سے روک دیا اور خود اُٹھے۔ ''صفدر مرزا! اب میں آپ کا جانا مناسب نہیں سمجھتا۔ اگر جاں بخشی ہوئی بھی تو صرف ان تینوں کی ہو گی۔ باقی پورا مغلیہ خاندان فرنگی کی بندوقوں، برچھیوں اور تلواروں کے حوالے کیا جا رہا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ کوئی پوشیدہ آنکھ آپ کو بادشاہ کے آس پاس بھی پھرتے دیکھے۔''

صفدر مرزا نے تعجب سے پہلے ماموں مرزا کی طرف، پھر میری طرف دیکھا جیسے میری رائے جاننا چاہتے تھے۔ حالات کی جونئی صورت ناگہاں سامنے آئی، اس نے میرے حوصلے کی دیوار گرا دی تھی۔ میرا خیال تھا، اعلیٰ حضرت، جنرل بخت خاں کی بات مان لیں گے اور سارا خاندان بہ حفاظت ان کے ساتھ کسی طرف چلا جائے گا۔ اسی لیے مقبرۂ ہمایوں کا رخ کیا تھا۔ مگر اب وہ بساط اُلٹ گئی تھی جس پر مغلوں کے مہرے پسپا ہو کر پھر آگے بڑھ سکتے تھے۔ وہ بازی مات ہو چکی تھی جسے کسی نئی چال سے سنبھالا جا سکتا تھا۔ مرزا الٰہی بخش اور زینت محل نے کھیل کا پانسہ ہی پلٹ دیا تھا اور بادشاہ شہ مات کے خانے میں کھڑا تھا۔

میں نے اپنی رائے کا اظہار کیا۔

''ماموں مرزا ٹھیک کہتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے صرف اپنی ملکہ زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کی سلامتی

---

[1] زینت محل بھی انگریزوں سے ملی ہوئی تھی۔ (''1857ء'' تصنیف میاں محمد شفیع)

سراؤں کے درمیان پالکی آگے بڑھی۔ بہادر شاہ ظفر کی صورت میں مغلوں کی رہی سہی آبرو بھی فرنگی کے قبضے میں چلی گئی۔ کچھ فاصلے پر میجر ہڈسن اپنے مسلح سواروں کے ساتھ ''شاہی سواری'' کا منتظر تھا۔ مرزا الٰہی بخش گھوڑے پر سوار پہلے ہی مقبرے سے روانہ ہو چکا تھا تا کہ ہڈسن کو اپنے کارنامے سے آگاہ کر سکے۔ بادشاہ کے نکلتے ہی مغربی دروازے کا بھاری پھاٹک بند ہو گیا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا اعلیٰ حضرت کو صرف بات چیت کے لیے بلایا گیا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہو گا کہ کمپنی سرکار انہیں اپنی نگرانی میں رکھے گی اور شاہی فرامین پر حسبِ خواہش ان کے دستخط کروالیا کرے گی جس کے عوض انہیں کچھ وظیفہ ملتا رہے گا۔ لیکن وہ اس بات کو بھول رہے تھے کہ مکان کی دیواریں ڈھے جائیں تو چھت زمین بوس ہو جاتی ہے اور صرف اس کا ملبہ اٹھانے کا کام باقی رہ جاتا ہے۔

یہ بات ماموں اورنگ مرزا نے اچھی طرح محسوس کر لی تھی کہ بوڑھے بادشاہ اپنی آل اولاد کی حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔ انہوں نے اپنے ساتھ صرف بیگم زینت محل اور شہزادہ جواں بخت کی جاں بخشی کا وعدہ لیا اور اپنی دوسری بیگموں، بیٹوں، پوتوں اور نواسوں سمیت پورے خاندان کو انگریز کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ یہی بات بے حد تکلیف دہ تھی۔ مقبرۂ ہمایوں میں تین ہزار محافظ سپاہ موجود تھی، جو فرنگی سواروں کو بادشاہ کی گرفتاری سے روک سکتی تھی لیکن جب انہوں نے خود گرفتاری قبول کر لی تو محافظ سپاہ بے کار ہو گئی۔ ماموں مرزا کا خیال تھا کہ اگر انہیں خود کو انگریز کے حوالے کرنا ہی تھا تو ذرا توقف کرتے اور پورے خاندان کے تحفظ کی ضمانت لیتے۔

انگریز کسی ہنگامے کے بغیر انہیں گرفتار کرنا چاہتا تھا۔ اس نے یہ اندیشہ نظر انداز نہیں کیا کہ اگر ان کی گرفتاری پر کوئی ہنگامہ، تصادم یا کشت و خون ہوا تو وہ خون ہندوستان میں ایک نئی بغاوت کا دھارا بن سکتا ہے۔ اسی لیے دہلی کو بزورِ طاقت فتح کرنے کے باوجود اس نے بادشاہ کی گرفتاری میں سیاسی حکمت عملی سے کام لیا۔ پہلے انہیں جنرل بخت خاں سے کاٹا، پھر ہڈسن سپردگی اور اسیری کا پیغام لے کر پہنچ گیا۔ اگر کوئی مغل ذہن معاملے کی اس اہمیت کا ادراک کر سکتا تو پورے خاندان کے لیے حفظِ جاں کی ضمانت حاصل کی جا سکتی تھی لیکن اس وقت بادشاہ کے صلاح کاروں میں کوئی شخص سیاسی سوجھ بوجھ نہیں رکھتا تھا یا پھر شکست و ناکامی نے سارے ذہن پراگندہ کر دیئے تھے اور ان کا خیال تھا کہ انگریز کی بات مان لینا ہی بہتر ہے۔ صرف ماموں اورنگ مرزا تھے جن کے نزدیک اعلیٰ حضرت نے مرزا الٰہی بخش کا مشورہ قبول کر کے بڑی سنگین غلطی کی تھی۔ لیکن ان کی سنتا کون تھا؟

❀......❀......❀

''قدم ہوشیار، نگاہ روبرو، پیرو مرشد، حضور عالی، بادشاہ سلامت، عمر دراز۔''

اس آواز کا مطلب یہ تھا کہ بادشاہ مقبرۂ ہمایوں سے روانہ ہو رہے ہیں۔ یہ آواز سنتے ہی مغلانی اور میں سروں کو اچھی طرح ڈھانپ کر ماموں اورنگ مرزا کے قریب آ گئیں، جو دروازے میں کھڑے تھے۔ ہمارے پیچھے دونوں خادمائیں تھیں۔ صفدر پیا ایک طرف اوٹ میں تھے لیکن ان کی نظریں بھی باہر صحن کی طرف جمی تھیں۔

چند ہی لمحوں میں ہمارے حجرے کے سامنے صحن میں پالکیاں نمودار ہوئیں لیکن جو منظر میں نے دیکھا، وہ ایسا دل گداز تھا کہ میرا جسم کانپنے لگا۔ ایک پالکی میں بادشاہ کی چہیتی ملکہ زینت محل، دوسری میں ان کے فرزند شہزادہ جواں بخت تھے۔ خود اعلیٰ حضرت چند خواجہ سراؤں کے جلو میں ان پالکیوں کے آگے آگے پیدل چل رہے تھے۔ بدن پر لباسِ شاہی تھا لیکن سر جھکا ہوا تھا۔ چہرے پر ویرانی اور دل میں غالباً ناقابل بیان غموں کا جوار بھاٹا اُٹھ رہا تھا۔

یہ مغلوں کے آخری تاج دار اعلیٰ حضرت سراج الدین بہادر شاہ ظفر شاہِ دہلی کا جلوسِ اسیری تھا جن کے خطابات[1] والقابات ''خورشید رایت، آسمان رفعت، بہرام صولت، کسریٰ حشمت، فریدوں سطوت، جمشید جاہ، کاؤس دستگاہ، سکندر شان، دارا دربان، سلیمان نگیں، سلطنت مکیں، مہر پرچم، کواکب چشم'' جیسے پُر شوکت اور زلزلہ فگن الفاظ سے آراستہ تھے مگر زندگی میں ایک بھی خطاب شرمندۂ معنی نہ ہو سکا کیونکہ سرکاری انگلشیہ کے وظیفہ خوار اور اس کے خلاف بغاوت کے جرم میں مبتلائے مصیبت ہوئے تھے۔ نافرمان تلنگے باغی ساتھ چھوڑ گئے۔ اپنوں نے بے وفائی کی اور جو آزادی کا جذبہ اور وفا کی لگن رکھتے تھے، ان کے ساتھ نہ جانے دیا۔

آگے پیچھے کوئی سپاہی یا بلم بردار نہیں تھا۔ بے بس، بے کس بادشاہ خود کو فرنگیوں کے حوالے کرنے جا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی بات ختم کر دی تھی کیونکہ دشمن کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ یہ منظر دیکھ کر میری آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔ دل کٹا جاتا تھا۔ ذہن میں کانٹے چبھ رہے تھے۔ بادشاہ مغلوں کا انجام بن کر میرے سامنے سے گزرے اور ہولے ہولے چلتے مقبرۂ ہمایوں کے مغربی دروازے سے نکل گئے۔ کچھ فاصلے پر میجر ہڈسن اپنے سواروں کو لیے موجود تھا، جسے بوڑھے بادشاہ کو ان حادثات کے سپرد کرنا تھا، جو ابھی پیش آنے والے تھے۔

بادشاہ کی اسیری کے ساتھ مغلیہ سلطنت کا ستارہ ڈوب گیا۔ ہندوستان میں تیموری حکومت اپنے انجام کو پہنچ گئی اور میں نے اس انجام سے اپنی اس کہانی کا آغاز اس لیے کیا ہے کہ اس کی ابتدا بھی اتنی ہی حیرت انگیز ہے، جتنا اس کا آخر افسوس ناک ہے۔ مگر ابھی تو مغلوں کے انجام کی وہ دل ہلا دینے والی باتیں بھی سنیے گا جنہیں سن کر شاید زمین کی چھاتی پھٹ جائے۔ لیکن زمین انسانوں کو کھا جاتی ہے اور ان کا ذکر داستانوں اور کتابوں میں باقی رہ جاتا ہے۔

مقبرہ ہمایوں سے اعلیٰ حضرت کی روانگی یا دوسرے لفظوں میں گرفتاری کا جو منظر لوگوں نے دیکھا، وہ ایسا دل گداز تھا کہ بے اختیار آنکھیں بھیگ گئیں۔ آلِ تیمور کی بے بسی پر رونے والے بہت تھے، آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں تھا۔

مغربی دروازے کے باہر کہاروں نے بادشاہ کی پالکی زمین پر رکھ دی۔ پنچھی اپنے قفس میں بیٹھا اور خواجہ

---

[1] یہ سارے خطابات بہادر شاہ کے روزنامچے میں موجود ہیں۔ (مصنف)

ہم سب حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''اگر میرا قیاس غلط نہیں تو وہ کل پھر آئیں گے اور کچھ اور لوگوں کو لے جائیں گے۔ جبھی میں کہتا ہوں، ہمیں یہاں سے نکل جانا چاہئے۔ مجھے صفدر مرزا کے بارے میں دھڑ کا ہے۔''

اس بات نے ہمیں چونکا دیا۔ ماں پریشان ہوگئی۔ ''مگر صفدر مرزا نہ بادشاہ کے بیٹے ہیں نہ پوتے، پھر دھڑ کا کس بات کا؟''

''ان پر مرزا مغل کے تحت ایک پلٹن کی افسری کرنے کا الزام عائد ہوگا اور پلٹن بھی وہ جس نے فرنگی فوج کو سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ پھر یہ ایک مغل شہزادی کے منگیتر ہیں اور اس ناتے میں ان کے لیے پریشان ہوں۔''

میں ماموں مرزا کا مطلب سمجھنے لگی اور گھبرا گئی۔ دہلی اور لال قلعے سے نکلنے کے بعد صفدر پیا ہی وہ حصار تھے، جس کے اندر میں محفوظ رہ سکتی تھی اور انہیں کسی بھی حالت میں، کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتی تھی۔ لیکن جو کچھ میں نے کہنا چاہا، وہ ماں نے کہہ دیا۔ ''پھر تو ہمارا یہاں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں۔ مگر جائیں گے کہاں؟''

''ملک خدا تنگ نیست۔'' وہ بتانے لگے۔ ''یہاں سے کشتیوں کا پُل زیادہ دور نہیں۔ وہاں تک ہمیں پیدل چلنا ہوگا۔ جمنا کے اس پار پہنچ جائیں تو کسی گاؤں سے بہلی (بیل گاڑی) کا بندوبست ہو جائے گا۔''

''میں تو جمنا تک بھی مشکل سے چل سکوں گی۔''

''موت پیچھا کر رہی ہو تو زندگی کی خاطر انسان ہر مشکل سے گزر جاتا ہے۔''

صفدر پیا جو ابھی تک خاموش بیٹھے تھے، بول پڑے۔ ''اورنگ مرزا! آپ تو یونہی گھبرائے جا رہے ہیں۔ یہ ہندوستان کے شہنشاہ ہمایوں کا مقبرہ ہے اور مقبروں، مزاروں، قبروں پر دھاوا کرنے والی فوج اپنے لیے گڑھا کھودتی ہے۔''

صفدر پیا، ماموں مرزا کو ان کے نام سے مخاطب کرتے تھے اور یہ انہی کی خواہش تھی کہ وہ میری طرح انہیں ''ماموں مرزا'' کہنے کے بجائے ''اورنگ مرزا'' کہہ کر بلایا کریں۔ ویسے دونوں کی محبت کا یہ عالم تھا جیسے باپ بیٹا ہوں۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر جیتے تھے۔ ان کے درمیان یہ تعلق میری وجہ سے تھا۔ ماموں مرزا اگر مجھے بیٹی سے بڑھ کر چاہے تو ان پر جان بھی دیتے تھے۔ مغلانی کئی مرتبہ کہہ چکی تھی، وہ دوسری شادی کر لیں۔ لیکن چند سال پہلے جب ممانی وضع حمل کے وقت جاں بحق ہوگئیں کیونکہ پیدائش سے قبل ہی بچہ مر چکا تھا تو ماموں مرزا کا دل دنیا سے اُچاٹ ہو گیا۔ اور گھر گرہستی سے ان کی دلچسپی جاتی رہی۔ مگر کچھ عرصے سے ان کی ساری شفقتیں ہم دونوں کے لیے وقف ہو کر رہ گئی تھیں۔ صفدر پیا کی بات سن کر کہنے لگے۔

''ہوسکتا ہے، فرنگی مقبرے پر دھاوا نہ کریں لیکن یہاں پکڑ دھکڑ تو ضرور ہوگی۔ میں چاہتا ہوں، ہم پہلے ہی مقبرہ چھوڑ دیں۔''

''لوگ ہمیں بزدل کہیں گے۔ مصیبت کے وقت حوصلہ رکھنا چاہئے۔''

''حوصلے کی دیواریں تو گر چکی ہیں صفدر مرزا! اس وقت ہم ان کے ملبے پر بیٹھے ہیں۔ بادشاہ نے گرفتاری دینے میں عجلت کی ہے۔ ہمیں یہاں سے نکلنے میں عجلت کرنا چاہئے۔ اگر ہم آج ہی رات یہاں سے چلے جائیں تو

(4)

مغل شہزادے

ہر کام اسی طرح ہوا جس طرح انگریز چاہتا تھا۔ بساط کا ہر مہرہ اس کے ترتیب دیئے ہوئے نقشے اور سوچی ہوئی چال کے مطابق خانہ بہ خانہ بتدریج آگے بڑھا اور مغل بادشاہ کو شہ مات کی بازی تک لے آیا جہاں کھیل ختم ہو گیا۔ بعض لوگوں کی طرح میرا بھی یہی خیال تھا کہ بات شاید اعلیٰ حضرت کی گرفتاری سے آگے نہ بڑھے۔ دہلی کی فتح کے بعد انگریز کا مقصد پورا ہو گیا اور اب وہ بلا شرکت غیرے ہندوستان کا حکمرانِ اعلیٰ تھا۔ پہلے کمپنی سرکار کلکتہ سے احکام نافذ کرتی تھی، اب وہ دہلی سے پورے ہندوستان پر حکومت کرے گی۔

میں سوچ رہی تھی کہ انگریز نے صرف بادشاہ زینت محل اور ان کے عزیز فرزند جواں بخت کو (جن کی ولی عہدی کے لیے وہ انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ تک عرضی دعویٰ کرتے رہے تھے) اپنی تحویل میں لینا ضروری سمجھا ہے، دوسرے مغل شہزادے اس کے نزدیک شاہی بساط کے بے کار مہرے ہیں، جنہیں نظرانداز کر دیا گیا ہے۔ مگر ماموں مرزا نے میری سوچ کا تارا تانا بانا بکھیر دیا اور کہا۔

''بادشاہ کی گرفتاری کے بعد فرنگ فوج کسی وقت بھی مقبرۂ ہمایوں کو گھیرے میں لے سکتی ہے۔ اب ہمارا یہاں مزید قیام کرنا مناسب نہیں۔''

ماں جو اعلیٰ حضرت کی روانگی پر بڑی افسردہ و غمگین ہو گئی تھی، خیر افسردہ و غمگین تو ہم سبھی تھے البتہ وہ ذرا زیادہ شکستہ خاطر تھی اور بڑے آزردہ لہجے میں بولی۔ ''اورنگ مرزا! فرنگی، بادشاہ، زینت محل اور جواں بخت کو لے گیا جس کی طرف سے وراثت و جانشینی کے دعوے کا خطرہ تھا۔ اب مقبرۂ ہمایوں میں کیا رکھا ہے کہ فرنگی فوج اس کا گھیرا ڈالنے آئے گی؟''

ماموں مرزا نے بہن کو یوں دیکھا جیسے اس کی ناسمجھی پر حیران ہوں۔ ''مغلانی! فرنگی بے شک بادشاہ اور جواں بخت کو لے گئے، جسے وہ اپنا ولی عہد اور جانشین بنانا چاہتے تھے۔ لیکن جو باغی آج بھاگ گئے ہیں وہ کل پھر اکٹھے ہو سکتے اور بادشاہ کے کسی بیٹے یا پوتے کو سلطنتِ مغلیہ کا وارث قرار دے کر ایک نئی بغاوت کی آگ بھڑکا سکتے ہیں۔ آگ جلتی بھی ہے، جلاتی بھی ہے۔ کیا فرنگی اب کسی مغل شہزادے کو آگ جلانے اور بھڑکانے کا موقع دیں گے؟''

بہادر نظر نہیں آیا۔''

ماموں مرزا ایک بار پھر انہیں حیرت پاش نظروں سے دیکھنے لگے۔ ''صفدر مرزا! اگر اس نے یہ بات کہی ہے تو وزن میں بڑی بھاری ہے۔ اور اگر وہ مغل شہزادوں کو قابل اعتماد نہیں سمجھتا تو خود اعتماد کے لائق ہے۔ کیونکہ جو کچھ اس نے کہا، جو کچھ اس نے سمجھا وہ ترازو میں تلا ہوا ہے اور اب اس سے میری دلچسپی بڑھ گئی ہے۔ ملاقات کے لیے کون سا وقت مقرر ہے؟''

''کل شام کا جب دو وقت باہم مل رہے ہوں گے۔''

''اور ملاقات کہاں ہوگی؟''

''مقبرۂ ہمایوں کی مغربی جانب پہلے کھنڈر میں۔''

''اب مجھے اپنے ملاقاتی کا حلیہ بتائیے۔''

صفدر پیا نے تعجب کا اظہار کیا۔ ''آپ کو اس کے حلیے سے کیا لینا ہے؟''

''حلیہ اس لیے پوچھا ہے کہ کل شام کو مغربی کھنڈر میں اپنے ملاقاتی سے ملنے آپ نہیں جائیں گے، میں جاؤں گا۔''

''وہ آپ سے ملاقات نہیں کرے گا۔''

''میں ملاقاتی سے صرف اس لیے ملوں گا کہ اسے اپنے ساتھ یہاں لے آؤں تاکہ آپ سے ملاقات کر سکیں۔ میں اسے بتا دوں گا کہ آپ کا مقبرے سے نکلنا خطرے سے خالی نہیں۔''

صفدر پیا پر ایک اور حیرت گزر گئی۔ ''باہر مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے اورنگ مرزا! خطرہ تو آدمی کے اندر ہوتا ہے۔''

ماموں مرزا نے بلا توقف جواب دیا۔ ''میں نے پہلے صرف یہ بتایا تھا کہ مجھے آپ کے بارے میں دھڑکا ہے۔ اب یہ بتاتا ہوں کہ میں مقبرۂ ہمایوں میں فرنگی کے جاسوسوں کی بو سونگھ رہا ہوں، جو خفیہ طور پر یہاں ایسے لوگوں کی نگرانی کر رہے ہیں جن کے نام انگریز کی فہرست میں ہیں اور......''

''انہوں نے ماموں مرزا کی بات کاٹ دی۔ ''تو آپ کے خیال میں انگریز نے ان لوگوں کی فہرست بنا رکھی ہے، جو اسے مطلوب ہیں؟''

''آپ کو یاد نہیں رہا، مرزا عبداللہ شاہ رخ اپنی بہن نرگس کے ہمراہ نہیں جا سکے تھے اور ایک سائیس کا بھیس بدل کر قلعے سے نکل گئے۔ ان کا نام انگریز کی فہرست میں تھا اور قلعے سے باہر فرنگی کے جاسوس ان کی نگرانی کر رہے تھے۔''

اب ہمیں ماموں مرزا کی بات کا وزن محسوس ہوا۔ وہ کہہ رہے تھے۔ ''مرزا ظہیر الدین مغل شاہی فوجوں کے کمانڈر اِنچیف تھے۔ جب کوئی فریق جنگ جیت لیتا ہے تو اسے ہارے ہوئے کمانڈر اور اس کے ساتھیوں کی تلاش ہوتی ہے۔ انگریز کمانڈر کو بھی مرزا مغل اور ان کے ساتھیوں کی تلاش ہوگی، جن میں آپ بھی شامل ہیں۔ اس وقت مقبرۂ ہمایوں میں ولی عہد مرزا قویاش، مرزا ظہیر الدین مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان، مرزا مددا، بادشاہ کے کئی پوتے موجود ہیں۔ مرزا مغل کے بیٹے عبداللہ مرزا اور مرزا قویاش کے فرزند سہراب مرزا کو تو میں —

بہتر ہوگا۔‘‘

’’آج رات؟‘‘

’’آج رات ہی موقع ہے پھر شاید وقت ہاتھ سے نکل جائے۔‘‘

صفدر پیا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور بولے۔’’آج رات تو یہاں سے نکلنا ممکن نہیں۔ میں نے کل ایک آدمی کو ملاقات کا وقت دے رکھا ہے۔‘‘

’’آپ اس آدمی سے پھر کبھی مل سکتے ہیں۔اس کی ملاقات زندگی سے ضروری نہیں ہو سکتی۔‘‘

’’اورنگ مرزا! زندگی بے شک انمول ہے لیکن مجھے جس ملاقاتی کا انتظار ہے، اس سے ملنا ہماری زندگیوں سے زیادہ قیمتی ہے۔‘‘

اس بات نے ہم سب کو حیرت زدہ کر دیا۔ ماموں مرزا ان کی طرف یوں دیکھنے لگے جیسے منتظر تھے کہ وہ ملاقات کے اس مقصد کی وضاحت کریں گے جس کے سامنے زندگی جیسی انمول شے حقیر قرار دی گئی تھی۔ غالباً وہ خود بھی کوئی اہم انکشاف کرنے والے تھے تاکہ ہم لوگ مطمئن ہو سکیں اور اسی رات وہاں سے جانے پر اصرار نہ کریں۔لیکن اچانک انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور خاموش ہو گئے۔ ماموں مرزا کہنے لگے۔

’’مجھے تسلیم ہے کہ بعض مقصد زندگی سے زیادہ قیمتی اور اہم ہوتے ہیں لیکن جب تک مقصد معلوم نہ ہو، زندگی داؤ پر نہیں لگائی جاتی۔‘‘

صفدر پیا سوچ میں پڑ گئے کہ آیا وہ کچھ بتائیں یا خاموش رہیں۔ مجھے خیال آیا کہ ہمارے مقبرۂ ہمایوں میں آتے ہی انہوں نے کہا تھا کہ وہ ہم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتے ہیں تو ضرور اس ملاقاتی ہی کے بارے میں کچھ بتانا چاہتے تھے۔لیکن بعدازاں حالات نے اچانک ایسی صورت اختیار کر لی کہ نہ وہ کچھ کہہ سکے، نہ ہم کچھ سن سکے۔ بادشاہ کی اسیری کے بعد بات چیت کا موقع ملا تو وہ صرف اپنی کسی ملاقات کا ذکر کر کے رہ گئے۔ غالباً بات ایسی تھی جس کے اظہار سے ہچکچا رہے تھے۔ ماموں مرزا نے مقصد پوچھا تو کہنے لگے۔

’’اورنگ مرزا! اپنے ملاقاتی سے ملے بغیر میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔البتہ اتنا ضرور بتا دینا چاہتا ہوں کہ اگر وہ راز کی بات اعلیٰ حضرت کو معلوم ہو جاتی تو نہ لال قلعے سے نکلتے، نہ خود کو فرنگی کے حوالے کرتے۔‘‘

یہ سن کر میں دنگ رہ گئی۔ ماموں مرزا مارے حیرت کے اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور ان کی طرف ہاتھ لہرایا۔

’’صفدر مرزا! اگر کوئی ایسی بات ہے تو میں آپ کے ملاقاتی کا انتظار کروں گا۔ یہ اندیشہ ضرور ہے کہ انگریز دوسری بار یہاں آنے میں دیر نہیں لگائے گا اور پکڑ دھکڑ ہو گی۔ پھر بھی ہم کل تک یہیں رہیں گے۔اب میں آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ ایسا راز جس سے مغلیہ خاندان کی تقدیر بدل سکتی تھی، اس آدمی نے جس سے آپ ملاقات کرنے والے ہیں، بادشاہ کو کیوں نہیں بتایا؟‘‘

’’اسے بادشاہ پر اعتماد نہیں۔ وہ سمجھتا ہے بڑھاپے نے اعلیٰ حضرت کو ضعیف کر دیا ہے۔ان کے ارادوں میں پختگی نہیں۔ پھر وہ ایسے لوگوں میں گھرے رہے ہیں، جو انگریز کے حمایتی بلکہ آلہ کار تھے۔ اس کے نزدیک مغل شہزادے بھی ناتجربہ کار اور عاقبت نااندیش ہیں جن پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ ایک رازِ سربستہ اُس کے سینے میں دفن ہے مگر صرف اسی آدمی کو بتایا جائے گا جو جان پر کھیل جانے کا حوصلہ رکھتا ہو اور مغل شہزادوں میں اسے کوئی ایسا

ماموں مرزا کے حجرے سے نکلتے ہی میں نے صفدر پیا سے ان کے پراسرار ملاقاتی کے بارے میں سوال کیا مگر ان کے جواب نے مجھے کچھ اور حیران کر دیا۔ انہوں نے بتایا۔

''میں اس آدمی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ کل رات جب بادشاہ کے ہوادار (تام جھام) کے پیچھے پیچھے درگاہ حضرت نظام الدین اولیا میں پہنچا تو وہیں اس سے ملاقات ہوئی تھی اور ملاقات ہوئی کہاں، کرائی گئی تھی۔ درگاہ سے اعلیٰ حضرت کی واپسی پر میں کچھ دیر کے لیے ایک طرف ہٹ گیا تھا کہ ان کا ہوادار ذرا آگے نکل جائے تو پیچھا کروں۔ میں چھپ کر ان کی نگرانی اور حفاظت کا فرض ادا کر رہا تھا۔ بس انہی چند لمحوں میں درگاہ کا ایک درویش میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

''صفدر مرزا! ایک صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔''

مجھے روانگی میں جلدی نہیں تھی۔ درویش کے ساتھ ہو لیا۔ وہ مجھے درگاہ ہی میں ایک طرف لے گیا جہاں اندھیرے میں کوئی صاحب کھڑے تھے۔ قریب پہنچ کر سلام کیا اور دیکھا تو اکسٹھ باسٹھ برس کا ایک معتبر آدمی، جس نے نیلے رنگ کی فرغل پہن رکھی تھی، میرا منتظر تھا۔ میں کئی بار درگاہ میں گیا، درگاہ کے متولی شاہ غلام حسن چشتی اور وہاں رہنے والے فقیروں اور درویشوں کو جانتا ہوں۔ مگر میرا ملاقاتی ان میں سے نہیں تھا۔ میرے پہنچتے ہی اس نے درویش کو رخصت کر دیا اور سرگوشی کے لہجے میں بتانے لگا کہ مجھے ایک اہم کام کے لیے منتخب کیا گیا ہے جس سے ہندوستان میں مغلوں کا ادبار ان کے اقبال میں تبدیل ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے رازِ سربستہ سے آگاہ ہے جس کا انکشاف اگر بادشاہ پر کر دیا جاتا تو وہ لال قلعہ نہ چھوڑتے۔

مجھے یہ سن کر بے حد تعجب ہوا کہ اعلیٰ حضرت اور ان کے فرزندوں کو چھوڑ کر میرا انتخاب کیوں کیا گیا؟ اور انتخاب کرنے والے کون لوگ ہیں؟ جس پر میرے ملاقاتی نے وہ بات بتائی، جس کا اظہار میں اورنگ مرزا کے سامنے کر چکا ہوں کہ بادشاہ اپنے بڑھاپے اور صلاح کاروں کے باعث اور شہزادے اپنی نااندیشی کی وجہ سے لائق اعتماد نہیں۔ وہ راز صرف ایسے فرد کو بتایا جا سکتا ہے جو مغلیہ خاندان سے تعلق رکھتا ہو اور فرنگی کو ملک سے نکالنے کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی دے سکے۔

اس اثناء میں اعلیٰ حضرت کی پالکی دور نکل گئی تھی اور مجھے ان کے پیچھے جانا تھا۔ یہ بات میرا ملاقاتی بھی جانتا تھا کہ میں بادشاہ کی نگرانی پر مامور ہوں، اس لیے دوسری ملاقات کا دن، وقت اور مقام طے کر کے اس نے مجھے رخصت کر دیا اور میں گھوڑے پر سوار شاہی ہوادار کے عقب میں ہو لیا۔ لالہ رخ! اپنے پراسرار ملاقاتی کی شخصیت میرے لیے کسی چیستان سے کم نہیں۔ حتیٰ کہ میں اس کا نام تک نہیں جانتا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ کوئی اہم بات ضرور جانتا اور اپنے دل میں قوم کا درد رکھتا ہے۔ میں نے اس کے چہرے پر سچائی کی روشنی دیکھی ہے جو مجھے اپنی طرف کھینچ رہی ہے۔''

ان کی باتیں سن کر ملاقاتی سے نہ صرف میری اپنی دلچسپی بڑھ گئی بلکہ اب میں بڑی بے چینی سے اس بات کی منتظر تھی کہ وہ دوسری ملاقات میں کون سا اہم راز منکشف کرتا ہے۔

میں یہ بھی واضح کر دینا چاہتی ہوں کہ میرے دل میں صفدر پیا کی محبت اور نبضوں میں تیموری خون کی گردش ایک ساتھ جاری ہے۔ اگر میں اپنی محبت کے لیے ہر طاقت سے ٹکرا سکتی ہوں تو تیموری ناموس کے لیے بھی جان

خود دیکھا ہے۔ مگر مرشد زادے الگ الگ حجروں میں چھپے[1] ہوئے ہیں اور کوئی یہاں اپنی موجودگی ظاہر نہیں کر رہا۔ اس لیے آپ کو بھی احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ آپ کا مقبرے سے باہر نکلنا اور اپنے ملاقاتی سے ملنے جانا خالی از خطرہ نہیں۔ میں آپ کو ان نادیدہ آنکھوں سے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں جو یہاں شہزادوں کی نگرانی کر رہی ہیں۔''

ان کی باتوں نے سب کو حیران کر دیا۔ لیکن صفدر پیا نے جو کچھ کہا وہ ان باتوں سے زیادہ حیران کر دینے والا تھا۔

''اورنگ مرزا! میرا ملاقاتی یہی تو دیکھنا چاہتا ہے کہ میں خطرے کی اس حالت میں باہر نکلتا ہوں یا مغل شہزادوں کی طرح مقبرے کے کسی حجرے میں چھپ جاؤں گا۔ ہوسکتا ہے کل یہاں کا منظر بدل جائے۔ جیسا آپ کہتے ہیں کہ فرنگی ہارے ہوئے کمانڈر اور اس کے ساتھیوں کی تلاش میں آئے گا۔ ہوسکتا ہے کل کچھ بھی نہ ہو اور وہ بادشاہ اور جواں بخت مرزا کی گرفتاری پر اکتفا کرلے۔ لیکن میں ہر حالت میں کل شام اپنے ملاقاتی سے ملنے جاؤں گا۔ میرے علاوہ نہ وہ کسی دوسرے سے ملے گا نہ یہاں آئے گا۔ ملاقات کے لیے اس نے صرف میرا انتخاب کیا ہے اور یہ بھی چاہتا ہے کہ جو کچھ وہ مجھے بتائے گا، اسے اپنی ذات تک محدود رکھوں۔''

''پھر تو آپ ہی اس سے ملنے جائیں گے اور اس طرح جائیں گے کہ دھرتی بھی آپ کے پیروں کی آہٹ نہ سن سکے۔'' ماموں مرزا نے کچھ اور بھی کہا اور یہ کہا۔ ''صفدر مرزا! آپ کو کل شام تک اس حجرے سے باہر نہیں نکلنا۔ ابھی تک چند خاص آدمیوں کے سوا عام لوگوں کو آپ کی موجودگی کا علم نہیں۔ اخفا کا یہ پردہ قائم رہنا ضروری ہے۔ میں چاہتا ہوں انگریز کے مخبروں کو آپ کی ہوا بھی نہ لگنے دوں۔ اسی میں ہماری بہتری ہے۔''

صفدر پیا نے ان کی یہ بات منظور کرلی کہ نہ تو وہ دوسرے دن کی شام تک حجرے سے باہر نکلیں گے، نہ مرزا ظہیرالدین مغل یا شاہی خاندان سے اپنا کوئی تعلق ظاہر ہونے دیں گے۔ ماموں مرزا یہ خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ بادشاہ کی گرفتاری کے بعد ان کے بیٹوں اور کچھ چیدہ چیدہ لوگوں کو بھی گرفتار کیا جائے گا اس لیے ہمیں شاہی خاندان سے الگ تھلگ رہنا چاہئے۔ یہ بات بھی غنیمت تھی کہ صفدر پیا نے ہمارے لیے وہاں جو حجرہ مخصوص کرایا، وہ مشرقی دروازے کی جانب اور شاہی خاندان کے افراد کی قیام گاہوں سے دور اور الگ تھلگ تھا۔

❀......❀......❀

وہاں حجرے اور کمرے تھوڑے تھے۔ لوگوں نے مقبرے کی فصیل کے اندر جہاں جگہ ملی خیمے لگا لیے یا کپڑے تان لیے تھے۔ اس طرح مقبرۂ ہمایوں میں ایک بستی آباد ہوگئی تھی۔ ہمیں دو روز وہیں قیام کرنا تھا۔ ماموں مرزا یہ تاکید کر کے کہ ہم حجرے کے اندر ہی رہیں اور کسی سے کوئی رابطہ نہ رکھیں خود باہر نکل گئے۔ وہ بادشاہ کی گرفتاری کے متعلق لوگوں کی چہ مگوئیاں سننا چاہتے تھے۔ لیکن ادھر صفدر پیا نے اپنے پراسرار ملاقاتی کے حوالے سے جو سنسنی پیدا کر دی تھی، وہ میرے رگ و ریشے میں دوڑتی پھر رہی تھی اور مجھے یہ تجسّس تھا کہ وہ ملاقاتی کون ہے؟ اور اس کے سینے میں کون سا راز محفوظ ہے جو مغلوں کی بگڑی ہوئی قسمت سنوار سکتا ہے؟

---

[1] مولوی ذکاءاللہ نے ''تاریخ ہندوستان'' میں غدر کے جو چشم دید حالات لکھے ہیں ان سے ان واقعات کی تصدیق ہوتی ہے۔ مولوی ذکاءاللہ جنہیں شمس العلماء کا خطاب بھی ملا، سرکار انگلشیہ کے حامی اور تنخواہ دار تھے مگر واقعہ نگاری میں انہوں نے حزم و احتیاط کو مدنظر رکھا۔ (قمر اجنالوی)

جانب ہانک دی گئیں جہاں زینت محل کی حویلی ہے۔ تینوں کو اس حویلی میں نظر بند کر دیا گیا۔ بادشاہ نے انگریز کمانڈر یا گورنر سے ملنے کی درخواست کی لیکن ان کی درخواست مسترد کر دی گئی اور جواب ملا، اب وہ بادشاہ نہیں صرف ایک قیدی ہیں اور قیدی کو اپنی قسمت کے فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے۔

اس خبر کے ساتھ وہ قیاس آرائیاں غلط ثابت ہو گئیں کہ فرنگی سرکار شاید بادشاہ کے ساتھ کوئی بات چیت کرے گی۔ بات چیت کا وقت گزر چکا تھا اور شاہی خاندان کی پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ یہ بھی بتا دوں کہ فرنگی نے بادشاہ کی بیگم تاج محل اور ان کے بیٹے شہزادہ مرزا عباس شاہ کو بھی اپنی تحویل میں لے لیا تھا اور انہیں شہر لے گئے تھے۔

دہلی میں مارشل لاء نافذ کر دیا اور کرنل برن کو شہر کا فوجی گورنر بنا دیا گیا تھا جس نے چاندنی چوک میں قطب الدین سوداگر کی کوٹھی میں اپنا فوجی ہیڈ کوارٹر قائم کیا تھا۔ فوج کو تین روز تک شہر کو لوٹنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ جو لوگ مارشل لاء نافذ ہونے سے پہلے نکل گئے، نکل گئے۔ بعد ازاں شہر سے نکلنا مشکل ہو گیا۔ اگر لوگ گھروں سے نکلتے اور مارشل لاء کی خلاف ورزی کرتے تو انہیں گولی مار دی جاتی تھی۔ کتنے ہی لوگ ہلاک ہوئے مگر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی گرفتاری کا تماشا لوگوں کو سرِ عام دکھایا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ اہلِ دہلی مغل بادشاہ کی رسوائی کا نظارہ کر لیں۔

اس خبر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بادشاہ کے بارے میں انگریز کے ارادے اچھے نہیں۔ میں تو نڈھال سی ہو کر بستر پر ڈھے گئی۔ کچھ کھانے پینے کا ہوش نہ رہا۔ میری طرح وہ تمام لوگ جو مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزین تھے، نئے اندیشوں اور نئی فکروں میں ڈوب گئے۔

❀......❀......❀

دوسرے دن کا سورج ایک نئی قیامت کے ساتھ طلوع ہوا۔ صبح ہی صبح خبر سنی کہ ولی عہد مرزا قویاش، جو جنگ میں بیلی پلٹن کے کرنل تھے، علی الصبح مقبرے کے مشرقی دروازے سے جو دریائے جمنا کے رخ تھا، گھوڑے پر سوار وہاں سے نکل گئے ہیں۔

مرزا قویاش کا ایک لڑکا مرزا یاور جس کی عمر اس وقت اٹھارہ اُنیس برس کے درمیان تھی اور دو لڑکیاں سلطان بانو اور ناز بانو سب وہیں تھے۔ بادشاہ کی گرفتاری اور نظر بندی کے بعد انہیں اپنی گرفتاری کا خطرہ تھا اس لیے منہ اندھیرے ہی مقبرے سے نکل کر جنگل کی طرف ہو لیے۔ فرنگی کے ڈر سے مغل شہزادے چھپتے پھر رہے تھے۔ میں کچھ دلگیر ہو گئی تھی۔ ماموں مرزا کہنے لگے۔

''لالہ رخ! مقبرۂ ہمایوں تو ایک پنجرہ ہے۔ اچھا ہوا وہ اس پنجرے کو چھوڑ گئے۔ قسمت اچھی ہو گی تو کسی محفوظ مقام پر پہنچ جائیں گے ورنہ زندگی[1] کا تو یہاں بھی رتی بھر بھروسہ نہیں۔''

مرزا قویاش میرے چچا تھے اور مجھے عزیز رکھتے تھے۔ ان کا اس طرح بے سر و سامانی کی حالت میں تنہا نکل

1۔ بادشاہ کی گرفتاری کے دوسرے روز سویرے ہی مرزا قویاش مقبرۂ ہمایوں سے نکل گئے تھے۔ بعد ازاں کچھ پتہ نہ چلا کہ ان پر کیا گزری۔ کسی فرنگی کا نشانہ بنے یا کسی درندے کا لقمہ؟ (مصنف)

پر کھیل جانے کا حوصلہ رکھتی ہوں۔ ماموں اورنگ مرزا کے روزنامچے نے یہ حقیقت مجھ پر واضح کر دی تھی کہ فرنگی ہندوستان پر غلبہ واختیار حاصل کرنے، ہندوستانی ریاستوں کو اپنا محکوم بنانے اور مغل بادشاہوں سے ان کا مرتبہ چھیننے کی خاطر سالہا سال سے بڑی گھناؤنی سازشیں کر رہے تھے۔ کلائیو اور وان ہیسٹنگز کے جانشینوں نے کلکتہ سے نکل کر ہندوستان کے متعدد علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ وہ مغلوں کے ادبار پر اپنے اقبال کی عمارت تعمیر کر رہے تھے اور ہندوستان کو لوٹ کا مال سمجھ رہے تھے۔

میں اکثر سوچتی اور کبھی کبھی بیداری میں خواب کی سی کیفیت سے گزرتی تھی کہ کاش مجھے کوئی ایسی طاقت مل جائے، کوئی ایسی ترکیب اور توانائی میسر آ جائے جس سے میں مغلوں کو برباد کرنے والی لہر کو آگے بڑھنے سے روک دوں اور فرنگی کو ہندوستان کی سرزمین سے نکال باہر کر دوں۔ جس طرح صفدر پیا کی محبت میرا نصیب بن گئی تھی اسی طرح فرنگی کو ہندوستان سے نکالنے کا خواب بھی میری عمر کے ساتھ ساتھ جوان ہوا تھا۔ مگر اس خواب کی بھیانک تعبیر دہلی کی شکست و بربادی، لال قلعے سے دست برداری اور بادشاہ کی گرفتاری کے روپ میں سامنے آئی تھی جس نے ہم سب کو مایوسی کے اندھیروں میں پھینک دیا تھا۔ مگر صفدر پیا کی زبانی ان کے پراسرار ملاقاتی کا حال سن کر ان اندھیروں میں امید کی ایک نئی کرن تھرتھرانے لگی اور خیال آیا کہ ابھی میرے خواب کی تعبیر کا کچھ حصہ باقی ہے۔

رات بھر کی جاگی اور تھکی ماندی مغلانی ایک گرم شال اوڑھ کر لیٹ گئی اور سو گئی تھی۔ کہتے ہیں نیند سُولی پر بھی آ جاتی ہے۔ مقبرے میں آتے ہی اگرچہ ہم نے کچھ آرام کر لیا تھا لیکن نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ مہرو اور عنبری بھی کونے میں دبکی اونگھ رہی تھیں۔ میں صفدر پیا کے ساتھ سرگوشیوں میں مصروف تھی۔ یہ خیال ذہن میں حیرت کے جھماکے سے پیدا کر رہا تھا کہ ان کی محبت کی طرح شاید مجھے میرے خواب کی تعبیر بھی مل جائے۔

انہی باتوں میں وقت گزرنے کا پتہ نہ چلا۔ باہر شام کا جھٹپٹا لگ رہا تھا کہ ماموں مرزا حجرے میں لوٹ آئے۔ انہوں نے آتے ہی یہ الم ناک خبر سنائی کہ میجر ہڈسن بادشاہ، زینت محل اور جواں بخت کی پالکیوں کو لاہوری دروازے سے شہر کے اندر لے گیا۔ آگے پیچھے مسلح فرنگی سوار اُن کی گرفتاری کا اشتہار بنے چل رہے تھے۔ میجر ہڈسن دہلی والوں کو جو وہاں رہ گئے تھے، یہ دکھا رہا تھا کہ اس نے مغل بادشاہ کو ان کی چہیتی ملکہ اور لاڈلے بیٹے سمیت گرفتار کر لیا ہے اور دہلی سے مغلیہ حکومت کا خاتمہ ہو گیا ہے۔

شاہی پالکیوں کو چاندنی چوک بازار تک پھرایا گیا اور لوگوں کو بادشاہ کی گرفتاری کا تماشا دکھایا گیا یا اسیری کی اچھی طرح نمائش کی گئی۔ پھر فرنگی سواروں کے پہرے میں پالکیاں لال قلعے کی طرف چلی گئیں۔ قلعے کے اندر پالکیاں دیوانِ عام کے سامنے عین اس جگہ پر ٹھہرائی گئیں جہاں کچھ عرصہ قبل باغیوں نے کچھ انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا تھا۔ بادشاہ نے اگرچہ باغیوں کو عورتوں اور بچوں کے قتل سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے شاہی حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا اور اب فرنگی بادشاہ کو ان کی بیگم اور بیٹے سمیت دیوانِ عام کے سامنے اس لیے لے گئے تھے کہ انہیں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل کا منظر نہ صرف یاد دلایا جائے بلکہ اس قتل کا ذمے دار ٹھہرایا جائے۔

لال قلعے میں پھرانے کے بعد جس پر انگریزوں کا قبضہ ہو چکا تھا، پالکیاں کڑے پہرے میں لال کنویں کی

''صفدر مرزا! قصہ تو کل[1] ہی ختم ہو گیا تھا، جب بادشاہ نے اپنی گرفتاری دے دی تھی۔ یہ تو اس کا تتمہ ہے۔''
''کیا آپ مرزا الٰہی بخش سے ملے ہیں؟''
''نہیں۔'' ماموں مرزا نے جواب دیا۔ ''اگر میں اس سے ملتا تو وہ ضرور سمجھ جاتا کہ آپ بھی میرے ساتھ ہوں گے۔ پہلے ہی مرزا قوباش اور مرزا مدو کے بارے میں پریشان ہو رہا ہے کہ دونوں یہاں سے چلے گئے ہیں۔ مجھے دیکھ لیتا تو اسے آپ کی فکر بھی لاحق ہو جاتی۔''
ابھی یہ گفتگو ہو رہی تھی کہ مرزا الٰہی بخش مغل شہزادوں مرزا ظہیر الدین مغل، مرزا ابو بکر اور مرزا خضر سلطان کے ہمراہ مغربی دروازے کی طرف جاتا نظر آیا۔ ہم اپنے حجرے کے دروازے میں کھسک آئے۔ جہاں سے مغربی دروازہ بخوبی دکھائی دیتا تھا۔ کل یہیں سے ہم نے پالکیوں کو روانہ ہوتے دیکھا تھا۔ شہزادوں کی سواری کے لیے رتھ منگوایا گیا تھا۔
تینوں شہزادے رتھ میں بیٹھے۔ منشی رجب علی چار مسلح سواروں کی نگرانی میں انہیں لے کر اس کھنڈر کی طرف روانہ ہو گیا جہاں لیفٹیننٹ میکڈانلڈ ایک سو فرنگی سواروں کے ساتھ ان کا منتظر تھا۔ ان سواروں میں رسالدار مان سنگھ کی ماتحتی میں کچھ دیسی سوار بھی تھے۔ میجر ہڈسن کچھ دیر کے لیے وہیں رک گیا تھا۔ اس نے مرزا الٰہی بخش سے کہہ کر شاہی سپاہ کے کمان دار کو بلایا تھا کہ باغی سپاہیوں سے ہتھیار لے لیے جائیں۔ دہلی میں مارشل لاء نافذ ہو چکا تھا اور لوگوں سے ہتھیار لیے جا رہے تھے۔ میجر ہڈسن مقبرہ ہمایوں میں مقیم سپاہیوں کو بھی بے ہتھیار کر دینا چاہتا تھا لیکن ابھی کمان دار نہیں آیا تھا کہ مرزا ابو بکر کا بیٹا مرزا سہراب جسے ابھی ابھی معلوم ہوا تھا کہ اس کا باپ گرفتار کر لیا گیا ہے، تلوار کھینچے دروازے میں نمودار ہوا اور میجر ہڈسن سے مخاطب ہو کر چلّایا۔
''تم ہمارے والد کو گرفتار نہیں کر سکتے۔''
وہ غصے اور جوش میں تلوار تول کر آگے بڑھا کہ اس اثنا میں ایک فرنگی سوار نے اس پر بندوق داغ دی۔ نوجوان شہزادہ ایک ہی گولی کھا کر گرا اور تڑپ کر ٹھنڈا ہو گیا۔ اسیر شہزادوں کا رتھ دور جا چکا تھا۔ مرزا ابو بکر نے گولی چلنے کی آواز سنی ہو گی نہ اپنے بیٹے کے مرنے کا منظر دیکھا ہو گا۔ لیکن مقبرۂ ہمایوں میں بندوق کا دھماکہ سب نے سنا اور یہ دیکھ کر کہ بادشاہ کا نوجوان پوتا مارا گیا ہے، وہاں ایک کہرام بپا ہو گیا۔
محافظ سپاہ کا کمان دار آ گیا۔ میجر ہڈسن نے اسے حکم دیا کہ تمام سپاہیوں سے ہتھیار اکٹھے کر کے آج شام تک تھانے میں جمع کرا دیئے جائیں۔ پھر اُس نے گھوڑے کی باگ موڑی اور اپنے دو سواروں کے ہمراہ لوٹ گیا۔ مرزا الٰہی بخش بھی گھوڑے پر سوار اس کے پیچھے ہو لیا اور خون میں لت پت مرزا سہراب کی لاش دروازے پر پڑی

---

[1] مولانا حق خیر آبادی نے جو خود بھی غدر کے بعد گرفتار ہوئے اور کالے پانی کی سزا میں انڈیمان بھیجے گئے تھے، اپنی تصنیف ''الثورۃ الہندیہ'' (بغاوتِ ہند) میں لکھا ہے کہ مقبرۂ ہمایوں سے بادشاہ اپنے بیٹوں اور پوتوں سمیت گرفتار ہوا اور پابہ زنجیر شہر بھیجا گیا۔ ''خدنگ غدر'' کے مصنف کا بھی یہی خیال ہے کہ بادشاہ اور شہزادوں کی گرفتاری ایک ساتھ عمل میں آئی تھی اور ہڈسن انہیں مقبرے سے سیدھا قلعے میں لے گیا تھا مگر گرفتاری کا جو حال ہماری داستان میں بیان کیا جا رہا ہے وہ صحیح ہے۔ بادشاہ ایک دن پہلے اور شہزادے دوسرے دن گرفتار کیے گئے تھے۔ (قمر اجنالوی)

جانا اچھا نہ لگا۔ سنا ہے جب گھوڑے پر سوار مقبرے سے نکلے تو خاک بستر تھے اور اپنی اولاد کی جدائی کا غم پانی بن کر آنکھوں میں تیر رہا تھا۔

ابھی ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تھے جو ناشتہ بھی تھا اور دوپہر کا کھانا بھی، کہ میجر ہڈسن مرزا الٰہی بخش اور منشی رجب علی کے ساتھ جو دہلی میں انگریز کے دیسی جاسوسوں اور مخبروں کا سربراہ تھا، مقبرے کے مغربی دروازے پر نمودار ہوا۔ عقب میں چند فرنگی سوار تھے، جنہوں نے بندوقیں تان رکھی تھیں۔ میجر ہڈسن کو دروازے پر چھوڑ کر مرزا الٰہی بخش دروازے میں داخل ہوا اور وہ کھیل شروع ہو گیا جس کے متعلق ماموں مرزا نے اپنے اندیشوں کا ذکر کیا تھا۔ مرزا الٰہی بخش کو اس حجرے کی طرف جاتا دیکھ کر جہاں مرزا ظہیرالدین مغل مقیم تھے، ماموں مرزا بھی چپکے سے باہر نکل گئے۔ مقبرے میں جو سپاہ موجود تھی، اسے پتہ چل گیا تھا کہ میجر ہڈسن ایک سو مسلح سوار لے کر آیا ہے جو کل کی طرح آج بھی مغربی کھنڈر اور جھاڑیوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ ایک سپاہی نے انہیں دیکھ لیا تھا اور اپنے کرنل کو اطلاع دے دی تھی۔ مگر وہ شاہی فوج کے کمانڈر انچیف مرزا ظہیرالدین مغل کی مرضی کے بغیر کچھ نہ کر سکتا تھا اور مرزا الٰہی بخش انہی سے ملنے گیا تھا۔

مقبرے میں ہر شخص کو پتہ چل گیا تھا کہ میجر ہڈسن، مغل شہزادوں کو گرفتار کرنے آیا ہے۔ ادھر مرزا مغل اور مرزا الٰہی بخش کے درمیان بات چیت ہو رہی تھی اور کیا بات چیت ہو رہی تھی، اس کے بارے میں کسی کو علم نہ تھا۔ ماموں مرزا کو گئے کافی دیر ہو گئی اور ہم سب پریشان تھے کہ کہیں وہ بھی اس گفتگو میں شریک نہ ہوں۔ کافی انتظار کے بعد وہ واپس آ گئے۔ ہم لوگ ان کے چہرے ہی سے بھانپ گئے کہ معاملہ بڑا بے ڈھب ہے۔ وہ خود ہی بتانے لگے۔

''میجر ہڈسن مغل شہزادوں کو گرفتار کرنے اور مرزا الٰہی بخش اُس کی زبان بن کر آیا ہے۔ اس نے آتے ہی مرزا مغل سے کہا کہ وہ اپنی گرفتاری پیش کریں۔ بادشاہ کے بعد اب ان کے بیٹے سرکار انگلشیہ کو مطلوب ہیں۔ مرزا مغل نے مرزا ابوبکر اور مرزا خضر سلطان کو وہیں بلا لیا۔ مرشد زادوں نے مطالبہ کیا کہ پہلے زندگی کی ضمانت دی جائے۔ لیکن مرزا الٰہی بخش نے جواب دیا کہ میجر ہڈسن غیر مشروط گرفتاری چاہتا ہے۔ جس پر تینوں شہزادوں نے باہم صلاح مشورہ کیا اور کہا۔

''تیموری خاندان کے لوگ اس طرح گرفتار نہیں ہوا کرتے۔ وہ تلواریں اُٹھاتے اور لڑتے ہیں۔ لڑائی میں دشمن کو مار گراتے یا خود مر جاتے ہیں۔ جب اورنگ زیب کے جلاد دارا شکوہ کو قتل کرنے قید خانے میں پہنچے تھے، اس نے ترکاری چھیلنے والی چھری سے ان پر حملہ کر دیا اور کچھ دیر جلادوں سے مقابلہ کرتا رہا تھا۔ ہم بھی لڑیں گے۔ ہمیں مرنا تو ہے۔ پھر کیوں نہ بہادری کی موت مریں۔''

یہ سن کر میں دنگ رہ گئی اور صفدر پیا نے کہا۔ ''اگر مرشد زادے لڑنے پر تیار ہو گئے ہیں تو یہاں تین ہزار سپاہی موجود ہیں جو ان کے ساتھ لڑیں گے۔''

''وہ تو لڑنے پر تیار ہو گئے تھے لیکن مرزا الٰہی بخش نے کچھ ایسے سبز باغ دکھائے اور کچھ ایسی چکنی چپڑی باتیں کیں کہ وہ لڑائی سے دستبردار ہو گئے اور گرفتاری دینے پر تیار ہو گئے ہیں۔''

''تو قصہ ختم ہوا؟''

کلیجہ ٹھنڈا نہ ہوا۔ وہ گھوڑے سے اُترا۔ مغل شہزادوں کے بہتے خون سے باری باری چلو بھرا اور پی لیا[1] یہ منظر اس قدر وحشیانہ اور غیر انسانی تھا کہ دیکھنے والے کانپ گئے۔ لوگ یہ بات سوچنے سمجھنے سے قاصر تھے کہ ایک انسان، دوسرے انسان کا خون پی کر ایسی درندگی کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے اس وحشت گردی پر شور مچایا، کچھ روئے چلاّئے لیکن میجر ہڈسن نے جواب دیا۔

''شہزادوں کی جاں بخشی کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا۔ انہوں نے سرکار انگلشیہ کے خلاف بغاوت کی، انگریزوں کو قتل کیا اور خود بھی مارے گئے۔''

نہتے لوگ کیا کر سکتے تھے۔ جسموں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ دلوں میں آگ بھڑک اُٹھی مگر اس آگ میں خود ہی جلنا اور خود ہی مرنا تھا۔ اگر دھاوا کرتے تو فرنگی سوار انہیں گولیوں سے چھلنی کر دیتے۔ رسالدار مان سنگھ نے لوگوں کو منتشر ہو جانے کی تاکید کی اور وہ دلوں پر غم واندوہ کا بوجھ لیے اِدھر اُدھر بکھرنے لگے۔ پھر تینوں لاشیں اُٹھا کر رتھ میں لادی گئیں اور رتھ مسلح سواروں کے درمیان شہر کی جانب چل پڑا۔

مغربی فصیل کے لاہوری دروازے سے رتھ شہر میں داخل ہوا اور کوتوالی کی طرف جانے والی سیدھی سڑک پر مشرق کو ہو لیا۔ کوتوالی وسط شہر میں واقع ہے۔ جب شہزادوں کی لاشیں وہاں پہنچیں تو انہیں کوتوالی کے باہر سرِعام لٹکا دیا گیا تاکہ لوگ مغلوں کی تباہی و بربادی کا آخری منظر دیکھ لیں۔ دہلی میں مارشل لاء لگا ہوا تھا۔ اِکا دُکا آدمی جنہوں نے ضروری کام سرانجام دینے کے لیے ''پاس'' حاصل کر لیے تھے، کوتوالی سے گزرتے اور یہ وحشیانہ منظر دیکھتے تھے۔ لیکن پورے شہر میں شہزادوں کے قتل اور پھانسیوں پر لٹکائے جانے کی خبر پھیل گئی۔ کوتوالی کے اردگرد رہنے والے لوگوں نے اپنے گھروں کی چھتوں سے، کھڑکیوں سے، روشندانوں سے اس درندگی کا نظارہ کیا اور دل تھام کے رہ گئے۔

یہ تھی مغل شہزادوں کے ہولناک انجام کی خبر جو مقبرۂ ہمایوں میں پہنچی اور جسے سنتے ہی نالہ و شیون کی ایسی

---

1 مولوی ذکاء اللہ نے ''تاریخ ہندوستان'' میں اس واقعے کو غلط بیان کیا ہے جو دہلی میں مشہور ہو گیا تھا کہ شہزادے بادشاہ کے ساتھ آئے تھے۔ جیل خانے کے قریب ہڈسن نے انہیں مار ڈالا اور ان کا خون پیا۔ شہزادوں کے بادشاہ کے ساتھ آنے والی بات تو واقعی درست نہیں لیکن میجر ہڈسن نے شہزادوں کو قتل کر کے جس درندگی کا مظاہرہ کیا اس کا ثبوت موجود ہے۔ خود مرزا الٰہی بخش کے ایک مصاحب کے بقول ہڈسن نے ایک ایک چلّو خون پیا اور کہا تھا۔ ''اگر میں ایسا نہ کرتا تو پاگل ہو جاتا''...... جنرل سر گیوف گاف نے جو محاصرۂ دہلی میں انگریزی فوج کے کمانڈنگ آفیسر تھے، اپنی تصنیف "Old Memories" (پرانی یادداشتیں) میں لکھا ہے کہ اس واقعے کا چشم دید گواہ لیفٹیننٹ میکڈانلڈ تھا جس نے مجھے یہ پوری روداد سنائی۔ اسے افسوس تھا کہ ہڈسن نے اپنے ہاتھ خون میں کیوں بھرے۔ رسالدار مان سنگھ نے بھی جو شہزادوں کی گرفتاری اور قتل کے وقت ساتھ تھا، اس واقعے کی تصدیق کی۔ کوپر جو ان ایام میں امرتسر کا ڈپٹی کمشنر تھا اور جس نے ہڈسن کی بربریت پر اسے مبارکباد دی تھی ''دی کرائسز اِن دی پنجاب'' میں لکھتا ہے کہ کسی توقف کے بغیر تشدد کی انتہائی کارروائی ہی ایک ایسا طریقہ ہے جس سے اس نیم وحشی ملک پر رعب و دبدبہ قائم ہو سکتا تھا۔ مگر متعدد انگریز مصنف ایسے بھی ہیں جنہوں نے ہڈسن کی درندگی پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔

رہ گئی۔

یہ سب کچھ آناً فاناً ہو گیا تھا۔ کچھ عورتیں روتی ہوئی لاش کے گرد جمع ہو گئیں۔ ان میں مرزا قوباش کی صاحب زادی سلطان بانو بھی تھی جس کی نسبت مرزا سہراب سے ہو چکی تھی۔ شہزادی نے اپنے ہونے والے دولہا کی خون میں لتھڑی ہوئی لاش دیکھی تو مارے صدمے کے گم صم ہو گئی۔ بیاہ سے پہلے ہی اس کا سہاگ اُجڑ گیا تھا۔ فرنگی سوار نے سہراب مرزا پر جس بے رحمی سے گولی چلائی اور اسے موت کے منہ میں دھکیل دیا، اسے دیکھ کر میرا اپنا کلیجہ دہل گیا تھا۔ بے چاری سلطان بانو کے دل پر کیا بیت گئی ہو گی؟ اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

میرا جی چاہتا تھا بھاگ کر جاؤں اور غم زدہ سلطان بانو کو تھام لوں جو شادی سے پہلے ہی بیوہ ہو گئی تھی۔ لیکن ماموں مرزا کے حکم کے مطابق نہ میں اور نہ صفدر پیا حجرے سے نکل سکتے تھے۔ البتہ وہ خود باہر نکل گئے۔ سہراب مرزا کی لاش دوازے سے اٹھا کر اندر لائی جا رہی تھی۔ مقبرۂ ہمایوں میں مقیم ہر عورت، ہر مرد کا دل اس واقعے سے دو نیم ہو گیا تھا کیونکہ جنگ ہارنے والی قوم سے خوشیاں چھین لی جاتیں اور صدمے اس کی جھولی میں ڈال دیئے جاتے ہیں۔

❁......❁......❁

مغلوں کے نصیب میں اب صرف صدمے اور غم ہی رہ گئے تھے۔ ایک مصیبت کے بعد دوسری مصیبت تھی۔ ایک غم کے بعد دوسرا غم تھا۔ 19 ستمبر کو قلعہ خالی کیا گیا۔ 20 ستمبر کو بادشاہ کی گرفتاری اور نظر بندی عمل میں آئی۔ 21 ستمبر کو شہزادے گرفتار ہوئے اور سہراب مرزا پر گولی چلی۔ ہر دن منحوس اور ہر تاریخ صدموں سے چُور تھی۔ لیکن ابھی مرزا ابوبکر کے بیٹے کی تجہیز و تکفین کا بندوبست ہو رہا تھا کہ اسیر شہزادوں کے بارے میں ایسی خبر آئی جس نے مقبرہ ہمایوں کی دیواروں اور ان دیواروں کے اندر گھرے ہوئے مردوں عورتوں پر زلزلہ طاری کر دیا۔

دو آدمی جو شہر کی جانب سے بھاگے آتے تھے، آگے پیچھے مغربی دروازے میں داخل ہوئے۔ انہوں نے کانپتی آواز میں رندھے ہوئے لہجے میں بتایا کہ تینوں شہزادے قتل کر دیئے گئے ہیں۔ سننے والوں پر ایک سکتہ سا طاری گزر گیا۔ لوگ دم بخود رہ گئے اور آنے والوں میں سے ایک اس قیامت کی روداد بیان کرنے لگا جو مغل شہزادوں پر ناگہاں ٹوٹ پڑی تھی۔

ہوا یہ تھا کہ ایک سو فرنگی سواروں کے گھیرے میں شہزادوں کا رتھ شہر کی طرف جا رہا تھا۔ اور ابھی فصیلِ شہر سے ایک میل دور تھا کہ ادھر سے لوگوں کا ایک ہجوم آتا دکھائی دیا۔ شاید وہ لوگ بلوہ کر کے بدنصیب شہزادوں کو چھڑانے آئے تھے یا ان کی گرفتاری پر صرف احتجاج کر رہے تھے۔ اس عرصے میں میجر ہڈسن بھی وہاں پہنچ گیا تھا۔ اس نے تینوں شہزادوں کو رتھ سے اُترنے کا حکم دیا۔ حیران و پریشان شہزادے نیچے اُتر آئے تو ہڈسن نے دوسرا حکم دیا کہ وہ اپنے کپڑے اُتار دیں۔ یہ حکم توہین آمیز تھا لیکن مجبور اور بے بس شہزادے حکم کے پابند تھے۔ زیردست کو بالادست کی ہر بات ماننا پڑتی ہے۔ تینوں نے اوپر کے کپڑے اتار دیئے۔ اسی لمحے میجر ہڈسن نے ایک فرنگی سوار سے قرابین (چوڑے منہ کی چھوٹی بندوق) جھپٹ لی اور پہلے مرزا ظہیر الدین مغل، پھر مرزا ابوبکر، پھر مرزا خضر سلطان پر گولیاں چلائیں۔ تینوں شہزادے یکے بعد دیگرے گرے اور خون میں لت پت تڑپ کر دم توڑ گئے۔

میجر ہڈسن نے پل کے پل میں تین مغل شہزادوں کو ہلاک کر دیا لیکن انہیں قتل کر کے بھی گورے بھیڑیے کا

(5)

نئے اسرار

اے ارضِ دہلی کے مسافر!

میرے وقائع نویس مہمان!

شہزادوں کی گرفتاری اور ہلاکت کا جگر خراج سانحہ 21 ستمبر کو دن کے وقت پیش آیا اور میں تجھے بتا چکی ہوں کہ اسی دن کی شام کو صفدر پیا کا اپنے پراسرار ملاقاتی سے ملنا طے تھا اور وہ یہ موقع کھونا نہیں چاہتے تھے۔ مگر حالات نے آناً فاناً جو خطرناک صورت اختیار کر لی وہ بڑی سنگین تھی۔ فرنگی کے جاسوسوں کو ان مغلوں اور دیگر اہم اشخاص کی فہرست مہیا کر دی گئی تھی جو سرکار انگلشیہ کو قتل، پھانسی یا عمر قید کے لیے مطلوب تھے۔ ماموں اورنگ مرزا کو یقین تھا کہ اس فہرست میں صفدر مرزا کا نام بھی ضرور ہوگا اور جیسا ہمیں بعد ازاں معلوم ہوا، ان کا نام فہرست میں موجود بلکہ سرفہرست تھا۔ ماموں مرزا کسی حالت میں کسی قیمت پر انہیں فرنگی کے حوالے کرنے پر تیار نہ تھے۔ اس حوالگی کا انجام ہم سب کو معلوم تھا۔ اسی لیے انہوں نے مقبرہ ہمایوں میں کسی کو ان کی موجودگی کا علم نہیں ہونے دیا۔ 20 ستمبر کی صبح ہی سے جب ہم مقبرے میں آئے، وہ حجرے میں بند ہو کر رہ گئے تھے۔ صرف مرشد زادے ان کے بارے میں جانتے تھے اور وہ خود مقبرے کو چھوڑ گئے یا دنیا سے سدھار گئے تھے۔

تیسرے پہر جب ہر شخص بڑا اُداس، غمگین اور کھویا کھویا بلکہ اپنے آپ سے بھی بچھڑا بچھڑا دکھائی دیتا تھا، مرزا الٰہی بخش کا ایک خاص مصاحب مقبرۂ ہمایوں میں داخل ہوا اور وئے اتفاق سے اس کی مڈبھیڑ ماموں اورنگ مرزا سے ہوگئی۔ وہ انہیں جانتا تھا۔ ملتے ہی پوچھنے لگا۔

''صفدر مرزا تو خیریت سے ہیں؟''

ماموں مرزا سمجھ گئے کہ اس نے یہ سوال کیوں کیا ہے، فوراً پریشان ہو گئے اور بے چینی سے بولے۔ ''میاں صاحب زادے! ان کا تو پرسوں سے کوئی اتا پتہ ہی نہیں مل رہا۔ نہ جانے کہاں چلے گئے؟ درگاہ نظام الدین اولیاؒ سے بھی معلوم کرایا مگر وہاں بھی نہیں ہیں۔ مار دھاڑ اور پکڑ دھکڑ کا زمانہ ہے۔ مجھے تو دھڑکا لگ رہا ہے، ہیں پکڑے یا مارے نہ گئے ہوں۔''

مصاحب نے بے پروائی سے کہا۔ '' پکڑے تو نہیں گئے، البتہ سنا ہے سرکار کو ان کی تلاش ہے اور میں نے

کرب ناک آوازیں بلند ہوئیں کہ اس تاریخی مقبرے کے در و دیوار کانپ اُٹھے۔ ہر شخص پر موت کا سایہ منڈلانے لگا۔ سنا گیا کہ فرنگی کو بادشاہ کے بیٹوں، پوتوں اور نواسوں کے علاوہ اور بھی بہت سے مغل اور باغی مطلوب ہیں، جنہوں نے انگریز کے خلاف بغاوت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا۔ ان کے ناموں کی ایک طویل فہرست منشی رجب علی کے مخبروں میں بانٹ دی گئی تھی تاکہ وہ ان کی تلاش میں سرگرم ہو جائیں اور کھوج لگائیں کہ کون کہاں چھپا ہوا ہے۔ مرزا الٰہی بخش اور اس کے مصاحب بھی اسی کام میں مصروف تھے۔

اب اس امر میں کوئی شک و شبہ نہیں رہ گیا تھا کہ انگریز مغلوں کو ہندوستان سے نیست و نابود کرنا چاہتا ہے تاکہ مغلیہ سلطنت کی وراثت کا دعویٰ کرنے والا کوئی فرد زندہ نہ رہے۔ ماموں مرزا نے جن بدترین اندیشوں کا اظہار کیا تھا وہ ناگہاں ظہور میں آ گئے تھے اور تیموری گھرانے کے افراد کی وسیع پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی تھی۔ ادھر مغل شہزادوں کی وحشیانہ ہلاکت اور کوتوالی کے باہر ان کی لاشوں کو پھانسیوں پر لٹکانے کا انتہائی الم ناک واقعہ سن کر مقبرۂ ہمایوں کے پناہ گزیں خود کو زندہ درگور سمجھنے لگے۔ محافظ سپاہیوں نے ہتھیار جمع کرا دیئے تھے اور اب ہر کسی کو اپنی جان کے لالے پڑے تھے۔

❁……❁……❁

بدل جائے۔"

عنبری باہر سے تھوڑی سی مٹی اٹھا لائی جو ان کے چہرے، ہاتھوں، بازوؤں پاؤں پر مل دی جس سے ان کا حلیہ بدل گیا۔ انہوں نے ایک ولایتی طمنچہ کُرتے کے نیچے صدری کی جیب میں ڈالا اور سر کے پٹکے سے نصف چہرہ ڈھانپ کر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اس لباس اور اس حلیے میں انہیں پہچاننا مشکل تھا مگر ان سے پہلے ماموں مرزا دروازے کی طرف بڑھے۔ انہوں نے بھی اپنا ولایتی طمنچہ جیب میں رکھ لیا تھا۔ وہ یہ کہہ کر نکل گئے۔

"صفدر مرزا! اس وقت آپ کا نام نتو گھوسی ہے۔ آپ گھوڑے کے لیے گھاس کاٹنے باہر جا رہے ہیں کیونکہ چارہ ختم ہو گیا اور گھوڑا بھوکا ہے۔ میں مغربی دروازے تک پہنچ جاؤں تو آپ حجرے سے چل دیجئے۔"

سورج غروب ہو گیا اور شام کا جھٹپٹا لگ رہا تھا جب صفدر پیا ایک گھسیارے کے روپ میں باہر نکلے اور مغربی دروازے کی جانب ہو لیے۔ میں اور عنبری دروازے کی اوٹ سے انہیں جاتے دیکھتی رہیں۔ ماموں مرزا ان سے پہلے ہی مغربی دروازے کی ڈیوڑھی میں پہنچ چکے تھے اور چوکیدار کے ساتھ باتیں کرنے لگے تھے۔ تھوڑی دیر میں صفدر پیا بھی وہاں پہنچ گئے۔ چوکیدار نے انہیں روکا۔ حالات کے پیش نظر حکم تھا کہ شام کے بعد کوئی شخص مقبرے سے باہر نہ نکلے گا مگر نہ جانے ماموں مرزا نے چوکیدار سے کیا کہا کہ اس نے دروازہ کھول دیا اور صفدر پیا دروازے سے نکل گئے۔ مگر ماموں مرزا، چوکیدار کے ساتھ ڈیوڑھی ہی میں بیٹھے رہے۔

غالباً اسی شام نیا چاند طلوع ہوا تھا جو جلد غروب ہو گیا اور رات کا اندھیرا گہرا ہوتا چلا گیا۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا، میری بے چینی بڑھ رہی تھی۔ میرے ساتھ مغلانی، مہرو اور عنبری بھی فکر مند تھیں۔ مہرو لنگر خانے سے رات کا کھانا لے آئی تھی لیکن کسی نے کھانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا۔ دو اڑھائی گھنٹے کے طویل اور صبر آزما انتظار کے بعد ان دونوں کو آگے پیچھے آتے دیکھا تو جان میں جان آئی۔ اب کے صفدر پیا جن کے سر پر گھاس کی ایک گٹھڑی تھی، پہلے حجرے میں داخل ہوئے اور ماموں مرزا ان کے چند منٹ بعد آئے۔

صفدر پیا اپنے پُراسرار ملاقاتی سے مل آئے تھے۔ ملاقات بہت ہی حیرت انگیز، بڑی انوکھی، بے حد عجیب و غریب اور بڑے اسرار میں لپٹی ہوئی تھی۔ مقامِ ملاقات وہی کھنڈر تھا جہاں 20 اور 21 ستمبر کو میجر ہڈسن نے اپنے مسلح سوار ٹھہرائے تھے جب وہ بادشاہ اور مغل شہزادوں کو گرفتار کرنے آیا تھا۔ وہ کھنڈر مقبرۂ ہمایوں سے مغرب کی جانب کچھ فاصلے پر تب بھی جھاڑیوں اور سرکنڈوں میں گھرا ہوا تھا اور اب بھی وہاں جھاڑ جھنکاڑ موجود ہے جس میں پہلے کی بہ نسبت کچھ اضافہ ہو چکا ہے۔

دہلی کے اردگرد اٹھارہ اٹھارہ بیس بیس میل تک قدیم کھنڈروں، ویرانوں اور ملبوں کے جو ڈھیر بکھرے ہوئے ہیں وہ مقبرۂ ہمایوں کے آس پاس بھی موجود ہیں اور صفدر پیا اس سڑک کو چھوڑ کر جو سیدھی شہر کی طرف چلی گئی ہے، ناہموار زمین پر جھاڑیوں کی اوٹ میں چلتے اس کھنڈر تک پہنچے۔ باہر شام کا ملگجا افسردہ اندھیرا ہولے ہولے گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ اس اندھیرے کی چادر میں لپٹے جب وہ کھنڈر میں داخل ہوئے، ان کا ملاقاتی پہلے سے وہاں موجود تھا جس نے آنے والے گھوسی کو پہچان لیا اور بولا۔

"صفدر مرزا! مجھے اندیشہ تھا شاید آج آپ ملاقات کے لیے نہ آ سکیں مگر آپ نے میرے اندیشے کو باطل ثابت کر دیا۔"

اسی لیے پوچھا تھا کہ اگر آپ جانتے ہوں تو فوراً انہیں کہیں اِدھر اُدھر کر دیں۔ لیکن آپ تو خود ان کے لیے پریشان نظر آتے ہیں۔''

''پریشان اس لیے ہوں کہ کسی نے انہیں دیکھا ہی نہیں۔ نہ وہ مقبرۂ ہمایوں میں آئے نہ درگاہ میں گئے۔''

مغلیہ خاندان کے بہت سے افراد درگاہ نظام الدین اولیاؒ میں چلے گئے تھے۔ اور بھی بہت سے لوگ وہاں پناہ گزین تھے۔ مصاحب تشویش کے لہجے میں بولا۔ ''پھر تو شاید غازی نگر چلے گئے ہوں۔ بہت سے لوگ اسی طرف گئے ہیں مگر آج کل کوئی راستہ محفوظ نہیں۔''

''میاں! ہو سکے تو مرزا الٰہی بخش سے پوچھنا۔ ممکن ہے وہ صفدر مرزا کے بارے میں کچھ جانتے ہوں۔ اور میری پریشانی کا ذکر بھی کرنا۔''

''اچھا اورنگ مرزا! ان سے پوچھوں گا۔''

یہ کہہ کر مصاحب آگے بڑھ گیا اور ماموں مرزا کچھ دیر اِدھر اُدھر پھرتے رہے۔ جب وہ مقبرے کی عمارت میں چلا گیا تو فوراً اپنے حجرے کی طرف لپکے اور ہمیں آکر صورتِ حال سے آگاہ کیا کہ مخبر مقبرے میں خاص مطلوبہ لوگوں کا اتا پتہ معلوم کرتے پھر رہے ہیں۔

ہم تو پہلے ہی جانتے تھے کہ اب کون سا کھیل شروع ہونے والا ہے۔ بلکہ کھیل شروع ہو چکا تھا۔ مرزا الٰہی بخش کا مصاحب کھلے بندوں آیا تھا۔ نہ جانے رجب علی اور الٰہی بخش کے خفیہ آدمی کہاں کہاں بیٹھے ہوں گے۔ وہاں مزید ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ لیکن جب تک صفدر پیا اپنے ملاقاتی سے مل نہ لیتے، ہم مقبرۂ ہمایوں چھوڑ نہیں سکتے تھے۔ اور اب شام کے جھٹپٹے میں جب دو وقت باہم ملتے ہیں، کسی کا مقبرے سے نکلنا اور مغربی کھنڈر تک جانا بڑا خطرناک کام تھا۔ میں سوچ رہی تھی ماموں اورنگ مرزا، صفدر پیا کو ملاقات ملتوی کر دینے کا مشورہ دیں گے یا خود مغربی کھنڈر تک جائیں گے اور پُراسرار ملاقاتی کو حالات کی سنگینی سے آگاہ کریں گے کیونکہ اگر کسی اہم مقصد کے لیے صفدر مرزا کا انتخاب کر لیا گیا تھا تو سب سے پہلے ان کی زندگی اور سلامتی ضروری تھی۔ انہیں جاسوسوں کی نظروں اور گرفتاری سے بچانا ضروری تھا۔ لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ سورج غروب ہونے سے تھوڑی دیر قبل انہوں نے ایک چھوٹی سی بقچی صفدر پیا کی طرف اچھال دی اور بولے۔

''صفدر مرزا! لباس تبدیل کر لیں۔ آپ کی ملاقات کا وقت ہوا چاہتا ہے۔''

مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ ماموں مرزا ان سے کہیں زیادہ اس ملاقات کے شائق تھے۔ انہوں نے دو روز سے انہیں حجرے میں بند کیے رکھا اور اب خود باہر نکال رہے تھے۔

صفدر پیا نے بقچی کھولی تو اندر سے گھسیارے کے کپڑے برآمد ہوئے۔ ایک میلی کچیلی دھوتی، ویسا ہی ایک کُرتہ، سر پر باندھنے کا ایک پگڑی نما پٹکا، کچے چمڑے کا ایک پھٹا پرانا جوتا اور ایک درانتی۔ وہ یہ سامان اٹھا کر حجرے کے دوسرے حصے میں گئے جسے ایک کپڑا تان کر الگ تھلگ کر دیا گیا تھا۔ تھوڑی دیر میں جب وہ لباس تبدیل کر کے اور ہاتھ میں درانتی لیے نکلے تو بالکل ایک گھوسی جان پڑتے تھے۔ ماموں مرزا نے انہیں غور سے دیکھا۔ سر سے پاؤں تک جائزہ لیا اور کہا۔

''لباس تو ٹھیک ہے صفدر مرزا! لیکن چہرے پر، ہاتھوں پر، پاؤں پر کچھ دھول مٹی ملنا پڑے گی تاکہ رنگت بھی

صفدر پیا نے پہلا سوال کیا۔ ''کل جب ہم حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ میں ملے تھے، آپ نے کسی عظیم مقصد کا ذکر کیا تھا جس کے ساتھ کوئی اہم راز بھی وابستہ ہے۔ سب سے پہلے تو میں اس مقصد کے بارے میں دریافت کرنا چاہتا ہوں۔''

محمد صادق بریلوی نے جو ساٹھ باسٹھ کے پیٹے میں تھا، ذرا تفصیل سے مقصد کی وضاحت کی اور بتایا۔

''ہندوستان کی تاریخ بدل رہی ہے اور دہلی میں مغلوں کی شکست و بربادی کے بعد بالکل ہی بدل جائے گی۔ فرنگی نے اس سرزمین پر جس طرح قدم جمائے ہیں اور جس ہوشیاری سے اپنے ہندوستانی حریفوں کو ایک ایک کر کے ختم کر دیا ہے، اس کا حال آپ سے اوجھل نہیں ہوگا۔ مرہٹے، مغل اور اودھ کے شاہ سرکار انگلشیہ کی شہنشاہیت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ اس نے مرہٹوں کو بکھیر دیا۔ سندھیا شاہی اور ہلکر شاہی کو پامال کیا۔ پیشوا باجی راؤ کو اپنا وظیفہ خوار بنایا۔ ستارہ گوالیار، ناگ پور اور جھانسی کے خلاف من مانی کی۔ نواب واجد علی شاہ کو قید کر کے کلکتہ بھیج دیا۔ بہادر شاہ ظفر کا انجام بھی کچھ مختلف نہیں ہوگا۔ مغل شہزادوں کے وحشیانہ قتل کے بعد انگریز کے ارادے کسی سے پوشیدہ نہیں رہے۔ وہ پورے ہندوستان کو اپنی زنجیروں میں جکڑ لینا چاہتا ہے۔ اس وقت اس کا اوّلین نشانہ مسلمان ہیں لیکن ہندو ریاستیں بھی فرنگی کی غارت گری سے بچ نہیں سکیں گی۔ دہلی کو تباہ و برباد کر کے اس کی فوجیں اودھ، روہیل کھنڈ، ناگ پور، کان پور، جھانسی اور ان ریاستوں کا رخ کریں گی جو انگریز کی غلامی کا جوا پہننے سے انکار کرتی ہیں۔ جن لوگوں نے دہلی کی مغلیہ سلطنت اور مسلمانوں کی تباہی و بربادی میں انگریز کا ساتھ دیا وہ نادان ہیں کیونکہ وہی قیامت جو مسلمانوں پر گزری، ہندوستان کی دوسری قوموں پر بھی گزرنے والی ہے۔

ہم نے فرنگی حاکموں کے خلاف آزادی کی تحریک چلانے کا عزم کیا ہے جو ہندوستان میں ناموسِ آدم کی توہین کے مرتکب ہوئے ہیں۔ اس وقت پورا ملک انگریزوں کی دہشت سے خوف زدہ ہے۔ انہوں نے شہروں کو ویران اور بستیوں کو پیوند زمین کر دیا ہے۔ ان کی بندوقوں اور توپوں کے دہانوں سے موت ٹپکتی ہے۔ سنگینوں اور تلواروں کے پھل زہر سے بھیگے ہوئے ہیں۔ آج ہندوستان کی فضا ان کے خونیں کارناموں سے بوجھل ہو رہی ہے۔ لوگوں پر ہول اور ہراس طاری ہے اور وہ ظلم و تشدد سے سہمے ہوئے ہیں۔ مگر ظلم اور دہشت کے خلاف جدوجہد ضروری ہے۔ ہوسکتا ہے ہم اس جدوجہد کا نتیجہ اپنی زندگی میں دیکھ لیں کیونکہ ہر کام کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے ہماری جدوجہد بڑی کٹھن، خطرناک اور طویل ہو پھر بھی ہم وہ جنگ جاری رکھیں گے اور اگر مر گئے تو اسے ورثے کے طور پر اپنی نئی نسل کو سونپ جائیں گے تاکہ آزادی کی جوت جلتی رہے۔ آپ کو آزادی کی اس جدوجہد کے لیے منتخب کیا گیا ہے اور آج اس ملاقات کا مقصد یہ دریافت کرنا ہے کہ کیا آپ ہماری تحریک آزادی میں شامل ہونے اور ہمارا ساتھ دینے پر تیار ہیں؟''

''مجھے نہ تحریک میں شامل ہونے سے انکار ہے نہ آزادی کی جنگ لڑنے سے۔ یہ جنگ تو میرے خون میں اُتر چکی ہے اور میرا مقدر بن گئی ہے۔''

''پھر آپ کو ایک حلف اٹھانا اور قربانی دینے کا عہد کرنا ہوگا۔''

''میں حلف اٹھانے اور عہد کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر آپ نے تحریک کا مقصد بتایا ہے، ابھی اس راز کے بارے میں کچھ نہیں بتایا جو اس مقصد سے وابستہ ہے۔ اور یہ بات بھی پوری طرح واضح نہیں کہ مغلیہ خاندان سے

پھر ان کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ صفدر پیا ہی کی زبان میں بیان کرتی ہوں۔ انہوں نے ہمیں اپنی بات چیت کی روداد تفصیل سے سنائی تھی اور میرے حافظہ میں آج بھی محفوظ ہے۔ جب ملاقاتی نے اپنے اندیشے کا ذکر کیا تو انہوں نے پوچھا۔ ''آخر آپ کو یہ اندیشہ کیوں ہوا تھا کہ میں نہیں آسکوں گا۔''

''اس لیے کہ یہ مغلوں پر ماتم کی رات ہے۔ میجر ہڈسن نے آج ہی مغل شہزادوں کو قتل کیا اور ان کے لہو سے اپنی پیاس بجھائی ہے۔ ان کی بے جان لاشیں اس وقت کوتوالی کی پھانسیوں پر لٹک رہی ہیں اور یہ اتنا بڑا صدمہ ہے جو مضبوط سے مضبوط آدمی کو بھی نڈھال کر دیتا اور اس سے زندگی کی دلچسپیاں چھین لیتا ہے۔ شاہی خاندان کے مردوں، عورتوں پر تو قیامت بیت گئی ہوگی۔ میں نے سوچا آپ بھی سوگوار اور غمزدہ ہوں گے۔ شاید صدمے کی شدت سے ملاقات کا خیال آپ کے ذہن سے محو ہو جائے۔''

''بے شک مجھے اس وحشیانہ خونریزی کا حال سن کر شدید دکھ ہوا۔ فرنگی نے مغلوں سے تخت و تاج چھیننے تو ان سے زندگی بھی چھین لی مگر جو کچھ ہاتھ سے جا چکا ہے وہ اب واپس نہیں آسکتا۔ نہ آنسو کسی قوم یا خاندان کی تقدیر بدل سکتے ہیں۔ میں اپنے دل میں کسی غم کی قبر نہیں بناتا۔ جو وعدہ کرتا ہوں اسے یاد رکھتا ہوں اس لیے اپنے صدموں کو شہنشاہ ہمایوں کے مقبرے میں چھوڑ کر یہاں آ گیا ہوں۔''

ملاقاتی نے ان کے سامنے سرخم کر دیا اور کہا۔ ''صفدر مرزا! جو شخص اپنے صدموں کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتا ہے وہی جواں ہمت عزم کی بنیاد پر انتقام کی دیوار اٹھاتا ہے مگر ایسے وقت جب دشمن آپ کی تلاش میں ہے، آپ گھوسی بن کر گھاس کاٹنے نکلے ہیں اور اپنی حفاظت کے لیے صرف ایک درانتی پر بھروسہ رکھتے ہیں۔''

''اس درانتی سے گھاس ہی نہیں، دشمن کی گردن بھی کاٹی جا سکتی ہے۔'' ساتھ ہی صفدر پیا نے اپنی صدری کی جیب سے جو کُرتے کے نیچے پہن رکھی تھی، ولایتی طمنچہ نکال کر دکھایا۔ ''یہ بھرا ہوا ہے اور کچھ فالتو گولیاں میری جیب میں ہیں۔ مجھ پر ہاتھ ڈالنے والا اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے گا۔''

ملاقاتی ان کے ہاتھ میں طمنچہ دیکھ کر مطمئن نظر آنے لگا۔ ''صفدر مرزا! دانائی انسان کے اندر کی حفاظت کرتی ہے اور ہتھیار اسے باہر سے محفوظ رکھتا ہے۔ جو لوگ اپنے اندر اور باہر کی حفاظت سے غافل ہو جاتے اور خود کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتے ہیں ان کی گردنیں کٹتی ہیں یا بقیہ زندگی کسی قید خانے میں گزرتی ہے۔ آپ کا انتخاب اسی لیے کیا گیا ہے کہ آپ اپنی حفاظت سے غفلت نہیں کرتے اور نہ کبھی خود کو فرنگی کے سپرد کریں گے۔''

''فرنگی نے ہماری آزادی اور زندگی کے راستے روک لیے ہیں اور میں مقبروں میں سونے والے عظیم مغلوں کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ جب تک میری نبضوں میں خون اور جسم میں جان باقی ہے، اپنے دشمن پر وار کرتا رہوں گا۔''

''میں اور میرے ساتھی جانتے ہیں کہ آپ کے اندر ایک ناقابل تسخیر آدمی چھپا ہوا ہے۔''

''مگر اس سے پہلے کہ میں کچھ سوال کروں اور اندھیرے کی اس ملاقات کا مقصد پوچھوں، آپ کا نام جاننا چاہتا ہوں۔''

ملاقاتی نے کہا۔ ''میرا نام محمد صادق ہے۔ رائے بریلی کا رہنے والا ہوں اور کاذب نہیں ہوں۔ آپ مجھ سے جو کچھ پوچھنا چاہتے ہیں، بلا جھجک پوچھیے۔''

شمولیت کیوں ضروری ہے؟''

''اس لیے کہ ان کی شمولیت کے بغیر آپ اس رازِ سربستہ میں شریک نہیں ہو سکتے جس پر ہماری تحریک آزادی اور جدوجہد کا انحصار ہے۔ اسرار کی یہ گرہ بھی سید صاحب ہی آپ پر کھولیں گے کہ شہزادی صاحبہ کی شمولیت کیوں لازمی ہے۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں، اگر عورت مرد کی پشت پر کھڑی ہو تو مرد کے حملہ کرنے کی قوت کئی گنا بڑھ جاتی ہے اور وہ دشمن پر فیصلہ کُن وار کرتا ہے۔''

ایک عورت کو میدانِ جنگ میں لانے اور حریف پر کاری ضرب لگانے یا پھر جدوجہد میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے یہ دلیل بڑی مضبوط تھی۔ جب عورت کسی خطرے میں شریک ہو، مرد کی ذمے داری بڑھ جاتی ہے۔ وہ خطرے پر غالب آنے کے لیے اپنی پوری قوت اور صلاحیت استعمال کرتا ہے۔ صفدر پیا رضیہ سلطانہ اور چاند بی بی کے کارناموں سے بھی آگاہ تھے۔ تاہم صادق ایلچی کی گفتگو سے انہوں نے اندازہ لگایا کہ تحریک آزادی میں میری شمولیت کا معاملہ ان اسرار سے تعلق رکھتا ہے جو مغلوں کی چار پشتیں دیکھنے والے بوڑھے سید برہان الدین کے علاوہ اور کوئی نہیں جانتا۔

معاملے کی اس حیرت انگیز اور سنسنی خیز صورت کو سمجھتے ہوئے انہوں نے اپنے ملاقاتی کو مطمئن کرنا ضروری سمجھا اور کہا۔ ''میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ سید صاحب کی طرف سے جو پیغام لے کر آئے ہیں، اس پر عمل ہو گا۔ میرے ساتھ شہزادی لالہ رخ بھی اس تحریک میں شامل ہوں گی جس کی دعوت لے کر آپ آئے ہیں اور جس طرح میجر ہڈسن نے مغل شہزادوں کو قتل کیا ہے، اسی طرح ہم بھی فرنگی بھیڑیوں کو خون میں غسل دیں گے تاکہ خون کے بدلے خون کا حکم پورا ہو۔''

جب صفدر پیا، مقبرۂ ہمایوں کے حجرے میں مجھے اور ماموں اورنگ مرزا کو اپنی ملاقات کا حال سنا رہے تھے اور وہ الفاظ دہرا رہے تھے جو میں نے ابھی بیان کیے ہیں و میری شریانوں میں خون کے ساتھ چنگاریاں سی دوڑنے لگیں۔ پورے جسم میں سمندری جوار کی سی لہر اُٹھی اور محسوس ہوا کہ میں مغلوں کا انتقام بن کر صفدر پیا کے دوش بدوش چل رہی ہوں۔ تحریک آزادی میں میری لازمی شمولیت کے بارے میں جو نتیجہ انہوں نے اخذ کیا، وہی بات میرے ذہن سے گزری کہ ضرور اس میں کوئی راز پنہاں ہے جو صرف سید برہان الدین ہی جانتے ہیں اور اب ان سے ملنا ضروری ہو گیا تھا۔ مگر ایلچی نے یہ نہیں بتایا کہ سید صاحب سے ملاقات کب، کہاں اور کیسے ہو گی؟

جب صفدر پیا نے تحریک میں شمولیت کا وعدہ کر لیا تو ایلچی ان سے کہنے لگا۔ ''صفدر مرزا! آپ لوگ آج ہی رات مقبرۂ ہمایوں چھوڑ دیں گے اور مہرولی کی طرف سفر کریں گے۔ ہو سکتا ہے، کل یہاں کچھ اور لوگوں کو گرفتار کیا جائے۔ آپ کو ہر قیمت پر گرفتاری سے بچنا اور شہزادی لالہ رخ کی حفاظت کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے آدھی رات کے بعد سفر مناسب ہو گا۔ لیکن آپ کو مہرولی کی طرف کہاں جانا ہے؟ یہ بات راستے میں بتا دی جائے گی۔ جب آپ لوگ مقبرۂ ہمایوں سے نکل کر مہرولی کا رخ کریں گے، میں زیادہ دور نہیں ہوں گا اور کہیں نہ کہیں آپ سے ملوں گا۔''

یہ کہہ کر ملاقاتی نے صفدر پیا کو رخصت کر دیا اور خود بھی رات کے اندھیرے میں ایک طرف غائب ہو گیا۔ واپسی پر انہوں نے گھوسی کا بہروپ قائم رکھنے کی خاطر راستے میں گھاس کاٹی اور پوٹلی اُٹھا کر مقبرے میں لوٹ

صرف مجھے اس مقصد کے لیے کیوں چنا گیا ہے؟''

ملاقاتی نے کسی تردّد کے بغیر جواب دیا۔''وہ راز جو ہماری جدوجہد کا محور ہے، سید صاحب آپ کو بتائیں گے۔صرف وہی اس کے بارے میں جانتے اور وہی ہماری تحریک کے رہنما ہیں۔ میں تو ان کا بھیجا ہوا ایلچی ہوں۔''

''سید صاحب کون ہیں؟''

''سید برہان الدین۔'' ملاقاتی نے ایک سنسنی خیز انکشاف کیا۔''ان کی عمر اس وقت 95 برس کی ہو چکی ہے۔ وہ 1762ء میں پیدا ہوئے تھے۔شہنشاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی جنت مکانی کے بعد جب شاہ عالم نے تخت سنبھالا اس وقت سید صاحب دس برس کے تھے۔انہوں نے شاہ عالم کے جلوس کا جشن دیکھا۔ پھر ان کے بعد 1806ء میں معین الدین اکبر شاہ کا جشنِ جلوس بھی دیکھا اور 1837ء میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے جلوسِ تخت نشینی میں بھی شریک ہوئے۔ وہ عمر میں بادشاہ سے 13 برس بڑے ہیں۔ انہوں نے دہلی پر روہیلوں، مرہٹوں اور انگریزوں[1] کے حملے بھی دیکھے اور ان کی روداد اس طرح بیان کرتے ہیں جیسے وہ کل کی باتیں ہوں۔''

صفدر پیا نے یہ سب کچھ بڑے تعجب سے سنا۔ انہیں اب پتہ چلا کہ اندھیرے کی خفیہ ملاقات کے پیچھے اصل آدمی کوئی اور ہے۔ 95 برس کے پراسرار سید برہان الدین جو عالمگیر ثانی کے عہد میں پیدا ہوئے اور تین مغل بادشاہوں کو تخت نشین ہوتے دیکھ چکے ہیں۔ ان کے ملاقاتی کی حیثیت محض ایلچی کی ہے۔ ابھی وہ اسی بات پر حیران ہو رہے تھے کہ ایلچی نے انہیں ایک نئی حیرت سے دوچار کر دیا اور کہنے لگا۔

''صفدر مرزا! آپ کو اس بات پر تعجب ہے کہ مغلیہ خاندان میں سے سید صاحب کی نگاہِ انتخاب صرف آپ پر کیوں پڑی؟ یہ سوال بے شک بڑا اہم ہے جس کا مختصر جواب میں نے کل ہی عرض کر دیا تھا مگر اس اجمال کی تفصیل سید صاحب خود بیان کریں گے کہ جس راز میں انہوں نے بادشاہ یا ان کے کسی فرزند کو شریک کرنا مناسب نہیں سمجھا اس میں آپ کو کیوں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ مجھے تو آپ سے ملنے اور یہ پیغام پہنچانے کی ہدایت کی گئی ہے کہ جس مقصد کی خاطر آپ کا انتخاب کیا گیا ہے، اس میں شہزادی لالہ رخ کی شمولیت ضروری ہے جو آپ کی منگیتر ہیں۔''

یہ ایک اور اچنبھا تھا کہ اس جدوجہد میں میری شمولیت ضروری سمجھی گئی تھی۔صفدر پیا اگرچہ اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے آزادی کے ساتھ ساتھ انسان کے عزوشرف سے گہری محبت اور غلامی سے شدید نفرت ہے۔فرنگی نے جس عیاری اور مکاری سے ہندوستان کی آزادی پر ڈاکے ڈالے تھے، جس بے رحمی سے مغلوں کی رہی سہی سلطنت کو غصب کر لیا تھا، اس کے خلاف میرے دل میں جذبات کا جوار بھاٹا اُٹھتا رہتا تھا اور مجھے کسی جدوجہد کے لیے بے چین رکھتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں سیدھا سید صاحب کی پیش کش میری مرضی کے عین مطابق تھی۔ پھر بھی انہوں نے پوچھ لیا۔

''آزادی کی جنگ میں مرد، مرد پر وار کرتا اور دشمن کو کاٹتا یا خود کٹتا ہے۔اس دار و گیر میں شہزادی لالہ رخ کی

---

[1] انگریزوں نے دہلی پر پہلا حملہ 1803ء میں مرہٹوں کے خلاف کیا اور اندھے مغل تاج دار شاہ عالم کو ان کے قبضے سے نکال کر اپنی تحویل میں لے لیا تھا۔ کمپنی سرکار کی طرف سے انگریزی فوج کا کمانڈر جنرل لیک تھا۔ یہاں اسی حملے کی طرف اشارہ ہے۔

ان مظالم کے خلاف جدوجہد کا آغاز بھی ضروری تھا۔

ہم جن واقعات سے گزرے اور جن حالات سے دوچار ہوئے، ان کا تقاضا یہی تھا کہ کچھ کرنا چاہئے۔ جسموں کے اندر انتقام کا دھارا چل رہا تھا اور ہم بے سروسامانی کے تختے پر کھڑے اس دھارے میں بہے جا رہے تھے۔ ماموں اورنگ مرزا کا خیال تھا کہ ہمیں دہلی سے فوراً نکل جانا اور آگرے اور گوالیار کے راستے دکن کا رخ کرنا چاہئے۔ لیکن راستے غیر محفوظ اور حالات مخدوش تھے۔ کمپنی سرکار کے دیسی جاسوس اور کارندے دہلی کے پورے ضلع میں مطلوبہ لوگوں کو ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ فرنگی دستے بھی دیسی سپاہیوں کے ہمراہ جن میں زیادہ تر سکھ اور ڈوگرے تھے، مشرق میں جمنا کے اس پار اور جنوب میں الور تک باغیوں کی تلاش میں گشت کرتے تھے۔ مقبرۂ ہمایوں سے نکل کر ہم کسی بھی جانب رخ کرتے، ہر شہر، ہر قصبے، ہر راستے میں گرفتاری کا خطرہ تھا۔

صفدر مرزا کا نام ان باغیوں کی فہرست میں تھا جو انگریز کو مطلوب تھے اور جن کے لیے قتل یا پھانسی سے کم سزا ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ اب مقبرۂ ہمایوں میں بھی کوئی شخص زیادہ دیر تک چھپا نہ رہ سکتا تھا۔ ہاں سے ہمارا نکلنا ضروری تھا اور صفدر پیا تحریک آزادی میں اپنی اور میری شمولیت کا جو وعدہ سید صاحب کے ایلچی سے لے کر آئے تھے، وہ ہمیں بہر حال پورا کرنا تھا کیونکہ اب ہمارے لیے صرف ایک ہی راستہ باقی رہ گیا تھا۔ مہرولی کا راستہ۔ جس کی نشاندہی ملاقاتی نے کی تھی۔

میرا، ماموں اورنگ مرزا اور صفدر پیا کا بھی ایک ہی فیصلہ تھا۔ مہرولی کی طرف سفر۔ اور یہ سفر ہمیں اسی رات نصف شب کو کرنا تھا۔ یہ بھی بتا دوں کہ تحریک آزادی میں میری شمولیت کسی رازِ سربستہ سے تعلق رکھتی تھی اور کسی دوسری جانب سفر کے خطروں اور اندیشوں کے علاوہ اس راز کی کشش بھی مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی جو 95 برس کے بوڑھے سید صاحب کے سینے میں محفوظ تھا۔

مغل شہزادوں کی الم ناک ہلاکت کے واقعات سن کر مغلانی کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔ اب اسے اپنے ہونے والے داماد صفدر مرزا کی فکر لاحق تھی جن کا نام مطلوبہ باغیوں میں سرفہرست تھا۔ وہ اسی فکر میں غلطاں اور ہماری باتوں سے بے تعلق سی ایک طرف لیٹی لیٹی سو گئی تھی۔ مہرو اور عنبری بھی دروازے کے پاس اونگھ رہی تھیں۔ ہم ٹھیک آدھی رات کو مقبرہ چھوڑنے اور مہرولی کی جانب جانے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ صفدر پیا کے پاس رسالے کا گھوڑا تھا جو سامان لادنے کے ساتھ بیمار مغلانی کی سواری کے بھی کام آ سکتا تھا۔ اچانک وہ بولے۔

''اورنگ مرزا! مہرولی کی طرف پالکیاں نہیں جائیں گی نہ کہاروں کا ہمارے ساتھ جانا مناسب ہے۔ اگر ایک دو گھوڑوں کا بندوبست ہو سکے تو ہمارا سفر آسان ہو جائے گا۔ نہ جانے آگے چل کر کیا حالات پیش آئیں۔ سواری کا ہونا ضروری ہے۔''

ماموں مرزا اُچھل کر کھڑے ہو گئے اور بتانے لگے۔ ''یہاں ایک صاحب کے پاس گھوڑا ہے جسے بیچنا چاہتے ہیں کیونکہ گھر سے پھوٹی کوڑی تک ساتھ نہیں لا سکے۔ ابھی ان سے جا کر بات کرتا ہوں۔''

وہ آندھی کی طرح گئے اور بگولے کی طرح لوٹ آئے۔ واپسی پر گھوڑا بھی ساتھ تھا جس کی قیمت مالک کو ادا کر آئے تھے۔ آدھی رات ہونے والی تھی۔ میں نے مغلانی، مہرو اور عنبری کو جگا دیا اور بتایا کہ ہم لوگ اسی وقت یہاں سے جا رہے ہیں۔ جب ماں کو پتہ چلا کہ مقبرۂ ہمایوں ملاقاتی کی ہدایت پر چھوڑا جا رہا ہے تو اس کے چہرے

آئے۔

یہ تھی سید صاحب کے ایلچی صادق بریلوی سے ان کی رودادِ ملاقات جو انہوں نے ہمیں سنائی اور جس نے میرے ساتھ ماموں مرزا کو بھی ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔

❀......❀......❀

جب صفدر پیا نے ہمیں درگاہ نظام الدین اولیا محبوب الٰہیؒ کے احاطے میں ایک پراسرار ملاقاتی کا واقعہ سنایا جس نے دوسرے روز شام کے وقت انہیں مقبرۂ ہمایوں کے مغربی کھنڈر میں بلایا تھا تاکہ معاملے کی بات چیت ہو سکے،، تب ہمیںؒ معاملے سے کہیں زیادہ اس رازِ سربستہ سے دلچسپی تھی جس کا ذکر ایک مقصد کے سلسلے میں کیا گیا تھا اور جسے معلوم کیے بغیر صفدر پیا بھی مقبرۂ ہمایوں سے کسی دوسری جگہ جانے پر آمادہ نہ تھے۔ ہمارا خیال تھا وہ اپنے ملاقاتی سے مل کر لوٹیں گے تو سب کچھ معلوم کر چکے ہوں گے اور آ کر اپنے فیصلے سے آگاہ کریں گے کہ اب ہمیں کیا کرنا ہے اور کہاں جانا ہے۔ لیکن جو روداد انہوں نے سنائی وہ اس قدر حیران کر دینے والی تھی کہ ایک نئی سنسنی پہلی سنسنی کے ساتھ مل کر ہمارے خون کے ساتھ ساتھ گردش کرنے لگی۔

ملاقاتی کے پیچھے اصل ملاقاتی کوئی اور تھے جنہوں نے مغل شہنشاہ عزیزالدین عالمگیر ثانی کا زمانہ بھی دیکھا تھا اور ایسے پُرآشوب حالات میں جب موت مغلوں کے تعاقب میں بھاگی پھر رہی تھی، شہزادوں کو قتل کر کے ان کی لاشیں پھانسیوں پر لٹکائی جا رہی تھیں، باقی تتر بتر ہو چکے تھے، بخت خاں روہیلہ اپنی فوج لے کر دہلی سے کسی نامعلوم سمت جا چکا تھا، جنگ آزادی میں شریک ہونے اور انگریز کے خلاف لڑنے والوں کی پکڑ دھکڑ جاری تھی، لوگ فرنگی فوجوں کی ہلاکت خیزیوں کے ڈر سے چھپتے اور اپنی جانیں بچاتے پھر رہے تھے اور کمپنی سرکار موت، بربادی، دہشت کے ہولناک سایوں میں ہندوستان پر اپنی حاکمیت کے فرمان نافذ کر رہی تھی، سید برہان الدین بے یقینی، نامرادی اور غلامی کے انہی ایام میں، بربریت کے انہی فرستادوں کے خلاف آزادی کی جنگ لڑنے کی دعوت دے رہے تھے۔

سیاسی حالات کے پس منظر میں یہ دعوت جذبات آفریں اور دلوں میں ہلچل مچا دینے والی تھی۔ سلطنتوں کی تاراجی، خاندانوں کی بربادی اور عزیزوں کی ہلاکت کے انتقام کا جذبہ ہی آدمی کو جدوجہد پر اُبھارتا ہے۔ مگر جس غیر ملکی طاقت کی ریشہ دوانیوں کے سامنے نواب سراج الدولہ، سلطان ٹیپو، مہاراجہ سندھیا، مہاراجہ ہلکر، باجی راؤ پیشوا، نواب واجد علی شاہ اور بہادر شاہ ظفر جیسے حکمران نہ ٹھہر سکے جنہیں لشکر و سپاہ کی قوت حاصل تھی، اس کے خلاف ایک لرزہ خیز شکست کے بعد جنگ آزمائی کی دعوت کیا معنی رکھتی تھی؟

کمپنی سرکار نے مرہٹوں، روہیلوں، سکھوں، جاٹوں، راجپوتوں اور مغلوں سے تخت و تاج چھین لیے تھے۔ اب ہندوستان میں کوئی طاقت اس کی حریف نہ تھی۔ پھر ایک محدود سی جدوجہد کا انجام کیا ہو سکتا تھا؟

عقل مصلحت اندیش ہوتی اور جذبات کے دھاروں کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ لیکن ظلم کی مزاحمت اور غلامی کے خلاف آزادی کی جدوجہد ایک فطری جذبہ ہے جسے روکا نہیں جا سکتا۔ دنیا میں حق و باطل کی کشمکش ہمیشہ جاری رہی ہے اور ہمیشہ جاری رہے گی۔ تاتار کے سیلابِ ہلاکت میں غرق ہو جانے کے باوجود تباہ حال عربوں نے تلوار اٹھائی اور فتح حاصل کی تھی۔ فرنگی سرکار نے ہندوستان کی سرزمین پر چنگیز اور ہلاکو کی تاریخ دہرائی تھی اور

رات بھی گزشتہ کئی راتوں کی طرح مغلوں پر بھاری تھی جس کے اندھیروں میں ہم ایک نئے سفر پر نکلے تھے۔ میں نے دھڑکتے دل اور بھیگی پلکوں کے ساتھ اپنے ستم نصیب عزیزوں کو ''خاموش الوداع'' کہی اور گھوڑا بڑھایا۔

❀......❀......❀

مقبرۂ ہمایوں سے نکل کر ہم مغرب کو اس سڑک کی طرف ہو لیے جو شہر کے دہلی دروازے سے مہرولی کو جاتی ہے۔ مقبرہ دہلی سے تقریباً چار میل اور مہرولی سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے۔ ہمیں مقبرے سے ایک میل مغرب کی سمت چل کر سڑک تک پہنچنا، پھر جنوب کا رخ کرنا تھا۔ رات مغلوں کی قسمت کی طرح تاریک تھی۔ راستہ بھی کالے اندھیرے میں لپٹا تھا۔ اس اندھیرے میں ماموں اور رنگ مرزا آگے آگے اور صفدر پیا پیچھے پیچھے پوری طرح چوکس اور کسی بھی خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ دونوں نے اپنے ولایتی طمنچے نکال لیے اور ہاتھوں میں تھام رکھے تھے مگر دور و نزدیک کہیں خطرے کے آثار نظر نہ آتے تھے۔ ہر اندیشہ، ہر خطرہ ہمارے اپنے دل میں تھا۔

اندھیرے میں گرد و پیش کا جائزہ لیتے اور قدم قدم چلتے آخر ہم اس سڑک پر پہنچ گئے جو مہرولی کو جاتا ہے۔ کالے اندھیرے میں جہاں تک نظر کام کرتی تھی، کوئی سایہ بھی ہمارے آس پاس نہیں تھا۔ مگر عجیب بات ہ ہوئی کہ جونہی ہم اس سڑک پر جنوب کی طرف مڑے اور آگے بڑھے، ناگہاں اندھیرے میں دور ایسی مدھم اور خفیف دھمک سنائی دی جیسے بہت دور کوئی فوجی قافلہ گزر رہا ہو۔ اسی سڑک پر ہمارے عقب میں دو میل پرے پرانے قلعے اور اس سے بھی پرے کوٹلہ فیروز شاہ کی قدیم عمارتیں تھیں۔ مدھم سی دھمک اسی طرف اُبھری تھی۔

ماموں اور رنگ مرزا انہی قدموں رک گئے اور تشویش انگیز لہجے میں بولے۔ ''شاید کوئی فوجی قافلہ پرانے قلعے سے نکل رہا ہے۔''

خفیف سی دھمک میں نے بھی سنی تھی مگر ہمارے رکتے ہی دور سے آتی آہٹ بند ہوگئی۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ ہمارے پیچھے کوئی دھمک، کوئی آہٹ، کوئی آواز نہیں، ہم پھر چل پڑے اور ابھی چند قدم بڑھے تھے کہ بہت دُور وہی آہٹ پھر اُبھری، جس پر ہمیں کسی فوجی قافلے کے گزرنے کا احتمال ہوا تھا۔ ہم دوبارہ رک گئے۔ کیونکہ اگر ہمارے عقب میں کوئی فوجی قافلہ حرکت کر رہا تھا تو مہرولی کی طرف سفر خالی از خطرہ نہ تھا۔ مگر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ ہمارے رُکتے ہی دور سے آنے والی آواز پھر رک گئی۔

ماموں مرزا اس نتیجے پر پہنچے ک وہ آہٹ جو تاریک سنسان رات کے سناٹے میں بہت دور سے آتی سنائی دیتی اور ہم چلتے ہیں تو اُبھرتی ہے، شاید ہمارے اپنے گھوڑوں کے چلنے کی بازگشت ہے۔ چنانچہ یہی سوچ کر ہم پھر آگے بڑھے اور بہت دور مدھم سی آہٹ پھر سماعت سے ٹکرانے لگی۔ لیکن اب ہمیں کوئی تشویش نہیں تھی۔ آہٹ یا صدائے بازگشت مزید مدھم ہوگئی یا بہت پیچھے رہ گئی تھی اور ہم آگے بڑھ رہے تھے۔ البتہ ایک نئی تشویش ضرور لاحق ہوگئی۔

سید صاحب کے ایلچی نے کہا تھا کہ وہ اس سفر میں ہم سے زیادہ دور نہیں ہوگا۔ راستے ہی میں کسی جگہ آ ملے گا اور بتائے گا کہ ہمیں کدھر جانا ہے؟ ہماری منزل کہاں ہے؟ مگر مصیبت کی اس رات کے کالے اندھیرے میں دور دور تک کسی وجود کا سایہ بلکہ شائبہ تک نہیں تھا۔ نہ کوئی آہٹ اور سرسراہٹ تھی۔ وہ مدھم سی دھمک بھی، جسے سن کر ہم

پر اطمینان کی کرن مسکرانے لگی اور باندیوں کو سامان سمیٹنے کا اشارہ کیا۔ مگر جب یہ سنا کہ ہم مہرولی کی طرف جا رہے ہیں تو پھر کسی اُلجھن میں کھوگئی۔

مغلانی جانتی تھی، خاندان کے متعدد افراد مہرولی گئے ہیں جن میں سے بعض درگاہ نظام الدین اولیأ میں اور کچھ قطب صاحب کے احاطے میں پناہ گزین ہیں یہ بات اب کسی سے ڈھکی چھپی نہ تھی کہ مرشدزادوں کی گرفتاری کے لیے فرنگی سوار اگر مقبرۂ ہمایوں میں آسکتے ہیں تو روپوش شہزادوں کی تلاش میں مہرولی اور قرب و جوار کی درگاہوں پر کیوں نہ جائیں گے۔ جاسوسوں اور مخبروں کے دام وہاں بھی بچھے ہوں گے۔ ان حالات میں ہمارا ادھر جانا خطرے سے خالی نہ تھا۔ میں نے بتایا۔ ''ابھی ہمیں اپنی منزل کا علم نہیں۔''

وہ حیران وششدرسی مجھے دیکھنے لگی۔ ''منزل کے بغیر سفر بے مقصد ہوتا ہے۔''

''مگر ہمارے سفر کا ایک مقصد ہے۔''

اس اثنا میں مہرو اور عنبری نے سامان لیا تھا اور ماموں مرزا اسے گھوڑے پر لادنے کے لیے بوروں کی صورت باندھ رہے تھے۔ سامان گھوڑے پر لد گیا تو انہوں نے مغلانی کو آگے اور مہرو کو اس کے پیچھے سوار کرایا۔ میں اور عنبری، صفدر پیا کے گھوڑے پر سوار ہوئیں۔ پھر ان دونوں نے گھوڑوں کی لگامیں پکڑیں اور آگے آگے مغربی دروازے کو ہولیے۔

مقبرۂ ہمایوں رات کی تاریکی اور افسردہ سناٹے میں ڈوبا ہوا تھا۔ صرف گھوڑوں کی ٹاپوں سے نصف شب کی خاموشی اور حیرت ٹوٹ رہی تھی۔ مغربی دروازے کے چوکیدار نے ہمیں تعجب سے دیکھا اور ماموں مرزا کے اشارے پر مہیب پھاٹک کھول دیا۔

میں پیچھے کہیں بتا آئی ہوں کہ مقبرے میں مقیم سپاہ سے ہتھیار لے لیے گئے تھے جس سے سپاہیوں کی بے دلی اور غیر محفوظ پناہ گزینوں کی مایوسی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اسی مایوسی اور بے یقینی کے باعث کچھ لوگ مشرقی دروازے سے جمنا کی طرف نکل گئے تھے اور انہیں روکا نہیں گیا تھا۔ اب نہ کوئی مقبرے کی چار دیواری کے اندر محفوظ تھا نہ باہر۔ رات کو وہاں سے نکلنے پر پابندی اس لیے لگا دی گئی تھی کہ لوگ کسی نئی مصیبت میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اور یہ پابندی بادشاہ نے لگوائی تھی جو خود مبتلائے مصیبت ہو چکے تھے۔

لوگوں کو وہاں بیٹھے نہیں رہنا تھا۔ مگر وہ اس انتظار میں تھے کہ حالات ذرا بہتر ہوں تو وہاں سے نکلیں۔ جب کہ حالات مزید بگڑتے جا رہے تھے۔ جب ہم باہر نکلے تو ہمارے عقب میں بھاری پھاٹک کراہتی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔ لیکن میں نے ایک دو پل کے لیے گھوڑا روک لیا اور مقبرۂ ہمایوں میں پناہ گزین مغل عورتوں اور مردوں کو دل ہی دل میں ''خدا حافظ'' کہا جن میں سے کئی موت کی چوکھٹ پر کھڑے تھے اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ انہیں کب گرفتار کر لیا جائے گا۔ ان کی بے بسی اور جدائی پر میرا دل صدمے سے دونیم تھا تاہم میں ایک بڑے مقصد کی خاطر ان سے الگ ہو رہی تھی اور اگر ڈھارس کا کوئی پہلو تھا تو یہ کہ وہ بھی ایک دو روز میں وہاں سے نکلنے اور محفوظ مقامات کی طرف روانہ ہونے کی سوچ رہے تھے۔ شاید وہ وقت کی مہیب گردش سے بچ کر نکل جائیں لیکن جو کچھ مجھے یا انہیں پیش آنے والا تھا، میں اس سے بے خبر تھی۔

صفر کا چاند اسی شام چند لمحوں کے لیے آسمان کی دھواں دھواں سی پیشانی پر نظر آیا پھر غروب ہو گیا تھا۔ وہ

آئے تھے۔ اور اگر میرا قیاس غلط نہیں تو جب ہم مقبرۂ ہمایوں سے نکل کر مہرولی جانے والی سڑک پر آئے تھے اور ہم نے بہت دور اپنے عقب میں ٹاپوں کی ہلکی سی، مدھم سی آہٹ سنی تھی جس پر کسی فوجی قافلے کی نقل و حرکت کا شبہ ہوا تھا تو وہ آہٹ دراصل انہی سواروں کی تھی جو ہم سے دُور رہ کر ہماری دیکھ بھال کر رہے تھے۔

ایلچی کی دوسری آواز نے ہمیں پھر چونکا دیا۔ ''صفدر مرزا! میں دو گھوڑے بھجوا رہا ہوں۔ اورنگ مرزا اور آپ کے لیے۔ ان پر سوار ہو کر ہمارے پیچھے آ جائیے۔''

فوراً ہی دو آدمی گھوڑے لے کر آئے اور ان کے حوالے کر کے چپ چاپ لیٹ گئے۔ وہ دونوں سوار ہوئے تو ساتھ ہی فوجی قافلہ مغرب کی طرف پرانے کھنڈروں اور خرابوں سے گزرنے لگا۔ بیس سوار ہمارے آگے آگے، بیس پیچھے پیچھے اور ہم ان دونوں ٹکڑیوں کے درمیان چل رہے تھے۔

❁......❁......❁

ماضی کے ویرانوں میں ملبے کی ڈھیریاں تھیں، ناہموار زمین تھی۔ کہیں کہیں گہرے گڑھے تھے مگر اندھیرے کے باوجود ہمارے آگے چلنے والے سوار ان کے درمیان ایک ٹیڑھے میڑھے راستے پر یوں گزرتے رہے جیسے وہ راستہ ان کا خوب دیکھا بھالا ہو۔ ہمارا خیال تھا، منزل کہیں قریب ہی ہو گی لیکن یہ خیال غلط ثابت ہوا۔ سفر کی رفتار تیز تھی جو صبح کاذب تک جاری رہا اور ہم کھنڈر، ویرانے، خرابے عبور کرتے مغرب کی جانب کوئی گیارہ بارہ میل دور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے جس کے خاکستری گھروندوں، گھاس پھونس کے جھونپڑوں اور مویشیوں کے باڑوں سے پتہ چلا کہ وہ جاٹوں اور گوالوں کی بستی ہے۔

بستی کا مکھیا دو تین آدمیوں کے ہمراہ بھاگا آیا اور صادق ایلچی کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔ صادق نے ہم چار عورتوں اور دو مردوں کو اس کے حوالے کر دیا اور تاکید کی۔ ''رنگا! مہمان کچھ دن تیرے پاس رہیں گے۔ ان کی خدمت اور حفاظت میں سستی نہ کرنا۔''

''کا بولت ہو جور! ہم سب سمجھت ہیں۔ کھدمت بھی، ہفاجت بھی۔ تمہار کو سکایت ناہیں ہووے گی۔''

پھر صادق نے صفدر پیا سے علیحدگی میں کچھ باتیں کیں اور پھٹتی پو میں اپنے سواروں کے ساتھ مشرق کی طرف لوٹ گیا۔ مگر اپنے گھوڑوں کے علاوہ صفدر پیا کا گھوڑا بھی لیتا گیا۔ وہ شاہی رسالے کا داغا ہوا گھوڑا تھا جس سے کسی دیکھنے والے کو شک ہو سکتا تھا کہ کوئی مغل افسر بستی میں آ کر ٹھہرا ہے۔

سواروں کے لوٹتے ہی مکھیا جس کا نام رنگا تھا، ہمیں لے کر چلا اور بستی کے گوشے میں الگ تھلگ ایک خاکستری مکان میں داخل ہوا جو دو کمروں پر مشتمل اور خوب لیپا پوتا، صاف ستھرا تھا۔ صبح کاذب ہولے ہولے صادق میں تبادیل ہو رہی تھی جس کی ہلکی سی روشنی میں ہم نے دونوں کمرے جو ایک جیسے تھے باہم تقسیم کر لیے۔ یہ بات کسی اچنبھے سے کم نہ تھی کہ مقبرۂ ہمایوں سے نکل کر ہمیں کئی میل دور گنوار جاٹوں اور گوالوں کی ایک بستی میں ٹھہرایا گیا۔ جبکہ ان مسلح سواروں سے جو ہمیں اپنی حفاظت میں لے کر آئے تھے، سید صاحب اور ان کے ایلچی صادق کے وسائل کا اندازہ ہوتا تھا۔ نہ جانے ہمیں وہاں ٹھہرانے میں کیا مصلحت تھی۔

ہم رات بھر کے جاگے اور تھکے ماندے تھے۔ کم از کم ماموں اورنگ مرزا، صفدر پیا اور میں نے تو ساری رات پلک تک نہ جھپکی تھی اس لیے نیند سے آنکھیں بوجھل ہو رہی تھیں۔ مہرو اور عنبری نے سامان کھول دیا۔ چارپائیوں پر

پریشان ہو گئے تھے، رات کے مہیب سناٹے میں کہیں گم ہو گئی اور اب سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ جانے ہمارا راہبر اس سڑک پر کسی جگہ ہمارا منتظر ہو گا یا نہیں ہو گا؟

اندھیرے میں سفر جاری تھا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، ایلچی کے بارے میں ہماری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ سڑک دہلی کے ویرانوں، کھنڈروں اور قدیم خرابوں کے درمیان سے گزرتی مہرولی کو جاتی ہے اور قطب صاحب سے پہلے حضرت نظام الدین اولیاؒ کی درگاہ آتی ہے۔ ہولے ہولے ہم درگاہ سے قریب ہوتے جا رہے تھے جہاں ہمیں نہیں جانا تھا۔ وہ جگہ مقبرۂ ہمایوں سے زیادہ غیر محفوظ تھی۔ یہ خیال بھی گزرا کہ صفدر پیا سے ایلچی صادق کی پہلی ملاقات درگاہ کے احاطے میں ہوئی تھی۔ ممکن ہے اس کا مسکن کہیں آس پاس ہی ہو اور درگاہ سے کچھ فاصلے پر وہ اچانک ہم سے آملے گا۔

ابھی ہم حضرت محبوب الٰہیؒ کے مزار سے چند فرلانگ دور تھے کہ ناگہاں ہمارے عقب میں زمین گھوڑوں کی ٹاپوں سے بج اٹھی اور ہم حواس باختہ سے سڑک پر رک گئے۔ کسی فوجی قافلے کا وہ اندیشہ جو ''دور کی آہٹ'' بن کر یا ہمارے دلوں میں سیندھ لگا کر گھس آیا تھا، بالکل سچ نکلا اور اب نگاہ ہمارے سروں پر آ گیا تھا۔

اندھیرے میں بجتی اور ہر آن قریب آتی ٹاپوں سے یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ ہمیں دو جانب سے گھیرا جا رہا تھا کہ ہم سڑک چھوڑ کر مشرق یا مغرب کی طرف بھاگ نہ سکیں۔ مگر ہم بھاگ تو سکتے ہی نہیں تھے۔ دو گھوڑوں پر چار عورتیں سوار تھیں۔ دونوں مرد پیادہ پا تھے۔ اس حالت میں بھاگنے کی کوشش بے کار ثابت ہوتی۔ صفدر پیا اور ماموں مرزا اس اچانک افتاد پر بے حد پریشان ہو گئے۔ مارے خوف کے ہم عورتوں کے ہاتھ پاؤں پھولتے اور ٹھنڈے ہوتے جا رہے تھے۔ اسی اثناء میں ماموں اورنگ مرزا کی سرگوشی سنائی دی۔ وہ کہہ رہے تھے۔

''صفدر مرزا! خطرہ ہمارے لیے کم اور آپ کے لیے زیادہ ہے۔ آپ اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر نکل جائیں۔ ہم پر جو کچھ گزرے گی، اسے جھیل لیں گے۔''

اندھیرے میں ان کی آواز اُبھری۔ ''میں لالہ رخ کو خطرے میں چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا اورنگ مرزا!''

میں نے درخواست کی۔ ''میری فکر نہ کیجئے۔ اپنے آپ کو بچایئے۔''

ماموں مرزا نے انہیں اپنی طرف کھینچ لیا۔ ''یہ وقت تکرار کا نہیں۔ ابھی مہرولی کا راستہ کھلا ہے۔ جانے میں دیر نہ کریں۔ آپ سلامت ہوں گے تو ہم سلامت رہیں گے۔''

اندھیرے میں لپکنے والا خطرہ ہمارے دائیں بائیں پھیل گیا اور اب فوجی سواروں کے ہیولے نظر آنے لگے۔ وہ سب رائفلوں سے مسلح اور تعداد میں چالیس تھے۔ بیس مشرقی طرف، بیس مغربی جانب۔ ہمارے اور ان کے درمیان دونوں سمت نصف فرلانگ کا فاصلہ تھا۔ اچانک اندھیرے میں آواز بلند ہوئی۔

''صفدر مرزا! یہاں سے آپ ہمارے ساتھ سفر کریں گے۔''

یہ آواز مغربی جانب سے آئی جسے سنتے ہی وہ حیرت سے اُچھل گئے۔ انہوں نے سید صاحب کے ایلچی کی آواز پہچان لی تھی جو فوجی سواروں کی رہنمائی کر رہا تھا۔ ہم سب حیران و ششدر رہ گئے۔ جو کچھ بھی ہوا وہ خلافِ توقع اور بڑا سنسنی خیز تھا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ صادق بریلوی ہمیں راستے میں ناگہاں اس طرح آملے گا کہ چالیس سوار اس کی رکاب میں ہوں گے۔ وہ سب صفدر مرزا کی بلکہ ان سے بھی بڑھ کر میری حفاظت کے لیے

ماموں مرزا نے اس سے بات چیت کی تو ایک نیا انکشاف ہوا کہ جب سے انگریزی فوج دہلی میں آئی اور اس نے پہاڑی پر اپنا کیمپ لگایا تھا، رنگا اسی وقت سے وہاں دودھ پہنچاتا رہا ہے۔ انگریزی کیمپ سے اس کے میل جول کا ذریعہ ایک دیسی پادری بنا تھا جس نے اسے اچھے نرخوں پر دودھ فراہم کرنے کا ٹھیکہ دلوایا۔ ورنہ پہلے وہ دودھ شہر ہی میں بیچتا اور تھوڑے دام کماتا تھا۔ جب سے انگریز کو دودھ پہنچانے کا ٹھیکہ ملا تھا اس کے سوئے بھاگ جاگ اُٹھے تھے۔

یہ انکشاف مزید سنسنی خیز ثابت ہوا کہ وہ انگریز کا قابل اعتماد آدمی تھا اور انگریزی کیمپ کے بریگیڈ کمانڈر کی طرف سے اسے وفاداری کا سرٹیفکیٹ بھی دیا گیا تھا۔ جب کبھی خود کیمپ میں جاتا تو ایک انگریز میجر تحفے میں اسے بسکٹوں کا ایک ڈبہ دیا کرتا تھا۔ اب رنگا وہی بسکٹ ہمارے لیے لے کر آیا اور ماموں مرزا سے کہہ رہا تھا۔

''ہجور! یو بسکٹ بنے تو انگریج کے ہیں پر چون پسان (آٹا میدہ) اپنے ہی دیس کا ہووے۔''

پھر لہجے میں کچھ رازداری پیدا کر کے بولا۔ ''ہمار بستی سے دودھ انگریجی کیمپو ماں جاوے تو سید جی کے ڈیرے بھی جاوے ہے۔ ہم سید جی کو یو بات بتائیو کہ گورا لوگ نے ہمار کو روٹی پھکیٹ دئیو۔ اِدھر بستی ماں کوئی انگریج، سکھ اور دو جی پلٹن ناہیں آوت۔ پڑ دھکڑ کا کوئی کھترہ ناہیں۔ تبھی ہم نے ہجور کی دیکھ بھال کا بچن دئیو۔''

رنگا جاٹ نے وہ بات کھول دی جس نے ہمارے دلوں میں تشویش کا دھڑکا پیدا کر دیا تھا۔ وہ انگریزی کیمپ میں دودھ پہنچاتا تھا مگر مار دھاڑ اور لوٹ کھسوٹ کے دن تھے۔ دہلی کو لوٹنے کے بعد کمپنی سرکار کی انگریزی اور دیسی پلٹنیں باغیوں کی تلاش و سرکوبی کے بہانے گرد و نواح کے دیہات، قصبوں اور شہروں کو لوٹتی پھر رہی تھیں۔ رنگا کو ڈر تھا کہ کہیں گورے یا دیسی فوجی اس کی پونجی بھی لوٹنے نہ آ جائیں جبھی اس نے کیمپ کے بریگیڈ کمانڈر سے وفاداری اور اعلیٰ کارکردگی کا سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا جس کی رُو سے کوئی ولایتی اور دیسی پلٹن اس کی بستی میں داخل ہو سکتی، نہ اس سے کسی قسم کی باز پرس کر سکتی تھی۔

یہ بھی معلوم ہو گیا کہ رنگا انگریزی کیمپ سے روپیہ ضرور کماتا رہا اور اب بھی کما رہا تھا لیکن ہندو جاٹ ہونے کے باوجود سید صاحب کا بڑا معتقد اور بھروسے کا آدمی تھا۔ جبھی ہمیں اس کا مہمان بنایا گیا تھا۔ انگریزی کیمپ سے تعلق کے باعث ہمارے دلوں میں جو شکوک اور خطرے پیدا ہوئے تھے وہ جاتے رہے۔ تازہ دودھ پیٹ بھر کے پیا تھا پھر بھی ہم سب نے اس کے انگریزی بسکٹ کھائے اور جب وہ چلا گیا تو دروازے بند کر کے بے فکری کی نیند سو گئے۔

رنگا کی بستی دہلی کی فصیل سے کوئی آٹھ نو میل جانب مغرب میں ماضی کے ایک خرابے میں واقع تھی۔ اردگرد پیوند زمین عمارتوں کی اونچی نیچی ڈھیریاں اور کچھ فاصلے پر کٹی پھٹی کھائیاں تھیں۔ ایسے ویران مقامات پر لوگ گھر بنانا اور آباد ہونا پسند نہیں کرتے۔ دہلی کے کھنڈروں اور خرابوں میں کہیں درویش فقیر کا تکیہ یا کسی سادھو سنیاسی کا جھونپڑا تو ہو سکتا تھا کوئی آبادی نہیں تھی۔ رنگا کی بستی میں بھی گنتی کے اُنیس بیس جھونپڑے اور مٹی کے صرف پانچ گھر تھے جن میں سے ایک ہمارے لیے خالی کر دیا گیا تھا یا پھر دو بڑے احاطے تھے جن میں ڈھور ڈنگر رکھے جاتے۔ گائیوں، بھینسوں کا دودھ سورج طلوع ہونے سے پہلے نکال لیا جاتا اور نو دس بجے کے درمیان انگریزی کیمپ میں پہنچایا جاتا تھا جس کے لیے دو تین بیل گاڑیاں موجود تھیں۔

چادریں بچھا دیں اور اپنے لیٹنے کے لیے پٹیلا گھاس کی چٹائی پھیلا دی، جو ہمارے کمرے میں غالباً اسی مقصد کے لیے رکھی تھی۔ مگر ابھی ہم سونے کی تیاریاں کر رہے تھے اور عنبری صحن کا دروازہ بند کرنے جا رہی تھی جو کھلا تھا کہ اسی کھلے دروازے سے سانولے رنگ کی ایک جوان عورت پیتل کی چھوٹی گاگر لے کر داخل ہوئی جو تازہ دودھ سے لبالب بھری تھی۔ ساتھ کانسی کے تین چار کٹورے بھی تھے۔

معلوم ہوا، وہ رنگا کی جورو ہے اور ہمارے ناشتے کے لیے بھینسوں کا تازہ دودھ لے کر آئی ہے۔ ہم سب نے پیٹ بھر کے دودھ پیا اور اس کا مزا میں آج تک نہیں بھول سکی۔ اورنگ ماموں نے اسے خالی کٹورا لوٹاتے ہوئے پوچھ لیا۔ ''کیا تم لوگ اتنے سویرے دودھ نکال لیتے ہو؟''

''سرکار! اگر دودھ سویرے ناہیں نکلت تو ٹھیک سے پر کمپو میں کیسے جاوت؟''

''کس کمپو (کیمپ) میں جاتا ہے دودھ؟''

''انگریجی کمپو میں۔''

یہ کہہ کر وہ تو گاگر اور کٹورے اٹھائے چلی گئی مگر ہمارے کلیجے دھک سے رہ گئے۔ ''انگریجی کمپو'' کے لفظ بجلی کی طرح گرے اور ہم حیرت کے سمندر میں ڈوب گئے۔ ہمیں جاٹ گوالوں کی ایسی بستی میں ٹھہرایا گیا تھا جہاں سے ہر روز دودھ انگریزی کیمپ میں بھیجا جاتا تھا۔

جب فرنگی فوج نے دہلی کا محاصرہ ڈالا تو اپنا کیمپ پہاڑی پر قائم کیا تھا۔ جو شمال مغرب میں واقع ہے اور وہیں سے شہر اور قلعے پر گولہ باری ہوتی تھی۔ انگریز نے دہلی پر اگرچہ قبضہ کر لیا اور مارشل لاء کا ہیڈ کوارٹر قطب الدین سوداگر کی کوٹھی چاندنی چوک میں قائم کیا گیا تھا۔ لوگوں کو پھانسیاں اندرون شہر کوتوالی میں دی جاتی تھیں۔ پرائز[1] ایجنسی کا محکمہ بھی شہر کے اندر قائم ہو چکا تھا جس کے تحت وہ گھروں، حویلیوں کے تیغے (دروازے یا محراب کی بندش کی پتھر اینٹیں) توڑتے، صحن یا کمرے میں زمین کھودتے اور مدفون زیورات، نقدی اور دوسرا قیمتی مال و اسباب نکالتے تھے۔ مگر انگریزی کیمپ بدستور پہاڑی پر قائم تھا۔

یہ اطلاع بے حد تشویش ناک تھی کہ مکھیا اور بستی کے دوسرے لوگ انگریز سے رابطہ رکھتے اور دودھ انگریزی کیمپ میں پہنچاتے تھے۔ ہم سوچنے لگے، ممکن ہے یہ بات سید صاحب اور ان کے ایلچی صادق کے علم میں نہ ہو کہ جاٹ گوالوں کی انگریزی کیمپ میں آمد و رفت ہے اور انعام کے لالچ میں وہ ہماری مخبری کر سکتے ہیں۔

رنگا کی جورو نے جو خبر سنائی تھی، اس نے نیند کے ساتھ ہمارے دلوں کا چین بھی لوٹ لیا۔ ابھی ہم معاملے کی اس سنگین صورت پر غور کر رہے تھے کہ صحن کا دروازہ پھر کھلا اور رنگا داخل ہوا۔ وہ صفدر پیا اور ماموں اورنگ مرزا کے کمرے میں پہنچا اور ہمارے کھانے کے لیے انگریزی بسکٹ لے کر آیا تھا۔ جس پر ہماری حیرت اور پریشانی کچھ اور بڑھ گئی۔

---

[1] 1857ء میں جب میرٹھ کے تلنگے باغی دہلی میں داخل ہوئے اور لوٹ مار شروع ہوئی یا بعد ازاں انگریزی فوج نے شہر پر حملہ کیا اور جنگ لڑی گئی تو بہت سے لوگوں نے زیورات، نقدی اور قیمتی اشیاء گھروں میں زیر زمین دفن کر دی تھیں۔ دہلی کی فتح کے ساتھ ہی انگریز نے پرائز ایجنسی قائم کر کے مدفون دولت نکالنا شروع کر دی تھی۔ (مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ ہندوستان)

(6)

استغاثہ

اے میرے مہمانِ عزیز!

میں نے تجھے بتایا تھا کہ مغلوں کی کہانی کا آغاز اس کے انجام سے کر رہی ہوں۔ تُو نے سن لیا ہے کہ 1857ء کے غدر یا جنگ آزادی کا نتیجہ کیا نکلا۔ انگریز نے دہلی فتح کر لی۔ لال قلعے پر قبضہ جما لیا۔ آخری مغل تاج دار سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے حفظ جان کے وعدے پر گرفتاری دے دی اور انہیں لال کنویں کی حویلی میں نظر بند کر دیا گیا جو زینت محل کے کمرے کے نام سے مشہور ہے۔ ولی عہد مرزا قوباش مقبرۂ ہمایوں سے نکل گئے اور پھر ان پر کیا بیتی، یہ کوئی نہیں جانتا۔ مرزا ظہیر الدین مغل، مرزا ابوبکر، مرزا خضر سلطان اور ابوبکر کا بیٹا مرزا سہراب گولیوں کا نشانہ بنے اور مغل شہزادوں کی لاشیں پھانسیوں پر لٹکائی گئیں۔ یہ سب کچھ سن کر تُو سمجھا ہو گا، مغلوں کا افسانہ ختم ہو گیا، ان کی کہانی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ لیکن ابھی اس کہانی کا انجام نہیں ہوا۔

مغلوں کا انجام اتنا ہولناک اور لرزہ خیز ہے کہ شاید دنیا کا کوئی حکمران خاندان ایسے بھیانک انجام کو نہیں پہنچا ہو گا جس بھیانک اور بدترین انجام تک انگریز نے مغلیہ خاندان کو پہنچایا دیا۔ ان کا انجام بیان کرنے کے بعد میں اپنی کہانی کی ابتدا کروں گی، جو لال قلعے سے شروع ہو کر علی گنج کے اس ویرانے تک آ پہنچی ہے جہاں میں اس وقت بیٹھی تجھ سے مخاطب ہوں۔

اس دنیا میں ہر بات کی ایک ابتدا اور ہر بات کی ایک انتہا ہوتی ہے۔ ہر آغاز اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ جس طرح بچہ جوان اور جوان بوڑھا ہوتا اور موت کے گڑھے میں اُترتا ہے تو اپنی کہانی کی ابتدا کرنے سے پہلے میں تجھے مغلوں کے انجام کی رُوداد سناتی ہوں جسے فرنگی کی وحشت یا پھر حالات نے ترتیب دیا ہے۔

❁......❁......❁

دہلی پر جو قیامت گزر گئی وہ ماضی میں اکثر شہروں پر گزرتی رہی ہے جنہیں فاتحین نے اپنے عتاب کا نشانہ بنایا۔ پھر بھی دہلی کی بربادی کا نقشہ کچھ مختلف تھا۔

مارشل لاء لگا کر اور لوگوں کو گھروں میں بند کر کے شہر کو تین روز تک لوٹنے کی جو اجازت دی گئی تھی، اس کا سلسلہ دراز ہوتا گیا۔ کمپنی سرکار کی انگریزی اور دیسی فوجوں نے شہر میں جو لوٹ مچائی، گھروں سے نکلنے اور شہر سے

دہلی سے کوئی سات آٹھ میل جنوب کی طرف "حوض خاص" کے نام سے ایسی ہی ایک آبادی قدیم آثار اور کھنڈروں کے درمیان بن گئی تھی۔ وہاں بھی گوالے ہی رہتے تھے مگر رنگا کی بستی کا نام صرف "بستی" تھا۔

ہمارا پہلا دن بخیریت گزر گیا۔ بستی کی طرف کوئی قافلہ نہ آیا۔ صرف رنگا کی جورو جس کا نام "بسنتی" تھا، ہماری خدمت پر مامور تھی یا پھر اس کی گیارہ بارہ برس کی لڑکی چمپا ہمیں کھانا پہنچاتی اور برتن سمیٹ کر لے جاتی تھی۔ کوئی دوسری عورت ہمارے پاس نہیں آئی۔ اس کا سبب بھی معلوم ہو گیا۔ بستی کی عورتوں میں صرف بسنتی اور چمپا ہی نہ اُپلے تھاپتیں، نہ گوبر کو ہاتھ لگاتی تھیں۔ غالباً رنگا کو یہ بات بتادی گئی تھی کہ ہمارا تعلق شاہی گھرانے سے ہے۔ جبھی اس نے اپنی جورو اور چھوری کے سوا کسی تیسری عورت کو ہمارے کھانے اور برتنوں کے قریب بھی نہیں پھٹکنے دیا۔ ماں بیٹی ہماری ہر ضرورت کا خیال رکھتی تھیں۔ ہمیں وہاں کوئی تکلیف نہیں تھی۔ البتہ جب ہوا مغرب سے مشرق کی طرف چلتی، مویشیوں کے باڑوں سے اُٹھنے والی گوبر کی بُو سے طبیعت متلانے لگتی تھی۔ مویشیوں کے باڑے بستی کے مغرب میں تھے اور ہمیں جس خاکستری مکان میں ٹھہرایا گیا، وہ مشرق میں واقع تھا۔

بستی میں رہتے تین چار دن بیت گئے۔ انگریزی کیمپ تک دودھ بیل گاڑیوں پر رنگا کے نائب کی نگرانی میں جاتا اور وہی مغل شہزادوں، باغیوں، قلعے سے کسی قسم کا تعلق رکھنے والوں اور بعض دوسرے لوگوں کی گرفتاریوں اور پھانسیوں کی خبریں لے کر آتا تھا جو رنگا کے ذریعے ہم تک پہنچتی رہتی تھیں۔ ظلم، دہشت، ہلاکت کی خبریں سن کر جسموں میں خون یوں کھولنے لگتا جیسے چولہے پر رکھی دیگچی میں پانی کھولتا ہے۔ رحم ہمارے دلوں سے رخصت ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دنیا جو کبھی لال قلعے کے جھروکوں سے بڑی حسین اور خوش رنگ نظر آیا کرتی تھی، اب ایک ویرانے کے خاکستری مکان سے دُکھوں اور مصیبتوں کا گھر دکھائی دینے لگی۔ دنیا کے کسی ملک میں لوگوں نے ایسے خوفناک نظارے شاذ و نادر ہی دیکھے ہوں گے جو کمپنی سرکار ہر روز اہلِ دہلی کو دکھا رہی تھی۔

ہم 19 ستمبر 1857ء کو لال قلعے سے نکلے 21 ستمبر کی رات کو مقبرۂ ہمایوں کو چھوڑ کر دہلی کے کھنڈروں اور خرابوں کے درمیان رنگا کی بستی میں آئے تھے۔ اسی بستی میں چند روز ہمارا قیام رہا لیکن اسی عرصے میں ہم نے مغلوں کی تباہی و بربادی کی جو خبریں اور کہانیاں سنیں وہ دل ہلا دینے والی تھیں۔

یہی وہ مقام ہے جہاں مغلوں کا انجام ہمارا منتظر تھا اور میں تجھے اسی ہولناک انجام سے آگاہ کروں گی۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

یہ ہولناک منظر دیکھ کر ضعیف العمر بادشاہ کے دل پر کیا بیت گئی ہوگی؟ سنا ہے جب انہوں نے جوان بیٹوں کا یہ حشر دیکھا تو مارے صدمے کے غش کھا کر گر پڑے۔ زینت محل اور مرزا جواں بخت نے بھی وہ بھیانک منظر دیکھا جو انہیں نہیں دیکھنا تھا۔ مگر اس دنیا میں اکثر لوگوں کو ایسی چیزیں دیکھنا پڑتی ہیں، جنہیں وہ دیکھنا پسند نہیں کرتے۔

زینت محل انگریز پر بھروسہ کرتی رہی تھیں۔ انہوں نے خود بادشاہ کو حفظِ جان کے وعدے پر گرفتاری کا مشورہ دیا تھا، غالباً یہ سوچا ہوگا کہ انگریز، اعلیٰ حضرت کے خلاف جو باغیوں کے آلہ کار بن گئے تھے اپنی ناراضی کا تھوڑا بہت اظہار ضرور کریں گے لیکن اس حد تک نہیں جائیں گے جو بوڑھے بادشاہ کے لیے اذیت کا باعث ہو۔ شہزادوں کے بریدہ سر دیکھ کر ان کی خوش فہمیوں کے آبگینے ٹوٹ گئے ہوں گے اور وہ سمجھ گئی ہوں گی کہ ہندوستان پر اپنا راج قائم کرنے کے لیے انگریز کہاں تک جا سکتے ہیں۔

بوڑھے بادشاہ کی خدمت میں ان کے عزیز بیٹوں کے سر پیش کرنے کا مقصد یہ ظاہر کرنا تھا کہ دہلی سے ان کی بادشاہت اور ہندوستان سے مغلیہ خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ اگر وہ اس صدمہ سے مر نہیں سکتے تو زندہ درگور ہو جائیں۔

صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بوڑھے بادشاہ کو اذیت پر اذیت دینے اور ان کی عزتِ نفس کو مجروح کرنے کا سلسلہ جاری رہا۔ انہیں صرف پانچ روپے یومیہ خوراک کے لیے ملتے تھے۔ فرنگی پہرے دار توہین آمیز فقرے کہتے اور انگریز حکام ان کے دل پر نت نئی بجلی گراتے تھے۔ مرزا الٰہی بخش اور اس کے مخبر اگر مقبرۂ ہمایوں میں پناہ لینے والے افراد کے متعلق خبریں دے رہے تھے تو منشی رجب علی کے گماشتے درگاہ نظام الدین اولیاؒ میں مغلوں کی تاک میں تھے۔

دوسرے روز لیفٹیننٹ میکڈانلڈ نے مقبرہ ہمایوں میں اور سانڈرس نے فرنگی سواروں کی جمعیت کے ساتھ درگاہ پر چھاپے مارے۔ 30[1] شہزادوں کو گرفتار کر لیا جن میں بادشاہ کے بیٹے، پوتے، نواسے اور داماد شامل تھے۔ شاہ اکبر ثانی عرش آرام گاہ کے بھائی مرزا قیصر جو بہت بوڑھے اور رشتے میں بہادر شاہ ظفر کے چچا تھے، نیز شاہ اکبر ثانی کے پوتے مرزا محمود شاہ بھی جو گنٹھیا کے مریض تھے، گرفتار ہوئے۔

شاہی خاندان کے ان تمام افراد کو پھانسیوں پر لٹکا دیا گیا۔ بوڑھے اور مریض بھی سزائے موت سے نہ بچ سکے۔ حالانکہ مرزا قیصر اور مرزا محمد غدر میں حصہ لینے کے قابل ہی نہ تھے۔ مگر اصل مدعا مغلیہ خاندان کو ختم کرنا تھا۔ پھانسی پانے والے تیس شہزادوں کے سر کاٹ کر بطور تحفہ بوڑھے بادشاہ کو بھجوائے گئے کہ وہ خاندان کا حسرت ناک انجام دیکھ لیں۔

میری عزیز پھوپھی، احمدی بیگم کے شوہر مرزا مینڈھو جو مرزا منجھو بھی کہلاتے اور بڑے دبدبے کے آدمی تھے، گرفتار ہوئے۔ مرزا بخت آور بھی پکڑے گئے، دونوں کو دریائے جمنا کی ریت پر کھڑا کر کے گولیوں کی باڑھ ماری گئی۔ مرزا شاہ رخ مرحوم کے بڑے صاحب زادے مرزا عبداللہ جن کا ذکر نرگس نظر کے حوالے سے کر چکی ہوں

---

[1] مولوی ذکاء اللہ نے اپنی ''تاریخ ہندوستان'' میں جو عہد انگلشیہ کے عروج کی تاریخ ہے، گرفتار ہونے والے شہزادوں کی تعداد 29 لکھی ہے مگر ظہیر دہلویؒ کی ''داستانِ غدر'' سے تصدیق ہوتی ہے۔ اصل تعداد 30 تھی۔ (مصنف)

بھاگنے والوں کو جس بے رحمی سے قتل کیا اور لوگوں کو جس کثرت سے پھانسیاں دی گئیں، ان کی مثال کہیں مشکل ہی سے مل سکے گی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان پر اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لیے ایک طرف ہندوستانیوں پر اپنی دہشت مسلط کر رہی تھی تاکہ وہ دوبارہ بغاوت کا نام نہ لیں اور ہمیشہ اس کی طاقت و ہیبت سے ڈرتے رہیں۔ دوسری جانب مغلوں کو نیست و نابود کرنے اور انہیں صفحۂ ہستی سے مٹا دینے پر تُلی گئی تھی تاکہ دودمانِ تیموری سے کوئی ایسا شخص زندہ نہ رہ جائے جو آگے چل کر کبھی حکومت و سلطنت کا دعویٰ کر سکے۔

کسی سلطنت، زمین یا جائیداد پر قبضہ کرنے اور اسے اپنی ملکیت بنانے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کے وارثوں کو مکمل طور سے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے اور کسی کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ کم از کم ایسے افرادِ خاندان کی زندگی ضرور چھین لی جائے جن کی طرف سے حقِ وراثت کا خطرہ ہو سکتا ہے۔

مغل سلطنت کے دو ولی عہد دارا بخت اور مرزا فخر الدین فتح الملک وفات پا چکے تھے۔ مرزا فخر الدین کی وفات کے بعد اگرچہ اعلیٰ حضرت قطعی طور پر اپنی چہیتی ملکہ زینت محل کے فرزند مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنانا چاہتے تھے مگر کمپنی سرکار نے شہزادوں کی ترتیب اور عمر کے اعتبار سے مرزا قویاش کو ولی عہد تسلیم کر لیا تھا اور یہ بات بادشاہ کی مرضی کے خلاف ہوئی تھی۔ ولی عہدی کے معاملے میں خاندان اور سرکار انگلشیہ کے ساتھ اعلیٰ حضرت کا جو طویل جھگڑا چلتا رہا، اس کی تفصیل میں آگے چل کر بیان کروں گی۔ اس وقت صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ ولی عہد مرزا قویاش بادشاہ کی گرفتاری کے بعد مقبرۂ ہمایوں سے نکل گئے اور زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ معلوم نہیں اُنہیں کسی فرنگی، کسی جاٹ، کسی تلنگے یا کسی درندے نے ہلاک کر دیا تھا۔ ان کی لاش تک نہ مل سکی۔

تین نامور شہزادے مرزا ظہیر الدین مغل، مرزا ابوبکر اور مرزا خضر سلطان جن کی طرف سے وراثت کے دعوے کا خطرہ تھا، میجر ہڈسن کی بربریت کا نشانہ بن چکے تھے اور ان کی لاشیں کوتوالی میں لٹکا کر فرنگی حاکموں نے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کر لیا تھا۔ شہزادہ جواں بخت جن کی ولی عہدی کے لیے بادشاہ ایک طرف اپنے بڑے لڑکوں اور دوسری جانب سرکار انگلشیہ سے اُلجھتے رہے تھے، ان کے ساتھ ہی لال کنوئیں کی حویلی میں یا زینت محل کے کمرے میں نظر بند تھے۔ زینت محل کو بھی وہیں نظر بند کیا گیا۔ بادشاہ کی دوسری اہم حرم تاج محل بھی اپنے بیٹے شہزادہ عباس شاہ کے ساتھ فرنگی کی تحویل میں تھیں۔

مغلیہ سلطنت کی وراثت کے قابل ذکر دعوے دار یا تو قتل ہو گئے یا انگریز کی قید میں تھے۔ اس کے باوجود مغلوں کو تباہ و برباد کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی گئی اور شاہی خاندان کے افراد کو چن چن کر موت کے گھاٹ اُتارا گیا۔

جیسا کہ میں بتا چکی ہوں، بادشاہ کے تین بیٹے قتل ہوئے اور ان کی لاشیں بیس گھنٹے کوتوالی کے باہر لٹکتی رہیں لیکن اس سنگ دلی یا دہشت گردی کا انتہائی اذیت ناک پہلو یہ ہے کہ تینوں شہزادوں کے سر کاٹ کر اور ایک طباق میں سجا کر جس پر ریشمی رومال ڈال دیا گیا تھا، زینت محل کی حویلی میں جو زینت محل کے کمرے کے نام سے پکاری جاتی تھی، نظر بند بوڑھے بادشاہ کے حضور پیش کیے گئے کہ اگر ان کے مصائب اور صدمات میں کوئی کمی رہ گئی ہے تو جوان بیٹوں کے کٹے ہوئے سروں سے پوری ہو جائے۔

ترپولیہ کے درمیان ایک حوض ہے، جہاں سات پھانسی گھر تھے۔ چھ چھ سات سات آدمیوں کو بیک وقت پھانسی دی جاتی تھی۔ اگر پھانسی پانے والے زیادہ ہوتے تو انہیں پھانسی کے لیے اپنی باری اا س وقت تک انتظار کرنا پڑتا تھا جب تک ان سے پہلے پھانسی پانے والوں کی لاشیں اُتار نہ لی جاتیں۔

ان دنوں موت سستی اور زندگی مہنگی تھی۔ صرف دہلی میں 27 ہزار مسلمان قتل کیے گئے۔ دہلی سے بھاگ کر جو لوگ راستوں میں جاٹوں، تلنگوں یا سکھوں اور فرنگیوں کے ہاتھوں مارے گئے وہ مستزاد ہیں۔ لاشیں گڑھوں میں یا راستوں پر پھینک دی جاتی تھیں جنہیں مردار جانور گھسیٹ کر لے جاتے یا ان کا گوشت گِدھوں، چیلوں اور کوّوں کے پوٹوں میں اُترتا تھا۔

کمپنی سرکار نے مغلوں کے ساتھ مسلمانوں اور آزادی کے خواہاں ہندوؤں کے لیے بھی موت کے راستے کھول دیئے تھے۔ ان راستوں پر اَن گنت لوگ ہمیشہ کے لیے گم ہو گئے۔ انگریز حاکموں نے تجارت کے لبادے اور مصلحت کے لباس اُتار کر فوجی وردیاں پہن لی تھیں۔ ان کی بندوقوں کے دہانے صرف موت اُگلتے تھے اور تلواروں کے وار سے ہندوستانیوں کا خون ٹپکتا تھا۔ انہوں نے بستیاں اُجاڑ دیں، قلعے مسمار کر دیئے اور لاتعداد مکانات کھنڈروں میں تبدیل کر دیئے۔ صرف دہلی میں ایک لاکھ مکان منہدم کیے گئے اور شہر ایسا ویران ہوا کہ لوگ مغلوں کی دہلی کو یاد کر کے آنسو بہاتے تھے۔

اس زمانے میں درندے بھوکے رہتے تھے نہ پرندے۔ وہ انسانی لاشوں کی ضیافت اُڑاتے تھے جو بکثرت دستیاب تھیں اور انسانی گوشت فراوانی سے مل جاتا تھا۔ ہندوستان کی فضا میں خون کی مہک رچ بس گئی تھی۔ ہوا کے جھونکے سرسراتے تو یوں لگتا جیسے ان کی سرسراہٹ ہڈسن اور سانڈرس اور کوپر جیسے درندوں کا نام لے رہی ہو۔ عورتیں راتوں کو وحشت ناک خوابوں سے ڈر کر بیدار ہو جاتی تھیں جن کے باپ، بھائی، شوہر اور بیٹے بڑی بے رحمی سے ہلاک کر دیئے گئے یا پھانسیوں پر لٹکائے گئے تھے۔

دہشت گردی کی انتہا یہ تھی کہ لوگوں کے گلے میں رسے باندھ کر انہیں درختوں پر پھانسی دی گئی۔

فرنگی نے ہندوستان میں سازشوں، رقابتوں، بدعہدیوں کے جو بیج بوئے وہ تناور درخت بن گئے تھے جن کے ساتھ ہندوستانیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں۔

اے ہندوستان کے سیاہ!

ارضِ دہلی کے مسافر!

جب تک میں جنگ آزادی کی ناکامی، ہندوستانیوں کی شکست و بربادی اور مغلوں کے حسرت ناک انجام کی روداد بیان نہ کرلوں، اپنی کہانی کا آغاز نہیں کرسکتی۔

میں نے راستوں پر پڑی ہوئی اور جانوروں کی کھائی ہوئی لاشیں دیکھی ہیں۔

لاشوں کے جنگل اور لاشوں کے شہر دیکھے ہیں۔

اُجڑی بستیاں اور پیوند زمین عمارتیں دیکھی ہیں۔

مکانوں کے ملبے اور ان ملبوں پر بیٹھ کر لٹے پٹے تباہ حال مردوں اور عورتوں کو آنسو بہاتے دیکھا ہے۔

جو کچھ میں نے دیکھا ہے وہ سورما بہادروں کو بھی لرزا دینے کے لیے بہت ہے۔ جو منظر میری نظروں سے

اگرچہ سائیس کا روپ بدل کر قلعے سے نکل گئے تھے لیکن کسی مخبر کی نشاندہی پر پکڑے گئے۔ میجر ہڈسن نے انہیں دہلی جیل کے سامنے اپنے ہاتھوں گولی ماری۔ بادشاہ کے محافظ دستے کا کمانڈر سمندر خاں کشمیری دروازے سے نکل رہا تھا کہ پکڑا گیا اور اسے گولی ماردی گئی۔

بعض شہزادوں کو جن میں بادشاہ کے پوتے اور نواسے شامل تھے صرف مغل ہونے کے جرم میں عمر قید کی سزا دے کر جیل بھیج دیا گیا جہاں ان سے چکی پسوائی جاتی اور کڑی مشقت لی جاتی تھی۔ مشقت نہ کرنے کی سزا میں کوڑے لگائے جاتے تھے۔ وہ بے چارے کوڑے کھاتے ہوئے مر گئے۔ ان میں سے کوئی بھی جیل سے باہر نہ آسکا۔

مغلوں کے بہی خواہوں کو بھی پھانسیاں دی گئیں۔ جھجھر کے رئیس عبدالرحمٰن خاں اور بلب گڑھ کے راجہ ناہر سنگھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ بغاوت کے ایام میں کسی انگریز نے ان سے پناہ لینا چاہی اور انہوں نے پناہ نہ دی تھی۔ اسی الزام میں دونوں کو پھانسی دے کر ان کی جاگیر اور جائیداد ضبط کر لی گئی۔ فرخ نگر[1] کے نواب احمد علی خان کو بھی اسی جرم میں پھانسی دی گئی۔

نواب بہادر جنگ خاں کے صاحبزادے محمد علی، شیخ امام بخش صہبائی اور ان کے بیٹے تقریباً ساٹھ افراد سمیت جانی تحفظ کی خاطر محمد علی کے مکان میں بند ہو گئے تھے۔ انہوں نے کسی فرنگی اور گورکھے کو، جو دیوار پھلانگ کر اندر داخل ہو رہے تھے روکا اور اپنی حفاظت کے لیے گولی چلائی تھی جس پر فوج نے حملہ کر کے سب کو ہلاک کر ڈالا۔

کمپنی سرکار کے انگریزی اور دیسی سپاہی جس شخص کو دیکھتے، اس پر گولی چلا دیتے تھے۔ مرزا اسد اللہ غالب کے بھائی مرزا یوسف جنہیں دیوانگی کا عارضہ تھا، گولیوں کی آواز سن کر باہر نکلے تھے کہ خود بھی گولی کا نشانہ بن گئے۔

بادشاہ کے استاد شیخ ابراہیم ذوق کے فرزند خلیفہ محمد اسمٰعیل فوق کو اس لیے پھانسی دی گئی کہ وہ شاہی اہلکار تھے۔

پلول کے جاگیردار نواب مرتضیٰ خاں کے صاحب زادے نواب میر خاں اور اس کے نوجوان بیٹے عثمان خاں پر یہ ''جرم'' عائد کیا گیا کہ وہ بادشاہ کے پوتے مرزا عبداللہ کے ہاں آتے جاتے تھے۔ باپ بیٹے کو اسی جرم میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔

فرخ آباد کے نوابوں میں سے نواب سخاوت حسین، نواب اقبال مند خاں، نواب غضنفر حسین خاں کو پھانسی دی گئی۔ لال قلعے کی حوالات میں بھی بہت سے نواب، رئیس اور امیر زادے قید تھے۔ ان میں سے ایک دو کو روز پھانسی ہوتی تھی۔

پھانسی پانے والوں کی ایک طویل فہرست میرے سامنے موجود ہے جو ماموں اورنگ مرزا نے مجھے مہیا کی تھی۔ ان کی تعداد تین ہزار[2] سے کچھ زیادہ ہے۔ دہلی میں شارع عام پر پھانسی گھر بنائے گئے تھے۔ کوتوالی اور

---

[1] مرزا غالب نے ''دستنبوہ'' میں جھجر، بلب گڑھ اور فرخ نگر کے والیوں کو پھانسی دینے کا ذکر کیا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ نے بھی ''تاریخ ہندوستان'' جلد نہم میں ان پھانسیوں کے متعلق لکھا ہے۔ (قمر اجنالوی)

[2] ایک انگریز مؤرخ اسپنسر وال پول کے مطابق بھی تین ہزار آدمیوں کو پھانسی دی گئی۔ دہلی میں سات روز تک قتل عام جاری رہا اور شہر کو اس طرح لوٹا گیا کہ نادر شاہی لوٹ مار بھی اس کے سامنے ہیچ تھی۔

(بحوالہ قیصر التواریخ)

(7)

مغلوں کا انجام

سقوطِ دہلی کے ساتھ ہی جب قلعہ خالی کر دیا گیا، جس طرف جس کا منہ اُٹھا، چل دیا۔ میں تجھے بتا چکی ہوں کہ شاہ عالم اکبر شاہ اور بہادر شاہ ظفر کی اولاد کے علاوہ 70 شہزادے قلعے میں رہتے تھے، جوان کے بھائیوں کی اولادیں اور شاہی خاندان سے اسی تعلق کی بنا پر ''سلاطین'' کہلاتے تھے۔ پھر ان کی بیگمات اور اولادیں بھی تھیں۔ گویا قلعے میں مغلوں کا ایک شہر آباد تھا جو 19 ستمبر 1857ء کو اُجڑ گیا۔ مرزا الٰہی بخش کا شمار بھی ''سلاطین' میں ہوتا تھا۔

اعلیٰ حضرت کے وہ قریبی عزیز (بیگمات، بیٹے، بیٹیاں اور داماد) جن کی رہائش قلعے میں تھی، ان کے انجام میں شریک تھے۔ لیکن 19 ستمبر کی رات ہی کو بادشاہ نے ان سب سے کہہ دیا تھا کہ وہ قلعے سے نکل جائیں اور ایسی جگہوں پر چلے جائیں جہاں محفوظ رہ سکیں۔ وہ باری باری سب سے رخصت ہو لیے اور کہہ چکے تھے کہ تمہیں خدا کو سونپا۔ اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے، ورنہ یہ آخری اور الوداعی ملاقات ہے۔ اپنے بیٹوں کو انہوں نے مقبرۂ ہمایوں میں جانے کا مشورہ دیا تھا جہاں خود بھی قیام کرنا چاہتے تھے لیکن بیٹیوں اور دامادوں سے کہہ دیا تھا کہ ہو سکے تو دہلی سے نکل جائیں۔

قلعہ چونکہ رات کو خالی کیا گیا تھا اس لیے شہزادوں کے ساتھ بیشتر افراد مقبرۂ ہمایوں ہی کی طرف بھاگے تھے۔ کچھ درگاہ نظام الدین اولیاؒ اور کچھ قطب صاحب میں چلے گئے۔ لیکن بہت سے لوگ یا تو دہلی کے گرد و نواح ہی میں کہیں چھپ گئے یا راتوں رات دہلی سے نکل گئے۔ جو خود نہ جا سکے انہوں نے اپنے بیوی بچوں کو ضرور بھیج دیا مگر بادشاہ کی گرفتاری اور شہزادوں کی ہلات کے بعد شاہی خاندان کے افراد کی تلاش شروع ہو گئی تھی اور وہ اپنے انجام کو پہنچ رہے تھے جو فرنگی نے ان کے لیے مقدر کر دیا تھا۔

انگریز کا انتقام چنگیز و ہلاکو کی دہشت اور سفاکی سے کم نہ تھا۔ میں نے مقبرۂ ہمایوں میں 21 ستمبر کی رات تک فاتحوں کی درندگی کے کئی جگر خراش واقعات سن لیے تھے۔ اسی رات تیسرے پہر ہم نے صفدر پیا کے پراسرار ملاقاتی کی ہدایت پر مقبرے کو چھوڑ دیا اور علی گنج کے ویرانے میں آ گئے تھے۔ ہم مقبرے سے کس طرح نکلے اور علی گنج تک کیسے پہنچے؟ اس کی روداد پھر سناؤں گی۔ پہلے تجھے اپنے وہ زخم دکھانا چاہتی ہوں جو میرے عزیزوں کی

گزرے ہیں، شاید ہی کسی بنتِ حوا کی نظروں سے گزرے ہوں گے۔

اتنی ڈھیر ساری لاشیں دیکھنے کے بعد بھی میں زندہ ہوں مگر جب وہ بھیانک مناظر میرے تصور میں اُبھرتے ہیں تو نبضوں میں خون منجمد ہونے لگتا ہے اور نظروں کے سامنے ترمرے سے ناچ اُٹھتے ہیں۔

میں نے ان شہزادوں کو جو رشتے میں میرے چچا، تایا اور بھائی تھے، فرنگی کی گولیاں کھاتے یا پھانسیوں پر لٹکتے نہیں دیکھا لیکن میرے کانوں نے ان کے تڑپنے اور دم توڑنے کی لرزہ خیز روداد سنی ہے، جسے سن کر مجھ پر سکتہ طاری ہو گیا اور یوں لگا جیسے میں ان کے ساتھ مر گئی ہوں۔

میرے مہمان عزیز!

یہ مغلوں کا نوحہ اور ہندوستانیوں کی فریاد ہے جو میں تجھے سنا رہی ہوں۔

یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف انسانیت کی بے حرمتی اور پامالی کا استغاثہ[1] ہے۔ جو میں نے تیرے ذریعے دنیا کی عدالت میں پیش کیا ہے لیکن یہ استغاثہ یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ اس کے کچھ بھیانک پہلو اور بھی ہیں۔

میں تجھے وہ پہلو، وہ گھاؤ، وہ زخم دکھاؤں گی اور تو جان لے گا کہ مغلوں کی کہانی کا انجام کتنا دردناک ہے۔

❁......❁......❁

---

[1] اس سرگزشت میں انسانی بے حرمتی کا جو استغاثہ پیش کیا گیا ہے، اس کی تصدیق اور تائید میں چند انگریزی شہادتیں ملاحظہ ہوں:

لندن کا اخبار ''ٹائمز'' بابت 16 نومبر 1857ء لکھتا ہے کہ انگریز فاتحین نے شہریوں کا قتل عام کیا۔ ہزاروں لوگوں کو تختۂ دار پر لٹکا دیا، جن کا اس بغاوت سے کوئی تعلق نہ تھا۔ دیہات میں غارت گری اور خوں ریزی کر کے ملک کو ویران اور سنسان بنا دیا۔

اس دور کے وزیراعظم انگلستان مسٹر ڈزریلی نے 30 ستمبر 1857ء کو ہندوستان میں ہونے والے قتل عام پر جو تقریر کی، وہ لائف بائی بیو کلے چہارم کے صفحہ 98 اور 99 پر درج ہے۔ انگلستان کے وزیراعظم نے کہا کہ ہندوستان میں انگریزی فوجیں جس طرح انتقام لے رہی ہیں، کسی انسان میں اس کو دیکھنے کی ہمت نہیں اور میں اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ انہوں نے اس بات پر بھی اظہارِ افسوس کیا کہ ان کی قوم کے مذہبی عقائد میں بڑی تبدیلی آ گئی ہے۔ وہ یسوع مسیح کی تعلیم کو چھوڑ بیٹھی اور اس کی جگہ خوں ریزی کے یونانی دیوتا مولوک کی رستم پرستش نئے سرے سے زندہ کر رہی ہے۔

ایک پادری کی بیوہ "Escape from Gawaliar" (گوالیار سے فرار) میں بیان کرتی ہے کہ لڑائی کے بعد بہت سے قیدیوں کو پھانسی دی گئی۔ فوجی عدالت کے حکم پر آدمیوں کو توپوں سے باندھ کر اُڑایا گیا۔ ایک دن ایک توپ میں بارود زیادہ بھری گئی۔ جب توپ چلائی گئی تو ملزم کا جسم گوشت کے لوتھڑوں میں تبدیل ہو کر اُڑا اور تماشائیوں پر گرا۔ آخر یہ انسانیت سوز اذیت ہم کب تک برداشت کریں گے؟

پر دھاوا بول دیا۔ قیمتی کپڑے، روپیہ اور زیور سب کچھ لوٹ لیا۔ زندگی بھی خطرے میں نظر آئی۔ میرٹھ کے گاؤں اجاڑہ میں شاہی حکیم میر فیض علی کی رہائش تھی۔ شہزادی کلثوم زمانی اور نواب نور محل نے کورالی کے زمیندار سے درخواست کی کہ انہیں کسی طرح اجاڑہ پہنچا دیا جائے۔ زمیندار نے اپنی بیل گاڑی پر شاہی خانوادے کو شاہی حکیم کے گاؤں پہنچا دیا۔ لیکن میر فیض علی نے آنکھوں پر ٹھیکری رکھ لی اور جواب دے دیا کہ اپنے گھر میں نہیں ٹھہرا سکتا۔

یہ ٹکا سا جواب سن کر کلثوم زمانی، نور محل اور مرزا ضیاء الدین بڑے پریشان ہوئے کہ اب کیا کریں، کہاں جائیں؟ لوٹ مار کے لیے تو کچھ پاس نہ تھا لیکن انگریزی فوج کے ہاتھوں گرفتاری کا خطرہ تھا۔ آخر حیدر آباد جانے کا فیصلہ ہوا۔ کورالی کے زمیندار نے جس کا نام معلوم ہوا کہ ''بستی'' تھا ساتھ نہیں چھوڑا اور انہیں لے کر دکن کی طرف چل پڑا۔ تینوں عورتیں بیل گاڑی میں تھیں۔ مرزا ضیاء الدین اور اور مرزا عمر سلطان گاڑی کے ساتھ ساتھ پیادہ پا چلتے رہے۔ بڑا طویل سفر اور جوکھوں کا راستہ تھا۔ مشکلیں، مصیبتیں اُٹھاتے کئی دنوں کے بعد آخر حیدر آباد پہنچی۔ وہاں ایک مکان کرائے پر لے لیا۔ مرزا ضیاء الدین بڑے اچھے خوش نویس تھے۔ طغرے لکھ کر چار مینار میں بیچتے رہے۔ بعد ازاں بارہ روپے ماہوار پر ایک نواب کے صاحب زادے کو قرآن پڑھانے کی نوکری کر لی مگر پتہ چلا کہ نواب شکر جنگ جس نے کچھ شہزادوں کو پناہ دی تھی، انگریز سے خوف زدہ ہو گیا ہے اور اس نے فیصلہ کیا ہے کہ اب شاہی خاندان کے کسی فرد کو پناہ نہیں دی جائے گی بلکہ جو کوئی آئے گا اسے حوالۂ انگریز کیا جائے گا۔

اب خبر نے نواب نور محل اور کلثوم زمانی بیگم کو پریشان کر دیا۔ اتفاق سے میاں نظام الدین کو جو حضرت میاں کالے صاحب کے فرزند تھے، ان کی حیدر آباد میں موجودگی کا علم ہوا تو خود ملنے آئے اور مل کر بڑے روئے۔ میاں نظام الدین نے سارے اخراجات کا بندوبست خود کیا اور ان لوگوں کو حج کے لے مکہ معظمہ بھجوا دیا جس سے ان کی مصیبت کٹی۔

❁......❁......❁

اعلیٰ حضرت کی بیٹی فاطمہ سلطان جو خاصی پڑھی لکھی تھیں، کافی عرصہ روپوش رہیں۔ بعد ازاں جب حالات ذرا سنبھلے تو انہوں نے دہلی کے ایک زنانہ مشن اسکول میں بطور معلّمہ نوکری کر لی اور اسی حیثیت سے زندگی بسر کی۔ خجستہ اختر اور محمدی بیگم جیسی شہزادیوں نے بھی معلّمی کا پیشہ اختیار کیا۔ محمدی بیگم ولی عہد مرزا دارا بخت کی بیوہ تھیں۔

بادشاہ کی دختر شہزادی ربیعہ بیگم بھی دوسری بہنوں کی طرح بڑے ناز و نعم میں پلی تھیں۔ غدر کے بعد شاہی خاندان پر جو مصیبت آئی، ربیعہ بیگم کو بھی اس سے گزرنا پڑا۔ اس مصیبت نے شہزادی سے زندگی کی ساری راحتیں چھین لی اور مجبوراً اُنہیں حسینی باورچی سے عقد کرنا پڑا۔ بعض لوگ اس واقعے پر طنز بھی کرتے ہیں کہ شاہِ دہلی بہادر شاہ ظفر کی بیٹی اور ایک باورچی کی بیوی لیکن یہ المیہ ان حالات کا نتیجہ تھا جس نے شاہی خاندان کے مردوں سے زندگیاں چھین لیں اور جو بچ گئے انہیں تنکوں کی طرح بکھیر دیا۔

ولی عہد مرزا دارا بخت جن کا انتقال جنوری 1849ء میں ہوا بڑے کثیر العیال تھے۔ چودہ صرف لڑکے تھے جن میں مرزا کالے، مرزا ابو، مرزا جھپو، مرزا احمد قابل ذکر ہیں۔ ان کی بیٹی گل بانو سے اعلیٰ حضرت اس لیے بھی بڑا پیار کرتے تھے کہ یتیم ہے۔ خیر قلعے میں یتیم شہزادیاں تو اور بھی تھیں لیکن بادشاہ چونکہ دارا بخت کو چاہتے اور ا

ہلاکت وخوں ریزی سے میرے دل پر لگے۔ یوں تو ہر زخم بڑا کاری اور ہر گھاؤ بڑا اذیت ناک تھا لیکن کچھ زخم ایسے ہیں، جنہیں وقت کا مرہم بھی مندمل نہیں کر سکا اور وہ کئی سال گزر جانے کے بعد آج بھی تازہ ہیں۔ ان زخموں میں اعلیٰ حضرت کی بیٹی اور میری پھوپھی احمدی بیگم کی بربادی اور ان کے شوہر مرزا مینڈھو کی ہلاکت کا زخم سب سے نمایاں ہے۔ جب تُو میری کہانی سنے گا تو خود سمجھ لے گا کہ وہ دونوں مجھے سب سے زیادہ کیوں عزیز تھے؟ وہی تو میری خبر گیری کرتے اور میری محبت کو پروان چڑھانے کی خاطر بادشاہ اور زینت محل تک سے جھگڑتے رہے تھے۔ انہی کی کوششوں سے صفدر پیا کے ساتھ میری نسبت طے ہوسکی ورنہ زینت محل تو مجھے کسی اور ہی کے پلے باندھنے پر تلی ہوئی تھیں۔

مرزا مینڈھو بڑے رعب داب والے اور دل کے کھرے آدمی تھے۔ دہلی میں ان کا خاص دبدبہ تھا۔ اپنی سرکار تھی، جہاں بیسیوں لوگ حاضری دیتے اور ان کے دسترخوان میں شریک ہوتے تھے۔ ان کی حویلی خانم کے بازار میں تھی۔ یہ بازار لال قلعے اور جامع مسجد کے درمیان کشمیری دروازے تک واقع اس علاقے میں تھا جو لال ڈگی جیل، کُوچہ بلاقی بیگم، کُوچہ خان چند، اُردو بازار اور گلیوں کا بازار جیسی آبادیوں پر مشتمل تھا، ان میں خانم کے بازار کو ایک خاص مقام حاصل تھا اور یہ خاص مقام مرزا مینڈھو کی عالی شان حویلی کے طفیل تھا جس کے دروازے پر ہمہ وقت پالکی نالکی لگی رہتی تھی۔

مرزا مینڈھو رعب وداب بھی رکھتے اور بہادر بھی تھے۔ فرنگی سے جنگ شروع ہوئی تو انہوں نے اپنی پلٹن کے ساتھ لڑائی میں حصہ لیا اور دشمن کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ باغی فوج کی شکست کے بعد فرنگی کو ان کی تلاش تھی اور جب وہ پکڑے گئے تو انہیں دریائے جمنا پر لے جا کر گولیوں سے چھلنی کر دیا گیا۔ ان کا لہو جمنا کی ریت میں اور جسم ایک گڑھے میں اُترا۔

شہزادی احمدی بیگم کو شوہر کے ہلاک ہونے کی خبر ملی تو دل پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ شہر کی حالت بد سے بدتر ہو گئی تھی۔ فرنگی، کشمیری دروازے سے شہر میں داخل ہو چکا تھا۔ لوگ بھاگ رہے تھے۔ احمدی بیگم کی حویلی بہو، بیٹیوں سے آباد اور دولت سے بھری ہوئی تھی۔ وہ افراتفری میں حویلی سے بھاگیں۔ زیور یا روپیہ ساتھ لے جانے میں جان کا خطرہ تھا۔ ہر طرف لوٹ مچ رہی تھی۔ انہوں نے زیورات دو دیگچیوں میں بھرے اور دونوں دیگچیاں حویلی کے اندر ہی گاڑ دیں۔ پھر بہو بیٹیوں سمیت صرف عزت ساتھ لے کر نکلیں اور در در کی ٹھوکریں کھاتی رہیں۔ آخر ایک گھر میں پناہ تو مل گئی لیکن پائی پائی کو محتاج ہو گئی تھیں۔ کپڑے چیتھڑوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ چاندی کی رکابیوں میں کھانے کا وقت گزر گیا تھا۔ اب مٹی کے برتن تھے۔ کوئی رحم کھا کر کچھ دے جاتا تو کھانا نصیب ہوتا تھا ورنہ فاقے سے رہتی تھیں۔

❁......❁......❁

اعلیٰ حضرت کی بیٹی کلثوم زمانی اپنے شوہر مرزا ضیاء الدین کے ساتھ قلعے میں رہتی تھیں۔ شوہر اور گود کی بچی زینت زمانی کو لے کر قلعے سے بھاگیں تو بادشاہ کی بیگم نور محل، ان کی والدہ اور بادشاہ کی سمدھن حافظ سلطان اور نور محل کے بھائی مرزا عمر سلطان بھی ہمراہ تھے۔ سواری کے لیے رتھ مل گیا۔ رتھ بان انہیں اپنے گاؤں کورالی میں لے گیا۔ رات خیریت سے گزر گئی مگر دوسرے دن اردگرد کے جاٹوں، گوجروں اور ان کی عورتوں نے کورالی گاؤں

نہیں ہوسکتا۔ تگا نمبردار ایک نیک آدمی تھا۔ اس نے نرگس نظر کو گھر میں رکھا۔ چار سال بعد اس کا رانگڑ خاوند رہا ہو کر آ گیا اور اسے اپنے گھر لے گیا۔

بادشاہ کی پوتی قلعے سے بھاگی۔ غازی نگر میں قید ہوئی پھر جاٹوں کے ہاتھ پڑی۔ ایک رانگڑ نے اسے خرید لیا اور اپنے بیٹے کا گھر بسایا۔ رانگڑ کو قید ہوئی مگر اس نے خریدی ہوئی بیوی کو اپنی ملکیت سمجھا اور قید سے رہا ہونے کے بعد اسے تگا نمبردار کے گھر سے لے گیا۔ تگا مسلمانوں نے رانگڑ کے اشارے ہی پر شہزادی نرگس نظر کو اغوا کیا اور اسے اپنے گاؤں میں رکھا تھا۔ یہ ہے ایک مغل شہزادی کی مصیبت اور بے کسی کا واقعہ کہ وہ بکی اور ایک رانگڑ کی جورو بنی۔

مرزا ظہیر الدین مغل کی ایک بیٹی لالہ رخ میری ہم نام تھی جس کی عمر اس وقت بہ مشکل آٹھ نو برس کے درمیان ہو گی۔ لالہ رخ ایک خوب صورت لونڈی کے بطن سے تھی جس سے مرزا مغل کو پیار ہو گیا تھا۔ اس لیے لالہ رخ کو بھی بہت چاہتے تھے اور مولانا عین اللہ کو اس کا اتالیق مقرر کیا تھا۔

قلعے میں انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل پر مولانا عین اللہ نے اعتراض کیا تھا کہ یہ ناجائز اور خلافِ اسلام ہے۔ جس پر ایک تلنگے باغی نے مرزا مغل اور لالہ رخ کی موجودگی میں انہیں چھرا گھونپ دیا کہ انگریزوں کی حمایت کرتے ہیں۔ تلنگا تو بھاگ گیا لیکن مولانا عین اللہ اس کے لگائے ہوئے زخم سے وہیں جاں بحق ہو گئے۔

پھر وہ وقت بھی آیا جب مرزا مغل خود میجر ہڈسن کے ہاتھوں ہلاک ہوئے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں فرانگی، انگریز عورتوں اور بچوں کے قتل کا انتقام مرزا مغل کی محبوب بیوی اور بیٹی سے نہ لیں، مرزا گھسیٹا جو شاہ عالم ثانی کی قربت کے باعث مرزا مغل کے ہاں رہتے تھے اور قدرت خاں جو قلعے میں ان کے قصر کا داروغہ تھا، ماں بیٹی کو ایک بہلی میں بٹھا کر مقبرۂ ہمایوں سے چھترپور کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک مہری بھی جو لالہ رخ کی خدمت پر مامور تھی، ہمراہ تھی۔ راستے میں تلنگے باغیوں کا دستہ مل گیا جو شکست کے بعد اِدھر اُدھر لوٹ مار کرتے پھر رہے تھے۔ انہوں نے بہلی کو گھیر لیا اور کہا کہ جو زیور اور مال و اسباب پاس ہے سب دے دو۔

ان میں وہ تلنگا باغی بھی تھا جس نے مولانا عین اللہ کو قتل کیا تھا۔ لالہ رخ نے اسے پہچان لیا۔ مرزا گھسیٹا اور قدرت خان نے ان سے تکرار کی کہ وہ انگریز کے باغی ہو کر اس شہزادے کے گھر والوں کو لوٹتے ہیں جو جنگ میں ان کا کمانڈر تھا اور جسے انگریز نے قتل کر دیا۔ تلنگوں نے حجت نکالی کہ قلعے کے مخبروں کی وجہ سے انہیں شکست ہوئی اور مغل کسی ہمدردی کے مستحق نہیں۔ جس پر بات بڑھ گئی تھی۔ تلنگوں نے مرزا گھسیٹا اور قدرت خان کو قتل کر دیا۔ مہری بھی جس کا نام خانم تھا، ماری گئی۔ صرف ماں بیٹی زندہ بچیں مگر ان کا سارا مال و اسباب اور زیور لوٹ لیا گیا۔

ایک تلنگے سوار نے جو بھرت پور کا رہنے والا تھا، مرزا مغل کی بیوی کو اپنے لیے پسند کر لیا کہ جوان اور خوبصورت ہے۔ مولانا عین اللہ کے قاتل نے لالہ رخ کا ہاتھ پکڑ لیا کہ اسے اپنی بیٹی بنا لے گا۔ وہ گوڑ گانواں کے ایک گاؤں سوہنہ میں رہتا تھا۔ اس طرح ماں بیٹی کے درمیان جدائی پیدا ہو گئی۔ انہوں نے بہت واسطے دیئے کہ انہیں جدا نہ کیا جائے مگر ان کی آہ و زاری کا کسی پر اثر نہ ہوا اور دونوں سوار اپنے ساتھیوں کے ہمراہ الگ الگ راستوں پر ہو لیے۔

کی وفات پر روئے بھی بہت تھے شاید اسی لیے گل بانو پر نظر توجہ تھی جب کہ وہ مرحوم دارا بخت کے لڑکوں سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ شہزادہ خضر سلطان کے بیٹے مرزا دارا شکوہ کو گل بانو سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ اسی کی خاطر وہاں آتے جاتے بھی تھے مگر یہ تعلق پروان نہ چڑھ سکا۔

جب غدر ہوا اور شکست و ناکامی کے ساتھ قلعہ خالی کرنا پڑا اس وقت گل بانو کی عمر پندرہ برس تھی۔ وہ اپنی ماں اور بھائیوں کے ساتھ درگاہ شاہ غلام نصیرالدین[1] میں پناہ گزین ہوئی تھی مگر بھائی تقریباً سب پکڑے گئے یا مارے گئے یا روپوش ہو گئے تھے۔ ماں مرگئی اور وہ اکیلی رہ گئی تھی۔ محبت کرنے والے بوڑھے دادا انگریز کی قید میں تھے۔ اب کوئی پرسانِ حال نہ رہا نہ کوئی دکھ بانٹنے والا تھا۔ اسی بے سی اور بے بسی کے عالم میں بدنصیب گل بانو اپنے والد مرزا دارا بخت کے مزار پر پہنچی جو درگاہ حضرت چراغ دہلی کے ایک کونے میں ہے اور قبر سے لپٹ کر قبر میں سونے والے باپ کو اپنا دُکھڑا سناتی رہی۔

سردی کا موسم اور تیز بارش۔ اس پر مستزاد یہ کہ گل بانو کو تیز بخار تھا۔ قبر سے لپٹ کر سو گئی۔ صبح قبر کے پہلو میں اس کی لاش پڑی تھی۔

❁......❁......❁

مرزا شاہ رخ مرحوم کی بیٹی نرگس نظر کا ذکر پہلے بھی کر چکی ہوں، میری ہم عمر تھی۔ رشتے میں چچا زاد بہن اور سہیلی بھی۔ اس نے غازی نگر جانے کا فیصلہ کیا تھا اور جس رات ہم قلعے سے نکلے ہیں وہ بھی خواجہ سرا کے ہمراہ رتھ میں بیٹھ کر چلی گئی تھی۔ سویرے دن چڑھے غازی نگر پہنچ گئی۔ وہاں اس کی انا کا گھر تھا۔ اسی نے شہزادی کو پناہ دی مگر بادشاہ کی اسیری اور شہزادوں کے قتل کے بعد سکھ فوج کا ایک دستہ غازی نگر کو لوٹنے نکلا۔ کسی نے بتا دیا کہ یہاں بادشاہ کی ایک پوتی اپنی انا کے گھر چھپی ہوئی ہے۔ سکھ سپاہی وہاں گئے اور نرگس نظر کے ساتھ بڑی بے ہودگی سے پیش آئے۔ بے چاری کے بال تک کھینچے گئے۔ آخر انہوں نے زبردستی اسے بیل گاڑی میں بٹھایا۔ انا اور اس کے گھر والے بھی سب قید ہوئے اور سکھ دستہ دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں ہینڈن ندی کے پاس جاٹوں اور گوجروں نے حملہ کر دیا۔ لڑائی میں تمام سکھ مارے گئے۔ جاٹوں نے نرگس نظر کو اپنا قیدی بنا لیا۔ اتفاق سے قریب کے ایک گاؤں سے کچھ رنگڑ مسلمان وہاں پہنچ گئے۔ نمبردار نے شہزادی نرگس نظر کو قیمت دے کر خرید لیا اور گاؤں میں لا کر اس کی شادی اپنے بیٹے سے کر دی۔ تقریباً چار مہینے بعد میرٹھ کی پولیس وہاں پہنچ گئی۔ نرگس نظر کے ساتھ رانگڑ نمبردار اور اس کے بیٹے کو بھی گرفتار کر کے دہلی لایا گیا۔ دونوں باپ بیٹا جیل بھیج دیئے گئے۔ ان پر باغی ہونے کا شبہ تھا اور شہزادی ایک مسلمان سپاہی کے حوالے کر دی گئی۔ وہ اسے لے کر گھر آیا تو بیوی نے خاوند کی خوب خبر لی اور نرگس نظر کو دھکا دے کر گھر سے نکال دیا۔ ایک بزرگ مسلمان نے شہزادی کو اپنے گھر میں پناہ دی مگر دوسری رات کچھ لوگ شہزادی کو اغوا کر کے لے گئے۔ وہ لوگ تگا مسلمان تھے اور جانتے تھے کہ اس کی شادی رانگڑ نمبردار کے بیٹے سے ہو چکی ہے، کوئی دوسرا اس کا مالک

---

[1] شاہ غلام نصیرالدین عرف میاں کالے چشتی خاندان سے تعلق رکھتے اور درویش کامل تھے۔ انہوں نے ایک شہزادی ملکہ بیگم سے شادی کر لی تھی۔ بہادر شاہ ظفر کو ان سے بڑی عقیدت تھی اور ایک خادم کی طرح ان کی حاضری دیتے تھے۔ (بحوالہ بہادر شاہ ظفر از امیر احمد علوی)

گواہی کافی تھی۔ گامی خاں مخبر نے گواہی دی کہ جب قلعے میں انگریز عورتوں اور بچوں کو دیوانِ عام کے سامنے قتل کیا گیا، یہ لڑکا وہاں موجود تھا۔ بلکہ یہی بادشاہ کا پیغام لے کر آیا تھا کہ انگریزوں کو قتل کر دو۔ علاوہ ازیں اپنے باپ خضر سلطان کے ہمراہ پہاڑی کی جنگ میں بھی شامل ہوتا رہا ہے۔

یہ سب کچھ جھوٹ تھا مگر وہاں جھوٹ سچ کو الگ الگ کرنے والا کون تھا؟ صاحب نے گامی خاں کی شہادت کافی سمجھی اور شہزادے کو پھانسی کا حکم سنا دیا۔ اچانک شہزادے نے گامی خاں سے پوچھ لیا۔ ''جس روز قلعہ دار ڈگلس صاحب کو باغیوں نے ہلاک کیا تھا، تم کہاں تھے؟''

گامی خاں اس سوال پر پریشان ہو گیا اور بولا۔ ''میں اس دن اپنے مکان میں تھا۔ اور کہاں ہوتا؟''

شہزادے نے صاحب کو بتایا۔ ''گامی خاں جھوٹ بولتا ہے۔ اتفاق سے میں اسی روز پیچش کی دوا لینے ڈاکٹر کے پاس گیا تھا جو ڈگلس صاحب کے مہمان تھے۔ میں نے وہاں باغیوں کا ہجوم دیکھا جن میں گامی خاں بھی موجود تھا اور انہیں صاحب کے قتل پر اُکسا رہا تھا۔ جب ڈگلس صاحب، ان کی میڈم اور مہمان قتل ہو گئے اس نے چاندی کا گلدان اٹھا لیا اور ان کے ہاتھ سے گھڑی اُتار لی تھی۔''

گامی نے اس واقعے سے انکار کیا اور مرزا کو جھوٹا قرار دیا۔ لیکن جب صاحب کے حکم پر اس کے مکان کی تلاشی لی گئی تو ڈگلس صاحب کی گھڑی اور چاندی کا گلدان دونوں اشیاء برآمد ہو گئیں۔ ان چیزوں کے علاوہ اس کے گھر سے اور بھی بہت کچھ نکلا۔ جس پر صاحب نے شہزادے کو رہا کر دیا اور ان کی جگہ گامی خاں کی پھانسی کا حکم صادر کیا۔

اس طرح وہ خبیث اور بدنہاد مخبر جو بیسیوں شرفاء کی گرفتاری، قید اور پھانسی کا باعث بنا تھا خود بھی انگریزوں کے ہاتھوں تختہ دار پر پہنچا اور لوگوں کو اس کے شر سے نجات ملی۔ لیکن مرزا داور زمانے کی جس گردش میں آ گئے تھے وہ نہ ٹلی۔ دہلی سے فرید آباد پہنچے جہاں ان کے دو پرانے نوکر رہتے تھے۔ خیال تھا ماں اور بہن وہاں مل جائیں گی۔ کیونکہ مقبرۂ ہمایوں سے نکل کر فرید آباد میں انہی کے ہاں جا رہے تھے کہ راستے میں گرفتار کر لیے گئے۔ اب پتہ چلا کہ ان دونوں میں سے کوئی وہاں نہیں پہنچی۔ کچھ دن فرید آباد میں رہ کر ماں اور بہن کو ڈھونڈتے رہے۔ بدر پور سے بھی کھوج لگایا لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا کہ شہزادہ خضر سلطان کی بیگ اور بیٹی کو آسمان کھا گیا یا مین نگل گئی۔ یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ وہ کس بیل گاڑی میں سفر کر رہی تھیں، کدھر گئیں؟ غالباً علاقے کے جاٹ گوجر گاڑی بان کو قتل کر کے ماں بیٹی کو گاڑی سمیت کسی گاؤں میں لے گئے تھے اور ان کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا ہو گا جو مرزا ظہیر الدین مغل کی بیگم اور بیٹی لالہ رخ کے ساتھ ہوا۔

افسردہ دل اور شکستہ حال مرزا تلاش بسیار کے بعد ناکام و نامراد بھوپال کی طرف چل دیئے۔ جس عزت و ناموس کو بچانے کی خاطر مقبرۂ ہمایوں سے نکلے تھے وہ فرید پور کے راستوں میں کہیں لٹ چکی تھی۔ جس امیر کے بھروسے پر بھوپال کا سفر کیا تھا، وہ بھی فوت ہو چکا تھا۔ مجبوراً ایک جگہ چوکیدار کی نوکری کر لی اور اس بات کو بھول گئے کہ وہ شہزادہ خضر سلطان کے بیٹے اور سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے پوتے ہیں۔

❁……❁……❁

سوہنہ ضلع گوڑ گانواں کا باسی دراصل ایک گھوسی تھا، جو لالہ رخ کو لے گیا تھا جس کی جورو نے کمسن شہزادی کو پیار سے گھر میں رکھا۔ انگریزی فوج جو باغیوں کو ڈھونڈتی پھر رہی تھی، آٹھویں روز سوہنہ پہنچ گئی اور تلنگے باغی کو گرفتار کر کے لے گئی جسے پھانسی ہوئی۔ اس کی ساری جائیداد بھی ضبط کر لی گئی تھی۔ گھوسی، جس نے کچھ زیور چھپا لیا تھا، لالہ رخ کے ساتھ ایک دوسرے گھوسی کے ہاں چلی گئی اور وہیں گزر بسر کرتی رہی۔ مگر ایک رات چور گھر میں گھس آئے اور گھوسن کے گلے سے ہنسلی اُتارتے وقت اسے گلا گھونٹ کر مار ڈالا۔ مکان والے گھوسی اور گھوسن نے شہزادی لالہ رخ کو اپنے پاس رکھ لیا۔ ان کے ہاں بھینسیں تھیں۔ مرزا مغل کی بیٹی گھر میں جھاڑو دیتی، بھینسوں کا گوبر اٹھاتی اور اُپلے تھاپتی تھی۔ گھوسی نے اپنے چھوٹے بھائی سے اس کی شادی کر دی اور لالہ رخ، مغل شہزادی سے سوہنہ ضلع گھوڑ گانواں کی ایک گھوسن بن گئی۔

❁......❁......❁

1857ء میں جن لوگوں نے جاسوسی اور مخبری کے ذریعے نام پیدا کیا ان میں منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش کا ذکر میں کر چکی ہوں۔ مرزا الٰہی بخش کے ساتھ اگر چہ میرا بھی ایک ناتا ہے خواہ دُور کا سہی جیسا کہ تجھے آگے چل کر معلوم ہو گا۔ اس ناتے مجھے لازم ہے کہ میں اس کا نام لیتے یا ذکر کرتے وقت ادب واحترام کو ملحوظ رکھوں۔ پھر وہ ''سلاطین'' میں شامل اور ''صاحبِ عالم'' بھی کہلاتا تھا اور مغلیہ دستور کے مطابق حفظ مراتب کا پاس ضروری تھا۔ لیکن گھر کے اس بھیدی کے لیے جس نے جنگ آزادی یا غدر کی ناکامی اور اعلیٰ حضرت کی اسیری کے ساتھ تیموری خاندان کی بربادی میں اہم کردار ادا کیا، میں اپنے دل میں احترام کا کوئی جذبہ نہیں رکھتی۔

منشی رجب علی اور مرزا الٰہی بخش جیسے بڑے مخبروں کے بعد جیون لال اور گامی خاں کا نام آتا ہے۔ میری کہانی میں تو اور بھی کئی مخبروں کے نام آئیں گے جن کے ذریعے اہم معلومات انگریز تک پہنچتی تھیں مگر اس وقت میں گامی خاں کا ایک واقعہ بیان کرتی ہوں۔

جب مرزا مغل، مرزا ابوبکر اور مرزا خضر سلطان کے وحشیانہ قتل کی خبر مقبرۂ ہمایوں میں پہنچی تو مرزا سلطان کے فرزند مرزا داور شاہ بھی جنہیں ولی عہد مرزا دارا بخت مرحوم کی بیٹی گل بانو کے ساتھ محبت ہو گئی تھی، اپنی والدہ اور چھوٹی بہن کو لے کر مقبرۂ ہمایوں سے نکل گئے کہ مبادا انگریز عورتوں اور بچوں کا انتقام لینے کی خاطر انہیں بھی گرفتار اور قتل کر دے، عشق ومحبت بھول کر جان کے لالے پڑ گئے۔ بیل گاڑی پر فرید آباد جا رہے تھے اور بہلی ابھی بدر پور پہنچی تھی کہ جس بات کا دھڑکا تھا وہ پیش آ گئی۔ پیچھے سے میجر ہڈسن کے سوار آ گئے۔ مرزا الٰہی بخش بھی ساتھ تھا۔ بہلی کی تلاشی لینے کے بعد مرزا داور شاہ کو پکڑ لیا۔ الزام وہی لگا کہ اس کا باپ انگریز عورتوں اور بچوں کو قتل کرانے میں شریک تھا۔

ماں نے فریاد کی کہ میرا بیٹا تو چار مہینوں سے پیچش کا مریض ہے۔ بے چارہ ہر وقت گھر میں رہتا تھا۔ اس کی کیا خطا ہے؟ اور یہ درست بھی تھا۔ غدر کے ایام میں مرزا داور بیمار تھے۔ مگر ہڈسن نہ مانا اور بولا۔ ''تحقیقات کے بعد فیصلہ ہو گا۔'' وہ مرزا کو دہلی کے انگریزی کیمپ میں لے آیا اور ایک پنجابی سپاہی سمندر خاں کے حوالے کر دیا کہ کہیں بھاگنے نہ دے۔

بیمار شہزادے کو چوتھے روز بڑے صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ پھانسی کے لیے ملزم کے خلاف صرف ایک

قیام تھا۔ مرزا تیمور شاہ، اکتسابِ علم کے لیے وہاں جاتا اور ان کے فیض سے بہرہ ور ہوتا تھا۔

شہزادے نے چاندنی محل کے اسی محل میں پرورش پائی۔ سن بلوغت کو پہنچا تو ماں نے وہیں مغل خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کر دی۔ سرکار کی طرف سے جو وظیفہ ملتا تھا، اس میں گزر بسر مشکل تھی۔ مرزا تیمور شاہ ایک باورچی کا شاگرد بن گیا۔ اس نے مغلی کھانے تیار کرنے کا ہنر سیکھا اور باورچی بن گیا۔

دہلی میں مغلوں کا کشت وخون ہوا تھا۔ شہر تباہی و بربادی کے ہول ناک مناظر سے گزرا تھا اور اس نے چھوٹی عمر ہی میں زہرہ گداز واقعات دیکھے تھے۔ دہلی اسے بھی راس نہ آئی۔ ماں اور بیوی دونوں کا انتقال ہو گیا تو خود بھی نام بدل کر دہلی سے نکل گیا اور کہیں جا کر باورچی کی نوکری کرنے لگا۔

❁......❁......❁

اکبر شاہ ثانی کے بھائی مرزا علی گوہر المعروف مرزا نیلی نے بڑی طویل عمر پائی۔ بعض معاملات میں بادشاہ سے انہیں اختلاف رہا تھا۔ بالخصوص کمپنی سرکار سے ملنے والے وظیفے سے جس کی مالیت ایک لاکھ روپے ماہوار تھی۔ وہ اپنا الگ حصہ مبلغ ایک ہزار روپے براہِ راست انگریز سے وصول کرتے تھے۔ سرکار انگلشیہ نے بھی یہ بندوبست کر دیا تھا کہ وہ مرزا نیلی کے ایک ہزار روپے علیحدہ کر لیتی اور بقیہ ننانوے ہزار اعلیٰ حضرت کو بھیج دیتی تھی۔

مرزا نیلی کی رحلت کے بعد بھی ایک ہزار روپے کی رقم ان کی بیگم خورشید جمال کو براہِ راست ملتی تھی اور وہ بڑی آسودہ حال تھیں۔ مرزا علی گوہر نے اپنی زندگی میں کئی خواصوں سے تعلقات رکھے تھے اور ان سے اولاد بھی ہوئی تھی لیکن بیگم خورشید جمال سے صرف ایک بچی ماہ جمال تھی جو ان کے بڑھاپے کی یادگار تھی۔ اس لیے وہ مہ جمال سے بہت پیار کرتے تھے۔ مگر مہ جمال ابھی صرف پانچ برس کی تھی کہ مرزا نیلی انتقال کر گئے۔ بیگم خورشید جمال کو اپنی اکلوتی بچی بہت عزیز تھی اور اسے لاڈ پیار سے رکھتی تھیں۔ لونڈیاں، باندیاں ہر وقت خدمت میں رہتی تھیں۔

مہ جمال کی رنگت اپنے باپ کی طرح سانولی تھی لیکن نقش ونگار بڑے دل کش تھے۔ جب غدر ہوا، اس کی عمر سولہ برس کی تھی۔ نجف گڑھ کی ایک مالن حویلی میں کام کرتی تھی۔ غدر سے کوئی ایک سال پہلے مہ جمال باغ میں سیر کرنے نکلی تو مالن کے جوان لڑکے کی نظر اس پر پڑ گئی اور وہ دیوانہ ہو گیا۔ مہ جمال کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کسی نے اسے دیکھ لیا ہے۔ سیر کر کے اپنے کمرے میں لوٹ آئی۔

ادھر مالن کے بیٹے کی حالت غیر ہو گئی۔ معاملے کی صورت ایسی تھی کہ کسی سے بیان بھی نہ کر سکتا تھا۔ ایک تو عشق یک طرفہ، دوسرے بات بھی کرتا تو پوری نہ ہوتی۔ بھلا تیموری شہزادی اور ایک مالن زادے کا کیا جوڑ؟ وہ بھی صورتِ حال کی اس نزاکت کو خوب سمجھتا تھا مگر شہزادی مہ جمال کی محبت ترک نہ کر سکا۔ دردِ محبت کو دل میں دبا لیا۔ آخر ایک جوگی سے ملاقات ہوئی۔ اس سے دل کا حال اور اپنی مجبوری کا قصہ بیان کیا۔ جوگی نے اس کے عشق صادق کی رُوداد سنی تو صبر کی تلقین کی اور کفن نما ایک فقیری پیرہن دیا کہ پہنے رکھو اور اللہ کو یاد کرو۔

مالن زادہ فقیری چولا پہن کر فقیر بنا اور کئی مہینے حالتِ دیوانگی میں جنگل جنگل گھومتا رہا۔ دل میں عشقِ صادق کی لگن تھی، اس کا اتنا اثر ہوا کہ جس بیمار پر دم پڑھتا وہ اچھا ہو جاتا تھا۔ کئی مرتبہ مہ جمال بھی بیمار ہوئی۔ فقیر کو بلایا

مرزا تیمور شاہ، اعلیٰ حضرت کا سب سے چھوٹا فرزند ایک لونڈی کے بطن سے تھا جس کی عمر 1857ء میں بہ مشکل دس برس کی ہوگی۔ بوڑھے بادشاہ پہلے تو لونڈی پر بڑے مہربان تھے، پھر ناراض ہو گئے اور ملنا جلنا ترک کر دیا۔ لیکن وہ ان کے بیٹے کی ماں بن چکی تھی اس لیے ماں بیٹے کو سرکاری خرچ باقاعدہ ملتا تھا۔ دونوں خاص بازار کے ایک شاہی مکان میں رہتے تھے جہاں بادشاہ کی طرف سے پہرے دار اور نوکر مقرر تھے۔

خاص بازار بڑا وسیع اور پُر رونق تھا جو قلعے کے دہلی دروازے سے جامع مسجد کے مشرقی دروازے کے سامنے تک چلا گیا تھا۔ ہر قسم کی دکانیں تھیں۔ اس بازار سے خانم کا بازار اور خان دوراں کی حویلی کو راستے جاتے تھے۔ خاص بازار کیا تھا، ایک شہرِ طلسمات تھا۔ اب تو وہاں کچھ بھی نہیں رہا۔ غدر کے بعد اس سارے علاقے کے بازار اور مکانات مسمار کر دیئے گئے جو لال ڈگی حوض سے کشمیری دروازے تک پھیلا تھا۔

19 ستمبر کو جب کمانڈر روسن فرنگی فوج لے کر شہر میں داخل ہوا تو ہر طرف بھگدڑ مچ گئی اور خاص بازار بھی خالی ہونے لگا۔ بادشاہ نے قلعہ چھوڑنے کا فیصلہ 19 ستمبر کی رات کو کیا تھا جب کہ شہر کے لوگ دن ہی کو بھاگ رہے تھے۔ انہوں نے خاص بازار کے شاہی مکان میں مقیم شہزادہ تیمور شاہ اور اس کی والدہ کے تحفظ کا کوئی بندوبست کیا نہ انہیں قلعہ میں بلایا۔ بادشاہ کی طرف سے جو پہرے دار اور نوکر وہاں مقرر تھے، وہ سب بھاگ گئے۔ کوئی سواری کا انتظام کرنے والا بھی نہیں تھا۔

اس افراتفری اور نفسانفسی کے عالم میں ماں نے بیٹے کا ہاتھ پکڑا۔ تھوڑی سی اشرفیاں سنبھالیں اور گھر سے نکلی۔ بہت سے لوگ درگاہ قدم شریف کی طرف جا رہے تھے جو فصیلِ شہر سے چند فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ ماں بیٹا بھی وہیں پہنچے اور ایک مکان سر چھپانے کو مل گیا مگر کھانے کو کچھ نہ مل سکا۔ دونوں بھوکے ہی سو گئے۔ صبح اُٹھے تو انگریز کے ہندوستانی سپاہی (پوربی ہندو) وہاں پہنچ چکے تھے اور لوگوں کو گرفتار کر رہے تھے۔ یہ ماں بیٹا بھی اسیر ہوئے۔ سپاہی انہیں قدم شریف سے پہاڑی کیمپ میں لے گئے۔ کئی میل کا فاصلہ بڑی جوکھوں سے کٹا۔ شام کو دونوں صاحب کے سامنے پیش کیے گئے جس نے کئی باتیں پوچھیں۔ ماں نے بتا دیا کہ وہ بادشاہ کی لونڈی اور ان کے بچے کی ماں ہے۔

انگریز افسر کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دونوں ماں بیٹا خاص بازار کی ایک حویلی میں رہتے تھے۔ قلعے سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا۔ انہیں وہیں ایک خیمے میں ٹھہرایا گیا اور دو وقت کا کھانا مقرر ہوا۔

مرزا تیمور شاہ اگرچہ قلعے سے باہر خاص بازار میں رہتا تھا لیکن ماں نے تیموری خون کی رعایت سے اس کی تعلیم و تربیت کا خاص خیال رکھا تھا۔ دونوں کئی مہینے خیمے میں پڑے رہے۔ بادشاہ کی گرفتاری، شہزادوں کے قتل، پھانسیوں اور لوگوں کو توپ سے اُڑائے جانے کے واقعات سنتے تو دل تھام کے رہ جاتے تھے۔ آخر یہ خون خرابہ رُکا، پکڑ دھکڑ بند ہوئی اور دہلی میں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا تو انگریز نے انہیں جامع مسجد کے قریب چاندنی محل کے محلے میں بھیج دیا جہاں تیموری خاندان کے بچے کھچے کچھ اور لوگ بھی رہتے تھے۔

انگریزی سرکار کی طرف سے ان کا دس روپے ماہوار وظیفہ لگا۔ ماں بیٹا خاص بازار کی حویلی میں جو کچھ چھوڑ آئے تھے، وہ سب کچھ لٹ چکا تھا۔ اب انہیں دس روپے میں گزر بسر کرنا تھی۔ مغلیہ خاندان کی تباہی و بربادی کے باوجود ماں نے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ قریب ہی ایک خانقاہ میں کسی بزرگ درویش کا

گفتگو چھڑی۔ اس کے علاج کی معجز نمائی کا ذکر چلا تو مالن نے بات کھول دی اور بتایا کہ وہ شہزادی سے محبت کرنے لگا تھا۔ اسی کی محبت میں سودائی ہو گیا۔ ایک جوگی نے فقیری چولا پہنایا اور نیم دیوانہ سا پھرنے لگا۔ دل میں شہزادی کی سچی لگن رکھتا ہے۔ اسی سچی لگن کے طفیل اس کے ''دم'' میں معجز نما تاثیر پیدا ہوئی کہ دم کرنے سے بیمار اچھے ہو جاتے ہیں۔

مہ جمال پر حیرت کا سکتہ گزر گیا وہ اس کا دیوانہ ہے۔ پھر قاضی کو بلوایا اور مالن زادے یا اپنے دیوانے فقیر کے ساتھ نکاح منظور کر لیا۔

ایک مغل شہزادی سے مالی کے لڑکے کی شادی ایک اچنبھا ضرور ہے لیکن یہ عشق صادق کی کرامت تھی جو ظہور میں آئی۔ تاہم اس واقعے کے پیچھے ٹوٹے آئینے کی طرح وہ حالات بھی بکھرے ہوئے ہیں، جن کی کرچیوں میں مغلوں کی تباہی و بربادی کے ساتھ ساتھ مغل شہزادیوں کی بے بسی اور بے کسی کی تصویریں نظر آتی ہیں کہ وہ کیسی کیسی بھیانک مصیبتوں سے دوچار ہوئیں۔

❁......❁......❁

اے ارضِ دہلی کے مسافر!

میرے وقائع نویس مہمان!

تُو یہاں اس لیے آیا ہے کہ مغلوں کے زوال اور انگریزوں کے عروج کی حقیقت معلوم کرے اور یہ جان سکے کہ ہندوستانیوں نے ایک اجنبی قوم کی غلامی کس طرح قبول کر لی، تو 1857ء کے حوالے سے میں نے ایک قوم کے زوال اور دوسری قوم کے عروج کی ایک جھلک دکھا دی ہے۔

ظلم، چوری، دہشت، وحشت اور انسانی توہین و تذلیل کے جو واقعات تُو سن چکا ہے ان میں تقدیر کا ہاتھ ضرور ہوگا جو مغلوں کے گرد چکر لگا رہی تھی لیکن یہ سارے واقعات انگریز کے کھاتے میں لکھے جائیں گے جس نے مغلیہ خاندان کو ختم کرنے کے لیے کہ کہیں سلطنت کا کوئی وارث زندہ نہ رہ جائے، ہر طرف دہشت کے دروازے کھول دیئے اور موت ان کھلے دروازوں سے نکل کر بھوکے بھیڑیے کی طرح مغلوں پر جھپٹتی رہی۔ مردوں کو چن چن کر قتل کر دیا اور پھانسیوں پر چڑھایا گیا۔ ان کی بیویاں، بیٹیاں، بہنیں جن کی جھلک شاید کبھی چشم فلک نے بھی نہیں دیکھی تھی، فرنگی کے ظلم و ستم سے خوف زدہ ہو کر پناہ کی تلاش میں بھاگیں لیکن راستوں میں گنواروں، جاٹوں، تلنگوں، گھوسیوں، پاسیوں، کاچھیوں اور چماروں نے انہیں لوٹ لیا۔ نقدی، زیور، مال و اسباب حتیٰ کے تن کے کپڑے تک اُتار لیے۔ پھر جو شہزادی جس کے ہاتھ لگی، اسے اپنے ساتھ لے گیا۔

یہ واقعات جو میں نے بیان کیے ہیں ایسے نہیں کہ سرکار انگلشیہ یا اس کے جاسوسوں، مخبروں اور گماشتوں سے اوجھل رہے ہوں گے۔ اس سرکار نے جو شرافت کی حکمرانی کا دعویٰ کرتی تھی، بغاوت کرنے والوں کو بدترین سزائیں دیں۔ مگر انسانیت کی توہین کرنے والے مجرموں کو چھوڑ دیا اور ان شرم ناک واقعات پر جو پوری دنیا کے لیے باعثِ ننگ تھے، مجرمانہ خاموشی اختیار کر لی۔

میں نے یہ واقعات ماموں اورنگ مرزا کے روزنامچے میں پڑھے جنہیں وہ مغلیہ سلطنت کے تتمے کی صورت

گیا، اس نے آ کر دم پڑھا۔ شہزادی اچھی ہو گئی۔ پھر سے دیکھا اور چلا گیا۔

غدر کے بعد جو مئی 1857ء میں شروع ہوا تھا، سرکار انگلشیہ سے ملنے والے وظیفے بند ہو گئے تھے اور بیگم خورشید جمال کی پہلی سی حالت نہ رہی تاہم گھر میں جمع پونجی بہت تھی۔ گزارا ہوتا رہا۔ جب ستمبر 1857ء میں دہلی کی حالت بگڑنے لگی انہوں نے کچھ نوکروں کو ساتھ لیا، بیٹی کو لے کر رتھ میں بیٹھیں اور نجف گڑھ کی جانب روانہ ہوئیں جہاں ان کی مالن کا گھر تھا۔ رتھ ابھی قصبے سے باہر تھا کہ فرنگی فوج کے سپاہیوں نے اسے گھیر لیا اور تلاشی پر اصرار کیا۔ ماں بیٹی کے ساتھ رتھ میں دو باندیاں بھی تھیں۔ نوکروں نے کہا۔ ”اندر خواتین ہیں۔ رتھ کا پردہ نہیں کھلے گا۔“

تو تکرار ہونے لگی اور تلوار چل گئی۔ سب نوکر ہلاک ہو گئے۔ رتھ بان جان بچا کر بھاگ گیا۔ سپاہیوں نے رتھ کی تلاشی لی۔ جو روپیہ پیسہ اور زیور تھا سب لوٹ لیا۔ سامان تک نہ چھوڑا اور چلے گئے۔ عجیب بے بسی کا سماں تھا۔ ایک باندی نے رتھ ہانکا اور مصیبت کا سفر پھر شروع ہوا لیکن سی طرف سے گوجر نکل آئے اور روپیہ، زیور مانگنے لگے۔ ان کے پاس تھا کیا؟ گوجروں نے بے چاریوں کے برقعے تک اتار لیے۔ خورشید جمال نے انہیں برا بھلا کہا کہ مرد ہو کر عورتوں سے ایسا سلوک کرتے ہو۔ جس پر جاہل گوجر بھڑک اُٹھے۔ خورشید جمال اور دونوں باندیوں کو لاٹھیوں سے مار ڈالا۔ مہ جمال مارے صدمے کے ماں کی لاش پر بے ہوش ہو گئی۔ گوجر بیل اور رتھ لے کر چلے گئے۔

مہ جمال بے ہوش پڑی تھی کہ ایک میواتی اسے اٹھا کر نجف گڑھ اپنے گھر لے گیا اور اس سے سب حال سنا۔ میواتی کی بیوی نے شہزادی کو تسلی دی اور کہا کہ وہ اس گھر میں بیٹی بن کر رہے گی۔ کچھ دن وہیں گزر گئے۔ لیکن ایک رات گھر میں آگ لگ گئی اور جلتا چھپر گرنے سے دونوں میاں بیوی جل مرے۔ گاؤں والوں نے آگ بجھائی۔ مہ جمال بچ گئی تھی۔ نمبردار اسے اپنے گھر لے گیا جس کی دو بیویاں اس سے بڑا کام لیتی اور کام میں ذرا دیر ہو جانے پر مارتی پیٹتی تھیں۔ شہزادی مہ جمال نمبردار کے گھر میں نوکر تھی۔ نمبردارنیوں کی گالیاں سنتی، مار کھاتی اور کام کرتی، تب کھانے کو روٹی ملتی تھی۔

مہ جمال اپنی والدہ کے ہمراہ دہلی سے نجف گڑھ ہی کے لیے روانہ ہوئی تھی کہ وہاں مالن کے گھر میں پناہ ملے گی لیکن اسے مالن کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ بے چاری مار کھاتی اور اپنی قسمت کو روتی تھی۔ ایک دن بیویوں کے کہنے پر نمبردار نے اسے گھر سے نکال دیا۔ کیونکہ وہ اچھی نوکرانی ثابت نہیں ہوئی تھی۔ حیران تھی کہ کہاں جائے۔ اپنی مالن کا خیال آیا۔ اسی اثنا میں کیا دیکھتی ہے کہ فقیری چولا پہنے وہی فقیر جس نے دم پڑھ کر اسے اچھا کر دیا تھا، ایک طرف سے چلا آتا ہے۔ مہ جمال نے فقیر کو، فقیر نے مہ جمال کو دیکھا تو دونوں اس اتفاقی ملاقات پر حیران رہ گئے۔

مہ جمال نے جو گزری تھی، سب بیان کی۔ اس کی دکھ بھری کہانی سن کر فقیر کا جو حال ہوا، وہ ہر کوئی سمجھ سکتا تھا۔ وہ اسے اپنے گھر لے آیا۔ وہ مالن ہی کا گھر تھا جس نے آنکھیں فرشِ راہ کیں۔ شہزادی کی مصیبت پر تڑپ تڑپ گئی۔ مگر مہ جمال پر یہ انکشاف پہلی بار ہوا کہ فقیر اسی کا لڑکا ہے۔

مالن نے مرزا علی گوہر نیلی کی بیٹی کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ وہ اپنے دکھ بھول گئی۔ ایک روز فقیر کے متعلق

لیکن انگریز نے مغلوں سے بغاوت کا ایسا بھیانک انتقام لیا کہ ان کی بہو، بیٹیوں اور بہنوں کی عزت تک محفوظ نہ رہنے دی اور کمپنی سرکار کے نزدیک مغلوں کا قتل ایک فرض کی حیثیت رکھتا تھا۔ مگر وہ ان کی عزت بھی شراب کے پیمانے میں گھول کر پی گئے۔

سلطنت اور حکومت جاتی رہے تو آدمی عزت کے سہارے زندہ رہتا ہے۔ عزت جاتی رہے تو کچھ باقی نہیں رہتا اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ کمپنی سرکار انگلشیہ نے مغلیہ خاندان سے سلطنت چھینی، حکومت چھینی، حتیٰ کہ عزت بھی چھین لی اور کوئی شے ان کے پاس نہ چھوڑی۔

تو یہ ہے مغلوں کی کہانی کا وہ عبرتناک انجام جہاں ایک پورا خاندان ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ ہے انسانی تذلیل کا وہ استغاثہ، جو میں کمپنی کی حکومت کے خلاف انسانوں کی عدالت میں پیش کرتی ہوں۔

مجھے اپنے خاندان کے انجام کو طول نہیں دینا کیونکہ جو شے ختم ہونے والی تھی، ختم ہوگئی۔ جو آخری بات میں کہنا چاہتی تھی وہ کہہ دی اور یہی بات مغلوں کے افسانے کی انتہا ہے جسے میں یہیں چھوڑتی ہوں۔

❁......❁......❁

اے خاکستانِ ہند کے سیاح!

تُو نے مغلوں کی تباہی و بربادی کا وہ آخری وحشت ناک منظر دیکھ لیا جو حالات کی گردش نے دکھایا اور اس جگر خراش تباہی کے بعد میرا استغاثہ بھی سن لیا جو میں نے ایسٹ انڈیا کمپنی کی سرکار انگلشیہ کے خلاف مہذب دنیا کی عدالت میں پیش کیا ہے۔

سلطنت اور حکومت کے ساتھ مغلوں سے ان کی آبرو تک چھین لی گئی اور کسی قوم یا خاندان کی آبرو کا لٹ جانا ہی دنیا کا سب سے بڑا سانحہ ہوتا ہے جو ہندوستان کی سرزمین پر پیش آیا۔ تاریخ انگریز پر الزام لگاتی ہے کہ اس نے برصغیر پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے درندوں کی طرح انسانوں کا شکار کھیلا۔ شریف خواتین کی لاج تک لٹوا دی۔ وہ طاقت کے نشے میں اس قدر وحشی ہوگیا کہ نہ انسانی زندگی کی حفاظت کر کا نہ نسوانی عزت کی۔ بلکہ اس نے موت، دہشت اور وحشت کا بازار خود گرم کیا کہ اس بازار میں مغلوں کا سب کچھ لٹ جائے اور کسی ہندوستانی کو انگریز کے خلاف سر اٹھانے کی جرأت نہ ہو سکے۔

ملکہ وکٹوریہ کی حکومت کہتی ہے کہ اس وحشت و بربریت کی ذمے داری انگریز اور انگلستان پر عائد نہیں ہوتی ہندوستان میں جو کچھ ہوا، وہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا کیا دھرا ہے جس نے اپنی تجارت کو حکومت میں بدل دیا۔ مگر میں یہ عذر تسلیم نہیں کرتی۔ انگلستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی سے اتنی بے خبر یا بے تعلق نہ تھی کہ جس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ کمپنی کے ڈائریکٹر جنرل، کورٹ آف ڈائریکٹرز، منتظمین، گورنر جنرل اور جرنیل حتیٰ کہ چھوٹے بڑے تمام عہدے دار اور افسر حکومتِ انگلستان کے تربیت یافتہ ہوتے تھے۔ پھر سمندر پار کے ایک ملک میں انگریزی فوجوں کی آمد اور ایسی ریاستوں کا غصب ونسب ایسٹ انڈیا کمپنی کا صرف نجی معاملہ نہیں تھا بلکہ اس میں انگلستان کی حکومت کے ارکان اور شہری ملوث تھے جنھوں نے ہندوستان کو ''سونے کی چڑیا'' اور لوٹ کا مال سمجھ رکھا تھا۔ دراصل کمپنی سرکار برصغیر میں حکومتِ انگلستان کے ہراول دستے کا فرض ادا کر رہی تھی اور کوئی حکمران

میں لکھتے رہتے تھے یا پھر ان لوگوں سے سنتے جو صفدر پیا اور ماموں مرزا سے ملنے آتے اور انہیں مغل گھرانے کو پیش آنے والی مصیبتوں سے آگاہ کرتے رہتے تھے تا کہ انگریز کے خلاف ان کے سینوں میں انتقام کی آگ بھڑکتی رہے۔ میں خود اس الاؤ میں جل رہی تھی۔ جب کوئی نیا واقعہ سنتی یا پڑھتی اپنا کلیجہ پیٹ لیتی تھی۔ میں نے مغلوں کی تباہی و بربادی پر اتنے آنسو بہائے ہیں کہ میری آنکھیں خشک ہو چکی ہیں اور اپنی مصیبتوں پر بہانے کے لیے کوئی آنسو نہیں بچا۔

معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا کہ مغلوں سے عزتِ نفس تک چھین لی گئی یا ان کی بہو، بیٹیوں، ماؤں، بہنوں کو راستوں میں لوٹا گیا اور وحشی گنواروں نے انہیں گھروں میں ڈال لیا بلکہ مغلوں کے ساتھ دہلی کے باشندوں اور بعض دوسرے شہروں کے لوگوں پر جو ہول ناک تباہی نازل ہوئی اس کے نتیجے میں بہت سی جوان عورتیں اور نوجوان لڑکیاں طوائفیں اور کسبیاں[1] بن گئیں۔ جن میں کئی مغل شہزادیاں بھی شامل تھیں۔

دہلی کے کئی بڑے ہوٹلوں کے آس پاس جہاں مال دار مسافر اور زیادہ تر انگریز افسر قیام کرتے تھے، برقع پوش عورتوں کی قطار لگ جاتی تھی جن میں قسمت کی ماری بعض شہزادیاں بھی اپنے آپ کو برقعوں میں لپیٹ کر آتی تھیں۔ وہ پہلے بھی کبھی غیر مردوں کو اپنی جھلک نہیں دکھایا کرتی تھیں اور اب بھی نہیں دکھاتی تھیں مگر ہوٹل کی تنہائی میں گاہک کے سامنے اپنا جسم تک پیش کر دیتی تھیں کیونکہ ان کے مرد، باپ، بھائی فرنگی نے مار ڈالے تھے اور انہیں عزت بیچ کر جس کے دام بھی گاہک ہی لگاتے تھے، اپنا پیٹ پالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ بعض شہزادیاں پیٹ کی خاطر گلیوں میں پھرتی اور بھیک مانگتی تھیں۔ بعض عزت فروخت کرتی تھیں۔

مجھے تسلیم ہے کہ آخری دور میں لال قلعے کے اندر بھی اخلاقی قدریں متزلزل ہو رہی تھیں۔ ایسی بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں جو ایک زوال پذیر معاشرے یا حکمران خاندان کا ورثہ بن جاتی ہیں۔ خوبرو مغلانیوں، خواصوں، مہریوں، باندیوں کی خوب صورتی آنکھوں کے پلڑوں میں تُل جاتی تھی مگر یہ سب کچھ لال پتھروں کی بلند و بالا فصیل کے اندر ہوتا تھا اور یہ بات بھی مدنظر رہتی تھی کہ جس کے ساتھ تعلق ہوا ہے، اسے اپنی زندگی کا حصہ بنا لیا جائے۔ یہی مغلیہ تہذیب اور شرافت کا تقاضا تھا جس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی تھی۔

جہاں تک کسی غیر قوم بالخصوص انگریز قوم کی عورتوں اور لڑکیوں کا تعلق ہے، کسی مغل نے غدر کے ایام میں بھی جب فرنگی سے جنگ لڑی جا رہی تھی، ان کی عزت لوٹنے کی کوشش نہیں کی اور ان کا نسوانی احترام ملحوظِ خاطر رکھا۔

---

[1] 1857ء کے غدر کا سب سے شرم ناک پہلو یہی ہے کہ جوان عورتوں اور لڑکیوں نے جن میں کئی مغل شہزادیاں بھی تھیں، کسبیوں کا پیشہ اختیار کر لیا۔ یوں تو مجبور و بے بس شہزادیاں اور شہزادیوں کے مصائب، دربدری اور مفلوک الحالی کی جگر خراش کہانیاں مولوی ذکاء اللہ، راشد الخیری، خواجہ حسن نظامی، بشیر الدین احمد اور کئی دوسرے مصنفوں نے بھی قلم بند کی ہیں، جنہیں پڑھ کر انسان کا دل کانپ اُٹھتا ہے۔ مگر شہزادیوں کے کسبیاں بن جانے کا واقعہ انتہائی تکلیف دہ ہے جس کی تصدیق مرزا غالب نے اپنے روزنامچے میں کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:
''اب یہ ''دِلّی'' نہیں ایک کیمپ ہے۔ مسلمان اہل حرفہ یا شاگرد پیشہ باقی سراسر ہندو معزول شدہ بادشاہ کے ذکور ہیں۔ جو بقیۃ السیف ہیں، وہ پانچ پانچ روپیہ مہینہ پاتے ہیں۔ اناث میں سے جو پیر، زن ہیں، وہ کٹنیاں اور جوانیں کسبیاں۔'' (مرزا غالب کا روزنامچہ۔ ص 12)

دفترِ دوم

سید برہان الدین کی سرگزشت

یا جرنیل اپنے ہراول دستے سے غافل نہیں ہوتا۔ اس لیے ہندوستان میں ڈھائی جانے والے مظالم، قتل عام، دہشت اور وحشت کے جرائم ایسٹ انڈیا کمپنی کے کھاتے میں ڈال کر انگلستان کی حکومت ان سے اپنا دامن نہیں بچا سکتی۔

1857ء سے پہلے اور اس کے بعد ہندوستان میں جو کچھ ہوا، اس سے سرکارِ برطانیہ بری الذمہ نہیں۔ وہ مغلوں کے انجام میں شریک ہے۔ یہ تیرے اس سوال کا جواب ہے کہ برطانوی گورنمنٹ خود کو ان واقعات سے الگ تھلگ اور بری الذمہ سمجھتی ہے جو میں نے سنائے یا مغلوں اور دوسرے والیانِ ہند کو پیش آئے جو آئندہ بیان کروں گی۔

❁……❁……❁

مہرولی کے قریب پہنچ گئے۔

مہرولی دہلی سے بارہ میل دور ایک قصبے کا نام ہے مگر یہ علاقہ مشہور بزرگ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ[1] کے طفیل ''قطب صاحب'' بھی کہلاتا ہے جو یہیں مدفون ہیں اور جن کا مزار مرجع خلائق ہے۔عربی زبان میں قطب اس کیل کو کہتے ہیں جس پر چکی گھومتی ہے مگر معنوی طور پر یہ لفظ اس ولی اللہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے جس پر قوم کی رہنمائی اور ہدایت کا مدار ہو۔

حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ قطب الاقطاب کہلاتے ہیں۔ وہ ترکستان سے بغداد اور بغداد سے ہندوستان آئے تھے۔ ان دنوں یہاں سلطان شمس الدین التمش کی حکومت تھی جو خود ان کے استقبال کو نکلا تھا۔ انہوں نے کیلوکھری میں سکونت اختیار کی۔ سلطان خدمت میں حاضر ہوتا اور گاؤں، زمین، جاگیر پیش کرتا تھا۔ قطب صاحب نے یہ پیش کش مسترد کر دی مگر اپنی ہدایت و رہنمائی سے ایک زمانے کو فیض یاب کیا۔سلطان التمش کا ان کے روحانی خلفاء میں شمار ہوتا ہے۔

اسی علاقے میں سلطان قطب الدین ایبک کا تعمیر کردہ وہ نیرنگ زمانہ قطب مینار ہے جو ہندوستان میں اپنی بلندی کی تنہا مثال ہے اور ''پھول والوں کی سیر''[2] بھی یہیں ہوتی ہے جس میں ہندو مسلمان اکٹھے شریک ہوتے اور دو قطاروں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ پھر مسلمانوں کی قطار درگاہ بختیار کاکیؒ کی طرف اور ہندوؤں کی قطار جوگ مایا مندر کی طرف چلی جاتی ہے۔

قطب مینار کے مغرب میں سلطان علاء الدین خلجی اور سلطان قطب الدین خلجی کے شاندار مقبرے تھے مگر نوابانِ اودھ نے ان مقبروں کا سفید پتھر اکھاڑ کر اپنے مورث اعلیٰ نواب منصور علی خاں صفدر جنگ کے مقبرے میں صرف کر لیا تھا جس سے خلجی مقبروں کی دلکشی ویرانی میں بدل گئی۔ مہرولی میں چاروں اطراف میلوں تک قبریں اور ڈھیریاں نظر آتی ہیں۔ دراصل یہ مختلف زمانوں کے قبرستان ہیں جہاں کئی مسجدیں بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ پرانی یادگاروں میں مسجد اولیا اور حوضِ شمسی مشہور ہیں۔ حوضِ شمسی کے ساتھ کچھ پرانی خانقاہیں تھیں جو کھنڈروں میں

---

[1] ''کاکی'' کی وجۂ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ ان کے لنگر خانے سے درویشوں اور مسافروں کو کاک تقسیم ہوا کرتے تھے۔ کاک آٹے کی چھوٹی سی گولی اور ہتھیلی کے برابر روٹی کو کہتے ہیں جسے تنور میں پکایا جاتا تھا۔ معمولی کاک میں نمک اور بڑھیا کاک میں گھی شکر ملایا جاتا جس کے کنارے اونچے ہوتے ہیں۔ اوپر حلوہ رکھا جاتا تھا۔ درویش اور مسافر کاک (یا کیک) بڑی رغبت سے کھاتے تھے۔ اسی نسبت سے ان کا نام ''کاکی'' مشہور ہو گیا۔ (بحوالہ انوار الاصفیا)

[2] بہادر شاہ ظفر کے بھائی مرزا جہانگیر نے کسی بات سے مشتعل ہو کر انگریز ریذیڈنٹ کے سر پر طمنچہ مار دیا تھا جس پر وہ گرفتار ہوئے اور الہ آباد کے قلعے میں قید کیے گئے۔ اس مصیبت پر ان کی والدہ نے حضرت بختیار کاکیؒ کے مزار پر منت مانی کہ بیٹا رہا ہو جائے تو مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائے گی۔ مرزا جلد رہا ہو گئے جس پر ان کی والدہ نے بڑی دھوم دھام سے ایک تقریب منعقد کی اور مزار پر پھولوں کی چادر چڑھائی۔ ہندو مسلمان سب اس تقریب میں شریک ہوئے اور مہرولی میں ایک میلہ سا لگ گیا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ مرزا جہانگیر فرنگی کی قید سے رہا ہوئے۔ پھر ''پھول والوں کی سیر'' کے نام سے ہر سال میلہ منایا جانے لگا۔ (قمر اجنالوی)

(8)

غلام قادر روہیلہ

ابھی ہم، رنگا کی بستی میں مقیم تھے کہ 29 دسمبر 1857ء کا سورج غروب ہوتے ہی صادق ایلچی صرف تین سواروں اور تین فالتو گھوڑوں کے ہمراہ اچانک بستی میں نمودار ہوا۔

وہ سید برہان الدین کا پیغام لے کر آیا تھا۔ انہوں نے صفدر پیا اور ماموں اورنگ مرزا کے علاوہ مجھے خاص طور پر بلایا تھا۔ ماموں مرزا اگرچہ صادق ایلچی سے بہت سی باتیں پوچھنا چاہتے تھے لیکن اسے کچھ سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اس کے نزدیک سب سے اہم بات سید صاحب سے ملاقات تھی، جس کے لیے وہ ہمیں لینے آیا تھا۔ ادھر ہم میں سے ہر فرد پراسرار سید برہان الدین کو دیکھنے اور ان سے ملنے کے لیے بے چین تھا۔ اس لیے ہم نے بی مغلانی، مہرو اور عنبری کو بستی میں چھوڑا اور گھوڑوں میں سوار ہو کر جو صادق ایلچی اور اس کے ساتھی لے کر آئے تھے، ان کے ساتھ جنوب مشرق کو چل دیئے۔

ہماری زندگی اور زندگی کی سمت ناگہاں تبدیل ہو گئی تھی۔ اب اس کا ایک نیا مقصد، ایک نیا مفہوم، ایک نیا راستہ تھا اور ہم اس راستے پر گامزن تھے۔

ماموں اورنگ مرزا، صادق ایلچی کے ساتھ ساتھ، میں اور صفدر پیا ان کے پیچھے پیچھے پرانے ویرانوں اور کھنڈروں کے درمیان گزرنے والے راستے اور پگڈنڈیاں کاٹتے جنوب مشرق کی طرف بڑھ رہے تھے۔ چاندنی رات میں وہ سفر بالکل ایک خواب سا لگ رہا تھا۔

میں نے محسوس کیا کہ ماموں مرزا، ایلچی سے بہت جلد گھل مل گئے ہیں۔ دونوں سرگوشیوں میں باتیں کرتے جا رہے تھے مگر ہم چپ تھے۔ ہمیں ایک دوسرے سے کہنا بھی کیا تھا؟ زبانیں خاموش کیوں نہ ہوں پھر بھی محبت کرنے والے خاموشی کی زبان سمجھتے ہیں۔ لیکن اپنی محبت کے ساتھ ہمیں آزادی کی لگن بھی تھی کیونکہ زندگی، آزادی اور محبت ایک ہی ذات کے تین جوہر ہیں اور اسی آزادی کا جذبہ ہمیں کشاں کشاں ایک طرف لیے جا رہا تھا۔

ہم تینوں میں سے کسی نے پوچھا نہ صادق نے کچھ بتایا کہ ہمیں کہاں جانا ہے؟ پہلے کی طرح اس رات بھی ہماری نامعلوم منزل کا راہبر وہی تھا۔ ہم پرانی دہلی اور کیلوکھری کے کھنڈروں کو مشرق کی طرف چھوڑتے ہوئے مہرولی کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چاندنی رات میں سفر دو گھنٹے جاری رہا۔ حتیٰ کہ ویرانوں اور خرابوں سے گزرتے

ماموں اورنگ مرزا بھی حلف اٹھانے کے لیے تیار تھے۔

سنگ مرمر کے جالی دار کٹہرے کے اندر قطب صاحب کا مزار کافی کھلا مگر کچا ہے اور دہلی کا سب سے قدیم آستانۂ عقیدت ہے جہاں اپنے وقت کا ہر سلطان، ہر شہنشاہ حاضری دیتا رہا اور لوگوں کا اکثر ہجوم رہتا ہے لیکن اس وقت ہم چاروں کے سوا درگاہ کا کوئی فقیر یا جاروب کش بھی موجود نہ تھا۔ غالباً ہماری خاطر سب کو وہاں سے ہٹا دیا گیا تھا۔ ہم نے قطب صاحب کے مزار پر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے۔ میرا خیال تھا سید صاحب کا ایلچی حلف کے الفاظ ادا کرے گا اور ہم وہ الفاظ دہراتے جائیں گے مگر ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم سب اپنے اپنے طور پر فاتحہ و درود پڑھتے اور دعا مانگتے یا اپنے عہد کی پاس داری کا اقرار کرتے رہے۔

میں اپنے خاندان کی تباہی و بربادی پر بہت دکھی اور دل گرفتہ تھی۔ مقبرۂ ہمایوں میں اپنے عزیزوں کی ہلاکت وخون ریزی پر آنسو بہا چکی تھی اور رنگا کی بستی میں بھی گرفتاریوں اور پھانسیوں کی خبریں سن کر روتی رہی تھی۔ مگر میں مزار پر ہچکیوں کے ساتھ پھوٹ پھوٹ کے روئی۔ جس طرح برف قطرہ قطرہ ہو کر تحلیل ہوتی ہے، اسی طرح میں بھی قطرہ قطرہ ہو کر پگھلتی رہی اور وہ آنسو جو میری زندگی کا آخری سرمایہ یا میری بچی کھچی پونجی کی حیثیت رکھتے تھے، میں نے قطب صاحب کے قدموں میں نچھاور کر دیئے اور وہاں اپنی آخری فریاد کی۔ کیونکہ اس کے بعد نہ تو مجھے آنسو بہانا تھے، نہ کسی سے فریاد کرنا تھی۔

مجھ پر درد و الم اور خود رفتگی کی ایسی کیفیت طاری تھی کہ یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ میرے ساتھی اپنی اپنی دعا ختم کر چکے اور بھیگی آنکھوں سے میری بے کلی، بے اختیاری اور بے خبری کو دیکھ رہے ہیں۔

جب میں نے اپنی دعا یا فریاد ختم کی تو میرا چہرہ آنسوؤں سے بھیگ چکا تھا اور جیسا کہ عرض کر چکی ہوں وہ آخری آنسو تھے جو میں نے بہائے مگر اس حالت میں بھی صادق ایلچی بہ چشم تر میرے سامنے تسلیم بجا لایا یا پھر ہمارے آگے آگے چل دیا۔

جب میں درگاہ میں داخل ہوئی اپنے آپ کو طوفان کے دھارے پر بہنے والے حقیر تنکے کی طرح کمزور اور بے بس محسوس کر رہی تھی۔ لیکن مزار سے نکلی تو ایک طاقت میری کمزور ذات کو سہارا دے رہی تھی کیونکہ غم کا اظہار اگر چہرے کو اُداس کر دیتا ہے تو چہرے کی اُداسی دل کو بیدار کرتی ہے یا پھر وہ آنسو جو ہم سچی لگن اور پوری تڑپ کے ساتھ بہاتے ہیں ضائع نہیں جاتے اور لازوال قدرت مصیبت میں ہمارا ہاتھ پکڑ لیتی اور ہمارے دل کو تقویت دیتی ہے۔

❁......❁......❁

گداز دلوں کے ساتھ ہم اس دروازے سے باہر نکلے جو جنوب مشرقی جالیوں کی طرف ہے۔ مرمر کی ان جالیوں کے علاوہ وہ دروازہ بھی مغل شہنشاہ فرخ سیر نے تعمیر کرایا تھا۔ اسی جانب پرانی مسجد ہے جس کے صحن میں کبھی قدیم طرز کے حجرے تھے لیکن اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کے عہد میں ان حجروں کو گرا کر ایک بہت بڑی باؤلی بنا دیا گیا۔ وہ باؤلی حافظ محمد داؤد خاں بہادر مستقیم جنگ نے 1844ء اور 1846ء کے درمیان سنگ خارا اور چونے سے تعمیر کرائی تھی۔

مسجد کے جنوب میں مجلس خانہ یا سماع کدہ ہے جہاں قوالی کی محفلیں لگتی ہیں۔ مجلس خانے کے شمال میں بڑا

تبدیل ہو چکی ہیں۔ اسی حوض کے کنارے شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا مزار ہے۔ قلعہ کوٹ کی مغربی سمت سلطان التمش کی بنائی ہوئی عیدگاہ کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ درگاہ کے جنوب میں شاہ عالم اور شاہ اکبر ثانی کے مقبرے ہیں اور ان مقبروں کے مغرب میں اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کا بنایا ہوا ''ظفر محل'' ہے جو 1847ء میں تعمیر ہوا تھا۔

درگاہ کی مغربی دیوار چینی مٹی کی ہے اور اس دیوار کے باہر سنگ مرمر کی موتی مسجد مغل عہد کی ایک خوبصورت یادگار ہے۔ مغرب کی جانب ٹوٹے پھوٹے مقبرے، شکستہ مزار، بے لوح کی قبریں، بے نام کی ڈھیریاں بے حد و حساب ہیں۔ یہ قدیم قبرستانوں کی سرزمین ہے جہاں دفن ہونے والے ہزاروں، لاکھوں افراد کی خاک دھرتی کی خاک میں مل گئی اور ہڈیاں گل چکی ہیں کیونکہ زمین کا پیٹ آدمیوں کو ہڈیوں سمیت ہضم کر لیتا ہے۔

چاندنی رات میں ہم نے مغرب سے جنوب مشرق کی جانب سفر کیا اور مہرولی میں مغربی سمت سے داخل ہوئے تھے اس لیے میں نے قطب صاحب کے مغرب میں بکھرے کچھ قدیم آثار کا ذکر مناسب سمجھا ہے تاکہ تُو اس علاقے کی تاریخی حیثیت سے آگاہ ہو سکے۔ آثار سے گزر کر جن سے دلوں پر ماضی کا ہول طاری ہوتا ہے ہم درگاہ کے دروازے پر پہنچ گئے جہاں چار آدمی پہلے سے ہمارے منتظر تھے۔ انہوں نے گھوڑوں کی لگامیں تھام لیں اور ہم نے گھوڑے چھوڑ دیئے۔

سقوطِ دہلی اور لال قلعے سے دست برداری کے بعد بہت سے لوگ مقبرۂ ہمایوں، حضرت چراغ دہلی، حضرت نظام الدین اولیاؒ، حضرت بختیار کاکیؒ کی درگاہوں میں پناہ گزین ہوئے تھے۔ مگر بادشاہ کی گرفتاری، شہزادوں کے قتل، باغیوں کی گرفتاری اور پھانسیوں کا سلسلہ شروع ہوتے ہی لوگ ان پناہ گاہوں سے نکل کر مختلف مقامات کی طرف بھاگ رہے تھے۔ قطب صاحب کی درگاہ کا احاطہ بڑا وسیع اور چاروں طرف کھلے صحنوں پر پھیلا ہے۔ شمالی صحن میں بہت کم بلکہ اِکا دُکا آدمی نظر آئے۔ زیادہ تر لوگ جنوب کے صحن میں فروکش تھے مگر تین چار دنوں میں اکثر وہاں سے بھی نکل گئے تھے۔ جنوبی اور شمالی صحنوں میں متعدد بزرگوں کے مزار اور مقبرے ہیں۔

اپنے راہبر کے ساتھ ساتھ ہم ان مزاروں اور مقبروں کو چھوڑ کر سنگ مرمر کے جالی دار کٹہرے کی سمت بڑھے جس کے اندر حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ ابدی نیند سو رہے تھے۔ صادق ایلچی نے بتایا۔

''سید صاحب کی ملاقات سے پہلے حضرت قطب صاحب کی حاضری ضروری ہے تاکہ اس مقدس مزار پر آپ صدقِ دل کے ساتھ اپنے مقصد پر کاربند رہنے کا عہد کریں اور یہ قطعۂ خاک آپ کے عہد کا گواہ رہے۔''

صادق ایلچی کے الفاظ تو معمولی لیکن ان کے معانی غیر معمولی تھے جن کی عظمت یا ہیبت نے ہمارے دلوں کو لرزا دیا جو دہلی کے مسلمانوں پر ٹوٹنے والے مصائب اور مغلوں پر گزرنے والی قیامت سے پہلے ہی گداز ہو رہے تھے۔ راحت کے ایام ہوں یا مصیبت کی گھڑیاں، اولیاء کے آستانوں پر حاضر ہونے والے اکثر لوگ صرف اپنی مشکلوں سے نجات اور اپنی مصیبتوں سے چھٹکارا چاہتے ہیں۔ مگر ہماری حاضری کا مقصد یہ تھا کہ ہم فرنگی کے خلاف آزادی کی جدوجہد کا عہد کریں جس نے ہندوستان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا اور لوگوں کے خون کے کفن پہنا رہا تھا۔

یہ مقصد درگاہوں پر مرادیں مانگنے والوں سے مختلف تھا بلکہ یہ کہنا درست ہو گا کہ ہمیں وہاں اس عہد کا حلف اٹھانے کی خاطر لایا گیا تھا جس کا ذکر صادق ایلچی اپنی دوسری ملاقات میں کر چکا تھا۔ صفدر پیا کے ساتھ میں اور

صرف انہی کے لیے مخصوص ہے، عاریتاً حاصل کیا گیا ہے اور ملاقات کے بعد آپ کی طرح میں بھی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ ہماری آئندہ ملاقات کہیں اور ہوگی۔ حالات کی طرح زندگی بھی اپنے راستے بدلتی رہتی ہے مگر کسی مقصد کے بغیر زندگی کا سفر بے معنی ہے۔''

میں ان کی باتیں سن کر حیران ہوتی رہی۔ بڑھاپا انسان کے قویٰ کو مضمحل کر دیتا اور آواز پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ مگر 95 برس کے سید برہان الدین کی آواز میں ایک دبدبہ اور پاٹ تھا۔ الفاظ کے اتار چڑھاؤ اور تلفظ کی ادائیگی میں پیرانہ سالی کی کوئی علامت نہ تھی۔ صرف بات کرتے کرتے وہ ذرا پل بھر کے لیے رک جاتے اور پھر سلسلۂ کلام شروع کرتے تھے۔ یہ گفتگو کرنے کا انداز تھا۔ ایک پل ٹھہر کے انہوں نے پھر کہا۔

''میں نے اپنی طویل زندگی گمنامی میں گزار دی ہے۔ لیکن اس گمنامی کا بھی ایک مقصد تھا۔ میرے والد سید شمس الدین مغل شہنشاہ عزیزالدین عالمگیر ثانی کے شاہی محرر اور لال قلعے میں ملازمت کرتے تھے۔ اگرچہ وہ زوال کا دور تھا اور کئی صوبے مغلیہ سلطنت کی عمل داری سے نکل گئے تھے۔ پھر بھی ہندوستان پر مغلوں کے نام کی دھاک ابھی قائم تھی۔ جب عالمگیر ثانی کو قتل کیا گیا، اس کا بیٹا عالی گہر بنگال کی مہم پر تھا۔ اسے عظیم آباد میں شاہ عالم کے لقب سے باپ کا جانشین بنایا گیا۔ انہی دنوں احمد شاہ ابدالی نے 1761ء میں احمد خاں روہیلہ، نجیب الدولہ اور شجاع الدولہ کے ساتھ مل کر پانی پت میں مرہٹوں کو شکست دی اور ہندوستان کا تخت و تاج عالی گہر شاہ عالم کے لیے چھوڑ کر کابل چلا گیا۔

میرے والد نے مجھے چھوٹی عمر ہی میں محرری کی تعلیم دی۔ اس زمانے میں دستور تھا بلکہ ہر زمانے میں یہی دستور رہا ہے کہ شاہ کا بیٹا شاہ، سپاہی کا بیٹا سپاہی اور محرر کا بیٹا محرر بنتا ہے۔ میں اٹھارہ برس کی عمر میں لال قلعے سے وابستہ ہوا اور مجھے شاہی محرروں میں جگہ مل گئی۔ میں ایک عام پرچہ نویس تھا۔ صرف شاہی خطوط، رقعات، پیغامات وغیرہ لکھنا میرے فرائض منصبی میں شامل تھا۔ لیکن والد صاحب کی وفات کے بعد مجھے ان کی جگہ پر ترقی دے دی گئی اور میں دربارِ شاہی کی کارروائی لکھنے والے محرروں میں شامل ہو گیا جن کی تحریریں محررِ اعلیٰ کی منظوری سے دفترِ شاہی میں رکھی جاتی تھیں۔''

یہ کہہ کر سید صاحب پھر ایک پل کے لیے رُکے اور اپنا سانس درست کر کے یا ذہن میں ماضی کی بکھری یادوں کو سمیٹ کر ہندوستان کی تاریخی روداد بیان کرنے لگے۔

''سکھ، مرہٹے، جاٹ اورنگ زیب عالمگیر کے دور میں بغاوتیں کر رہے تھے اور مغل فوجوں نے ان بغاوتوں کو کچل دیا تھا لیکن اورنگ زیب کے جانشین مغلیہ سلطنت کے خلاف ہونے والی سازشوں اور بغاوتوں پر قابو نہ پا سکے۔ صوبے، اضلاع، شہران کے قبضے سے نکلتے چلے گئے۔ اس کا بنیادی سبب اقتدار کے داخلی جھگڑے تھے۔ حکومت کی کمزوری سے سلطنت بھی بکھرنے لگی۔ نادر شاہ درانی اور احمد شاہ ابدالی کے حملوں کے نتیجے میں حالات مزید خراب ہونے لگے۔

اورنگ زیب نے 1707ء میں انتقال[1] کیا۔ جس کے بعد بڑے بیٹے معظم (بہادر شاہ اوّل) اور اس کے

---

[1] ''فال آف دی مغل ایمپائر'' (زوالِ سلطنتِ مغلیہ) کے مصنف سر جادو ناتھ سرکار نے زوالِ سلطنت کے یہ اسباب تفصیل کے ساتھ رقم کیے ہیں۔ (قمر اجنالوی)

وسیع رقبہ ہے، جہاں سینکڑوں قبریں ہیں۔ ان میں میاں نصیر الدین کالے صاحب اور حکیم محمد شریف خاں کے بھی مزار ہیں۔ مسجد کی مغربی دیوار کے نیچے حضرت فخر الدین چشتی نظامی کا مزار ہے۔

ہمارا راہبر ہمیں باؤلی[1] کی طرف لے گیا جس کے عقب میں ایک حجرہ تھا۔ وہ ہمارے آگے آگے اسی حجرے میں داخل ہوا اور اس کا دروازہ بند کر دیا گیا۔ مگر چھوٹا سا حجرہ خالی پڑا تھا۔ صرف اس کے طاقچے میں مٹی کا دِیا جل رہا تھا۔ عقبی دیوار میں ایک دروازہ نظر آیا۔ صادق ایلچی اسی طرف بڑھا اور اسے کھول دیا۔ دروازہ کھلتے ہی ایک زینہ نمودار ہوا جو کہیں نیچے اُترتا تھا۔ ترچھے زینے کی چوڑائی ایک گز سے زیادہ نہ تھی اور اس سے ایک ہی آدمی گزر سکتا تھا۔

ہم اس زینے پر ہو لیے۔ صادق ایلچی آگے آگے تھا۔ اس کے پیچھے صفدر پیا تھے۔ ان کے پیچھے میں تھی اور میرے پیچھے ماموں مرزا تھے۔ پوری پندرہ سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک لمبے مستطیل کمرے میں داخل ہوئے جہاں وہ طویل کمرہ ختم ہوتا تھا۔ وہاں ایک سہ شاخہ شمع دان روشن تھا اور تین شمعوں کی روشنی میں ایک سفید ریش بزرگ سرخ بانات کے غالیچے پر بیٹھے تھے اور جیسا ہمارے راہبر نے بتایا، وہی سید برہان الدین تھے۔

ہمیں دیکھتے ہی وہ کھڑے ہو گئے۔ ان کی طویل العمری کا ذکر سن کر میں یہی سمجھی تھی کہ جس بزرگ نے عزیز الدین عالمگیر ثانی کا زمانہ دیکھا، پھر یکے بعد دیگرے شاہ عالم، شاہ اکبر ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے جلوس دیکھے حتیٰ کہ مغلیہ سلطنت ختم ہوتے دیکھی، وہ بڑے پیرانہ سال اور نحیف البدن ہوں گے لیکن میں 95 برس کی عمر میں ان کی جسمانی صحت اور جسم کی حرکت دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ بلکہ میرے ساتھ صفدر پیا اور ماموں مرزا نے بھی انہیں عجلت سے اُٹھتے دیکھا تو حیران ہوئے تھے۔ 95 سال کا بوڑھا تو کسی سہارے کے بغیر اُٹھ نہیں سکتا۔

ہم قریب گئے تو مغلیہ دستور کے مطابق آداب وسلام ہوئے۔ وہ خندہ پیشانی سے ملے۔ میں نے چادر اوڑھ رکھی تھی جس سے ماتھا اور ٹھوڑی چھپ گئے مگر نصف چہرہ کھلا تھا۔ انہوں نے مجھے شفقت کی نظر سے دیکھا اور وہ نظر ایسی تھی جس میں پدری محبت کا دھارا چل رہا تھا۔ ایسی ہی نگاہ صفدر پیا پر بھی ڈالی۔ پہلے میرے، پھر ان کے سر پر اپنا بوڑھا ہاتھ رکھا۔ اسی ہاتھ سے ماموں اورنگ مرزا کے ساتھ مصافحہ کیا اور ہمیں غالیچے پر بیٹھنے کے لیے کہا لیکن اس وقت تک خود نہیں بیٹھے جب تک ہم بیٹھ نہیں گئے۔

وہ بوڑھے ضرور تھے۔ چہرے پر 95 برس کے طویل سفر کی پگڈنڈیاں دکھائی دے رہی تھیں جن پر کہیں کہیں گزرے وقت کی دھول جم گئی تھی۔ لیکن زندگی کا سفر ابھی جاری تھا اور اس سفر کے ساتھ ساتھ زندگی کی جدوجہد بھی جاری تھی۔ آنکھیں اس بڑھاپے میں جب ان کا نیل ڈھلنے لگتا ہے، غیر معمولی طور سے روشن اور تابناک تھیں۔ طویل العمری کے باوجود نہ کمر خم ہوئی تھی، نہ بدن میں شکستگی کے آثار تھے۔ البتہ آک کی بڑھیا کے مانند سفید بالوں سے جوان کی بزرگی کا نشان تھے، پتہ چلتا تھا کہ وہ جوانی کے ماہ وسال بہت پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔

انہوں نے بیٹھتے ہی گفتگو کا آغاز کر دیا اور کہنے لگے۔ ''میں نے آپ لوگوں کو یہاں آنے کی زحمت دی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ نے میری دعوت قبول کی۔ ملاقات کے لیے اس مقام کا انتخاب ایک خاص مقصد اور مصلحت کے تحت کیا گیا ہے۔ ورنہ میں یہاں نہیں رہتا۔ خلیفۂ درگاہ سے یہ کمرہ جہاں وہ اعتکاف بیٹھتے ہیں اور

[1] اب باؤلی کو پاٹ کر وہاں مسافروں کے لیے کمرے بنا دیئے گئے ہیں۔ (قمر اجنالوی)

''میں نے بتایا ہے کہ شاہ عالم کے زمانے میں جب میں بھی جوان ہی تھا، والد کی وفات کے بعد مجھے شاہی محرروں میں جگہ مل گئی تھی جو دربارِ شاہی کی رُوداد قلم بند کرتے تھے۔ یہ اعزاز کوئی اتنا اہم تو نہیں تھا مگر لال قلعے اور دربار سے تعلق کا ذریعہ ضرور تھا اور بعض ایسی باتیں بھی میرے علم میں آ جاتی تھیں جن سے عام لوگ اکثر ناواقف رہتے تھے۔ مجھے اس حقیقت کے اظہار میں کوئی ہچکچاہٹ یا تشویش نہیں کہ دربارِ شاہی میں ہونے والی بعض باتیں انتہائی ناخوشگوار ہوتی تھیں۔ شاہ عالم کے وزیر اور مشیر انہیں اصل امور سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے اور داخلی سازشوں میں مصروف رہتے تھے۔ قلعے کے حالات بھی اچھے نہیں تھے۔ اپنی سلطنت کا تحفظ کرنے کے بجائے مغل شہزادے عیش و عشرت میں مگن رہتے تھے اور حکومت و سلطنت کے دفاع کی کسی کو فکر نہ تھی۔

انہی ایام میں جب ہندوستان میں ہر طرف طاقت آزمائی ہو رہی تھی، روہیل کھنڈ میں روہیلے افغانوں نے زور پکڑا اور غلام قادر روہیلہ اپنے لشکر لے کر دہلی پر چڑھ آیا۔ مغلوں نے شکست کھائی، روہیلوں نے دہلی کو لوٹا اور لال قلعے پر بھی قبضہ کر لیا۔ غلام قادر روہیلہ اتنی بڑی طاقت کا مالک نہیں تھا کہ وہ ہندوستان اور شہنشاہیت کے خواب دیکھنے والے مرہٹوں اور انگریزوں کا مقابلہ کر سکتا۔ اس زمانے میں یہاں مرہٹے اور انگریز ہی غالب اور برتر طاقت کی حیثیت رکھتے تھے۔ سکھ، روہیلے، جاٹ، پنڈارے بعض علاقوں پر قابض ضرور ہو گئے لیکن برتر طاقتیں انہیں کسی وقت بھی پامال کر سکتی تھیں اور ہوا بھی یہی۔

غلام قادر روہیلے کا لشکر دہلی کو اور وہ خود مغلوں کے خزانے لوٹنے آیا تھا۔ چوسر کی گوٹ اس کے حق میں پڑی تھی۔ اس نے شاہ عالم کو اس کے اپنے گھر میں ''شہ مات'' دے دی اور گرفتار کر لیا۔ اس شکست و گرفتاری کا اہم واقعہ یہ ہے کہ غلام قادر نے شاہ عالم کی آنکھیں نکلوا دی تھیں۔

تاریخ میں اس کے بہت سے اسباب لکھے ہوں گے۔ روہیلے نے مغل شہنشاہ کی آنکھیں کیوں نکلوا دی تھیں اور انہیں بینائی کے نور سے ہمیشہ کے لیے محروم کیوں کر دیا تھا؟ اگر شاہ عالم کا جرم اتنا ہی سنگین تھا تو انہیں قتل بھی کر سکتا تھا۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ فاتح، مفتوح حکمرانوں کی گردنیں مارتے رہے ہیں۔ لیکن غلام قادر نے ایسا نہیں کیا۔ بینائی سے محروم کر دینے کے باوجود شاہ عالم کو زندہ رکھا اور اس ظلم کا عذر یہ نکالا کہ شاہ عالم نے میرے باپ پر حملہ کر کے نجیب الدولہ کو مرہٹوں سے لٹوایا تھا۔ غلام قادر خان، نجیب الدولہ کا پوتا تھا اور اس نے اپنے باپ اور دادا کا بدل لینے کے لیے مغل شہنشاہ کو اندھا کر دیا جیسا کہ سمجھا جاتا ہے۔

اس الم ناک اور انتہائی سنگ دلانہ واقعے کا ایک سبب میں بھی جانتا ہوں اور ایسا ہے وہ سبب جس پر لوگ شاید مشکل ہی سے یقین کریں۔ دنیا میں بعض حقیقتیں اخفا کے پردوں میں مستور رہتی ہیں اور وقت گزر جانے کے بعد کوئی ان پر توجہ نہیں دیتا۔ میں نے خود آج تک اس بات کو چھپائے رکھا ہے جو مجھے اتفاق سے معلوم ہو گئی تھی۔ کیونکہ بھید کی بات پر پردہ ہی پڑا رہے تو بہتر ہے۔

غلام قادر روہیلے کو قلعے سے لوٹ کا جو مال ہاتھ لگا، وہ اس کی توقعات سے بہت کم تھا۔ کسی نے بتایا کہ شاہ عالم نے اصل خزانہ کہیں چھپا دیا ہے۔ اس نے مغل شہنشاہ کو اپنے حضور طلب کیا اور خزانے کے بارے میں پوچھا جو اسے ملنے والی اطلاع کے مطابق کہیں دفا کر دیا گیا تھا۔ شاہ عالم نے خزانے کو چھپانے یا دفن کرنے سے انکار کیا جس پر روہیلہ غضب ناک ہو گیا اور گرج کر بولا۔

بھائی اعظم کے درمیان اقتدار کی خونریز جنگ ہوئی جس میں معظم کامیاب ہوا مگر وہ پانچ برس حکومت کر سکا۔ اس کا جانشین جہاں دار بڑا اوباش تھا۔ صرف دس ماہ میں چل بسا۔ پھر فرخ سیر نے تخت سنبھالا۔ 1710ء میں سکھ سرہند پر چڑھ آئے تھے۔ فرخ سیر اور سید برداران میں داخلی جھگڑے نے جو صورت اختیار کر لی، اس کے باعث حسین علی 1719ء میں مرہٹہ پیشوا بالا جی وشوا ناتھ کی فوجیں دلی میں لے آیا۔ بالا جی کے بعد اس کے بیٹے باجی راؤ نے 1720ء میں بندھیل کھنڈ پر قبضہ کر لیا اور مالوہ و گجرات سے بھی چوتھ وصول کرنے لگا۔ 1739ء میں جب محمد شاہ کی حکومت تھی، نادر شاہ درانی نے دہلی پر حملہ کیا۔ دہلی کو لوٹا اور مغلوں کو مزید پامال کر دیا۔ اس کی واپسی کے بعد سکھ، مرہٹے، جاٹ پھر مغلیہ علاقوں کو روندنے لگے۔ باجی راؤ پورے ہندوستان پر حکمرانی کے خواب دیکھنے لگا۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی دعوت پر احمد شاہ ابدالی 1760ء میں آیا تھا جس نے پانی پت کے میدان میں مرہٹہ لشکر کو شکست دے کر ہندوستان پر ان کی حکمرانی کے خواب بکھیر دیئے مگر ابدالی کی واپسی کے بعد ہندوستان میں جو سیاسی ابتری پھیلی اور مختلف طاقتوں نے جو لوٹ مچائی، تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مغل حکمرانوں بہادر شاہ اوّل، جہاں دار فرخ سیر، رفیع الدرجات، رفیع الدولہ، محمد شاہ (رنگیلا)، احمد شاہ اور عزیز الدین عالمگیر ثانی کے عہد تک مغلیہ سلطنت کے خلاف جو بغاوتیں ہوئیں، جو داخلی جھگڑے اُٹھے، انہوں نے تیموری قوت کو ادھیڑ کے رکھ دیا تھا۔ لیکن احمد شاہ ابدالی کے لوٹتے ہی ہندوستان ''لوٹ کا مال'' بن گیا۔ انگریز، مرہٹے، سکھ، روہیلے، جاٹ، پنڈارے اپنی کچھاروں سے نکل آئے اور ہندوستان میں سیاسی لوٹ مار کا بازار گرم ہو گیا۔ ہر طاقت برصغیر کے حصے بخرے کرنے اور اپنے علاقے بڑھانے میں مصروف ہو گئی۔ جس علاقے پر جس نے قبضہ کر لیا، اسی کا ہو گیا۔ جس شہر میں لوٹ مچی، کوئی اسے بچانے نہ آیا۔ شاہ عالم کی سلطنت حوادث میں گھر گئی۔

سیاسی اصطلاح میں اسے طوائف الملوکی کہا جاتا ہے۔ یعنی بدنظمی، بدانتظامی، نااتفاقی، سرکشی اور لوٹ کھسوٹ کا دور۔ مغلیہ سلطنت اندرونی بغاوتوں اور بیرونی حملوں سے اپنی حاکمانہ ہیئت کھو چکی تھی۔ اس کے باوجود تباہی کے ہر دھارے کا رخ اسی جانب تھا۔ اس کی وجہ یہ تھیں۔

- مغل تاج دار ابھی تک ''شہنشاہ'' کہلاتے تھے۔
- بہت کچھ لٹ جانے کے باوجود ایک وسیع رقبے پر ان کی حکومت تھی
- کئی والیانِ ریاست ان کی اطاعت کا دم بھرتے اور مغلوں کے سوا کسی کو ہندوستان کا جائز اور قانونی حکمران نہیں سمجھتے تھے۔

❁......❁......❁

ہندوستان میں طوائف الملوکی یا سیاسی مار دھاڑ کی تاریخ بیان کرنے کے بعد سید صاحب تھوڑی دیر کے لیے پھر چپ ہو گئے۔ ہم یہ واقعات بڑی توجہ سے سن رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے اپنی یادداشت کا جو ورق کھولا، وہ بڑا حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھا۔ اس مرتبہ ان کی خاموشی کا وقفہ پہلے سے ایک دو پل زیادہ تھا۔ آخر وہ کہنے لگے۔

تیموری خاندان سے رخصت[1] ہوگئی ہے۔''

پھر اس نے حکم دیا کہ اس واقعے کے ساتھ اس کے الفاظ بھی رقم کیے جائیں اور پھر ایوان سے نکل گیا۔''

یہ واقعہ سن کر میں تڑپ گئی اور بے اختیار بول پڑی۔ ''اگر اس وقت میں ہوتی تو غلام قادر روہیلہ نہ اپنی آنکھیں سلامت لے کر اُٹھتا نہ زندہ باہر جاتا بلکہ وہاں سے اس کا جنازہ نکلتا۔''

سب نے چونک کر مجھے دیکھا اور میری کیفیت پر حیران رہ گئے۔ مارے غصے اور جوش کے میرا بدن کانپ رہا تھا اور سب اس حالت پر پریشان تھے۔ مگر میں نے سید صاحب کی آنکھوں میں اطمینان کی جھلک دیکھی۔ ساتھ ہی ان کی آواز سنائی دی۔ ''غیرت انسان کی پہچان ہے اور مجھے خوشی ہے کہ آپ اس کا مفہوم اور مقصد اچھی طرح سمجھتی ہیں۔''

اچانک صفدر پیا کو ایک عجیب بات سوجھی اور پوچھنے لگے۔ ''اعلیٰ حضرت نے کہیں اسی لیے تو بخت خاں کے ساتھ جانے سے انکار نہیں کر دیا تھا کہ وہ بھی غلام قادر کی طرح روہیلہ ہے؟''

سید صاحب نے جواب دیا۔ ''مرزا الٰہی بخش نے بادشاہ کو یہی بات یاد دلائی تھی کہ مغلوں اور روہیلوں میں پرانی دشمنی ہے۔ مگر غلام قادر اور بخت خاں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ایک نے دہلی پر حملہ کیا اور لال قلعے کو لوٹ لیا۔ مگر دوسرا مغلوں کی مدد کرنے دہلی آیا تھا۔ اگر بادشاہ، بخت خاں کے ساتھ چلے جاتے تو مغلیہ خاندان تباہ و برباد ہونے سے بچ جاتا۔ فرنگی بھی اس طرح قتل عام کرتے نہ لوگوں کو سرعام پھانسیوں پر چڑھاتے۔ حکمران ہاتھ سے نکل جائے تو دشمن کو اس کے حملے اور انتقام کا دھڑکا لگا رہتا ہے۔ مگر بہادر شاہ ظفر نے یہ بات نہیں سوچی۔ ان کے مصلحت اندیش بڑھاپے نے دشمن پر اعتماد کر لیا۔''

ماموں اورنگ مرزا خود بھی اعلیٰ حضرت کی اس غلطی پر نالاں تھے جو ان سے اپنی گرفتاری دینے کی صورت میں سرزد ہوئی۔ مگر یہاں انہوں نے بادشاہ کی حمایت کا پہلو نکالا۔ ''وہ کرتے بھی کیا؟ انگریز نے دام ہی ایسا بچھایا تھا کہ اس میں پھنس گئے۔''

''اورنگ مرزا! حکمرانوں کے فیصلے ملک اور قوم کی تقدیر سمجھے جاتے ہیں۔ ان کا اٹھا ہوا راست قدم قوم کو آزادی کی راہ پر ڈال دیتا ہے اور ایک ہی غلط قدم ملک کو غلامی کے جہنم میں دھکیل دیتا ہے۔''

سید صاحب کا لہجہ پہلے سے کچھ بدل گیا تھا۔ ان کے ذہن میں پھر ماضی کے گرد باد چکر کاٹنے لگے اور وہ

---

[1] علامہ اقبال نے غلام قادر روہیلہ کے الفاظ کو اس طرح قلم بند کیا ہے ؎

مرا مسند پہ سو جانا بناوٹ تھی، تکلف تھا
کہ غفلت دور ہے شانِ صف آرایانِ لشکر سے
یہ مقصد تھا مرا اس سے کوئی تیمور کی بیٹی
مجھے غافل سمجھ کر مار ڈالے میرے خنجر سے
مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر
حمیت نام ہے جس کا، گئی تیمور کے گھر سے

(بانگِ درا)

”اعلیٰ حضرت! آپ میری بات کو سمجھیں اور انکار کر کے اپنی ذات سے دشمنی نہ کریں۔“

انہوں نے دیکھا کہ ایسا آدمی سامنے کھڑا ہے جو رحم سے نا آشنا ہے پھر بھی بڑے تحمل سے جواب دیا۔

”غلام قادر! تمہیں اختیار ہے، ہماری بات پر یقین کرو یا نہ کرو۔ مگر جو کچھ ہمیں بتانا تھا وہ بتا چکے ہیں۔“

”میں آخری موقع دے رہا ہوں کہ مجھے پوشیدہ خزانے کا پتہ بتا دیں۔ اگر اب بھی انکار کیا تو آپ پر ایک بھیانک رات طاری کر دی جائے گی جو کبھی ختم نہیں ہوتی۔“

شاہ عالم کے پاس ایک ہی جواب تھا۔ ”ہم کسی خفیہ خزانے سے واقف نہیں۔ جو کچھ تھا، وہ تم لوٹ چکے ہو۔“

یہ آخری جواب سن کر روہیلہ مشتعل ہو گیا اور اس نے حکم دیا۔ ”شاہ عالم کی آنکھیں نکال دی جائیں تاکہ وہ بھی اپنی چھپائی ہوئی دولت کو نہ دیکھ سکیں۔“

اسی وقت دو آدمی مغل شہنشاہ پر جھپٹے اور انہیں اپنے شکنجے میں کس لیا۔ تیسرے نے ان کی آنکھوں میں خنجر گھونپ دیا اور باری باری دونوں پتلیاں نکال دیں[1] شاہ عالم کی چیخیں بلند ہوئیں اور چہرہ خون سے بھر گیا۔ اس طرح اس پر کبھی ختم نہ ہونے والی رات طاری کر دی گئی۔ مگر روہیلے کا انتقام یہیں ختم نہیں ہو گیا۔

اس نے ایوانِ شاہی میں عیش و نشاط کی محفل منعقد کی اور اس محفل میں مغل شہزادیوں کو رقص کرنے کا حکم دیا۔ شاہی خواتین اور دخترانِ تیمور پر جیسے برقِ آسمانی ٹوٹ پڑی۔ وہ شہزادیاں جن کے حُسن کی جھلک کبھی چشمِ فلک نے بھی نہیں دیکھی ہوگی، برہنہ سر اس کے حضور لائی گئیں اور انہیں رقص پر مجبور کیا گیا۔ ساتھ ہی یہ حکم بھی ہوا کہ شاہی محرر اس واقعے کو قلم بند کریں۔ میرے سوا وہاں کوئی نہ تھا۔ سارے محرر اور پرچہ نویس بھاگ گئے یا روپوش ہو گئے تھے۔ سپاہی مجھے پکڑ لائے کہ حکم کی تعمیل کروں۔

وہ ایک عجیب منظر تھا۔ دخترانِ تیمور کھلے منہ رقص کر رہی تھیں۔ چہرے اُداس، آنکھوں میں آنسو مگر پاؤں جنبش پر مجبور تھے۔ اس منظر کی کیفیت تحریر کرتے ہوئے میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ قلم تھرا رہا تھا۔ اسی اثنا میں جب مغل شہزادیاں ناچ رہی تھیں، غلام قادر نے کمر سے تلوار کھول دی۔ خنجر نکال کر اپنے پاؤں میں رکھ لیا اور مسندِ شاہی پر نیم دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیں جیسے اونگھ یا سو رہا ہو۔ وہ خود تو بے خبر ہو گیا لیکن شہزادیوں کے پاؤں فرشِ مرمر پر تھرکتے اور پھسلتے رہے۔ رقص جاری تھا کہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اچانک اٹھا، تلوار کمر سے باندھی، خنجر اٹھا کر پیٹی میں اڑس لیا اور بولا۔

”جو بہادر میدانِ جنگ میں لشکر کی صفیں آراستہ کرتے ہیں، وہ رقص کی محفل میں سویا نہیں کرتے۔ میں نے مسند پر سونے کا تکلف اس لیے کیا تھا کہ اگر تیموری کسی بیٹی میں غیرت ہو تو غافل اور بے خبر دیکھ کر مجھے میرے ہی خنجر سے ہلاک کر دے مگر ایسا نہیں ہوا۔ تیموری کسی بیٹی نے میرا خنجر اُٹھانے کی جرأت نہیں کی جس سے معلوم ہو گیا کہ آلِ تیمور میں غیرت نہیں رہی۔ بس یہ رقص بند کرو۔ میں دنیا کو صرف یہی دکھانا چاہتا تھا کہ شرم اور غیرت

---

[1] علامہ اقبال نے اس سفاکانہ واقعے کو نظم میں بیان کیا ہے ۔

روہیلہ کس قدر ظالم، جفا جُو ، کینہ پرور تھا
نکالیں شاہ تیموری کی آنکھیں نوکِ خنجر سے

(بانگِ درا)

اور مکن درہ میں اسے شکست دی۔ پھر اس کی فوجیں دہلی پہنچ گئیں۔ اب شاہ عالم، ہلکر کی تحویل میں تھے۔ مگر جنرل لیک نے انگریزی فوج کی شکست کا بدلہ چکانے کے لیے پھر دہلی پر چڑھائی کی۔ ہلکر، دہلی کے دفاع کی ذمہ داری نواب مرتضیٰ خان[1] کو سونپ کر پنجاب کی طرف چلا گیا تھا۔ نواب نے ہلکر کی طرف سے جنرل لیک کا شدید مقابلہ کیا۔ مگر انگریز کا پلہ بھاری رہا۔ آخر مرتضیٰ خاں نے ہلکر اور جنرل لیک کے درمیان صلح کرا دی۔

ان جنگوں میں اگرچہ کمپنی سرکار کا اپنا دیوالیہ نکل گیا اور جنرل لیک جمنا پار انگریزی علاقے میں چلا گیا لیکن اس نے اندھے مغل شہنشاہ سے انگریزوں کے لیے بہت سی مراعات کے ساتھ حکمرانی کے حقوق بھی حاصل کر لیے تھے اور اب شاہ عالم انگریز کی نگرانی میں تھے۔

یہ تمام واقعات میرے سامنے پیش آئے۔ میں نے روہیلوں، مرہٹوں، انگریزوں کو دہلی پر حملے کرتے دیکھا۔ شاہ عالم کو شطرنج کے پٹے ہوئے مہرے کی طرح ہر فاتح کی تحویل میں جاتے دیکھا اور یہ بھی دیکھا کہ مغلوں نے ان واقعات سے کوئی سبق حاصل نہ کیا بلکہ ان کی عیش و عشرت کی راتیں کچھ اور رنگین، کچھ اور طویل ہو گئیں۔

شاہ عالم وہ بدنصیب حکمران تھے جن کی بینائی چھین لی گئی۔ اندھے کی رات طویل ہوتی ہے۔ ان کی حکمرانی کا دکھوں بھرا عہد بھی کافی طویل تھا۔ انہوں نے 45 برف حکومت کی اور حکومت کہاں کی؟ کبھی مرہٹوں، کبھی انگریزوں کے وثیقوں کی مہر بنے رہے۔ جو کچھ وہ چاہتے تھے، لکھوا لیتے اور اس پر شہنشاہِ ہند اعلیٰ حضرت عالی گہر شاہ عالم کے نام کی مہر لگ جاتی تھی۔

وہ دیوانی اختیارات کی مہر بھی تھے اور دوسروں کے ہاتھ میں سیاسی بساط کے مہرے بھی، جنہیں طاقتور اپنی مرضی سے جس خانے میں چاہتا رکھ دیتا تھا۔ جس طرح شطرنج کے پیادے اسپ، فیل، رخ، فرزین، شاہ سب شاطر کی مرضی پر حرکت کرتے ہیں اور آگے بڑھنے یا پیچھے ہٹنے سے انکار نہیں کر سکتے، اسی طرح شاہ عالم بھی مرہٹوں اور انگریز کی چال کے مہرے اور انہی کے اشارے پر حرکت کرتے تھے۔ سندھیا نے تو پھر بھی ان کی شہنشاہی کا بھرم قائم رکھا تھا لیکن انگریز نے انہیں اس مسند سے نیچے گھسیٹ لیا اور تمام مغلیہ سلطنت کا انصرام خود سنبھال کر ان کا وظیفہ مقرر کر دیا تاکہ اندھے حکمران کو کاروبارِ حکومت کی تکلیف اور پریشانی نہ اٹھانا پڑے۔

1806ء میں شاہ عالم کا انتقال ہوا۔ وہ زندگی کے عذاب اور حکومت کے جنجال سے چھوٹے۔ پھر ان کے فرزند معین الدین شاہ اکبر ثانی کے لقب سے اس مغلیہ سلطنت کے وارث قرار پائے جس کی حیثیت ایک لٹی پٹی ریاست سے زیادہ نہ تھی اور جس پر انگریز نے اپنی شہریاری کا سایہ ڈال رکھا تھا۔

شاہ اکبر ثانی شہنشاہ کی بجائے صرف ایک وظیفہ خوار بادشاہ تھے جن کی تقرری کا پروانہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دفتر کلکتہ سے جاری ہوا۔ وہ اگرچہ کمپنی کی شرائط کے پابند اور محدود اختیارات رکھتے تھے پھر بھی ان کے جلوسِ

---

[1] نواب مرتضیٰ خاں اردو کے شاعر اور تذکرہ نویس مصطفیٰ خاں شیفتہ کے والد بڑے ماہر فوجی تھے۔ انہوں نے جسونت راؤ ہلکر کی ملازمت کر لی تھی۔ ہلکر اور جنرل لیک کے درمیان صلح کا ذریعہ بنے اور اس صلے میں دہلی کے قریب پلول کا علاقہ جاگیر میں ملا۔ مگر نواب مرتضیٰ خاں کی وفات پر انگریز نے جاگیر واپس لے لی اور خاندان کی پنشن لگا دی تھی۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ جہانگیر آباد کے جاگیردار تھے۔ یہ علاقہ ان کے والد نے نیلامی میں خریدا تھا۔ (قمر اجنالوی)

ہمیں ایک بار پھر گزرے زمانے میں لے گئے۔

''شاہ عالم سے بھی کچھ ایسی ہی غلطیاں سرزد ہوئی تھیں جن کا خمیازہ ملک اور قوم کو بھگتنا پڑا۔ اگر انہوں نے آنے والے خطروں کی آہٹیں سنی ہوتیں تو غلام قادر روہیلہ کی سرکشی کو اس چٹان میں بدل دیتے جو نئے خطروں کا راستہ روکتی۔ مگر انہوں نے غلام قادر کو ایک ڈاکو اور لٹیرے سے زیادہ اہمیت نہ دی اور اپنی بینائی تک کھو بیٹھے۔ بلکہ اس کے تشدد کا نشانہ بنتے رہے۔ حتیٰ کہ مہاراجہ سندھیا نے دہلی پر حملہ کیا اور روہیلہ لشکر کو مار بھگایا۔ غلام قادر کو سخت عذاب دے کر ہلاک کیا اور عالم کو اس کے عذاب سے چھڑایا۔ انہوں نے بھی سندھیا کو اپنا نجات دہندہ سمجھا۔ اس کی تعریف میں شعر لکھے اور اسے ''فرزند من است'' قرار دیا۔

غلام قادر روہیلہ کتنا ہی ظالم، سفاک اور بے رحم سہی مگر اس نے تیموری گھرانے کی بے حمیتی کے بارے میں جو الفاظ کہے تھے وہ آج تک میرے دل پر نقش ہیں۔ میں نے ایک محرر کی حیثیت سے دخترانِ تیمور کے رقصِ بے چارگی کا واقعہ قلم بند کیا اور غلام قادر کے الفاظ بھی تحریر کیے تھے تاکہ مغلیہ خاندان کی بے غیرتی سے متعلق اس کا فیصلہ مغلوں کے دفترِ شاہی میں محفوظ کر دیا جائے۔ وہ پرچہ دفتر میں رکھ دیا گیا تھا لیکن بعدازاں میں نے دفتر سے چوری چھپے نکال کر پھاڑ ڈالا بلکہ نذرِ آتش کر دیا تھا۔ کیونکہ وہ تحریر آلِ تیمور کی توہین و رُسوائی کا اشتہار تھی اور اس کا دفترِ شاہی میں محفوظ رہنا مناسب نہیں تھا۔ مگر اس تحریر کو میں اپنے دل کی کتاب سے نہیں پھاڑ سکا۔ ان الفاظ کو اپنے حافظہ کی لوح سے نہیں مٹا سکا۔

میں غلام قادر روہیلے کے الفاظ اپنے حافظے سے کیوں محو نہ کر سکا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ روہیلہ اگرچہ مغلوں کا دشمن تھا لیکن اس نے مغلوں کی بے حمیتی کے بارے میں جو فیصلہ دیا وہ سو فیصد درست تھا۔ تیموری گھرانے کے حالات تو محمد شاہ رنگیلا، احمد شاہ اور عالمگیر ثانی ہی کے زمانے میں بگڑ گئے تھے اور مغلوں کو عیش و نشاط سے فرصت نہیں ملتی تھی۔ یہ حالات میں نے دیکھے نہیں صرف سنے تھے۔ لیکن شاہ عالم کے دور میں جب میں لال قلعے سے وابستہ ہوا اور شاہی محرر کے طور پر وہاں ملازم تھا تو جو کچھ میں نے دیکھا وہ اس سے کہیں بدتر تھا جس کے صرف افسانے سنے تھے۔

کہتے ہیں آنکھوں دیکھی، کانوں سنی سے بہتر ہوتی ہے۔ بھلا سنی سنائی کا کیا اعتبار؟ مغلوں کی عیش پستی کے جو افسانے میں سن چکا تھا اگرچہ ان کی شہادتیں موجود تھیں لیکن ان کی رنگینی اور عیاشی کے واقعات بہ چشم خود دیکھے تو لال قلعے کی ملازمت سے میرا جی بے زار ہو گیا۔

اس دور میں عیش و عشرت کے ہنگاموں کا یہ عالم تھا کہ مغلوں کو اپنے مستقبل کی کوئی فکر نہ تھی۔ وہ سندھیا شاہی مرہٹوں کے آلہ کار بنے رہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار کو جو بنگال، بہار اور جنوبی ہند کے بعض علاقوں پر حکومت کر رہی تھی، یہ بات ناگوار گزری کہ مرہٹے، اندھے مغل شہنشاہ کے نام پر خود فرماں روائی کریں۔ انگریز ہندوستان پر اپنی شہنشاہیت کے نقشے تیار کر رہا تھا۔ اس مقصد کے لیے دہلی پر قبضہ و اختیار ضروری تھا۔

1803ء میں جنرل لیک فرنگ فوج لے کر دہلی پہنچ گیا۔ اس نے مرہٹوں کو شکست دی۔ شاہ عالم کو اپنی تحویل میں لے لیا اور دیوانی اختیارات حاصل کیے جو سندھیا شاہی مرہٹوں کو حاصل تھے۔ 1804ء میں ایک اور تبدیلی ہوئی۔ جسونت راؤ ہلکر جو ایک بہترین جنگجو مرہٹہ حکمران تھا، امیر خان روہیلہ کے ساتھ مل کر فرنگی فوج سے اُلجھ گیا

بادشاہ اور ان کے نازک مزاج مشیر لال قلعے میں ڈیرا ڈالنے والے تلنگوں اور گنوار سپاہیوں کے شور وغل پر جز بز ہوتے۔ انہیں مغلوں کی نفاست پسندی کا درس دیتے، شاہی آداب ملحوظ رکھنے کی تلقین کرتے اور بادشاہ کی عزت وتکریم کے اصول سکھاتے تھے۔ حالانکہ جنگ کا صرف ایک مقصد ہوتا ہے کہ ہر قیمت پر اور ہر حالت میں سپاہی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ جنگ کے بعد آپ اسے اخلاقی ضابطے اور معاشرتی آداب سکھا سکتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اس کے جنگی جوش کو اُبھارنا ضروری ہے۔ لیکن لال قلعے میں گنوار باغیوں پر نکتہ چینی کی جاتی تھی اور انہیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑا تھا جو جنگ کا تجربہ نہیں رکھتے تھے بلکہ رموزِ مملکت سے بھی ناآشنا تھے۔

بہت سی اندرونی خرابیوں کے علاوہ بے تدبیری کی انتہا تو یہ تھی کہ جنرل بخت خاں جیسے ماہر جنگ کے احکامات کی پروانہ کی گئی اور اس کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں کیونکہ مغل شہزادوں خاص طور پر مرزا ظہیر الدین مغل کو اندیشہ تھا کہ کہیں بخت خاں ان پر غالب نہ آ جائے۔

یہ ساری باتیں جنگ کی ناکامی کا سبب بنیں اور بہادر شاہ ظفر کو قدرت کی طرف سے آزادی حاصل کرنے کا جو موقع ملا تھا وہ بے تدبیری کی نذر ہو گیا۔ اس کے پیچھے مغلوں کی اس عیش پسندی، تن آسانی، آرام طلبی اور فوجی ناتجربہ کاری کے عوامل بھی کھڑے تھے جو شاہ عالم کے دورِ حکومت میں روایت کی صورت اختیار کر گئے تھے اور جنہیں غلام قادر روہیلے نے بے غیرتی اور بے حمیتی سے تعبیر کیا تھا۔ اس پر مستزاد بادشاہ کے بعض اہل خانہ کی انگریز سے ہمدردی، دوستی اور لال قلعے میں فرنگی کے مخبروں کی ساز باز تھی جس نے مغلوں کو ہلاکت کی رسّی میں باندھ دیا۔''

یہ سب کچھ بیان کرنے کے بعد سید صاحب خاموش ہو گئے۔ انہوں نے جنگ کی ناکامی کا الزام مغلوں کی عیش پرستی، فرنگی جاسوسوں کی ساز باز، شہزادوں کی فوجی ناتجربہ کاری اور اعلیٰ حضرت کی بے تدبیری پر لگایا تھا۔

قبل ازیں ماموں اورنگ مرزا بھی وہی کچھ کہتے رہے تھے جو سید صاحب نے کہا۔ البتہ انہوں نے اورنگ زیب عالمگیر جنت مکانی کے جانشینوں کی تاریخ کے جو اوراق ہمارے سامنے کھولے اور عالی گہر شاہ عالم کی زندگی میں پیش آنے والے واقعات کی جو تفصیل بیان کی، وہ بلاشبہ عبرت کی داستان تھی۔ میں نے اپنے بزرگوں کے حالات پڑھے اور سنے بھی تھے لیکن سید صاحب نے جس انداز اور جس لہجے میں گفتگو کی وہ بالکل مختلف تھا۔ بعض باتیں میرے لیے نئی تھیں۔ شاہ عالم کی آنکھیں نکلوانے کا واقعہ سن چکی تھی مگر اب اس حادثے کا ایک نیا سبب معلوم ہوا تھا۔

تیمور کی کسی بیٹی نے غلام قادر پر خنجر نہ اٹھایا۔ شہزادیاں مارے شرم کے زمین میں گڑ گئی ہوں گی۔ اب مجھے خیال آیا دخترانِ تیمور کے رقص پر تیمور کے بیٹوں اور مغل شہزادوں کی غیرت وحمیت کہاں مر گئی تھی کہ ان میں سے کسی کا ہاتھ تلوار کے قبضے پر نہ گیا؟

مرہٹوں اور انگریز کے دیوانی وثیقوں پر شاہ عالم کے نام کی مہریں لگتی رہیں لیکن مغل خاموش بیٹھے رہے۔ صوبوں پر صوبے اور شہروں پر شہر مغلوں کے اختیار سے نکلتے چلے گئے مگر وہ اپنی عشرت کوشیوں میں مگن رہے۔ انگریزی وظیفوں کے ساتھ انگریزی شراب نے ان کے ہوش سلب کر لیے اور وہ سلطنت کو لٹتے اور اُجڑتے دیکھ کر بھی اپنی مدہوشی کے حلقے سے نہ نکل سکے۔ مجھے اس بات پر بھی حیرت ہوئی کہ مغلوں کے لیے انگریز کے وظیفوں

تخت نشینی، رسم تاج پوشی، توپوں کی سلامی، مالی مراتب، قلاروں (شاہی سواری کے آگے آگے چلنے والے لال انگرکھے اور کالی پگڑی والے سپاہی)، شاہی تام جھام، دربار داری، مصاحبوں، حاجبوں، مجروں، آدابوں، خواجہ سراؤں، نذروں، نذروانوں کا سلسلہ حسبِ سابق جاری رہنے دیا گیا کہ بے چارے بادشاہ بالکل ہی شکستہ خاطر نہ ہو جائیں اور کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ انگریز نے انصرامِ سلطنت تو سنبھال ہی لیا تھا، اس کے ساتھ مغلوں سے بادشاہی کی رسمیں بھی چھین لی ہیں۔

شاہ اکبر ثانی ایک رسمی بادشاہ تھے جو 31 برس اس رسم کو نبھاتے رہے اور جب 1837ء میں اللہ کو پیارے ہوئے تو ان کے بیٹے سراج الدین بہادر شاہ ظفر انگریز کے وظیفہ خوار بادشاہ کی حیثیت سے تختِ طاؤس پر جلوس فرما ہوئے۔ انہوں نے 62 برس کا طویل زمانہ شہزادگی میں گزار دیا تھا۔ اس لیے انگریز نے بھی ان کے ضعیف کندھوں پر بادشاہت کا زیادہ بوجھ نہ ڈالا۔ ان کی شاہی ذمے داریاں کچھ اور کم یا ہلکی کر دیں کہ اعلیٰ حضرت پہلے ہی بوڑھے ہیں، بارِ حکومت نہیں اٹھا سکیں گے، رہی سہی ذمے داریاں خود سنبھال لیں اور بادشاہ کو بچی کھچی مغل سلطنت کے جھمیلوں سے بھی تقریباً فارغ کر دیا۔

بہادر شاہ ظفر کو احساس تھا کہ تمام اختیارات سرکار انگلشیہ نے ہتھیا لیے ہیں۔ شاید اسی لیے انہوں نے بادشاہت کم اور شعر و شاعری زیادہ کی۔ اور بے چارے کرتے بھی کیا؟ یا پھر فقیری درویشی کی طرف راغب ہو گئے۔ مگر میرے اس طویل بیان کا مقصد یا تتمہ یہ ہے کہ وظیفے کے سنہرے پنجرے کو توڑنے اور انگریز سے آزادی حاصل کرنے کا جو موقع بہادر شاہ ظفر کو ملا، اندھے شاہ عالم اور بے بس اکبر شاہ ثان کو نہیں مل سکا۔ لیکن بادشاہ نے وہ موقع ضائع کر دیا۔

کمپنی سرکار کی دیسی فوجوں نے اس سے بغاوت کر کے سراج الدین بہادر شاہ ظفر کو ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کر لیا تھا۔ جنرل بخت خاں کی روہیلہ فوج دہلی پہنچ گئی تھی۔ علمائے ہند نے انگریز کے خلاف جہاد کا فتویٰ جاری کر دیا تھا۔ لوگ آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے جوق در جوق جمع ہو رہے تھے۔ مرہٹہ ریاست اور پیشوا باجی راؤ کے جانشین نانا فرنویس، ان کا بہادر جرنیل تانتیا توپی، جھانسی کی رانی لکشمی بائی، جگدیش پور کے راجہ کمار سنگھ اور دوسرے کئی ہندوستانی بہادر کمپنی سرکار کے خلاف برسرِ پیکار[1] ہو گئے تھے۔ ہندوستان کی زمین انگریز کے قدموں تلے سے کھسک رہی تھی اور پورے ملک کی نظریں دہلی پر لگی تھیں۔

اگر بہادر شاہ ظفر جرأت و ہمت، سیاسی حکمت عملی اور فوجی تدبر سے کام لیتے تو جنگ جیت سکتے تھے اور مغلیہ سلطنت کو پھر بحال کر سکتے تھے لیکن نہ وہ نا اہل مشیروں، ناتجربہ کار شہزادوں، بے وقوف خواجہ سراؤں، انگریز کے حامیوں اور مخبروں کے حصار سے باہر نکل نہ ایک مغل ہیرو اور پُراعتماد قائدِ انقلاب بن کر سامنے آئے۔ اسی لیے تلنگے باغی بھی نہ صرف ان سے ناراض ہو گئے بلکہ ان کی نافرمانی کرنے لگے۔

---

[1] 1857ء میں صرف دہلی کی مغلیہ سلطنت نے سرکار انگلشیہ سے بغاوت نہیں کی بلکہ متعدد ریاستوں نے انگریز کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے تھے جن میں مرہٹہ حکمران نانا صاحب، تانتیا توپی، رانی لکشمی بائی اور راجہ کمار سنگھ کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی فضا بھی پیدا ہو رہی تھی۔ جنگ آزادی کے ان بہادروں کا ذکر ہندوستان کے حالات میں ذرا تفصیل سے آئے گا۔ (قمر اجنالوی)

(9)

شاہ عالم کا خفیہ خزانہ

درگاہ کے اس مستطیل کمرے میں جہاں ہم بیٹھے تھے، ایک اُداس خاموشی چھا گئی تھی اور شہ سانے شمع دان میں جلتی شمعوں کی روشنی ہمارے چہروں پر اُداسی کا زرد سایہ ڈال رہی تھی۔ سید صاحب کی بات ختم ہو جانے کے بعد یوں لگتا تھا اب کہنے کے لیے کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ حالانکہ اصل بات ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ جو کچھ ہم نے سنا وہ اس معاملے کی تمہید تھی جس سے ہم دوچار ہونے والے تھے۔ آخر میں نے خاموشی کو توڑا اور سید صاحب سے مخاطب ہوئی۔

''آپ نے ماضی کے حالات سنا کر اور جو کچھ اب پیش آیا، اس کا ذکر کر کے ہمارے دل دہلا دیئے ہیں۔ مگر ہم آپ کے پیغام پر یہاں آئے اور اب صرف یہ سننا باقی رہ گیا ہے کہ ہمیں کس جانب اور کس راستے پر چلنا ہے؟''

انہوں نے سر اٹھا کر مجھ پر نظر ڈالی، میری بے چینی کو سمجھا اور کہنے لگے۔

''لالہ رخ بیٹی! مغلوں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے میں خود ایک بھنور میں ڈوب گیا تھا۔ اب تو بھنور ہی بھنور ہیں۔ گرداب ہی گرداب ہیں۔ اور آپ نے جو سوال کیا ہے، اس کا جواب مجھی کو دینا ہے۔ لیکن میں نے جو بات شروع کی تھی ابھی وہ ختم نہیں ہوئی۔ اسے مکمل کرنے کے بعد آپ کے سوال کا جواب بھی میں ہی دوں گا۔''

میں سمجھی تھی انہوں نے ماضی کے حوالے سے جو کچھ کہنا تھا، کہہ چکے ہیں اور اب مستقبل کے بارے میں کچھ کہیں گے مگر وہ حال سے ایک بار پھر ماضی کے زمانے میں لوٹ گئے اور اپنی یادداشتوں کا ورق اُلٹ کر بولے۔

''جس طرح میں غلام قادر روہیلے کی بات، جو اس نے تیموری گھرانے کی بے حمیتی کے بارے میں کہی تھی، آج تک اپنے دل کی لوح سے نہیں مٹا سکا۔ اسی طرح شاہ عالم کی آنکھیں نکالے جانے کا واقعہ بھی میرے ذہن سے محو نہیں ہو سکا۔ غلام قادر نے ان سے کسی پوشیدہ خزانے کا پتہ پوچھا اور انکار پر انہیں بینائی سے محروم کر دیا تھا۔ اگر فی الواقع کوئی خزانہ زیرِ زمین چھپایا گیا ہوتا تو وہ کسی انسان کے نزدیک آنکھوں کی جوت سے زیادہ قیمتی نہیں ہو سکتا تھا۔ جب جلاد خنجر لے کر مغل شہنشاہ پر جھپٹا، وہ اس کا پتہ بتا کر اندھی سرنگ میں گرنے سے بچ سکتے تھے پھر بھی مجھے وہم ہو رہا تھا کہ اس بھیانک واقعے کے پیچھے کوئی ایسی بات ضرور ہے جس کا بھید کوئی نہیں جانتا۔ آخر وہ آدمی کون تھا جس نے خفیہ خزانے کی بات غلام قادر تک پہنچائی؟

میں اس قدر کشش تھی کہ اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر بھی وظیفے کی رقم میں اضافے کی خاطر کمپنی سرکار سے عرضی پرچہ کرتے رہے کیونکہ مغل شہزادے ان سے اپنے وظیفوں کے لیے لڑتے جھگڑتے تھے۔ میرے ہوش سنبھالنے سے پہلے اور بعد بھی مغلوں کی عشرت کوشیوں، تن آسانیوں، بے خبریوں کا وہی عالم تھا جن کے باعث شاہ عالم اپنے مرتبے سے گر گئے اور اندھیرے کی قبر میں اتر گئے تھے۔

عیش پرستی اور تن آسانی کا نتیجہ ہر قوم اور ہر خاندان کے لیے وہی ہوتا ہے جس سے مغلیہ خاندان دوچار ہوا مگر ہم حضرت بختیار کاکیؒ کی درگاہ میں مغلوں کے انجام کا نوحہ سننے یا ان کی تباہی و بربادی پر آنسو بہانے نہیں آئے تھے اور نہ سید صاحب نے ہمیں اس مقصد کے لیے بلایا تھا۔ اپنی بدنصیبی پر آنسو ہم بہت بہا چکے تھے۔ اب تو اس معاملے کی بات سننا تھی، جس کے لیے ہمیں ایلچی بھیج کر طلب کیا گیا تھا۔

❁......❁......❁

حکم دیا۔ اس نے بتایا۔ ''یہ شہنشاہ کا حکم ہے۔'' دس قفل پانچ شاہی صندوقوں اور گیارہواں قفل اس کمرے کے دروازے کو لگایا جائے گا جہاں صندوق رکھے جائیں گے۔

وہ اس خدمت کے عوض مجھے پانچ اشرفیاں دے گیا اور تاکید کر گیا کہ یہ رازداری کا معاملہ ہے۔ کسی کے کان میں ان قفلوں کی بھنک بھی پڑ گئی تو تمہارے لیے اچھا نہ ہوگا۔ مجھے کسی سے اس معاملے کا ذکر کرنے کی ضرورت بھی کیا تھی۔ پھر یہ شہنشاہ کا حکم تھا اس لیے میں نے پوری احتیاط ملحوظ رکھی اور بیس یوم کے اندر گیارہ قفل تیار کر دیئے۔ پھر ایک داروغہ میرے پاس آیا۔ میں نے ابجد کے قفل اس کے حوالے کر دیئے اور انہیں بند کرنے اور کھولنے کی ترکیب بتانے لگا تو اس نے کہا۔ ''ترکیب بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ شاہی صندوقوں اور کمرے کے دروازے کو یہ قفل تمہی لگاؤ گے۔ اُٹھو اور میرے ساتھ چلو۔''

میں اس کے ساتھ ہولیا۔ ابھی رات کا پہلا پہر شروع نہیں ہوا تھا۔ ہم ایک سنسان مقام پر پہنچے جہاں ایک شخص تین گھوڑے لیے کھڑا تھا اور تینوں گھوڑوں کے رخ تین مختلف اطراف کو تھے۔ وہاں پہنچتے ہی داروغہ نے میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پھر اس کے نوکر نے جو تنومند، مضبوط اور طاقتور تھا، میری بغلوں میں ہاتھ ڈال کر مجھے اٹھایا اور فضا میں گھمانے لگا، جیسے کسی بچے کو گھمایا جاتا ہے۔ مجھے چکر آ گئے۔ جب اس نے چھوڑا، میں تیورا کر گر پڑا۔ میرے اوسان بحال ہوئے تو اسی نے مجھے اٹھایا اور ایک گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دی۔ گھوڑے کی لگام ضرور میرے ہاتھ میں تھی مگر آنکھوں پر پٹی ہونے کی وجہ سے میں کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے ایک پراسرار سفر شروع ہوا۔ داروغہ آگے، اس کا قوی ہیکل ساتھی میرے پیچھے اور ان دونوں کے درمیان میرا گھوڑا خود بہ خود چل رہا تھا۔

داروغہ نے بتا دیا تھا کہ انہیں ایک خفیہ مقام پر جانا ہے۔ اس لیے مجھے یہ معلوم نہیں ہونا چاہئے میں کس سمت جا رہا ہوں۔ سمت کے بجائے مجھے یہ اندازہ بھی نہ ہو سکا کہ اندھیرے میں کتنا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ تاہم کافی طویل فاصلہ تھا۔ آخر ایک جگہ گھوڑے رُکے اور مجھے نیچے اُتارا گیا۔ گھوڑے وہیں چھوڑ کر داروغہ کسی جانب بڑھا اور قوی ہیکل نوکر میرا ہاتھ تھامے اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ کچھ دیر کے بعد ہم ایک دروازے میں داخل ہوئے۔ پھر دوسرا دروازہ آیا اور ہم ایک زینہ اُترنے لگے اور کسی تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ ہم کسی سرنگ میں چل رہے ہیں۔ اچانک ہم دائیں جانب مڑ گئے۔ میں نہیں جانتا کہ وہی سرنگ دائیں جانب مڑ گئی یا کوئی بغلی سرنگ تھی۔ وہ سرنگ ایک کمرے کے دروازے پر ختم ہوئی۔ دروازہ عبور کر کے ہم کمرے میں داخل ہوئے جہاں میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی۔

وہ ایک زمین دوز کمرہ تھا، جس میں دو مشعلیں روشن تھیں۔ ان کی روشنی میں یہ دیکھ کر میں بدحواس ہو گیا کہ شہنشاہ بہ نفس نفیس وہاں موجود ہیں اور ان کے دائیں بائیں دو قوی ہیکل حبشی غلام ان کی حفاظت کے لیے کھڑے ہیں۔ میں جھک کر کورنش بجا لایا۔ انہوں نے مجھے اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ اسی لمحے داروغہ نے لپک کر وہ چرمی تھیلا مجھے پکڑا دیا جس میں میرے بنائے ہوئے ابجد کے قفل تھے اور خود اپنے ساتھی کے پاس دروازے کی طرف ہٹ گیا۔ حبشی محافظ بھی اپنی جگہ کھڑے رہے۔ میں عالم پناہ کے پیچھے ہولیا۔ وہ مجھے کمرے کے بائیں گوشے میں لے گئے جہاں ایک چھوٹا سا دروازہ کسی حجرے میں اُترتا تھا۔ حجرے میں بھی مشعل روشن تھی۔ عالی

ایک چوب دار نے بڑی رازداری سے مجھے بتایا کہ وہ بخشی خانے کا ایک منشی ہے جس نے قادر خان روہیلے کے کان بھرے ہوں گے۔ کچھ عرصہ قبل کسی شہزادے نے اس کی بیٹی کے ساتھ کوئی برا سلوک کیا تھا جس کی شنوائی شہنشاہ تک نہیں ہو سکی تھی۔ پھر اسے بخشی خانے سے بھی نکال دیا گیا اور وہ کہیں چلا گیا تھا۔ اسی بدبخت نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لینے کے لیے قادر خاں کو کوئی اُلٹی پٹی پڑھائی ہوگی۔

غلام قادر کے ایک مصاحب احمد خان سے جو رسالدار بھی تھا، میری کچھ جان پہچان ہوگئی تھی۔ دخترانِ تیمور کے رقص کی روداد قلم بند کرنے کے لیے وہی مجھے ایوانِ شاہی میں لے گیا تھا۔ وہی شہنشاہ کے اس کمرے کی نگرانی پر مامور تھا جہاں شاہی طبیب ان کی بے نور آنکھوں کے زخموں کا علاج کرنے آتا تھا۔ طبیب کے سوا کسی کو وہاں جانے کی اجازت نہ تھی۔ حتیٰ کہ اعلیٰ حضرت کا خادمِ خاص بھی اس کمرے میں نہیں جا سکتا تھا۔ لیکن احمد خاں ایک روز مجھے اندھے شہنشاہ کے پاس لے گا کہ میں انہیں قادر خاں روہیلے کا ایک نامہ پڑھ کر سنا دوں اور اس پر ان کی مہر لگواؤں۔

وہ حکم نامہ ایک جاگیر کی ضبطی کے بارے میں تھا۔ میں شہنشاہ کی حالت دیکھ کر کانپ گیا۔ آنکھوں پر پٹی بندھی اور چہرے پر مردنی چھا رہی تھی۔ میں نے شاہی دستور کے مطابق سلام کیا اور احمد خاں کی موجودگی میں بتایا کہ مجھے ایک حکم نامہ پڑھنے کے لیے لایا گیا ہے۔ پھر میں نے حکم نامہ پڑھ کر سنایا اور انہوں نے اس پر مہر لگانے سے انکار کر دیا۔

میں احمد خاں کے ساتھ ہی کمرے سے نکل آیا۔ شاہ عالم کی حالت دیکھ کر میرے دل کو جو صدمہ پہنچا تھا اس کا اظہار احمد خان سے کر دیا اور دبے لفظوں میں یہ بھی بتایا کہ بخشی خانے کے جس معمولی منشی کی اطلاع پر اعلیٰ حضرت کے ساتھ یہ بے رحمانہ سلوک کیا گیا وہ جھوٹا ہے۔ اس نے دراصل اپنی بیٹی کا بدلہ لینے کی خاطر قادر خاں کے کان بھرے ہیں۔

احمد خاں میری بات سن کر دنگ رہ گیا پھر اس نے بتایا کہ وہ بخشی خانے کے کسی منشی کو نہیں جانتا اور نہ کسی ایسے آدمی کی باتوں پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اب حیران ہونے کی باری میری تھی۔ احمد خاں میرے تعاون پر خوش تھا۔ وہ مجھے ملحقہ کمرے میں لے گیا اور جو کہانی سنائی وہ بڑی عجیب وغریب تھی۔

اس کے بقول خزانے کی اطلاع دینے والا بخشی خانے کا کوئی منشی نہیں بلکہ شاہی مسلح خانے کا ایک قفل ساز غلام علی تھا جو خود بھی زیر حراست ہے۔ اس نے اعلیٰ حضرت سے کوئی بدلہ لینے کے بجائے محض اپنی جان بچانے کے لیے خفیہ خزانے کا انکشاف کیا۔ جس روز دہلی پر حملہ ہوا بہت سے لوگ مارے یا گرفتار کیے گئے تھے۔ گرفتار ہونے والوں میں غلام علی بھی شامل تھا۔ اسے قتل کرنے کا حکم احمد خاں نے دیا لیکن وہ رسالدار کے قدموں پر گر پڑا اور گڑگڑایا کہ اگر اس کی جان بخشی کر دی جائے تو ایک خفیہ خزانے کے متعلق اہم انکشاف کر سکتا ہے۔

احمد خاں رسالدار نے اسے قتل کرنے کے بجائے غلام قادر خاں کے حضور پیش کیا جہاں اس نے شاہی صندوقوں اور ان کے قفلوں کی حیرت انگیز روداد سنی۔ غلام علی نے بتایا۔

''میں شاہی مسلح خانے کا قفل ساز، آہن گر اور قفل ابجد بنانے کا فن جانتا ہوں۔ ایک دن شاہی محلات کا داروغہ میرے پاس آیا اور مجھے ابجد کے دس قفل اور ان سے بھی مشکل اور مضبوط تر ایک گیارہواں قفل تیار کرنے کا

''اب تم خود سوچو، اس رات شہر سے باہر کس عمارت میں جس کی جگہ اور سمت کا اندازہ وہ نہیں کر سکا، شہنشاہ کی موجودگی کیا معنی رکھتی تھی؟ ابجد کے قفل اور بھاری چوبی صندوق، پھر ایک تہ خانہ، سرنگ، زمین دوز کمرہ اور اس کمرے سے ملحق ایک اور زمین دوز حجرہ جہاں مقفل صندوق بند کر دیئے گئے۔ رات کے وقت وہاں ایک ایسا ہوش ربا کھیل کھیلا گیا جس کا سب سے اہم کردار شہنشاہ خود تھا۔ ایک ہزار اشرفی کے عوض غلام علی کو بتایا گیا کہ اس نے ایک خواب دیکھا ہے۔ لیکن وہ کوئی خواب یا کھیل نہیں، فی الواقع اس رات وہاں ایک اہم واقعہ رونما ہوا تھا اور مغل شہنشاہ نے ایک بہت بڑا خزانہ مخفی کر دیا تھا۔''

میں یہ پُر تحیر روداد سن کر صمٌ بکمٌ رہ گیا اور ابھی کچھ کہنے ہی والا تھا کہ احمد خاں نے ایک اور سنسنی خیز انکشاف کر دیا۔ ''تم یہ سن کر مزید حیران ہو گے کہ داروغہ، اس کا قوی ہیکل نوکر اور دونوں حبشی غلام جنگ میں ہلاک ہو چکے ہیں اور قفل ساز غلام علی نے ان کی لاشیں بہ چشم خود دیکھی تھیں۔ اگر میں ان کی جان بخشی نہ کر دیتا تو وہ بھی مارا جاتا۔ اس طرح اس واقعے کے صرف دو کردار یا دو شاہد باقی بچے ہیں۔ ایک شہنشاہ خود، دوسرا غلام علی قفل ساز۔ مگر عالم پناہ نے اس واقعے سے انکار کیا۔ جس کی پاداش میں اپنی بینائی ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھے۔''

اب مجھے تسلیم کرنا پڑا کہ جہاں پناہ شاہ عالم میں برداشت کی کتنی بڑی قوت ہے۔ انہوں نے آنکھیں گنوا دیں، بینائی کھو دی لیکن اپنے انکار کو اقرار میں تبدیل نہیں کیا۔ احمد خاں نے ابھی ایک اور بات بھی چھپا رکھی تھی، جسے اس طرح کھولا۔

''شہنشاہ کے انکار اور اس کی آنکھیں نکال لینے کے بعد غلام علی قفل ساز کو بھی میری حراست میں دے دیا گیا تھا تاکہ میں اپنے طور پر کسی طرح اس عمارت کا کھوج لگانے کی کوشش کروں جہاں اسے لے جایا گیا تھا اور شاہی صندوقوں میں ابجد کے قفل لگائے گئے تھے۔ میں نے اس پر زور دیا کہ وہ اپنے حافظے کو کریدے اور کوئی ایسی بات یاد کرے جو اس عمارت میں اسے عجیب محسوس ہوئی ہو۔ قفل ساز نے بتایا۔

''وہ کوئی قدیم عمارت یا کوئی مقبرہ تھا۔ کیونکہ مجھے وہاں ایسی بُو محسوس ہوئی تھی جیسی قدیم اور بند رہنے والی عمارتوں یا مقبروں میں ہوتی ہے۔''

میرا خیال تھا اگر اس پر دباؤ ڈالا جائے تو شاید کوئی اور بھی مفید بات بتا سکے جس سے اس عمارت کا کھوج لگانے میں آسانی ہو۔ چنانچہ میں نے اسے دھمکی دی۔

''غلام علی! اپنے دماغ پر زور دے کر سوچو اور کوئی مطلب کی بات بتاؤ ورنہ جہاں پناہ کی تو صرف آنکھیں نکالی گئی ہیں، تمہارے جسم سے جان نکال لی جائے گی۔

میں سمجھتا تھا یہ دھمکی کارگر ہو گی۔ وہ رات بھر سوچتا رہے گا اور صبح ضرور کوئی مفید بات بتا سکے گا۔ مگر سویرے جب میں اس کمرے میں گیا جہاں وہ نظر بند تھا تو وہاں غلام علی قفل ساز کے بجائے اس کی لاش پڑی تھی۔ میں نے فوراً قادر خاں کو اطلاع دی۔ اس نے مجھے حکم دیا کہ غلام علی کی موت کو بالکل خفیہ رکھا جائے اور رات کو لاش کسی گڑھے میں دبا دی جائے بلکہ یہ بات شاہ عالم کے کانوں تک پہنچائی جائے کہ قفل ساز کو روہیل کھنڈ منتقل کر دیا گیا ہے۔ اس ہدایت پر اسی رات عمل کر دیا گیا۔

شہنشاہ کی آنکھوں کا علاج اس لیے ہو رہا تھا کہ ان سے خزانے کے بارے میں مزید پوچھ گچھ کی جائے۔

جاہ کے پیچھے پیچھے چھ یا سات سیڑھیاں اُتر کر میں اس زمین دوز لمبوترے حجرے میں پہنچا جس کی دیوار کے ساتھ پانچ بڑے بڑے چوبی صندوق، جن پر فولاد کی پتریاں چڑھی تھیں، ایک قطار میں رکھے تھے۔

عالم پناہ نے مجھے حکم دیا کہ میں ان صندوقوں کو اپنے ہاتھ سے ابجد کے قفل لگاؤں اور ساتھ ساتھ انہیں بند کرنے اور کھولنے کی ترکیب بھی بتاتا جاؤں۔ قفل ابجد بند کرنے کے لیے پہلے چونکہ کسی لفظ یا نام کا تعین کرنا پڑتا ہے لہٰذا انہوں نے سب نام پہلے تجویز کر لیے تھے۔ وہ مجھے ہر صندوق کے دو قفلوں کے دو نام بتا دیتے تھے۔ جن کے حروفِ ابجد کے لحاظ سے پہلے میں قفل بند کرتا اور پھر انہیں کھول کر دکھاتا تھا جس کے بعد عالم پناہ حروفِ ابجد کو ملا کر قفل خود کھولتے اور ان حروف کو گڈمڈ کر کے قفل بند کرتے رہے۔ جب پانچوں صندوق مقفل کر دیئے گئے، ہم زمین دوز حجرے سے باہر آ گئے۔ ان کے حکم پر داروغہ لپک کر آیا اور حجرے سے مشعل نکال لایا۔ پھر سرنگ کے دروازے کی طرف ہٹ گیا۔

حجرے کا دروازہ بڑا بھاری اور مضبوط تھا۔ عالی جاہ کے اشارے پر میں نے وہ برنجی دروازہ بند کیا اور اس کے فولادی کُنڈے میں گیارہواں قفل لگایا۔ اسے کھولنے اور بند کرنے کی ترکیب بتائی جس کے مطابق عالم پناہ نے وہ قفل بھی خود کھولا اور خود بند کیا۔

اس کارروائی کے بعد انہوں نے قفل ابجد کے فن میں میری تعریف کی اور کہا۔ ''تمہیں اس خدمت کا انعام دیا جائے گا۔''

میں آداب بجا لایا۔ داروغہ سرنگ کے دروازے سے نکل کر پھر کمرے میں داخل ہوا۔ پہلے کی طرح میری آنکھوں پر پٹی باندھی اور مجھے اپنے ساتھ لے کر سرنگ میں آ گیا جہاں اس کے قوی ہیکل ساتھی نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور مجھے اس سرنگ سے بلکہ اس عمارت سے نکال کر اسی جگہ لے آیا جہاں ہم نے گھوڑے چھوڑے تھے۔ وہاں ایک بار پھر مجھے چکر دینے کا عمل دہرایا گیا تاکہ میں اپنے سفر کی سمت کا اندازہ نہ کر سکوں اور پہلے کی طرح گھوڑوں پر واپسی کا سفر شروع ہوا۔ ہم جا تو شہر ہی رہے تھے لیکن میں نہیں جانتا تھا وہاں داخلہ کس دروازے سے ہو گا۔ واپسی پر داروغہ نے مجھے باتوں میں لگا رکھا تھا اس لیے یہ بھی پتہ نہ چل سکا کہ ہم کتنی دیر چلتے رہے اور باتوں باتوں میں کتنا فاصلہ طے کر چکے ہیں۔

جہاں سفر ختم ہوا، وہاں گھوڑے سے اتارنے کے بعد مجھے فضا میں گھمانے اور چکر دینے کا عمل دوسری مرتبہ دہرایا گیا۔ جب آنکھوں سے پٹی کھلی تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اسی ویران اور سنسان میدان میں کھڑا ہوں جہاں سے سفر شروع ہوا تھا اور پہلے کی طرح تینوں گھوڑوں کا رخ تین مختلف اطراف کو تھا۔ پھر داروغہ میرے ساتھ چلا اور تاکید کرتا رہا کہ میں اس واقعے کو یکسر بھول جاؤں اور یہ سمجھوں کہ میں نے کوئی خواب دیکھا تھا۔ گھر کے قریب پہنچ کر اس نے اشرفیوں کا ایک توڑا میرے سپرد کیا۔ میں نے گھر میں آ کر اسے کھولا تو پوری ایک ہزار اشرفیاں تھیں اور باہر میرے نصیب کی طرح پو پھٹ رہی تھی۔ یہ اس رات کا بہت بڑا صلہ یا انعام تھا جس سے میری ساری کلفت دور ہو گئی اور مجھے یوں محسوس ہونے لگا جیسے سچ مچ میں نے کوئی طلسمی خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر ایک ہزار اشرفی کی صورت میں میرے سامنے تھی۔''

قفل ساز غلام علی کی یہ ہوش ربا داستان سنا کر احمد خاں کہنے لگا۔

کے بعد میں اکثر سوچا کرتا تھا، غالباً غلام علی قفل ساز نے اپنی جان بچانے کی خاطر غلام قادر اور احمد خاں کے سامنے ایک من گھڑت بات بیان کی تھی۔ اس نے داروغہ، اس کے قوی ہیکل نوکر اور عالم پناہ کے دو حبشی غلاموں کے علاوہ جو چاروں حملے میں ہلاک ہو چکے تھے، کسی پانچویں آدمی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا تھا کہ خزانے کا قصہ اس نے خود کو موت سے بچانے کے لیے بیان کیا ہوگا لیکن اس کے بیان کیے ہوئے قصے نے شاہ عالم کو بینائی سے محروم کر دیا اور یہ بڑا اذیت ناک حادثہ تھا۔

دربار کی ملازمت سے میرا جی اچاٹ ہو گیا تھا مگر ملازمت چھوڑنے سے پہلے میں نے عالم پناہ سے ملاقات کی عرضی دی، جو منظور ہو گئی۔ میری درخواست کے مطابق کمرے میں ان کے خادمِ خاص کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ میں شہنشاہ کے حضور آداب بجا لایا اور بتایا کہ چند اہم باتیں حضور کے گوش گزار کرنے کی خاطر تنہائی کی ملاقات ضروری سمجھی تھی۔ پھر بیان کرنے لگا کہ دخترانِ تیمور کے رقص کی جو رُوداد غلام قادر کے حکم سے دفترِ شاہی میں رکھی گئی تھی، اسے میں نے مہاراجہ سندھیا کی آمد سے بھی بہت پہلے نکال کر نذرِ آتش کر دیا تھا۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے۔ جب میں نے ملازمت سے علیحدگی کی خواہش ظاہر کی تو پوچھنے لگے۔ ''ملازمت چھوڑ کر کیا کرو گے؟''

عرض کیا۔ ''ایک چیز تلاش کروں گا جو کھو گئی ہے۔''

انہوں نے پوچھا۔ ''کیا چیز کھو گئی ہے؟''

''مغلوں کی عظمت۔''

یہ جواب سن کر وہ بڑے مضطرب ہو گئے پھر میں نے ان کی آواز سنی۔ ''برہان الدین! تم جیسے وفاداروں کی ہمیں ضرورت ہے۔''

میں نے انہیں ایک اور اطلاع دی۔ ''عالم پناہ! وہ بدبخت غلام علی قفل ساز جو حضور کی مصیبت کا باعث بنا اور جس کے متعلق آپ کو اطلاع دی گئی تھی کہ اسے روہیل کھنڈ بھیج دیا گیا ہے دراصل فوت ہو چکا ہے۔ جس رات حضور کو اس کے روہیل کھنڈ بھیجنے کی اطلاع دی گئی اس سے ایک رات قبل وہ مر گیا اور لاش خفیہ طور پر کسی گڑھے میں دبا دی گئی تھی۔ اس کے زندہ رکھنے کا ناٹک اس لیے کھیلا گیا تھا کہ حضور سے خزانے کے بارے میں مزید تفتیش کی جائے۔''

اس اطلاع کے ساتھ ہی میں نے نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ دیکھنا چاہتا تھا ان پر کیا اثر ہوتا ہے۔ شہنشاہ نے غلام علی کی موت پر تعجب کا اظہار ضرور کیا لیکن خزانے کے حوالے سے ان کے چہرے پر کوئی غیر معمولی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔ نہ میں نے انہیں چونکتے دیکھا۔ اس اطلاع پر انہوں نے کوئی بات بھی نہیں کی۔ بس ایک پراسرار خاموشی اختیار کر لی جس میں اندھے پن کا دکھ کروٹیں لے رہا تھا۔

جب میں نے رخصت کی اجازت لی تو بولے۔ ''تم ملازمت چھوڑ رہے ہو لیکن جب کبھی ہمیں ملنے کو جی چاہے، قلعے میں آ سکتے ہو۔ ہماری دنیا میں اب اُجالا نہیں ہوگا لیکن ہم ان لوگوں کی قدر کرتے ہیں جو آلِ تیمور کے لیے روشنی کے متلاشی ہیں۔''

میں نے آداب کیا۔ پھر اس کمرے سے، شاہی محل سے، حتیٰ کہ لال قلعے سے نکل آیا۔ مگر عجیب بات تھی کہ

میں اس رات ان سے خود ملا اور قفل سازی کہانی دہرا کر بتایا کہ اسے روہیل کھنڈ بھیج دیا گیا ہے۔ جہاں پناہ نے وہ کہانی سن کر کہا۔ ''یہ تو الف لیلیٰ کی کوئی عجیب داستان معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ بغداد نہیں، دہلی ہے۔ ضرور اس نے اشرفیوں کا کوئی خواب دیکھا ہوگا۔''

دوسرے روز اچانک غلام علی کے گھر کی تلاشی لی گئی لیکن وہاں سے ایک بھی اشرفی برآمد نہ ہوسکی حالانکہ اسے انعام ملے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا اور اس کے گھر میں خوش حالی کا منظر ہونا چاہئے تھا۔ لیکن وہاں غربت برس رہی تھی۔ اس کی بیوی، بیٹی اور ساس نے بھی کسی ایسے واقعے سے لاعلمی کا اظہار کیا اور کہا۔

''اگر غلام علی کو شہنشاہ کی طرف سے انعام میں اشرفیاں ملی ہوتیں تو ہمارے گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔''

یہ سب کچھ بتا کر احمد خاں نے مجھے مزید حیرت میں ڈال دیا۔ جب گھر میں غربت تھی تو اشرفیوں والی بات درست نہیں ہوسکتی تھی جبکہ وہ اشرفیاں چوری کی نہیں تھیں نہ ان کے صرف کرنے پر کوئی پابندی تھی۔ احمد خاں کا خیال تھا شہنشاہ کی آنکھوں کے زخم اچھے ہو جائیں تو تفتیش کا نیا مرحلہ شروع ہوگا اور اس مرتبہ انہیں شدید عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا۔

شاہ عالم پر گزرنے والے حادثے کو ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ مہاراجہ سندھیا گوالیار سے اپنی مرہٹہ فوج لے کر نکلا اور آندھی کی طرح منزلیں مارتا ہوا ناگہاں دہلی پہنچ گیا۔ اس نے شہر اور قلعے پر قابض روہیلوں کو رُوئی کی طرح دھنک ڈالا۔ انہیں بے دریغ قتل کیا۔ غلام قادر خاں روہیلے کو گرفتار کر لیا۔ شاہ عالم کو قیدِ ستم سے چھڑایا اور قادر خاں کو انتہائی عذاب دے کر اس طرح موت کے گھاٹ اتارا کہ دیکھنے والے پکار اٹھے۔ ''مہاراج سندھیا نے روہیلے سے مغل شہنشاہ کا بدلہ لے لیا۔''

روہیلے بے دریغ قتل کیے گئے۔ بہت تھوڑے بھاگنے میں کامیاب ہوئے۔ غلام قادر خاں کے دوسرے افسروں کے ساتھ رسالدار احمد خاں بھی ہلاک ہوا۔ جن جلادوں نے شہنشاہ کی آنکھیں نکالی تھیں ان کا بند بند کاٹ دیا گیا۔ مہاراجہ سندھیا اندھے شہنشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ غلام قادر کے خون سے لتھڑی ہوئی تلوار ان کے قدموں میں ڈال دی۔ خود کو عالم پناہ کا بیٹا قرار دیا اور شاہی خاندان پر ہونے والے مظالم کی تلافی کرنے لگا۔

❁......❁......❁

لال قلعے کا منظر ایک بار پھر تبدیل ہوگیا تھا۔ مہاراجہ سندھیا نے ظالم کے خلاف مظلوم کی حمایت میں تلوار اٹھائی تھی۔ مغلوں کو روہیلوں کے تشدد سے بچایا تھا۔ ان خدمات کے عوض اس نے شاہ عالم سے دیوانی اختیارات حاصل کر لیے اور ان کے نام پر خود مغلیہ سلطنت کا انتظام کرنے لگا۔ مفرور محرر لوٹ آئے تھے مگر اب شہنشاہ کا دربار نہیں لگتا تھا۔ کبھی سندھیا کا فوجی گورنر یا ریذیڈنٹ (کیونکہ خود سندھیا گوالیار لوٹ گیا تھا) ایوانِ خاص میں نمودار ہوتا تھا اور جہاں پناہ کے احکامات سنائے جاتے تھے جن پر ان کی مہر ثبت ہوتی تھی۔ بینائی کھو جانے کی وجہ سے وہ اکثر خلوت نشیں رہتے تھے مگر سلطنت کی ہر بات ان کے علم میں لائی جاتی تھی۔

غلام قادر خاں، اس کے افسروں اور احمد خاں رسالدار کی ہلاکت کے ساتھ ہی خزانے کا معاملہ قصہ پارینہ بن گیا تھا۔ کیونکہ اس کا داستان گو غلام علی قفل ساز بھی دنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ اس کے گھر کی غربت کا واقعہ سننے

دوسری اہم کڑی یہ تھی کہ شاہ عالم ثانی جنت مکانی نے قفل ساز کی بیوی کو خفیہ پیغام کے ذریعے دہلی سے نکل جانے اور اشرفیاں چھپا کر رکھنے کی تاکید کی تھی۔

ہم لوگ سید صاحب کی زبانی ایک داستانِ اسرار سن کر بڑے حیران ہوئے۔ وہ گڑ گانواں اس لیے گئے تھے کہ غلام علی کی بیوی کو شوہر کی المناک موت سے آگاہ کر سکیں۔ لیکن ایک ہزار اشرفیوں کی تصدیق ہو جانے کے بعد انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا اور غلام علی کے چہرے سے کفن سرکائے بغیر چپ چاپ لوٹ آئے۔ کیا خبر غریب قفل ساز کو مرنے کے بعد کفن بھی نصیب ہوا یا تن کے کپڑوں ہی میں کہیں دبا دیا گیا تھا۔ تاہم سید صاحب نے اس کی موت پر اسرار کا پردہ یا کفن ضرور ڈال دیا تھا۔

لال قلعے سے نکل کر میرے قدم خود بہ خود غلام علی قفل ساز کے مکان کی طرف اُٹھتے چلے گئے جس کا پتہ میں بہت عرصہ پہلے معلوم کر چکا تھا۔ اس کے گھر والوں کو بھی یہی بتایا گیا تھا کہ غلام علی کو روہیل کھنڈ بھیج دیا گیا ہے جہاں وہ نظر بند ہے۔ مجھے خیال آیا کہ گھر والوں کو حقیقت سے باخبر کر دوں۔

کسی کے انتقال کی خبر دینا ایک ناخوشگوار فرض ہے۔ میں ناخوشگوار فرض ادا کرنے غلام علی کے مکان پر پہنچا مگر معلوم ہوا اس کی بیوی (دراصل بیوہ) اپنی بیٹی اور ساس کو لے کر گڑگانواں چلی گئی ہے جہاں اس کا میکہ ہے۔ میں گڑگانواں پہنچا اور مکان بھی ڈھونڈ لیا لیکن غلام علی کے انتقال کی خبر دینے کے بجائے اس کی بیوی سے ان اشرفیوں کی بات کرنے لگا جو قفل ساز کے بقول اسے قفل ابجد کے صلے میں ملی تھیں۔

پہلے تو بیوی نے پروں پر پانی نہ پڑنے دیا۔ پھر میں نے سرگوشی کے لہجے میں کہا۔ ''عالم پناہ کی طرف سے آیا اور یہ پیغام لایا ہوں کہ خبردار ان اشرفیوں کا ذکر کسی سے نہیں کرنا۔''

یہ سنتے ہی اس نے آواز دبا کر جواب دیا۔ ''ہم نے تو پہلے بھی کسی سے ذکر نہیں کیا۔ جس روز میرا شوہر پکڑا گیا اسی روز اشرفیاں زمین میں دبا دی تھیں۔ جب حکیم صاحب اعلیٰ، اعلیٰ حضرت کا پیغام لے کر آئے کہ دہلی سے نکل جاؤ، ہم شہر چھوڑ کر یہاں آ گئے۔ سنا تھا میرے شوہر کو روہیل کھنڈ میں قید کر دیا گیا تھا۔ کئی مہینے گزر گئے اس کی کوئی اطلاع نہیں آئی۔ وہ کب رہا ہو گا؟ گھر کے اخراجات کی تو کوئی فکر نہیں۔ ایک ہزار اشرفیاں زندگی بھر کے لیے کافی ہیں۔ آپ میری طرف سے عالی جاہ کو مطمئن کر دیجیے گا کہ ہماری زبانیں بند رہیں گی۔''

غلام علی کی بیوہ کی زبانی یہ باتیں سن کر میں دنگ رہ گیا۔ اس نے انہی دنوں جب شاہی حکیم شہنشاہ کی زخمی آنکھوں کا علاج کر رہے تھے، اعلیٰ حضرت کے پیغام پر اپنی بیٹی اور ساس کے ساتھ دہلی کو خیر باد کہہ دیا اور اپنے میکے آ گئی تھی اور اعلیٰ حضرت نے یہ پیغام حکیم صاحب کے ذریعے بھیجا تھا۔

اب اس بات کی تصدیق ہو گئی کہ غلام علی قفل ساز کی کہانی کوئی خواب نہ تھا، الف لیلیٰ کی کوئی حکایت نہ تھی۔ میں نے قفل ساز کے انتقال کی خبر دینا مناسب نہ سمجھا اور وہاں سے چپ چاپ لوٹ آیا۔

ہمارے میزبان سید برہان الدین نے جو ہمیں قفل ابجد کی ایک عجیب و غریب کہانی سنا رہے تھے، غلام علی کی بیوی (دراصل بیوہ) کی گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قفل ساز نے پانچ شاہی صندوقوں اور کسی تہ خانے کی جو روداد بیان کی تھی، وہ کوئی فرضی کہانی یا ذہنی اختراع نہیں ہو سکتی جیسا کہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اس نے اپنی جان بچانے کی خاطر روہیلے سردار غلام قادر خاں اور اس کے رسالدار احمد خاں کو ایک جھوٹی کہانی سنا دی ہو گی۔

میں سوچ رہی تھی وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ یہ بات قرین قیاس ہی نہیں تھی کہ ایسے موقع پر کوئی شخص جھوٹ کا سہارا لے سکتا ہے۔ غلام علی اچھی طرح جانتا تھا، اگر اس کی بات غلط نکلی تو موت کے دردناک عذاب میں مبتلا کر دیا جائے گا اور روہیلہ اس کا بند بند کٹوا دے گا۔ اس نے یہی سوچ کر وہ پراسرار واقعہ جو اسے پیش آیا، بیان کیا ہو گا کہ شہنشاہ تشدد کے ڈر سے خزانے کا پتہ بتا دیں گے اور اس کی جان بچ جائے گی۔ لیکن معاملہ اس کی توقع سے کہیں آگے بڑھ گیا۔ شہنشاہ نے ایک بدترین عذاب سے گزر کر بھی زبان نہ کھولی۔ جبکہ قفل ساز صرف ایک دھمکی سے مر گیا تھا۔

بہرحال غلام علی کے بیان کردہ قصے کی تان نے ایک ہزار اشرفیوں کی تصدیق کر دی تھی۔ اس سلسلے میں

کے زمانے میں بھی اگرچہ وہاں بڑی رونق رہی لیکن اکبر شاہ ثانی اور شاہ عالم ثانی کے عہد میں تو چوک سعد اللہ خاں ''نگار خانۂ چین'' کہلاتا تھا جہاں پیشہ ور ذاکر اور واعظ منبروں پر دل گداز کر دینے والی تقریریں کرتے اور ایسے مرصع جملے نکالتے تھے کہ سننے والے دل تھام کر بیٹھ جاتے۔ مگر ان دنوں دہلی پر پہلے روہیلے قیامت بن کر ٹوٹے، پھر مرہٹے آن براجے۔ اس لیے وعظ و خطابت کے ہنگامے بھی ماند پڑ گئے تھے۔

مہاراج سندھیا نے عالم پناہ کو اپنی پناہ میں لے لیا اور ان کا شاہی وقار، ادب و احترام سب ملحوظ رکھا تھا۔ پھر بھی مغلوں کی پہلی آن بان جاتی رہی اور دہلی کے علاوہ گرد و نواح پر بھی مرہٹوں کی حکومت تھی۔

ان دنوں کوئی عام آدمی شہنشاہ سے ملاقات نہیں کر سکتا تھا۔ بینائی سے محروم ہو جانے کے بعد وہ اپنے حجلۂ خاص تک محدود ہو گئے تھے اور عزیز و اقارب کے علاوہ خاص مقربین اور مصاحبین بھی ناظرِ اعلیٰ اور داروغۂ محلات کی اجازت کے بغیر حاضری نہیں دے سکتے تھے۔ پھر مرہٹہ کارخاص کے افسر اہم آدمیوں کی ملاقات پر خفیہ نظر رکھتے تھے کہ کہیں کوئی بدخواہ انہیں مہاراج سندھیا سے برگشتہ نہ کر دے۔ ان پابندیوں کے باوجود ایک روز میں چوک سعد اللہ خاں سے نکلا اور قلعے میں پہنچ گیا۔ کچھ پرانے لوگ مجھے جانتے تھے مگر قلعے کا ناظرِ اعلیٰ نیا آدمی تھا۔ میں نے عالم پناہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی تو اس نے مجھے ایک مرہٹہ افسر کے پاس بھیج دیا۔

اس کے نزدیک میری ملاقات کا مقصد مبہم یا پھر بے کار تھا۔ کیونکہ میں صرف عالی جاہ کو دیکھنا اور ان سے دو باتیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کارِ بے کار کے لیے شہنشاہ کو ملاقات کی زحمت نہیں دی جا سکتی تھی لہٰذا میری درخواست نامنظور کر دی اور اس گزارش پر بھی توجہ نہ دی گئی کہ میں مغل دربار کا سابق محرر اور عالم پناہ کا عقیدت مند ہوں۔ مرہٹہ افسر کے نزدیک نہ میری ملاقات کا کوئی مقصد تھا نہ میں شہنشاہ کا کوئی عزیز تھا اور نہ ہی میری کوئی حیثیت تھی۔ میں اس کے دفتر سے مایوس نکلا اور خود کو بڑا حقیر محسوس کر رہا تھا کہ ناگاہ شہنشاہ کے خادمِ خاص سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ وہ مجھے اچھی طرح جانتا تھا۔ کہنے لگا۔

''عالم پناہ ایک دو بار پوچھ چکے ہیں کہ سید برہان الدین ہمیں بھول گیا؟''

میں نے بتایا۔ ''قدم بوسی کے لیے حاضر ہوا تھا مگر ملاقات منظور نہیں ہوئی۔''

وہ اسی وقت شہنشاہ کی طرف بھاگا اور وہ صورتِ حال بیان کی جو مجھے قلعے میں پیش آئی تھی۔ انہوں نے داروغۂ محلات کے ذریعے مجھے طلب کر لیا۔ اس معاملے کی خبر ناظرِ اعلیٰ اور مرہٹہ افسر کو بھی ہو گئی۔

میرے لیے یہ بات بڑی حوصلہ افزا تھی کہ عالم پناہ نے ایک معمولی محرر کو یاد رکھا۔ جب میں خادمِ خاص کے ہمراہ خدمت میں حاضر ہوا اور سلام عرض کیا تو ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ میں نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ کو بوسہ دیا تو انہوں نے ایک ذو معنی سوال کیا۔

''برہان الدین! تمہیں جس گم شدہ شے کی تلاش تھی، کہیں اس کا نشان ملا؟''

میں نے پچھلی ملاقات میں عرض کیا تھا کہ مجھے مغلوں کی عظمتِ رفتہ کی تلاش ہے۔ ان کا سوال سن کر مجھے اپنی بے بسی اور ان کی مجبوری کا خیال آیا۔ دل پر ایک ضرب لگی اور کہا۔

''عالم پناہ! اس گم شدہ شے کو ڈھونڈنے اور واپس لانے کے لیے مجھے مغل لشکروں کی ضرورت ہے جو میرے پاس نہیں ہیں۔''

(10)

اسیری

اب میں ان کی کہانی وہاں سے پھر شروع کرتی ہوں، جہاں انہوں نے چھوڑی اور ہم پر حیرت کی ایک نئی کیفیت طاری کردی تھی۔ سید صاحب نے کہا تھا۔

''میں گڑگانواں سے دہلی لوٹ آیا۔ اب میرا ذہن ہر وقت ایک نامعلوم تہ خانے اور شاہی صندوقوں کے گرد چکر کاٹنے لگا۔ بلکہ ابجد کے قفلوں میں بند ہو کر رہ گیا۔ اگر ان صندوقوں میں خزانہ ہی تھا تو یہ بات کسی چیستان سے کم نہ تھی کہ اسے قلعے کے اندر کسی خفیہ اور محفوظ جگہ چھپانے کے بجائے قلعے سے بلکہ شہر سے بھی باہر ایسی قدیم و ویران عمارت میں جس پر مقبرے کا گمان ہوتا تھا، چھپانے میں کیا مقصد اور کیا راز پنہاں تھا؟

غلام علی قفل ساز نے یہ بات محض اٹکل اور قیاس سے بتائی تھی کہ اس عمارت پر مقبرے کا گمان ہوتا تھا۔ اب کیا معلوم وہ کوئی مقبرہ تھا بھی یا نہیں۔ بعض پرانی اور اکثر بند رہنے والی عمارتوں سے بھی مقبروں جیسی بو آیا کرتی ہے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ مطلوبہ عمارت لال قلعے سے کتنے فاصلے پر اور کس جانب واقع ہے۔ مگر ایک امر یقینی تھا کہ وہ عمارت دہلی سے کافی دور کسی ویرانے میں تھی اور دہلی کے باہر چاروں طرف ویرانے، کھنڈر، مزار یا پھر غوری، خلجی، لودھی، مغل بادشاہوں اور بڑے بڑے سرداروں کے مقبرے تھے۔ ان ویرانوں، کھنڈروں، مزاروں، مقبروں میں کسی ایسی عمارت کو ڈھونڈنا آسان کام نہ تھا جس کا نام پتہ بھی معلوم نہ ہو۔

میں نہیں جانتا میرے دل میں اس پراسرار عمارت کو کھوجنے اور خزانہ ڈھونڈنے کا شوق کیوں پیدا ہوا؟ مگر اندھے شہنشاہ کے سوا کوئی اس مقام کی نشاندہی نہیں کرسکتا تھا اور ان سے کچھ معلوم کرنا بہت مشکل بلکہ ناممکن تھا۔ میں اپنے کمرے میں لیٹا پہروں سوچتا رہتا کہ آخر ان سے یہ بات کیسے معلوم کی جائے؟

قلعے کے لاہوری دروازے سے نکل کر جامع مسجد کا رخ کریں تو اردو بازار (فوج کا بازار)، خانم کا بازار اور کئی محلے، حویلیاں ہیں جہاں بیشتر وہ لوگ رہتے تھے جو قلعے میں ملازمت کرتے یا دربار میں حاضری دیتے اور وہاں آمد و رفت رکھتے تھے۔ میرا مکان قلعے کے سامنے چوک اللہ خاں[1] کے پچھواڑے واقع ہے۔ بہادر شاہ ظفر

---

[1] انگریز نے 1857ء میں دہلی اور لال قلعے پر قبضے کے بعد چوک سعد اللہ خاں، اُردو بازار، خاص بازار، خانم کا بازار اور اردگرد کے سب کُوچے محلے مسمار کردیئے تھے جس سے دہلی کا نقشہ ہی بدل گیا۔ (قمر اجنالوی)

بے اصل قرار دیا۔ میں حیران تھا، جب اشرفیوں کی بات اور قفل ساز کی بیوی کو دی جانے والی خفیہ ہدایت مجھ پر آشکار ہو گئی تھی، پھر وہ خود کو چھپا کیوں رہے تھے؟ میں نے ذرا جرأت کر کے پوچھا۔

''جب کسی بات کا کھلنا یا نہ کھلنا یکساں ہے تو پھر شاہی حکیم کی معرفت غلام علی کی بیوی کو دہلی سے چلے جانے اور اشرفیاں چھپانے کی ہدایت بھیجنے کی کیا ضرورت تھی؟

اندھے شہنشاہ کے ہونٹوں پر ایک کراہ سی تڑپ گئی۔ ''برہان الدین! یہ اس وقت کی بات ہے جب روہیلے نے ہماری آنکھیں نکلوا دی تھیں اور غلام علی کی بیوی کو خاموش رہنے کی تاکید اس لیے کی گئی تھی کہ کہیں ان اشرفیوں کو غلام علی کی بیان کردہ کہانی کا حصہ نہ سمجھ لیا جائے جو اسے ایک اور خدمت کے صلے میں دی گئی تھیں۔''

میری حیرت بڑھ گئی۔ ''ایک اور خدمت؟''

''ہاں......'' شہنشاہ بتانے لگے۔ ''غلام علی نے قفل ابجد ایجاد کر کے ایک اہم خدمت انجام دی تھی اور ہم نے اس کی ایجاد کو نہ صرف پسند کیا بلکہ کچھ شاہی دستاویزات محفوظ رکھنے کی خاطر جو ہمارے نزدیک کسی خزانے سے زیادہ قیمتی ہیں، اس سے ایک قفل ابجد بھی حاصل کیا تھا۔ وہ اہم دستاویزات دفتر شاہی کے ایک صندوقچے میں بند ہیں اور غلام علی نے ہمارے سامنے اسے قفل ابجد لگایا ہے۔ ہم نے اسے کچھ اور قفل تیار کرنے کا حکم بھی دیا تھا۔ شہنشاہ کی حیثیت سے ہمارا فرض تھا کہ ایک انوکھی ایجاد پر کاریگر کو انعام دیں اور اس کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ وہ اس فن کو مزید ترقی دے سکے۔''

یہ بات سن کر مجھ پر ایک سکتہ سا گزر گیا کہ غلام علی کو ایک ہزار اشرفیاں قفل ابجد کی ایجاد پر دی گئی تھیں۔ وہ قفل شاہی دستاویزات کے ایک صندوقچے کو لگایا گیا تھا جو آج بھی شاہی دفتر میں موجود ہے۔ وہ دستاویزات ان کے بقول کسی خزانے سے زیادہ قیمتی تھیں۔ وہ میرے چہرے پر گزرنے والی کیفیت دیکھ تو نہیں سکتے تھے، تاہم میری خاموشی سے انہوں نے اس حیرت کا اندازہ ضرور لگا لیا جس سے میں دوچار تھا۔ پھر اس میں مزید اضافہ کر دیا اور بڑی مدھم آواز میں جسے میں ہی سن سکتا تھا، کہنے لگے۔

''ہم نے دستاویزات کے صندوقچے کو جو قفل ابجد لگوایا، اس کی کلید صرف دو حرفوں میں مخفی ہے اور وہ دو حروف ہیں ''رخ''۔''

''رخ'' سے ان کی کیا مراد تھی؟ کوئی چہرہ، کوئی سمت، کوئی کنارہ یا شطرنج کا مہرہ؟ اور یہ راز کی بات وہ صرف مجھے کیوں بتا رہے تھے؟ میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ خود شہنشاہ نے کہا۔

''برہان الدین! ہم چاہتے ہیں، تم قلعے میں دوبارہ ملازمت کر لو اور دربار سے رابطہ رکھو۔ ہمیں تمہاری ضرورت ہے۔''

مغل دربار کا نقشہ اگرچہ بدل گیا تھا پھر بھی میں نے ان کی خواہش کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور دوبارہ ملازمت پر آمادہ ہو گیا۔

قفل ابجد کا لفظِ کلید ''رخ'' جس طرح سید برہان الدین کے لیے حیرت کا سبب بنا تھا، اسی طرح میں بھی اسے سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی اور سنسنی کی لہر میرے جسم میں بھی دوڑنے لگی۔ اس سنسنی کی وجہ بتانے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ یہ دو حرفی لفظ ''رخ'' میرے نام کا حصہ ہے اور خواہ کسی معنی اور کسی پہلو سے استعمال کیا جائے، اسے

اندھے شہنشاہ نے فوراً میرا ہاتھ پکڑ کر دبایا جس سے میں یہ سمجھا کہ مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی خیال گزرا، شاید میری ملاقات کی جو غیر معمولی طریق سے ہوئی، نگرانی ہو رہی ہے۔ میں نے گھبرا کر خادمِ خاص کی طرف دیکھا۔ وہ میرا مطلب سمجھ گیا اور اشارے سے بتانے لگا کہ ایسی کوئی بات نہیں۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر بھی سرگوشی کے لہجے میں، تاکہ شاہی محل کی کوئی دیوار بھی میری بات نہ سن سکے، شہنشاہ کو بتایا۔

''عالم پناہ! غلام علی قفل ساز کی بیوہ نے حضور کی ہدایت پر کئی مہینے پہلے دہلی چھوڑ دی تھی اور آج کل اپنے میکے گڑگانواں میں رہتی ہے۔ اس نے اشرفیوں کا معاملہ کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا مگر اپنے شوہر کے لیے بڑی پریشان ہے۔''

انہوں نے میری بات توجہ سے سنی اور حیرت سے پوچھا۔ ''تم وہاں کیا لینے گئے تھے؟''

مجھے اس سوال کی توقع تھی، جواب دیا۔ ''غلام علی کی بیوی کو یہ بتانے کہ وہ بیوہ ہو چکی ہے۔''

''پھر تم نے بتایا کیوں نہیں؟''

''میں نے اچانک اپنا ارادہ بدل دیا اور سوچا، اگر اسے شوہر کے انتقال کی خبر مل گئی تو رونے چلاّنے لگے گی اور کیا خبر اس کی موت کا الزام حضور پر لگائے۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ گرفتاری کے بعد غلام علی کو روہیل کھنڈ بھیج دیا گیا تھا۔ جب دو تین سال تک شوہر واپس نہیں آئے گا تو سمجھ لے گی کہ شاید روہیلوں نے اسے مار ڈالا اور رو پیٹ کر خاموش ہو جائے گی۔ گزر اوقات کی فکر نہیں۔ اگر سنبھال کر خرچ کرے تو ایک ہزار اشرفیاں اس کی زندگی بھر کے لیے کافی ہیں۔ یہی سب کچھ سوچ کر میں نے قفل ساز کی موت پر پردہ ڈال دیا۔''

خیال تھا، شہنشاہ میری تدبیر کو پسند کریں گے اور کہیں گے۔ ''تم نے اچھا کیا۔'' جس سے مجھے معاملے کی بات آگے بڑھانے کا موقع مل جائے گا۔ لیکن یہ سب کچھ سن کر انہوں نے پراسرار خاموشی اختیار کر لی اور اپنے آپ کو مجھ سے چھپانے لگے۔ وہ جانتے تھے، میں واحد شخص ہوں جو غلام علی قفل ساز کی کہانی سن چکا اور اب یہ بھی جان گیا ہوں کہ اسے کسی خدمت کے صلے میں ایک ہزار اشرفیاں دی گئی تھیں۔ حتیٰ کہ یہ بات بھی میرے علم میں آ چکی ہے کہ انہوں نے شاہی حکیم کی معرفت قفل ساز کی بیوی کو دہلی سے چلے جانے اور اشرفیوں کا معاملہ پردۂ راز میں رکھنے کی ہدایت کی تھی، اس کے باوجود ان کی چپ حیرت انگیز تھی۔ لیکن اب میں ان کی پراسرار خاموشی کا قفل کھولنے کے لیے بڑا مضطرب تھا۔ اپنی آواز دبا کر انہیں توجہ دلائی۔

''اعلیٰ حضرت! ممکن ہے غلام علی نے اپنی بیوی کو بتا دیا ہو کہ اسے ایک ہزار اشرفیاں کس خدمت کے صلے میں ملی تھیں اور کسی وقت وہ اصل بات کھول دے۔''

وہ حیران ہوئے۔ ''کون سی اصل بات؟''

''جو غلام علی نے روہیلے کو بتائی تھی۔'' میرا لہجہ کچھ اور سرگوشیانہ ہو گیا تھا تاکہ مجھے شریکِ راز کر سکیں۔

وہ پل دو پل کچھ سوچتے رہے، پھر بولے۔ ''جس بات کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہو سکتا، اسے کھولنا یا نہ کھولنا یکساں ہے۔''

گویا انہوں نے ایک بار پھر ''اصل بات'' کو مخفی رکھا اور قفل ساز کی بیان کردہ کہانی کو بے نتیجہ، بے مقصد اور

''برہان الدین! مغلوں کی تلوار کا لوہا نرم پڑ گیا ہے اور ان کے نیزوں کے پھل کُند ہو گئے ہیں۔ فرنگی، مرہٹے، سکھ، روہیلے، جاٹ ہندوستان کے علاقے اور ان علاقوں کی دولت تقسیم کر رہے ہیں۔ مغل کسی کا راستہ روکنے کے قابل نہیں رہے۔ یہ بات ہمارے لیے سوہانِ روح ہے۔ ہندوستان ایک بڑی تباہی سے دوچار ہے۔ ہم اس تباہی کو روک دینا چاہتے ہیں مگر روک نہیں سکتے کیونکہ آنکھوں سے محروم ہو گئے اور کسی ایسے شخص کا چہرہ بھی نہیں دیکھ سکتے جو ہمارے لیے اپنے دل میں درد رکھتا ہو۔ تمہیں مغلوں کی عظمتِ رفتہ کی تلاش ہے لیکن ہم چاہتے ہیں تم کسی ایسے مغل کو تلاش کرو، جو ہماری گردن سے احتیاج اور مجبوری کا جوا اُتار سکے۔ قلعے میں بہت سے مغل شہزادے اور سردار رہتے ہیں۔ ان سے ملو اور کوئی ایسا آدمی ڈھونڈو جس کی رگوں میں اکبر، جہانگیر، اورنگ زیب کا خون ابھی باقی ہو۔ اگرچہ ہم معذور اور مجبور ہیں پھر بھی ابھی بہت کچھ ہمارے اختیار میں ہے اور مغل سلطنت کی بحالی کے لیے ہر چیز قربان کر سکتے ہیں۔ جس روز کسی ایسے مغل کو تلاش کر لو، اسے ہمارے پاس لے آؤ۔ ہم اسے لشکر و سپاہ کی قوت فراہم کریں گے۔ پھر آسمان پر ایک نیا ستارہ چمکے گا اور جہاں جہاں وہ ستارہ چمکے گا، وہاں زمین پر ایک نئی روشنی ہوگی۔''

میں نے یقین دلایا کہ ان کے حکم کی تعمیل کروں گا اور یہ بھی سمجھ گیا کہ شہنشاہ نے مجھے قلعے کی ملازمت پر کیوں مجبور کیا تھا۔ دراصل وہ خود بھی اسی اذیت میں مبتلا تھے جس نے میرے دل میں شگاف ڈال دیا تھا اور میرے ذریعے کسی ایسے آدمی کی تلاش میں تھے جو مغلیہ سلطنت کو زوال کے بھنور سے نکال سکتا۔ میں نے اندھے شہنشاہ کی لاٹھی بننا قبول کر لیا۔

اس دن کے بعد میں شہزادوں اور مغل سرداروں سے ملنے اور انہیں قریب سے دیکھنے لگا۔ شہنشاہ کا محررِ خاص ہونے کے ناتے مجھے ان سے ربط پیدا کرنے اور میل جول بڑھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ کم و بیش دو مہینے اسی جانچ پڑتال میں گزر گئے۔ لیکن ان میں ایک بھی ایسا نہیں تھا جسے مغلیہ سلطنت کی فکر ہوتی۔ سب اپنے عیش و آرام میں مگن تھے۔ کوئی شراب کا رسیا تو کوئی حُسن و عشق کا متوالا تھا۔ کسی کو رقص و موسیقی اور طوائفوں سے فرصت نہ تھی، کسی کو کبوتر بازی کا لپکا تھا۔ کچھ ایسے بھی تھے جو ڈینگیں مارنے اور شیخی بگھارنے میں بڑے رستم مگر ہمت کے بڑے بودے تھے اور ان پر یہی ضرب المثل صادق آتی تھی کہ نام ہمارا، گاؤں تمہارا۔ بعض کو مغلوں کے ادبار و زوال کا احساس ضرور تھا لیکن ان میں حالات سے لڑنے کا حوصلہ نہیں تھا۔

میری مایوسی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مجھے وہ زمین ہی نہیں مل رہی تھی جس پر قدم جمائے جا سکتے۔ جب کوئی فرد، کوئی خاندان، کوئی معاشرہ زندگی کے ہموار راستے سے ہٹ جائے تو ہر قدم پر ٹھوکر کا احتمال ہوتا ہے اور کبھی کبھی ایک ہی ٹھوکر اسے موت کے نشیب میں لڑھکا دیتی ہے۔ وہاں بھی یہی معاملہ درپیش تھا۔ کوئی ایسا شخص نظر نہیں آتا تھا جس کے ہاتھ میں ڈوبتی کشتی کی پتوار دے دی جائے اور وہ اسے کنارے سے لگا سکتا ہو۔ اب میں شہنشاہ کا سامنا کرتے ہوئے ہچکچاتا تھا۔ آخر انہیں کیا بتاتا کہ اکبر اور عالمگیر تو کیا، یہاں کوئی مغل بھی دکھائی نہیں دیتا۔ سب پرائے اور بیگانے نظر آتے ہیں اور میں کسی بیگانے آدمی کی ضمانت نہیں دے سکتا۔

ایک روز انہوں نے خود مجھے طلب کر لیا اور دریافت کیا کہ میری تلاش کا حاصل کیا نکلا؟ میں نے عرض کیا۔

''عالم پناہ! جنگیں لڑنے اور فتوحات حاصل کرنے والے مغل رخصت ہو گئے۔''

میری ذات سے ایک تعلق رہے گا۔ میں نہیں جانتی، سید صاحب کی زبان سے یہ رُوداد سن کر صفدر پیا اور ماموں اورنگ مرزا بھی ''رخ'' کو لفظِ کلید قرار دینے پر چونکے یا حیران ہوئے تھے یا نہیں لیکن میری حیرت قدرتی تھی، جسے میں نے اپنی ہی ذات میں چھپالیا۔ سید صاحب کی کہانی سے دلچسپی بڑھ گئی تھی اور اب مجھے یہ اضطراب یا انتظار تھا کہ اس لفظِ کلید سے قفل ابجد کھلنے کا واقعہ کب ظہور میں آتا ہے۔

❁......❁......❁

''عالم پناہ نے اسی وقت ناظمِ اعلیٰ کو بلایا اور میری تقرری کا حکم جاری کر دیا۔ یہ فوری تقرری ناظمِ اعلیٰ کے علاوہ قلعے کے مرہٹہ افسر کے لیے بھی حیران کن ثابت ہوئی۔ اس طرح میں اپنے پہلے کام پر بحال ہو گیا بلکہ عہدے میں ترقی بھی ہوئی۔ مجھے محررِ اعلیٰ (میر منشی) کا نائب بنا دیا گیا اور یہ خدمت سپرد ہوئی کہ ضروری کاغذات اعلیٰ حضرت کی خدمت میں پیش کروں اور انہیں پڑھ کر سناؤں۔

یہ ایک اہم خدمت تھی جس کے طفیل مجھے اکثر شہنشاہ کے حضور حاضر ہونا پڑتا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ غلام علی قفل ساز نے خفیہ خزانے کے متعلق جو کہانی بیان کی، اس میں کوئی حقیقت تھی یا نہیں۔ البتہ اعلیٰ حضرت نے اشرفیوں کے صلے کا جو واقعہ سنایا وہ بالکل قرین قیاس بلکہ حقیقت پر مبنی تھا۔ دفترِ شاہی میں وہ صندوق موجود تھا جسے غلام علی نے قفل ابجد لگایا تھا اور جس میں بعض اہم دستاویزات رکھی گئی تھیں۔ عالم پناہ نے مجھ پر اعتماد کرتے ہوئے اس کا لفظِ کلید بھی بتا دیا تھا۔ اگر کہیں خزانہ رکھوایا ہوتا تو مجھے اس سے بھی آگاہ کر دیتے۔

غلام علی کی کہانی تو کسی طلسم ہوش ربا سے کم نہ تھی۔ سوچا، شہنشاہ نے اسے مزید قفل تیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ شاید اس نے ازخود فرض کر لیا ہو کہ ابجد کے وہ قفل ایسے صندوقوں کو لگائے جائیں گے جن میں خزانہ ہو گا۔ یوں اس کے ذہن نے ایک پراسرار کہانی کا تانا بانا بن لیا ہو۔ پھر بھی وہ ایک کاریگر تھا، قصہ گو نہیں اور ایک آہن گر سے ایسی عجیب و غریب کہانی کی توقع نہیں ہو سکتی تھی۔ کبھی کبھی خیال آتا، شہنشاہ سے اپنی بے چینی کا اظہار کروں کہ آخر غلام علی کو خزانے کی کہانی سوجھی کیوں؟ پھر میں خود ہی سوچتا کہ ایسا سوال کر کے پایۂ اعتبار سے گر جاؤں گا۔ جب وہ اشرفیوں کے صلے کا پس منظر بیان کر چکے ہیں جو درست بھی ہے تو حیران ہوں گے کہ میں قفل ساز کی کہانی کیوں دہراتا ہوں اور مجھے کسی خزانے سے جس کا کوئی اتا پتہ نہیں، کیا دلچسپی ہے؟

یہی سب کچھ سوچ کر میں نے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور قفل ساز کی کہانی کو ذہن سے بھلانے کی کوشش کرنے لگا۔ ایک روز میں چند ضروری فرامین کی خواندگی کے لیے جو مرہٹوں کے دیوانی اختیارات سے متعلق تھے، اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر تھا اور اتفاق سے ہم دونوں کے علاوہ کوئی تیسرا فرد وہاں موجود نہ تھا کیونکہ مہاراجہ سندھیا کا مرہٹہ مختارِ خاص (ریذیڈنٹ) ان فرامین پر مہرِ شاہی لگوانے کے لیے خود حاضر نہ ہو سکا اور یہ فرض مجھے سونپ دیا گیا تھا کہ میں شہنشاہ کو فرمان پڑھ کر سنا دوں اور ان پر مہرِ شاہی لگواؤں۔ عالم پناہ کا خادمِ خاص ہی ان دنوں مہر بردار تھا جسے حضور نے وزیر سلطنت کی طلبی کے لیے بھیج دیا تھا کہ وہ ان فرامین پر مہرِ شاہی لگوانے کے لیے خود کیوں حاضر نہیں ہوا؟

کچھ ایسا ہی اتفاق پیش آیا تھا کہ مجھے شہنشاہ کے حضور تنہائی کا موقع مل گیا۔ وہ اس تنہائی میں اپنے دل کی بات زبان پر لے آئے اور سرگوشی میں کہنے لگے۔

خلاف بغاوت پر آمادہ کرتا تھا۔ میں نے اس الزام سے بہتیرا انکار کیا لیکن میری کوئی بات تسلیم نہ کی گئی اور بطور سزا گوالیار کے قلعے میں قید کا حکم صادر ہوا۔

جن لوگوں نے مرہٹوں کی قید کاٹی ہے، وہ جانتے ہیں کہ ان کی قید کتنی سخت اور اذیت ناک ہوتی ہے۔ میں تو سازش اور بغاوت کا مجرم قرار دیا گیا تھا۔ باغی کا نہ صرف باہر کی دنیا سے رابطہ پوری طرح کاٹ دیا جاتا بلکہ کال کوٹھڑی کے اندر بھی اس کے پاؤں میں بیڑی پڑی رہتی ہے جس کی زنجیر کا آہنی کنڈا دیوار میں پیوست ہوتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔ اس قید کا ایک بھیانک پہلو یہ تھا کہ میرے گھر والوں یا لال قلعے کے اہلکاروں میں سے کسی کو علم نہ تھا کہ میں مرہٹوں کی قید میں ہوں۔ وہ یہی سمجھتے تھے، کچھ لٹیرے جنہوں نے گھر میں گھس کر زیورات لوٹ لیے تھے، مجھے باندھ کر لے گئے اور شاید میری رہائی کے عوض کسی رقم کا مطالبہ کریں گے۔ کیونکہ انہیں تلاش پڑتاس کے باوجود گھر سے نقدی نہیں مل سکی تھی۔

یہ بات مجھے تفتیش کرنے والے مرہٹہ سردار وشواناتھ بھاؤ نے بتائی تھی تا کہ میں کہیں یہ نہ سمجھ بیٹھوں کہ میری گرفتاری پر گوالیار سرکار سے احتجاج ہوگا اور مجھے رہا کر دیا جائے گا۔ رہائی کا دارومدار تفتیشی افسر بھاؤ کے ساتھ میرے تعاون پر تھا۔ ورنہ دہلی میں یہی سمجھا جائے گا کہ لٹیروں نے قتل کر کے میری لاش کسی گڑھے یا کھڈ میں پھینک دی ہوگی اور کوئی زندہ انسان یہ نہیں جان سکے گا کہ میں کہاں ہوں اور میرا انجام کیا ہوا؟

جب مجھے ''باغی'' قرار دے کر سزا کا حکم سنا دیا اور ایک کال کوٹھڑی میں ڈال دیا گیا تو میں یہی سمجھا کہ تفتیش ختم ہوئی اور اب مجھے اسی کال کوٹھڑی میں جینا اور مرنا ہے جس کی آہنی سلاخوں والی کھڑکی سے آسمان کی تھوڑی سی جھلک نظر آتی یا وہ گہرا نالا دکھائی دیتا تھا جو اونچی فصیلوں کے ساتھ ساتھ بہتا اور جس کے ذریعے گندا، بدبودار پانی بھر جاتا تھا۔ مگر ٹھیک پندرہویں دن بھاؤ میری کوٹھڑی میں موجود تھا۔ اب کے اس نے ایک نیا سوال کیا کہ میں شاہ عالم کے خفیہ خزانے کے بارے میں کیا جانتا ہوں؟

یہ سوال سن کر میری جو حالت ہوئی، بیان نہیں کر سکتا۔ میں نے اگر اس ضمن میں غلام علی قفل ساز کی ایک عجیب و غریب کہانی سنی بھی تھی تو اب مجھے اس پر یقین نہیں تھا اور نہ میں وہ الف لیلوی داستان مرہٹہ سردار کو سنانا چاہتا تھا کہ مبادا دہلی میں شہنشاہ پر کوئی نئی قیامت ٹوٹ پڑے۔ میرا جواب یہ تھا۔

''سردار بھاؤ! جس طرح میں کسی سازش کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور جرمِ بے گناہی میں یہاں قید کر دیا گیا ہوں، اسی طرح شہنشاہ کے کسی خفیہ خزانے سے بھی قطعی بے خبر ہوں۔ مجھے تو صرف اتنا علم ہے کہ لال قلعے کا خزانہ روہیلوں نے لوٹ لیا تھا۔''

اچانک مرہٹہ سردار نے سنسنی خیز سوال کر دیا۔ ''تمہیں یہ تو علم ہوگا کہ قادر خاں نے بادشاہ کی آنکھیں کیوں نکلوائی تھیں؟''

''بے شک، مجھے اس بات کا علم ہے۔ کیونکہ غلام قادر کے حکم سے میں نے بطور محرر اس بھیانک واقعے کا حال تحریر کیا تھا۔ قادر خاں روہیل کھنڈ کے والی نجیب الدولہ کا پوتا تھا اور اس نے مغل شہنشاہ پر الزام عائد کیا تھا کہ انہوں نے میرے باپ پر حملہ کیا اور میرے دادا پر مرہٹہ لشکر کو چڑھا دیا تھا جس نے نجیب الدولہ کو لوٹ لیا۔ اسی پاداش میں قادر خاں نے دہلی پر حملہ کیا، لال قلعے کو لوٹا اور شہنشاہ کی آنکھیں نکلوا دیں۔ اس نے عالم پناہ سے اپنے

شہنشاہ کے چہرے پر مایوسی کا سایہ کچھ اور گہرا ہو گیا۔ ''اگر مغلوں کے بازوؤں میں دم ہوتا تو دشمن کو ہماری بینائی چھیننے کی جرأت کیسے ہوتی؟ ہم دوسروں کے محتاج کیوں ہوتے؟''

❀......❀......❀

وہ ملاقات مایوسی پر ختم ہوئی۔ لیکن اس ملاقات پر ابھی تیسرا دن ختم ہوا تھا اور میں رات کو اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ پتہ چلا گھر میں چور گھس آئے ہیں۔ ہڑبڑا کر اٹھا لیکن بستر سے اُٹھ نہ سکا۔ بدن رسیوں سے جکڑا ہوا اور حلق میں کپڑا ٹھنسا تھا کہ بول نہ سکوں۔ میری بیوی، بیٹی اور گھر کا نوکر بھی سب بندھے پڑے تھے۔ سات چوروں نے جن کے ہاتھ میں ننگی تلواریں تھیں اور چہرے منڈاسوں سے چھپے ہوئے تھے پورے مکان کو کھنگال ڈالا تھا لیکن بیوی کے زیورات کے سوا انہیں کوئی نقدی نہ مل سکی۔ تلاشی سے فارغ ہوئے تو سر میں ضربیں لگا کر مجھے بے ہوش کیا اور اٹھا کر لے گئے۔ نہ جانے کب ہوش آیا۔ مگر ہوش میں آنے کا سبب وہ ہچکولے تھے جن سے میں مسلسل دوچار تھا۔ آنکھیں کھلیں تو کیا دیکھتا ہوں کہ اسی طرح رسیوں میں بندھا ایک بیل گاڑی میں لیٹا ہوں اور دو مسلح پہرے دار دائیں جانب اور دو بائیں جانب بیٹھے ہیں۔ مگر اب ان کے چہروں پر منڈاسے نہیں تھے۔ یہ بھی پتہ چل گیا کہ باہر دن کا اُجالا رخصت ہو رہا ہے اور ہمارے آگے پیچھے کچھ اور بھی بیل گاڑیاں ہیں جن میں مسلح آدمی سوار ہیں اور مجھے ان کی نگرانی میں کہیں لے جایا جا رہا ہے۔

یہ جان کر مزید حیرت ہوئی کہ ہم متھرا سے گزر آئے اور آگرہ پہنچنے والے ہیں۔ پوری رات اور پورا دن سفر میں گزرا تھا اور آگرہ میں بھی رکے بغیر سفر جاری رہے گا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کی بڑی کوشش کی کہ مجھے کیوں پکڑا گیا اور جانا کہاں ہے؟ مگر کسی سوال کا جواب نہ ملا۔ ایک دن میں گوالیار کے قلعے کی ایک کال کوٹھڑی میں بند تھا۔ گوالیار مہاراجہ سندھیا کی راج دھانی یا پایۂ تخت تھا۔ وہاں ایک مرہٹہ سردار مجھ سے یہ باز پرس کرنے لگا کہ میں دہلی کے قلعے میں اندھے شہنشاہ کو مہاراج سندھیا کے خلاف کیا پٹی پڑھاتا رہا ہوں اور میرے ساتھ اور کون کون لوگ ہیں؟

مجھ پر ایک سکتہ سا گزر گیا۔ میں جن لوگوں کو چور اور لٹیرے سمجھتا رہا، وہ دراصل مرہٹہ فوج کے سپاہی تھے جو چوروں کا بھیس بدل کر میرے مکان میں گھسے اور بڑی ہوشیاری سے مجھے پکڑ کر گوالیار میں لے آئے تھے۔ گھر میں نقدی یا زیورات کی نہیں بلکہ ایسے کاغذات اور خطوط کی تلاش ہوتی رہی تھی جن سے میرے ساتھیوں کا پتہ نشان مل سکتا۔ ان کا خیال تھا کچھ اور لوگ بھی شہنشاہ کو ورغلانے میں میرے شریک ہوں گے۔

میں نے بتایا، شہنشاہ تو مہاراج سندھیا کے شکر گزار ہیں کہ انہیں روہیلوں کی قید سے چھڑایا اور قادر خاں کو عذاب دے کر ہلاک کیا جس نے اعلیٰ حضرت کی آنکھیں نکلوا دی تھیں۔ انہیں مہاراج کے خلاف ورغلانے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مجھ پر دوسرا الزام یہ تھا کہ جب میں مغل دربار کی ملازمت ترک کر چکا تھا، پھر دوبارہ ملازمت پر بحال کیوں کیا گیا؟ اور لال قلعے میں شہزادوں، خاندان کے اہم افراد اور مغل سرداروں سے کس لیے میل جول بڑھاتا رہا؟ جبکہ ایک معمولی محرر کی حیثیت سے میرا ان سے کوئی تعلق تھا نہ دوستی کا ناتا۔ مرہٹوں کے محکمۂ خفیہ کے نزدیک میری دوسری ملازمت ایک سازش کے تحت عمل میں آئی اور اس سازش کا مقصد مغل شہزادوں اور سرداروں کو مہاراج کے

مرہٹہ سردار ایک بار پھر سوچ میں پڑ گیا اور سوچ کر بولا۔ ''دیکھو برہان الدین! ہمیں پتہ چلا ہے کہ شاہ عالم نے اپنا خزانہ کہیں چھپا رکھا ہے۔ غلام علی نے اپنے انوکھے تالے لگائے تھے، جنہیں کوئی دوسرا آدمی نہیں کھول سکتا۔ تم اس خزانے کو جانتے ہو اور غلام علی کو بھی جانتے ہو۔ اس سے انوکھے تالے تمہی نے بنوائے تھے۔ اگر اپنا جیون پیارا ہے تو اس خزانے کا پتہ بتا دو۔ نہیں تو تمہارا جیون ناش کر دیا جائے گا۔''

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور غصے میں دروازے کی طرف مڑا۔ میں نے کہا۔ ''مجھے کسی خزانے کا علم نہیں۔ اگر کوئی خفیہ خزانہ ہے تو شہنشاہ سے پوچھو۔''

''مہاراج کا حکم ہے، ان سے کچھ نہ پوچھا جائے۔ ان کا وچار ہے تم اپنی زبان کھول دو گے اور اسی میں تمہارا بھلا ہے۔''

پھر وہ باہر نکلا۔ کال کوٹھڑی کا آہنی دروازہ بند گیا اور سنتری نے دروازے کو تالا لگا دیا۔ معاملے کی صورت بڑی خطرناک اور بھیانک ہو گئی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے اب میں کبھی باہر کی دنیا نہ دیکھ سکوں گا۔ باہر کی دنیا سے میرا رابطہ ٹوٹ گیا تھا۔

❁......❁......❁

باپ اور دادا کا بدلہ لیا تھا۔''

سردار وشواناتھ بھاؤ میرا جواب سن کر سوچ میں پڑ گیا مگر فوراً اس نے پینترا بدلا۔ ''برہان الدین! تم سید ہو اور مجھے آشا ہے کہ جھوٹ نہیں بولو گے۔''

''سردار بھاؤ! یقین کرو۔ پہلے بھی میں نے کوئی جھوٹ نہیں بولا اور نہ شہنشاہ کو کبھی مہاراج سندھیا کے خلاف اُکسایا۔

وہ بڑی بے رحمی سے بولا۔ ''اس بات کا نیاؤ ہو چکا ہے۔''

''تم جس بات کو نیاؤ کہتے ہو، وہ انیائے ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔''

اس نے میری بے گناہی کا معاملہ چھپر پہ رکھا اور بڑے درشت لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''تم شاہی مسلح خانے کے قفل ساز غلام علی سے کتنی بار ملے تھے؟ اور بادشاہ کی طرف سے اسے کتنے قفل تیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا؟''

میں چیخا۔ ''سردار بھاؤ! یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے کسی غلام علی قفل ساز کی شکل تک نہیں دیکھی نہ اسے جانتا ہوں، نہ کبھی اس سے ملا ہوں۔''

مرہٹہ سردار نے مجھ پر ایک اور بجلی گرا دی۔ ''تم رکاب گنج کی اس گلی کو جانتے ہو، جہاں غلام علی رہتا تھا اور ایک بار اس کے مکان پر بھی گئے تھے۔ اس گلی میں ایک مندر ہے اور پچھم کی اور ایک مسجد جس کے قریب ہی غلام علی کا مکان تھا۔ جب تم اسے جانتے ہی نہیں تو ملنے کیوں گئے تھے؟''

پہلے بتا چکا ہوں کہ شہنشاہ کو قفل ساز کی موت سے مطلع کرنے کے بعد میں اس کی بیوی کو بھی آگاہ کرنا چاہتا تھا مگر وہ اپنی بیٹی اور ساس کو لے کر دہلی سے جا چکی تھی۔ یہاں تک تو درست تھا کہ میں غلام علی کے مکان تک پہنچ گیا اور مرہٹہ سردار نے مکان کا پتہ ٹھیک بتایا تھا مگر اس کے بقول میں غلام علی کو ملنے گیا تھا جو اس وقت مر چکا تھا۔ یا تو اسے صحیح اطلاع نہیں ملی تھی یا وہ جانتا تھا، میں غلام علی سے نہیں اس کی بیوی سے ملنے گیا تھا۔ پھر وہ جانتا ہو گا کہ میں گڑگانواں بھی گیا تھا۔

اچانک خیال آیا، غلام علی تو دہلی پر مرہٹوں کے حملے سے قبل ہی مر گیا تھا۔ ممکن ہے دہلی کے مرہٹہ کارخاص کو اس کے مرنے کا علم نہ ہو۔ کیونکہ روہیلہ سردا نے غلام علی کی موت پر اخفا کا پردہ ڈال دیا اور اس کے گھر والوں کو یہی بتایا تھا کہ اسے روہیل کھنڈ بھیج دیا گیا ہے۔ یہی سوچ کر میں نے سردار بھاؤ کو جواب دیا۔

''اس بات سے غلام علی بھی انکار کرے گا کہ میں اس سے ملنے گیا تھا۔ کیونکہ میں اسے اور وہ مجھے جانتا ہی نہیں۔ اسی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے؟''

مرہٹہ سردار بے ساختہ بولا۔ ''وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ دہلی سے بھاگ گیا اور کچھ پتہ نہیں کہ کہاں ہے۔''

جو بات بالکل بے ساختہ زبان پر آ جائے، وہ گویا دل کی آواز ہوتی ہے۔ میں نے وشواناتھ بھاؤ کے دل کا چور پکڑ لیا کہ غلام علی کے بارے میں صحیح معلومات نہیں رکھتا۔ یہ نہیں جانتا ہے کہ میں گڑگانواں بھی جا چکا ہوں۔ اب مجھے کچھ تسلی ہوئی اور اسے بتانے لگا۔

''سردار بھاؤ! مجھ پر وشواس کرو۔ میں رکاب گنج میں ایک بار نہیں کئی بار گیا ہوں مگر غلام علی کو ملنے کبھی نہیں گیا۔ نہ اس کی شکل سے واقف ہوں۔ تم مجھے پھانسی پر لٹکا دو گے تو بھی میرا یہی جواب ہو گا۔''

گندے نالے کو عبور کر کے جس پر لکڑی کا پل تھا، ہم مغربی فصیل کی طرف ہو لیے جدھر ایک جیل خانے کی خوف ناک عمارت نظر آ رہی تھی۔ خوف ناک اس لیے کہ قلعے کی فصیل کے اندر اس کی اپنی فصیل اور اپنی چار دیواری بڑی اونچی تھی۔ گویا قلعے کے اندر ایک اور قلعہ تھا۔ میں نے ''خوفناک'' کا جو لفظ استعمال کیا ہے، وہ اس عمارت کی وحشت و دہشت اور ہولناکی کے لیے کافی نہیں۔ جیسا کہ آپ لوگ میرے آئندہ بیان سے خود اندازہ کر لیں گے۔ اس الگ تھلگ عمارت کی اونچی اور مضبوط دیواریں تھیں، جنہیں کوئی انسان پھلانگنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ایک بڑا مہیب برنجی پھاٹک اور اس پھاٹک کے اندر لوہے کا ایک اور بھاری جنگلا یا دروازہ تھا جہاں دو ہٹے کٹے مسلح سنتری پہرہ دے رہے تھے۔

ہم نے آگے پیچھے پہلے پھاٹک، پھر لوہے کا جنگلا پار کیا اور اس عمارت یا جیل خانے کے دالان میں آ گئے جو ڈیڑھ دو کنال کے رقبے میں پھیلا ہوا اور جس پر بڑے بڑے پتھروں کا مضبوط اور بڑا ہموار فرش تھا۔ سامنے کچھ کمرے تھے جیسے ڈربے ہوتے ہیں اور ان ڈربوں میں بدنصیب قیدی تھے، جنہیں میں دیکھ نہ سکا۔ کیونکہ سارے ڈربے بند تھے اور ہر ڈربے میں ایک چھوٹا سا گول سوراخ ہوا کے لیے رکھا گیا تھا تاکہ قیدی سانس لے سکے۔ میں ان تابوت نما ڈربوں یا کمروں کو دیکھ کر کانپ گیا۔ نہ جانے کہاں سے نکل کر جیل کا داروغہ، سردار وشواناتھ بھاؤ کے سامنے پہنچ گیا اور اس کے ہمراہ دوسری طرف چل دیا۔ اس طرف کوئی ستر پچھتر قدم کے فاصلے پر ایک اور اونچی دیوار نظر آئی۔ اس دیوار میں بھی ایک برنجی پھاٹک تھا۔ داروغۂ جیل اور سردار بھاؤ کے پیچھے سنگی دالان پر چلتے ہم اسی پھاٹک پر پہنچے جس پر بھاری قفل پڑا تھا۔

داروغہ نے دو دیوہیکل چوکیداروں کی مدد سے جو اس کے ساتھ ہی آئے تھے، بھاری پھاٹک کا ایک کواڑ کھولا تو اس پھاٹک کے اندر بھی ایک مہیب آہنی جنگلا دکھائی دیا۔ اس جیل میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے دوہرے دروازے تھے۔ مقفل جنگلا کھلا تو ہم دوسرے دالان میں پہنچے۔ ادھر ایسا بھیانک سناٹا طاری تھا جیسا قبرستان اور شمشانوں میں ہوتا ہے۔ لگتا تھا انسان تو کیا، کوئی پرندہ بھی اونچی دیواروں کے اس حصار میں پَر نہیں مار سکتا۔ دالان کے سامنے کچھ کمرے تھے مگر پہلے دالان کے کمرے سے مختلف۔ ان میں کوئی قیدی نہیں تھا۔ دونوں چوکیدار جن کی ہیئت کذائی پر بھوتوں کا گمان ہوتا تھا، ایک وسطی کمرے کی طرف چلنے لگے جو دوسرے کمروں سے الگ تھلگ اور گول تھا۔ ایک چوکیدار نے اس کمرے کا مقفل دروازہ کھولا تو اس کے اندر بھی ایک آہنی جنگلا نمودار ہوا۔ جنگلے کا قفل کھلا تو پتہ چلا کہ وہ گول کمرہ دراصل گول زینہ ہے جو نیچے کسی تہہ خانے میں جاتا ہے۔ کیونکہ وہاں مشعل روشن کر لی گئی تھی۔ دونوں چوکیدار آگے پیچھے زینہ اُترنے لگے۔ مشعل کی روشنی میں علی الترتیب داروغۂ جیل، مرہٹہ سردار بھاؤ، دونوں سپاہی، پھر میں اور میرے پیچھے پیچھے دوسرے دو سپاہی ایک ایک کر کے زینے میں پہنچ گئے۔

لگ بھگ تیس سیڑھیاں اترنے کے بعد زینہ ختم ہوا اور چوبی دروازہ نظر آیا، جو مقفل تھا۔ اس دروازے کے پیچھے ایک اور مقفل آہنی جنگلا تھا۔ تہہ خانے کے اندر بھی دوہرے دروازے تھے۔ ایک چوبی، دوسرا آہنی۔ زینے سے نکل کر ہم ایک راہداری میں آئے جو تقریباً آٹھ فٹ چوڑی اور چالیس فٹ لمبی ہو گی۔ راہداری کی دونوں جانب دو دو دروازے تھے جو تہہ خانے کے کمروں میں کھلتے ہوں گے۔ خیال آیا وہیں کسی کمرے میں مجھے بند کیا

(11)
زندانِ اجل

سید صاحب کی حیرت انگیز کہانی جاری تھی۔

مرہٹہ سردار چلا گیا تو میں نے غور کیا کہ غلام علی قفل ساز کی جھوٹی یا سچی کہانی اگرچہ نامناسب اور غیر معتبر طریق سے مرہٹوں تک پہنچی لیکن ان کے کانوں میں ''خفیہ خزانے'' کی بھنک پڑ گئی ہے او یہ بات شہنشاہ کے حق میں نہیں جاتی۔ غلام قادر روہیلے کی طرح مہاراجہ سندھیا بھی ''خفیہ خزانے'' کے ذکر پر چونک گیا ہوگا اور اب مرہٹوں کی کوشش ہوگی کہ اس خزانے کا سراغ لگایا جائے۔'

میں اس امر کا اعتراف کرتا ہوں کہ مہاراجہ سندھیا نے اعلیٰ حضرت کو روہیلوں کے ظلم سے چھڑایا، غلام قادر خان سے ان کا بدلہ لیا اور دہلی پر قبضہ وتصرف کے باوجود ان کی شہنشاہی قائم رکھی۔ لیکن اس کے عوض مرہٹوں نے مغلیہ سلطنت میں جو دہلی کے اردگرد دو دو سو میل کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی، دیوانی اختیارات حاصل کر لیے تھے۔ نام اگرچہ شاہ عالم ثانی ہی کا استعمال ہوتا تھا لیکن حکومت دراصل مرہٹے کر رہے تھے۔ وہ بھلا کسی خفیہ خزانے کو کیوں چھوڑتے؟

وشواناتھ بھاؤ مجھے بتا چکا تھا، اس سلسلے میں شہنشاہ سے کچھ نہیں پوچھا جائے گا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ مہاراجہ سندھیا ان کی عزت کرتا اور اپنا اعتماد گنوانا نہیں چاہتا تھا۔ مہاراجہ کا خیال تھا، ایک نہ ایک دن میں ہی سب کچھ بتا دوں گا۔ مگر میں تو کچھ جانتا نہیں تھا۔ اور جو باتیں میرے علم میں آ گئی تھیں، انہیں بیان کرنا ہرگز مناسب نہ تھا۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اپنی زبان بند رکھوں گا۔

دوسرے روز مرہٹہ سردار بھاؤ پھر آ گیا۔ ننگی تلواریں لیے چار مرہٹہ سپاہی ساتھ تھے۔ اس نے بتایا، میرا قید خانہ تبدیل کیا جا رہا ہے۔ کال کوٹھڑی کے محافظ سپاہی نے دیوار کے آہنی کنڈے سے بیڑی کی زنجیر نکالی اور میرے ہاتھ میں ڈال دی۔ پھر وہ مجھے کوٹھڑی سے لے کر نکلے اور ایک طرف چل دیئے۔ میرے پاؤں میں بیڑی، ہاتھوں میں زنجیر تھی۔ دو سپاہی آگے، دو پیچھے تھے اور بھاؤ سب کے آگے چلا جا رہا تھا۔ بیڑی کے علاوہ فکر سے بھی میرے پاؤں من من بھر کے ہو رہے تھے کہ نہ جانے مجھے کس قید خانے میں لیے جاتے ہیں اور کیا نئی مصیبت پیش آنے والی ہے۔ تن بہ تقدیر چلتا رہا۔

مہمان رہا۔ یہیں اس کا انت ہوا۔ پر اتم سنسکار نہیں ہو سکا۔ تم اس کا پنجر دیکھ چکے ہو۔ یہ گھر ایک برس سُونا رہا۔ اب تم آ گئے ہو۔ یہ تمہاری اپنی اِچھا ہے کہ یہاں ایک دن رہو، ایک مہینہ رہو، ایک برس رہو یا جیون بھر یہیں رہو۔ پہلا بندی اکیلا رہتا تھا۔ تم اکیلے نہیں رہو گے۔ مرنے والے کا بھوت یہاں سے باہر نہیں نکل سکا ہو گا۔ وہ تم سے ملتا رہے گا۔ جب تم اس بھوت سے چھٹکارا چاہو اور زبان کھولنے کی خواہش کرو تو مجھے سندیس بھیج دینا۔

یہ بات بھی اچھی طرح سوچ لو کہ مرنے کے بعد ہندو کی ارتھی جل جاتی اور مسلمان کا مردہ قبر میں اُتر جاتا ہے۔ پر تم اس سمے جیتے جی دھرتی کے پیٹ میں کھڑے ہو جو قبر کے پیٹ سے بڑا نیچا اور گہرا ہے۔ قبر اتنی گہری نہیں ہوتی۔ جب ہم یہاں سے چلے جائیں گے تو وہ سارے پٹ اور جنگلے جنہیں پار کر کے ہم یہاں آئے ہیں، بند ہو جائیں گے اور تم دھرتی کے اس گہرے پیٹ میں اکیلے رہ جاؤ گے۔ صرف مرنے والے کا بھوت تمہارے ساتھ ہو گا۔ کوئی آدمی اس تہہ خانے اور اس کے بند جنگلوں اور کواڑوں سے نکل نہیں سکتا۔ پھر بھی یہاں سے نکلنے کا ایک راستہ اور کواڑ ہے اور اس کواڑ کے پٹ تمہارے اپنے من میں کھلتے اور بند ہوتے ہیں۔ جس دن تم اپنے من کے پٹ کھول دو گے اس بندی گھر کے سارے کواڑ اور جنگلے بھی کھل جائیں گے اور تم اس سنسار کو دیکھ سکو گے جسے باہر چھوڑ آئے ہو۔''

یہ سب کہہ کر وہ پلٹنے لگا تو میں نے پوچھا۔ ''سردار بھاؤ! میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں کہ جو کچھ مجھ سے پوچھنا چاہتے ہو میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔''

وہ بڑے کرخت لہجے میں بولا۔ ''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آدمی کچھ باتیں بھول جاتا ہے اور سمجھتا ہے کہ وہ کچھ نہیں جانتا۔ پر بندی گھر میں جب موت آگے پیچھے پھرتی ہے، اسے سوچنے کا سمے ملتا ہے اور بھولی بسری باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ تم بھی دھرتی کے اس پیٹ میں بیٹھ کر سوچو گے تو کچھ نہ کچھ یاد آ جائے گا۔''

پھر وہ داروغہ، سپاہیوں اور چوکیداروں کے ہمراہ وہاں سے نکلا۔ آہنی جنگلا اور چوبی دروازہ بند ہو گیا اور قفل لگ گئے۔ ان لوگوں کے جاتے ہی روشنی بھی وہاں سے نکل گئی اور میں اندھیرے میں کھڑا گول زینے میں ان کے اوپر جاتے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ چند لمحوں بعد زینے کے اوپر والا جنگلا اور کواڑ بھی بند ہوئے اور میں نے اوپر والے تہ خانے کی راہداری میں ان کے قدموں کی ہلکی سی آہٹ سنی جو پہلے زینے کی طرف جا رہی تھی۔ پھر میں کچھ نہ سن سکا کیونکہ غم کی شدت سے میرا دماغ سن ہو کے رہ گیا اور میں اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو گیا۔ لیکن فوراً خود کو سنبھالا اور خود کو یاد کیا۔

مجھے بے چینی اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ یہ گھٹن ناف تک اُترے ہوئے تہ خانے کی گہرائی، تاریکی اور تنہائی کے سبب تھی۔ ورنہ سانس لینے کے لیے ہوا موجود تھی اور میں نہیں جانتا اتنے عمیق اور چاروں طرف سے بند تہ خانے میں ہوا کی نامعلوم آمدورفت کا سلسلہ کیا تھا۔ بے چینی اور پریشانی اس بات پر بھی تھی کہ اس ہولناک اور بدترین قید خانے میں جہاں سے فرار ہونے کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ مجھے گلے کے طوق اور پاؤں کی بیڑی سے آزاد نہیں کیا گیا تھا۔ کچھ دیر دیوار کے سہارے کھڑا رہا، پھر گھاس پھونس کے بستر پر ٹانگیں پسار کے بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کیا کروں؟ مرہٹہ سردار مجھے ایسی بات یاد کرنے کے لیے کہہ گیا تھا جو میں جانتا ہی نہیں تھا اور زمین کے گہرے پیٹ میں جہاں مجھے اُتار دیا گیا تھا، اس اذیت اور دہشت کا اصل مقصد یہ تھا کہ جو کچھ میں نہیں جانتا

جائے گا۔ مگر دونوں چوکیدار جو پہلے ہی جانتے تھے کہ میرے لیے کون سی جگہ تجویز کی گئی ہے، راہداری کے آخری سرے پر ایک مقفل دروازے کی طرف بڑھے۔ وہ دروازہ اور اس کا آہنی جنگلا کھلا تو انکشاف ہوا کہ وہاں ایک اور گول پیچ دار زینہ ہے جو اس تہ خانے کے بھی نیچے کسی اور تہ خانے میں اُترتا ہے۔ پوری پچیس سیڑھیوں کے بعد زینہ ایک چوبی دروازے پر ختم ہوگیا۔ جب وہ دروازہ اور اس کا آہنی جنگلا کھلا تو ہم ایک طویل وعریض کمرے میں داخل ہوئے جس کی چھت اور دیواروں کے ساتھ جگہ جگہ جالے لٹک رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا اس بھیانک کمرے کو عرصۂ دراز کے بعد کھولا گیا ہے۔

فراعنۂ مصر کے مقبرے جو زمین میں تہہ در تہہ بہت گہرے بنائے جاتے تھے، یقیناً بڑے خوف انگیز ہوں گے لیکن وہ کمرہ جو ایک تہہ خانے کے نیچے دوسرے تہہ خانے میں واقع اور گویا زمین کے پیٹ میں اُترا ہوا تھا، فراعنۂ مصر کے مقبرے سے زیادہ بھیانک تھا۔ اس کی طویل دیوار میں ایک کھلا در تھا۔ جس کے پیچھے ایک اور کمرہ تھا۔ مرہٹہ سردار وشوانا تھ بھاؤ نے بتایا کہ دراصل وہی کمرہ میرا ''آرام کدہ'' ہے اور جہاں ہم کھڑے ہیں وہ کمرے کا دالان ہے۔ پھر اس نے مشعل بردار چوکیدار کو اشارہ کیا کہ وہ مجھے کمرے کا دالان اچھی طرح دکھا دے۔

میں مشعل کی روشنی میں دالان کا جائزہ لے رہا تھا کہ ناگہاں نظر ہڈیوں کے ایک انسانی پنجر پر پڑی جو لمبی دیوار کے ساتھ فرش پر چت پڑا تھا۔ اس ڈھانچے کے ساتھ ساتھ مٹی بھی تھی جس میں کچھ ہڈیاں دب گئی تھیں اور مٹی اس بدنصیب آدمی کے اپنے ہی جسم کی تھی۔ وہ اسی تہہ خانے میں قید ہوگا۔ جب مر گیا تو اس کی لاش وہیں پڑی رہی اور مٹی میں تبدیل ہوگئی۔ مگر اوپر کی مٹی نیچے گر جانے سے ہڈیوں کا ڈھانچہ نکل آیا تھا۔ البتہ کھوپڑی پر موجود مٹیالے بال اور آنکھوں کے کھلے حلقے اس انسانی پنجر کو بڑا خوفناک بنا رہے تھے۔

ایسے تہہ خانے میں جہاں مجھے قید کرنے کے لیے لایا گیا تھا، ایک انسانی لاش کا یہ حشر دیکھ کر میرے پسینے چھوٹ گئے۔ سردار بھاؤ، داروغۂ جیل اور دونوں قوی ہیکل چوکیداروں کے لیے وہ منظر غالباً نیا نہیں تھا لیکن ان چار سپاہیوں نے جو میری نگرانی کر رہے تھے، کسی جیل خانے میں ایسا بھیانک نظارہ غالباً پہلی بار دیکھا تھا جو ایک لرزہ خیز عجوبے سے کم نہ تھا۔ کیونکہ میری طرح وہ بھی اسے دیکھ کر کانپ گئے تھے۔

سردار بھاؤ کے اشارے پر مشعل بردار چوکیدار اس کھلے در کی طرف بڑھا جو میرے ''حجرۂ راحت'' کا واحد دروازہ تھا۔ بھاؤ اور داروغہ کے ساتھ میں بھی اس کمرے میں پہنچ گیا جو عرض میں دالان سے ذرا کم لیکن طول میں برابر تھا۔ دونوں کمروں کی دیواریں کالے پتھروں سے اٹھائی گئی تھیں جن میں قیدیوں کی تیرہ بختی بھی شامل تھی۔ وہاں کھاٹ یا بستر نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ سیاہ پتھروں کے فرش پر دیوار کے پاس کچھ گھاس پھونس پڑا تھا جو مرنے والے قیدی کا بچھونا رہا ہوگا۔ مرہٹہ سردار نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا۔

''برہان الدین! یہ ہے تمہارا نیا گھر جہاں تمہیں اس سے تک رہنا ہے جب تک اپنی زبان نہیں کھول دیتے۔ تمہیں ایک کمبل دیا جائے گا جسے اوڑھ کے اس بستر پر (اس نے گھاس پھونس کی طرف اشارہ کیا جس پر گرد جمی تھی) چین سے سوسکو گے۔ کھانا تیسرے دن ملے گا جسے تم چاہو تو ایک ہی دن کھالو یا اس سے دو دن گزار سکتے ہو۔ تمہارے ہاتھوں کی زنجیر اُتار دی جائے گی پر پاؤں کی بیڑی اور گلے کا پھندا نہیں اُترے گا۔ تم سے پہلے جو بندی یہاں رہتا تھا، اس نے مہاراج کو ایک انمول چیز کا پتہ بتانے سے ''ناں'' کر دی تھی اور کئی برس اسی گھر کا

اسیری اور نظر بندی کا آغاز ہوا۔
تیسرے دن پانی کا ایک لوٹا، تین چپاتیاں، ترکاری یا دال کی کٹوری ملتی تھی۔ پانی کے اس لوٹے سے دو روز اپنی ضروریات پوری کرتا اور ساتویں آٹھویں دن غسل بھی کر لیتا تھا۔ میرا خیال تھا سردار وشوانا تھ بھاؤ جلد میری خبر لینے آئے گا کہ مجھے کوئی ''بھولی بسری بات'' یاد آئی ہے یا نہیں؟ لیکن انتظار کے دن طویل ہوتے چلے گئے۔ مجھے اس بدترین قید خانے میں پڑے ایک مہینہ گزر گیا اور کسی نے میری خبر نہ لی۔ بس چوکیدار کھانا دے کر چلا جاتا تھا۔ اسی طرح ایک سہ ماہی، پھر ششماہی بیت گئی۔ حتیٰ کہ پورا سال ہو گیا اور میں سوچنے لگا کہ شاید وہ مجھے بھول گیا ہے۔ لیکن دوسرا سال شروع ہوتے ہی مرہٹہ سردار ایک دن اچانک مشعل بردار کے ساتھ میرے کمرے میں نمودار ہوا اور آتے ہی کہنے لگا۔ ''برہان الدین! میں پوچھنے آیا ہوں کیا اپنے من کا تالا کھولو گے یا نہیں؟''
اس کے سوال کی طرح میرا جواب بھی مختصر تھا۔ ''میرے دل میں دروازہ ہی نہیں۔ تالا کہاں لگاؤں گا؟''
وہ غصے میں بولا۔ ''دل کی نہیں تو بھیجے کی کوٹھڑی کھول دو۔''
وہ مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگا اور میں نے کہا۔ ''سردار بھاؤ! میں جانتا ہوں، تم مجبور ہو اور مجھے اذیت دے کر خوش نہیں۔ میں کوئی شکایت نہیں کرتا۔ صرف ایک درخواست ہے۔''
''بولو کیا ہے؟''
میں نے اپنی آواز میں کچھ نرمی پیدا کر لی۔ ''یہ قید خانہ جسے تم میرا گھر کہتے ہو، ایسا مضبوط ہے کہ کوئی قیدی یہاں سے بھاگنے کی سوچ بھی نہیں سکتا۔ پھر میرے گلے میں پھندا اور پاؤں میں بیڑی کیوں ہے؟ دیکھو میں ایک سال میں کتنا کمزور ہو گیا ہوں اور بیڑی سے میرے پاؤں اور ٹخنے زخمی ہو گئے ہیں۔ میں ٹھیک سے نماز نہیں پڑھ سکتا۔ اگر میری بیڑی کھلوا دو تو تمہیں دعا دوں گا۔''
وہ غور سے میری طرف دیکھتا اور کچھ سوچتا رہا پھر چوکیدار کو اشارہ کیا۔ وہ مشعل سردار بھاؤ کے ہاتھ میں دے کر اوپر چلا گیا۔ لوٹ کے آیا تو اس کے ہمراہ داروغہ، ایک لوہار اور لوہار کے پاس بیڑی کاٹنے والا ہتھیار بھی تھا۔ سردار وشوانا تھ بھاؤ کے حکم پر میرے پاؤں کی بیڑی کاٹ دی گئی۔ گلے کا طوق اتار دیا گیا۔ میں نے اس کی طرف سپاس کی نظروں سے دیکھا تو وہ بولا۔
''میں اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کر سکتا۔''
اس نے میری درخواست قبول کر کے مجھ پر ایک احسان کیا تھا اور اس احسان کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس بھی سوائے آنسوؤں کے اور کچھ نہیں تھا جو بے اختیار آنکھوں سے ٹپک پڑے۔ وشوانا تھ بھاؤ نے میرے چہرے پر آنسو دیکھے تو منہ دوسری جانب پھیر لیا۔ پھر میں نے اس کی آواز سنی۔
''برہان الدین! کوئی بھولی بات یاد کرو۔ مہاراج کو وشواس دلایا گیا ہے کہ تم کچھ جانتے ہو۔''
یہ کہہ کر اور میرے جواب کا انتظار کیے بغیر وہ کمرے سے نکل گیا۔ اس کے پیچھے پیچھے دوسرے لوگ بھی چلے گئے۔ تہ خانے کا دروازہ بند ہو گیا اور میں اندھیرے میں وہیں کھڑا ان کے اوپر جاتے قدموں کی چاپ سنتا رہا۔ پھر انہی قدموں بیٹھ کر اپنے ٹخنوں اور پیروں پر ہاتھ پھیرنے لگا جنہیں ایک سال کے بعد بیڑیوں سے رہائی ملی تھی۔ میں نے وشوانا تھ بھاؤ کو دعا دی جس نے کہا تھا کہ وہ اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں کر سکتا مگر اس نے کچھ اور

وہ بتاؤں۔ اس ساری سوچ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ دنیا میرے لیے ختم ہوگئی، زندگی بہت دور چلی گئی اور موت بالکل قریب آ گئی ہے۔ دالان میں پڑا ہوا انسانی ڈھانچہ شہادت دے رہا تھا کہ میں مُردوں کی دنیا میں آ گیا ہوں اور جلد یا بدیر ایک دن میرا انجام بھی وہی ہوگا جو مجھ سے پہلے قیدی کا ہو چکا ہے۔

دیر تک انہی خیالوں میں کھویا رہا۔ اس گہرے اور تاریک حجرۂ اجل میں دن رات میں کوئی امتیاز نہ تھا۔ پھر بھی اندھیرے سے مانوس ہو جانے کے بعد میں اس کمرے کا حدودِ اربعہ دیکھنے لگا۔ وہ کھلا در بھی جو دالان میں کھلتا تھا، کسی پرچھائیں کی صورت نظر آیا۔ مجھے وہیں جینا، وہیں مرنا تھا۔ اس لیے اندھیرے سے سمجھوتا کرنے اور خود کو اس کا عادی بنانے لگا۔ جب کمرے کا حدودِ اربعہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا تو سمجھ لیا کہ باہر رات چھا گئی ہے۔ جبھی میرے کمرے کا اندھیرا پہلے سے گہرا اور کالا ہو گیا ہے۔

بیٹھے بیٹھے تیمم کیا اور اندازے سے قبلہ رُو ہو کر نماز ادا کی۔ خدا کے حضور گڑگڑایا۔ نہ جانے کب تک روتا گڑگڑاتا رہا حتیٰ کہ بھوکا پیاسا گھاس پھونس کے بستر پر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کمرے میں بدستور اندھیرا تھا لیکن میں اس اندھیرے کمرے کا حدودِ اربعہ دیکھ سکتا تھا۔ گویا باہر سورج طلوع ہو چکا اور دن چڑھ گیا تھا لیکن میری دنیا میں نہ سورج طلوع ہوا، نہ دن چڑھا بلکہ اندھیرا تھا۔ اس لیے نماز پڑھی۔ فارغ ہوا تو دروازہ کھلا اور وہی چوکیدار جو کل داروغہ کے ساتھ آیا تھا، ایک ہاتھ میں مشعل، دوسرے میں پانی کا لوٹا اٹھائے داخل ہوا۔ پیچھے دوسرا چوکیدار تھا جس کے کندھے پر میلا کچیلا کمبل، دائیں ہاتھ میں تلوار اور بائیں ہاتھ میں پیتل کی رکابی نظر آئی۔ اس میں ترکاری کی ایک کٹوری اور تین چپاتیاں تھیں۔

مشعل بردار نے پانی کا لوٹا فرش پر رکھا۔ دوسرے نے کھانے کی رکابی دیوار کے مستطیل طاقچے میں رکھی جو قیدی کی اشیاء یا کھانا رکھنے کے لیے بنایا گیا تھا۔ کمبل کندھے سے اتار کر گھاس کے بستر پر رکھ دیا اور بڑے سخت لہجے میں بولا۔ ''یہ جل بھوجن دو دن کا ہے۔ اب تیسرے دن ملے گا۔'' پھر دالان کے ایک گوشے کی جانب اشارہ کیا۔ ''گوہ، موت کے لیے اُدھر موتری ہے۔''

مشعل بردار نے دالان میں لے جا کر مجھے موتری دکھائی۔ پرلے کونے کے فرش پر کوئی سات آٹھ انچ قطر کا ایک گول سوراخ تھا جس کے قریب اس سے کچھ بڑا پتھر پڑا تھا تاکہ رفع حاجت کے بعد موری کو ڈھک دیا جائے۔ سوراخ کافی گہرا اور اندر ایک پائپ تھا جس کے ذریعے گندگی کہاں جاتی تھی؟ یہ میں نہیں جان سکا۔ البتہ مشعل بردار چوکیدار سے صرف یہ پوچھا کہ پورب کدھر اور پچھّم کدھر ہے؟ دراصل میں اپنا قبلہ درست کرنا چاہتا تھا۔ اس نے ہاتھ سے بتایا کہ اِدھر پورب اور اُدھر پچھّم ہے۔ رات میں نے اندازے سے جس رخ نماز ادا کی، وہ ٹھیک ہی تھا۔

❁......❁......❁

چوکیدار کے جاتے اور زینے کا دروازہ بند ہوتے ہی میرے ''حجرۂ اجل'' میں گہرا اندھیرا ہو گیا۔ کچھ دیر کے بعد اس اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہوا تو رکابی اٹھائی اور کھانے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ کل کا بھوکا تھا۔ دو چپاتیاں کھا گیا۔ تیسری دوسرے دن کے لیے بچا کے رکھ لی۔ لوٹے سے پانی پیا اور خدا کا شکر ادا کیا کہ زمین کے اس گہرے اور اندھیرے پیٹ میں بھی کھانے کو کچھ مل گیا۔ اس طرح اس مہیب اور تاریک تہہ خانے میں میری

نہیں جانتا۔ اب ایک سال کی نظر بندی کے بعد ادھوری کہانی بیان کی ہے تو ضرور پوری بات جانتا ہوں مگر کسی خاص وجہ سے بتانا نہیں چاہتا۔ ہوسکتا ہے اس عمارت یا مقبرے کا اتا پتہ دریافت کرنے کے لیے جس کا غلام علی نے ذکر کیا تھا اور جس کی میرے فرشتوں کو بھی خبر نہیں، مجھے اذیت دی جائے۔

کسی بات سے مسلسل انکار کے بعد اس کے اعتراف یا اقبال کر لینے سے آدمی کا اعتبار ٹوٹ جاتا ہے اور اس کی زندگی تفتیشی افسر کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ یہ سوچ کر میں نے سردار بھاؤ کو بلانے اور غلام علی کی محیر العقل کہانی سنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اپنا پہلا فیصلہ قائم رکھا کہ اس کہانی کا ذکر میری زبان پر نہیں آئے گا۔

❁......❁......❁

وشوانا تھ بھاؤ کی مہربانی سے مجھے قید میں کچھ سہولتیں مل گئی تھیں لیکن قید بہر حال قید ہوتی ہے۔ میں اپنے گھر بار، بیوی، بچی، عزیز و اقارب سے دور اور سورج کی روشنی تک سے محروم کر دیا گیا تھا۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ میں زندہ ہوں یا مر گیا، پھر یہ دکھ کچھ کم نہ تھا کہ میرا جرم صرف بے گناہی تھا اور میں جیتے جی قبر میں اُتر گیا ہوں۔

ہندو عقیدے کے مطابق آدمی مرنے کے بعد کوئی دوسری شکل (جون) اختیار کر لیتا ہے یا بھوت بن جاتا ہے۔ اسی لیے سردار بھاؤ مجھے پہلے قیدی کے بھوت سے ڈرا رہا تھا جس کا پنجر دالان میں پڑا تھا۔ میرے نزدیک بھوت پریت کا تصور آدمی کی اپنی ضعیف الاعتقادی ہے ورنہ حقیقت میں اس کا کوئی وجود نہیں۔ جبھی پہلے قیدی کا بھوت کبھی مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ تہہ خانے کے دالان میں اس کا ڈھانچہ اسی لیے پڑا رہنے دیا گیا تھا کہ نئے قیدی کو نفسیاتی طور سے خوف زدہ کیا جا سکے اور اس سے کوئی بات اُگلوائی جائے۔ شاید وہاں ایسے ہی قیدی بند کیے جاتے تھے جن سے کچھ دریافت کرنا مطلوب ہوتا۔ خود مجھے بھی ایک نامعلوم یا خیالی قید خانے کا راز معلوم کرنے کی خاطر وہاں لایا اور ہڈیوں کے ڈھانچے سے ہراساں کیا گیا تھا۔

میں وہاں ایک انسانی پنجر دیکھ کر اس لیے ڈر گیا تھا کہ شاید اس تہہ خانے میں میرا بھی وہی انجام ہونے والا ہے جو مجھ سے پہلے قیدی کا ہوا۔ ایک حجرۂ اجل میں جو تقریباً پچاس پچپن فٹ تک بطن زمین میں اُترا ہوا ہو، وہ ڈر طبعی تھا۔ لیکن بعد ازاں میں نے خود کو خدا کی مرضی پر چھوڑ دیا کہ جو اسے منظور ہے وہی ہوگا۔ ایک سال اسی تہ خانے میں گزار چکا اور اب اس ڈھانچے کا کوئی خوف نہیں تھا۔ البتہ جب رفع حاجت کے لیے موتری میں جاتا اور واپس آتا تو دالان میں دیوار کے ساتھ اس ڈھانچے کو دیکھ کر عجیب سی وحشت ہوتی تھی اور وحشت اس لیے ہوتی کہ مرنے کے بعد ایک انسان کی رسومِ میت ادا نہیں کی گئی تھیں اور اس کے پنجر کو خوف کا ذریعہ یا تماشا بنا دیا گیا تھا۔ انسان دنیا میں ایک ہی بار پیدا ہوتا ہے اور ایک ہی بار مرتا ہے۔ مرنے کے بعد ایک ناتے کے سوا دنیا سے اس کے سارے تعلق ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ ناتا اس کا جسم ہے جو ایک دن مٹی ہو جاتا ہے۔ اس لیے مٹی کو مٹی میں دبا دینا چاہئے۔

میں نے کئی بار سوچا تھا کہ داروغہ یا سردار بھاؤ سے کہلواؤں وہ اس ڈھانچے کو تہہ خانے سے ہٹا دیں کیونکہ انسانیت کے ناتے آدمی مر جانے والے دشمن کی لاش بھی جلا دیتا یا دبا دیتا ہے۔ لیکن ہمیشہ یہی بات مجھے روکتی رہی کہ شاید وہ اس خواہش کو میری کمزوری پر محمول کریں اور سمجھیں کہ میں اس پنجر سے خوف زدہ ہو گیا ہوں۔

بھی کیا۔ دوسرے روز جب پہرے دار کھانا لے کر آیا تو اس کا ساتھی بھی ہمراہ تھا۔ وہ کھانے کی رکابی کے علاوہ میرے لیے پانی کے لوٹے کی جگہ ایک ڈول، مٹی کا بڑا دِیا، تیل کی کپی، دِیا سلائی، نیا کُرتہ پاجامہ اور کپڑے کے ایک تھیلے میں بڑا مبارک اور انمول تحفہ لے کر آئے تھے۔ انہوں نے سب چیزیں سامنے رکھ دیں۔ مشعل بردار نے کپڑے کا وہ تھیلا میرے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔

''ڈول، دِیا، تیل، کُرتہ، پاجامہ سب بھاؤ جی نے بھیجے ہیں اور تمہارے لیے یہ پوتر پوتھی بھی۔ ہم تو بڑا پاپی ہے۔ اس پوتھی کو ہاتھ بھی ناہیں لگایا۔ پر من میں آوے تو بھوان سے ہمارے واسطے بھی کچھ بول دینا۔''

تھیلے سے وہ پوتھی نکالی تو جزدان میں بند قرآن مجید تھا۔ میں نے اسے بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا۔ سردار وشوا ناتھ بھاؤ نے مجھ پر دوسری مہربانی کی تھی۔ وفورِ جذبات سے آنکھیں بھیگ گئیں۔ آنسو بہہ نکلے اور میں بھرّائی ہوئی آواز میں پہرے داروں سے کہنے لگا۔

''سردار بھاؤ کا شکریہ ادا کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔ جو کچھ دیکھ رہے ہو، وہی بتا دینا۔''

میں نے ان کے سامنے دِیے میں تیل ڈالا، رُوئی کی بتی رکھی اور اسے روشن کیا۔ وہ چلے گئے تو قرآن کو تھیلے میں لپیٹ کر طاقچے میں رکھا۔ زمین کے پیٹ میں اُترے ہوئے اس مہیب تہ خانے میں جس کے اوپر ایک اور تہ خانہ تھا۔ غالباً پہلی بار چراغ روشن ہوا تھا۔ ڈول میں پانی تھا۔ سب سے پہلے غسل کیا، نئے کپڑے پہنے، پھر کھانے کے لیے بیٹھا اور یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ روٹیاں تین کے بجائے چار تھیں۔ ساتھ آلو کی بھجیا اور تلی ہوئی مچھلی کا ایک ٹکڑا۔ میں ایک بار پھر مرہٹہ سردار کی اس مہربانی پر خدا کا شکر بجا لایا۔

کھانا اگرچہ تیسرے دن ملا تھا، مگر اب روٹیوں کی تعداد تین سے چار ہوگئی تھی اور ترکاری کے ساتھ مہینے میں ایک بار مچھلی گوشت آتا۔ ڈول واپس نہیں لیا گیا۔ میں اس میں تھوڑا تھوڑا پانی جمع کرتا رہتا اور ہفتے میں ایک بار غسل کر لیتا تھا۔ سردار بھاؤ نے اس تاریک تہہ خانے میں دِیا اور تیل اس لیے فراہم کیا تھا کہ قرآن مجید کی تلاوت کر سکوں۔ میں صبح شام دو وقت باقاعدگی سے تلاوت کرتا، پھر چراغ بجھا دیتا تھا۔ تیل کی کپی دو ماہ بعد ملتی تھی اس لیے میں تیل ضائع نہ کرتا اور ضرورت ہی کے وقت دِیا جلاتا تھا۔

سردار وشوا ناتھ بھاؤ نے میرے ساتھ جو مہربانیاں کی تھیں، ان کا صلہ یہ تھا کہ میں اسے کم از کم غلام علی قفل ساز کی اس کہانی سے آگاہ کر دیتا جو غلام قادر روہیلے کے مصاحب احمد خاں سے سنی تھی اور صاف صاف کہتا کہ اس سے زیادہ میں اور کچھ نہیں جانتا۔ غلام علی مر چکا ہے اور مرے ہوئے آدمی دوبارہ نہیں آیا کرتے۔ ایک رات فیصلہ کر لیا کہ چوکیدار کھانا لے کر آئے گا تو اسے کہہ دوں گا کہ سردار بھاؤ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ممکن ہے وہ مہاراج کو میری بے گناہی کا یقین دلا سکے اور مجھے رہا کر دیا جائے۔ قید خانے میں بیوی اور بچی کی یاد بری طرح ستایا کرتی تھی۔ قید سے چھوٹے بغیر ان سے مل نہیں سکتا تھا۔ اور وہاں سے رہائی کا ایک ہی ذریعہ تھا کہ سردار بھاؤ کے پلّے میں کچھ ڈالو۔

رات کو یہی فیصلہ کر کے سو گیا کہ رہائی کی خاطر مرہٹہ سردار کو اعتماد میں لینا ضروری ہے۔ لیکن دن کو بیدار ہوا تو معاً خیال آیا، غلام علی کی کہانی سنا کر نہ صرف میں بھاؤ کی ہمدردی کھو دوں گا بلکہ اپنے لیے کوئی نئی مصیبت پیدا کر لوں گا۔ وہ یہی سمجھے گا، پہلے میں کچھ بتانے سے انکار کرتا رہا اور یہی کہتا رہا کہ خفیہ خزانے کے بارے میں کچھ

سے وہ نیا قیدی میں تھا۔

نہیں معلوم اصل بات کیا ہوگی۔ مگر میرے قیاس اور اندازے نے جو کہانی ترتیب دی ہے وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ میرے نزدیک مرنے والا انہی ہیروں کی وجہ سے گرفتار ہوا اور اس حجرۂ اجل میں قید کر دیا گیا جہاں سے فرار ممکن نہ تھا۔ تشدد کے باوجود اس نے یہ نہیں بتایا ہوگا کہ دونوں الماس کہاں چھپا چکا ہے۔ اور انہیں اپنے ساتھ ہی لے کر مر گیا۔

اب میں نے اس پنجر کو ڈھک دینے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور دونوں ٹانگوں کے نیچے اور اردگرد سے جو مٹی ہٹا چکا تھا، دوبارہ وہیں ڈال دی اور اسے بالکل ویسے ہی جما دیا، جیسے پہلے جمی تھی۔ اپنے ہاتھوں اور پیروں کے تمام نشانات بھی مٹا دیئے تاکہ پتہ نہ چل سکے کہ میں نے پنجر کو چھیڑا ہے۔ پھر بھی اُلٹ پٹ ہونے سے مٹی کی حالت یا ہیئت کچھ بدل گئی تھی اور اسے پہلی صورت اختیار کرنے میں کچھ دن درکار تھے۔ میں نے اس سلسلے میں یہ احتیاط ملحوظ رکھی کہ تیسرے روز جب پہرے دار کھانا لے کر آتا تو تہ خانے کے قفل کھلنے کی آواز سن کر خود دروازے پر پہنچ جاتا اور نہ صرف کھانا وہیں وصول کر لیتا بلکہ شکریہ بھی ادا کرتا کہ اسے کھانا پہنچانے کی خاطر کتنی سیڑھیاں اُترنا اور چڑھنا پڑتی ہیں۔

میرا مقصد یہ تھا، نہ وہ دالان میں آئے اور نہ مرنے والے کے پنجر کو دیکھے۔ یہ حربہ کامیاب رہا۔ پہرے دار سمجھتا تھا کہ میرے لیے جو زحمت اٹھاتا ہے، مجھے اس کا احساس ہے۔ وہ میرے ساتھ پہلے سے کچھ اور اچھا سلوک کرنے لگا۔ اس طرح میرا اصل مقصد پورا ہو گیا اور میں نے پہرے دار کو بھی اپنی طرف مائل کر لیا۔

دونوں الماس جو اس پنجر سے دستیاب ہوئے، بڑے قیمتی بلکہ نایاب تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کا وزن تین تولے سے کچھ زیادہ ہی ہوگا۔ تاہم تین تولے یعنی 144 قیراط کے لگ بھگ وزن بھی بہت تھا۔ میں نے وہ الماس اپنے پھٹے پرانے کُرتے کی ایک دھجی میں باندھ کر بحفاظت رکھ لیے تھے کہ اگر وہاں سے رہا ہو گیا جس کی کوئی امید نہ تھی تو میرے کام آئیں گے اور اگر میری موت اسی زمین دوز کمرے میں ہوئی تو مرنے سے پہلے سردار وشوا ناتھ بھاؤ کو اس کی مہربانیوں کے صلے میں دے جاؤں گا۔

❀……❀……❀

مرہٹہ سردار پھر سال بھر میرے قریب نہ پھٹکا مگر میری اسیری پر دوسرا سال ختم ہونے کے بعد وہ تہ خانے میں آیا اور صرف یہی پوچھنے آیا تھا کہ مجھے کوئی پرانی بات یاد آئی یا نہیں؟ اس مرتبہ داروغہ کی بجائے صرف وہ چوکیدار ہمراہ تھا جو مجھے کھانا پہنچایا کرتا تھا۔ میں نے ایک ہی بات میں ان سوالوں کا جواب بھی دے دیا جو ابھی اس نے نہیں کیے تھے۔

''سردار بھاؤ! تم ایک اچھے انسان ہو۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو دنیا بھر کے خزانے تمہارے سپرد کر جاتا لیکن دنیا کے کسی خزانے پر میرا اختیار نہیں۔ پھر بھی تمہاری مہربانیوں کے بدلے میں اپنی نیک دعاؤں کا خزانہ تمہارے لیے چھوٹ جاؤں گا۔ مہاراج سے صرف یہ پوچھو کہ جس بات کا مجھے علم نہیں اسے کیسے بیان کروں؟''

''برہان الدین! میں تمہاری چنتا کو سمجھتا ہوں پر مہاراج نہیں سمجھتے اور تم بھید کی بات بتائے بنا یہاں سے نکل نہیں سکتے۔''

ایک دن جی میں آئی، کیوں نہ میں ہی اس پر مٹی ڈال دوں۔ پنجر کے نیچے اور اس کے آس پاس اتنی مٹی ضرور تھی جو اسے چھپانے کے کام آ سکتی تھی۔ میں نے چراغ جلایا اور اس کی روشنی میں ڈھانچے کا جائزہ لیا۔ مرورِ ایام سے کیونکہ قیدی کو مرے بڑا عرصہ ہو گیا تھا اور مٹی سخت ہو چکی تھی جسے کھودنے کے لیے میرے پاس کوئی ہتھیار نہیں تھا۔ تین مہینوں سے مجھے کھانے میں جو گوشت دیا جا رہا تھا اس کی ایک دو ہڈیاں میں نے احتیاطاً سنبھال لی تھیں۔ مچھلی کا ایک چار انچ لمبا کانٹا بھی تھا۔ انہی ''ہتھیاروں'' کی مدد سے مٹی کھودنا شروع کی۔ یہ کام مشکل ضرور تھا لیکن اس میں انسانی احترام کی لگن شامل تھی کہ مرنے والے کے جسم یا ڈھانچے کی بے حرمتی نہیں ہونی چاہئے۔ اسی جذبے اور لگن سے جمی مٹی کھودتا اور ایک طرف ہٹاتا رہا۔

مٹی کھودنے کا کام میں نے ٹانگوں کی طرف سے شروع کیا تھا۔ تقریباً نصف دن میں گھٹنوں کے اوپر تک کی مٹی ہٹانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ کوشش بھی تھی کہ پنجر ٹوٹنے نہ پائے۔ جب میں رانوں کی مٹی ہٹا رہا تھا تو خاک میں اٹی ہوئی بیر کے برابر کوئی سخت چیز برآمد ہوئی جیسے پتھر کا کوئی ٹکڑا ہو۔ وہ ٹکڑا جس پر مٹی جمی تھی، نوک دار اور تراشا ہوا تھا۔ اس پر جمی گرد صاف کی تو ٹکڑا چراغ کی روشنی میں چمک اُٹھا اور میں یہ دیکھ کر دنگ رہ گیا کہ وہ ایک تراشا ہوا انتہائی قیمتی الماس تھا جس کا وزن ڈیڑھ تولے کے لگ بھگ ہو گا۔

یہ ایک اچنبھا تھا کہ مرنے والے نے اتنا قیمتی ہیرا اپنی ران میں چھپا رکھا تھا۔ میں چند لمحے عجیب کیفیت سے دوچار رہا۔ پھر دوسری ٹانگ کی مٹی ہٹائی تو خاک دھول میں اٹا ہوا ویسا ہی ایک اور الماس برآمد ہوا جو ہو بہو پہلے ہیرے کی طرح ترشا ہوا اور اتنا ہی وزنی تھا۔

مجھ پر حیرت کا ایک سکتہ سا گزر گیا اور سوچنے لگا کہ مرنے والے کی قید و اسیری اور موت کا سبب غالباً وہی دو قیمتی الماس تھے جنہیں مہاراجہ سندھیا حاصل کرنا چاہتا ہو گا۔ لیکن وہ کسی قیمت پر اور کسی حالت میں نہیں دینے پر آمادہ نہ ہو سکا۔ یقیناً وہ کوئی اہم آدمی تھا۔ مہاراجہ کو معلوم ہو گا کہ اس کے پاس دو قیمتی الماس ہیں اور انہیں حاصل کرنے کی کوشش کی ہو گی۔ مگر نہ جانے کیا معلوم تھا کہ وہ آدمی مہاراجہ کو ہیرے دینا ہی نہیں چاہتا تھا۔ یہ یال بھی ہو گا کہ گھر پر چھاپہ مار کر ہیرے زبردستی چھین لیے جائیں گے یا اسے کسی الزام میں قید کر کے پورے گھر کو کھوند ڈالا جائے گا اور اس کی متاعِ عزیز لوٹ لی جائے گی۔ اس خیال کے پیش نظر اس نے ہیرے اپنے ہی پاس رکھنے کا فیصلہ کیا اور عملِ جراحی کے ذریعے اپنی دونوں رانوں میں محفوظ کر لیے ہوں گے۔ یہ کام کوئی ماہر جراح ہی کر سکتا تھا کہ قیمتی ہیروں کو کس طرح گوشت کے اندر چھپایا جا سکتا ہے۔ اس نے عملِ جراحی کی تکلیف گوارا کی لیکن ہیروں کا مہاراجہ کے ہاتھ لگنا گوارا نہ کیا۔ اسیری کے بعد وہ یہ بھی جانتا ہو گا کہ تہ خانے سے زندہ نہیں نکل سکتا تاہم اس بات سے مطمئن ہو گا کہ مرنے کے بعد اس کی ارتھی کسی شمشان میں جلا دی جائے گی اور جسم کے ساتھ ہیرے بھی ضائع ہو جائیں گے۔ اگر وہ مسلمان تھا تو اسلامی رسوم کے مطابق اس کی میت کسی قبرستان میں دفن کر دی جاتی اور ہیرے بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتے۔ بہرحال کوئی ایسا معاملہ ضرور تھا جس کے باعث وہ ہیروں کو ضائع کر دینے پر تیار ہو گیا لیکن یہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ وہ قیمتی الماس مہاراجہ سندھیا تک پہنچ سکیں۔ وہ قید خانے میں اذیتیں سہتا مر گیا تاہم اس کی لاش جلائی گئی نہ دفن کی گئی اور بطور سزا وہیں پڑی رہنے دی تاکہ جب جسم گل سڑ جائے اور صرف ڈھانچہ باقی رہ جائے تو اس سے کسی نئے قیدی کو خوف زدہ کیا جا سکے۔ بدقسمتی

دینے کا کوئی حق نہیں۔''

وہ حیران رہ گیا۔ ''کیسی سزا؟''

''دوست ہو یا دشمن، مر جائے تو اس کا آخری ٹھکانہ شمشان یا قبرستان ہوتا ہے۔ مگر ساؤ کا مردہ جسم یہیں پڑے پڑے مٹی ہو گیا۔ گویا مرنے کے بعد بھی اس کی سزا ختم نہیں ہوئی۔''

''وہ تو ہو گئی۔''

''پھر انسان ہونے کے ناتے اس کی مٹی اور ہڈیاں یہاں سے اٹھا لو اور اپنے دھرم کے مطابق کسی دریا میں بہا دو۔''

سردار بھاؤ نے مجھے غور سے دیکھا۔ ''کچھ اپنے بارے میں بھی کہنا چاہتے ہو؟''

''نہیں......''

یہ میرا آخری جواب تھا جس کے بعد ملاقات ختم ہو گئی اور وہ چکی دار کے ساتھ لوٹ گیا۔ دوسرے روز تہ خانے کے دالان سے اجی ساؤ کے جسم کی خاک اور پنجر اٹھا لیا گیا۔ فرش صاف کر دیا گیا۔ یہ سردار وشوا ناتھ بھاؤ کی ایک اور مہربانی تھی کہ اس نے میری بات مان لی اور مرنے والے کا انتم سنسکار کر دیا۔

وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کسی خفیہ خزانے کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔ معلوم نہیں اس نے مہاراج سے بھی کچھ کہا تھا یا نہیں۔ اگر کہا ہوتا تو میں اس زندانِ اجل سے رہا ہو جاتا لیکن میری قید طویل ہوتی چلی گئی۔ سردار وشوا ناتھ بھاؤ پہلے ایک سال کے بعد مجھ سے کچھ پوچھنے آیا کرتا تھا لیکن اجے ساؤ کا ڈھانچہ اُٹھوانے کے بعد اس نے قید خانے میں آنا چھوڑ دیا حتیٰ کہ مجھے وہاں اسیری کا بوجھ ڈھوتے کئی سال گزر گئے اور میں جسمانی طور پر بہت کمزور ہو گیا۔ خیال گزرا شاید مہاراجہ سندھیا کے ساتھ سردار بھاؤ بھی مجھے اپنے ذہن سے اُتار چکا اور بھول گیا ہے کہ میں ایک اجل بدوش تہ خانے میں بند پڑا ہوں اور اجے ساؤ کی طرح ایک دن وہیں مر جاؤں گا۔ وقت کے ساتھ ساتھ مایوسی میرے حواس پر غالب آنے لگی۔ مسلسل قید اور تنہائی میرے جسم کو چاٹ رہی تھی اور اب یہ گمان یقین میں تبدیل ہو گیا تھا کہ میری موت زمین کے پیٹ میں اُترے ہوئے اسی کمرے میں لکھی ہے کہ کئی سال کے بعد وشوا ناتھ بھاؤ ایک بار پھر موت کے اس مہیب تہ خانے میں نمودار ہوا۔

اس کے ہمراہ جیل خانے کا نیا داروغہ تھا۔ پہلا داروغہ مر گیا تھا۔ سردار بھاؤ جو پہلے سے کچھ بوڑھا دکھائی دے رہا تھا، آتے ہی بولا۔ ''برہان الدین! یہاں سے جو کچھ تمہیں لینا ہے، لے لو اور میرے ساتھ چلو۔''

میں نے جزدان میں لپٹا ہوا قرآن مجید اٹھا لیا اور سوچا نہ جانے اب وہ مجھے کہاں لے جائے گا۔ کسی دوسرے قید خانے یا مقتل میں؟ مجھے بہرحال اس کے ساتھ چلنا تھا اور چل پڑا۔ مشعل کی روشنی میں تہ خانے اور اس کے منحوس زینے عبور کر کے ہم باہر نکلے تو کئی سال کے بعد میں نے نیلا آسمان اور اس پر چمکتے ہوئے سورج کو دیکھا مگر دل اندر سے دھڑک رہا تھا کہ معلوم نہیں یہ نظارہ کتنی دیر کا ہے؟

جیل خانے کے بڑے آہنی جنگلے اور بڑے برجی پھاٹک سے نکلے تو باہر ایک رتھ موجود تھا۔

سردار بھاؤ میرے ساتھ رتھ میں سوار ہوا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ رتھ گوالیار کے راج محل کے سامنے کھڑا تھا۔ سردار بھاؤ مجھے لے کر محل میں داخل ہوا جہاں مہاراجہ سندھیا، زری کے پردوں سے آراستہ خاص کمرے میں میرا

میں نے محسوس کیا، میرے متعلق اس کا ذہن کچھ اور صاف ہو چکا ہے مگر اصل معاملہ مہاراجہ سندھیا کا ہے جو مطمئن نہیں ہوتا۔ اب میرا جواب یہ تھا۔ ''پھر میں اس معاملے کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔''

سردار بھاؤ نے بات نہیں بڑھائی اور چپ چاپ کھڑا مجھے دیکھتا رہا۔ میں نے بھی اپنے متعلق کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہ سمجھی۔ زندگی میں ایک مقام ایسا بھی آتا ہے جب ہر کہا سنا بے کار ہوتا ہے۔ میری زندگی میں وہ مقام آ گیا تھا۔ مہاراجہ سندھیا ''بھید کی بات'' پوچھنے پر مصر تھا اور میں کسی بھید سے آگاہ نہ تھا۔ لہٰذا اس معاملے سے بالکل الگ تھلگ ہو کر بات کی۔ ''سردار بھاؤ! دالان میں پڑا ڈھانچہ کس آدمی کا ہے؟''

اس نے گول مول جواب دیا۔ ''تم سے پہلے بندی کا۔''

''یہ بات تم دو برس پہلے بھی بتا چکے ہو۔ میرے سوال کا مطلب یہ ہے وہ آدمی کون تھا اور کس جرم میں پکڑا گیا؟''

بھاؤ بتانے لگا۔ ''وہ ایک مرہٹہ سردار تھا، اجے ساؤ۔ اس پر شک تھا کہ اجین کے راجہ جسونت راؤ ہلکر سے مل گیا ہے۔ اس نے بھی اپنے من کا تالا نہیں کھولا اور مہاراج کو کوئی ٹھیک بات نہیں بتائی۔ دوسرا پاپ یہ کیا کہ ایک وید جی کو مار ڈالا جو اس کے من کی بات جان گیا تھا۔''

میں وید جی کے ذکر پر چونکا۔ مرنے والے کے متعلق جس کا نام اجے ساؤ بتایا گیا تھا، میرے ذہن نے جو کہانی ترتیب دی تھی، اس میں کسی وید حکیم کا ہونا ضروری تھا جو عملِ جراحی کر سکتا ہو، یہ جاننے کے لیے میں نے پانسہ پھینکا۔ ''کیا وید نے اجے ساؤ کا من چیر کو دیکھ لیا تھا کہ اس میں کیا ہے؟''

سردار بھاؤ نے میرے خیال کی تصدیق کر دی اور ثابت ہو گیا کہ وید ایک جراح تھا۔ میرے جسم میں سنسنی کی لہر دوڑنے لگی۔ ''کیا اس نے اجے ساؤ کے من کا بھید مہاراج کو یا کسی اور کو بتا دیا تھا؟''

''وہ بھید بتانے ہی جا رہا تھا کہ ساؤ نے اسے مار ڈالا۔ تب مہاراج نے دوشی کو پکڑنے کا حکم دیا اور وہ اسی بندے خانے میں لایا گیا۔''

مرہٹہ سردار اجے ساؤ کے بارے میں یہ بات غلط تھی یا صحیح کہ وہ مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر سے مل گیا تھا لیکن اس میں کوئی شبہ نہ رہ گیا کہ صرف جراح وید ہی جانتا تھا کہ اس نے ہیرے کہاں سے چھپا لیے ہیں۔ جراحی کا عمل اسی نے کیا تھا۔ شاید انعام کے لالچ میں نیت خراب ہو گئی اور وہ مہاراجہ سندھیا کو ہیروں کی خبر دینا چاہتا ہو کہ ساؤ کو پتہ چل گیا یا شک ہو گیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ گویا میں نے مرنے والے کے متعلق جو کچھ سوچا وہ غلط نہ تھا۔ سردار بھاؤ نے اچانک سوال کر دیا۔

''تم نے اس کے بارے میں کیوں پوچھا تھا؟''

''میرا خیال تھا شاید اسے بھی کسی خزانے کی پوچھ گچھ کے لیے پکڑا گیا ہو۔''

یہ چبھتی ہوئی بات سن کر پل بھر کے لیے وشواناتھ بھاؤ کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔ کیونکہ وہ الماس بھی جنہیں اس سے ہتھیانے کی کوشش کی گئی، کس خزانے ہی کا حصہ تھے۔ مگر میں نے بات کا رخ بدل دیا اور اپنے اصل مقصد پر آ گیا۔

''سردار بھاؤ! اس نے جو کچھ بھی کیا تھا، اس کی سزا بھگت لی اور مر گیا۔ مگر مرنے کے بعد تمہیں اسے سزا

(12)

بادشاہت اور ولی عہدی کے جھگڑے

میں 1805ء کے سن عیسوی میں سفر کر رہا تھا اور میری پہلی منزل آگرہ تھی۔ معلوم ہوا کہ آگرے اور مغل سلطنت پر مہاراجہ سندھیا کا اختیار ختم ہو چکا اور وہ علاقہ فرنگی کی عمل داری میں آ گیا ہے۔

جب میں دہلی سے گرفتار کر کے گوالیار لایا گیا، اس وقت مغل شہنشاہ عالی گہر شاہ عالم ثانی مہاراجہ سندھیا کی تحویل میں تھے مگر میری اسیری کے طویل دور میں بہت سے واقعات ہو گزرے تھے جن کا مجھے علم نہ تھا۔ کمپنی کی سرکار انگلشیہ اور جسونت راؤ ہلکر سے معرکوں کی وجہ سے دہلی پر مہاراجہ سندھیا کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ پھر مہاراجہ ہلکر نے امیر خاں روہیلے کے ساتھ مل کر دہلی پر قبضہ کیا اور مغل سلطنت کو اپنے زیر سایہ کر لیا۔ مگر 1803ء میں انگریز فوجوں نے ہلکر شاہی مرہٹوں کو بھی دہلی سے نکال دیا اور اندھے مغل شہنشاہ کو اپنی نگرانی میں لے لیا۔ اب مغل سلطنت میں فرنگی کا عمل دخل تھا اور مہاراجہ سندھیا کی طرح کمپنی سرکار نے بھی مغلیہ علاقے میں دیوانی اختیارات حاصل کر لیے تھے۔

مجھے یہ سب باتیں گوالیار سے نکلتے ہی معلوم ہو گئیں کیونکہ خبریں پرندوں سے زیادہ تیز رفتار ہوتی اور آناً فاناً ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہیں۔ اب پتہ چلا کہ مہاراجہ سندھیا نے مجھے اس وقت رہا کیا تھا، جب اس کا دہلی پر کوئی اختیار نہ رہا اور مغل شہنشاہ کے ساتھ ان کا سب کچھ انگریز کے قبضے میں چلا گیا تھا۔

مجھے مغلوں کے ادبار پر شدید افسوس تھا جو ماضی میں ان کے اردگرد کسی بھیڑیے کی طرح چکر لگاتا رہا۔ احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد مغلیہ سلطنت کی حالت کچھ اور ابتر ہو گئی تھی جس پر کبھی جاٹ، کبھی روہیلے، کبھی مرہٹے جھپٹتے رہے۔ سندھیا شاہی مرہٹوں کے بعد ہلکر شاہی مرہٹے آن براجے۔ انہیں انگریز نے نکالا اور مغلیہ سلطنت پر اپنا اختیار مضبوط کرنے لگا۔

اٹھارہویں صدی ختم ہونے تک بنگال اور بہار میں فرنگی کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ یہ دونوں صوبے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملکیت سمجھے جاتے تھے جو مشرقی گھاٹ کے ساتھ ساتھ مدراس کی طرف بھی بڑھ رہی تھی۔ ہندوستان لوٹ کے مال کی طرح تقسیم ہو رہا تھا۔ وسطی ہند میں مرہٹوں کی ریاستیں تھیں۔ ستارہ میں پیشوا بالاجی، گوالیار میں مہاراجہ سندھیا، اجین میں جسونت راؤ ہلکر، دکن میں نظام، اودھ میں نواب وزیر، روہیل کھنڈ میں روہیلے امیر،

منتظر تھا۔ راستے میں سردار وشواناتھ بھاؤ نے میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیا تھا۔ اب بھی وہ کچھ نہیں بولا۔ مرہٹہ مہاراج کے سامنے اچانک حاضری پر میں گھبرا سا گیا لیکن شاہی آداب کے مطابق کورنش بجالایا پھر میں نے مہاراجہ سندھیا کی آواز سنی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''برہان الدین! ہمیں اس بات کی گواہی مل گئی ہے کہ تم نردوش تھے اور تم نے دہلی کے لال قلعے میں کسی مغل شہزادے یا سردار کو ہمارے خلاف نہیں اُکسایا تھا اس لیے تمہیں چھوڑ دیا گیا ہے۔ پر تم نے کئی برس بندی گھر میں کشٹ اُٹھایا ہے اور ہم اس کشٹ کا ڈنڈ (تاوان) بھریں گے۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنا بازو اٹھایا اور اسی وقت ایک تحویل دار نے آگے بڑھ کر ایک ہزار اشرفیوں کے دو توڑے میرے سامنے رکھ دیئے۔ میں نے جھک کر سلام کیا اور مہاراج کی اس عنایت کا شکریہ ادا کیا تو وہ بولا۔ ''ہماری طرف سے اپنا دل صاف کرلو اور گھر جاؤ۔ سردار وشواناتھ بھاؤ تمہاری سواری کا بندوبست کردے گا۔''

اس کے ساتھ ہی ملاقات ختم ہوگئی اور مہاراجہ سندھیا نے مجھے انعام دے کر رخصت کر دیا۔ میں حیران تھا جس ''خفیہ خزانے'' کا پتہ دریافت کرنے کے لیے مجھے جیتے جی زمین کے گہرے پیٹ میں اتار دیا گیا اور کئی سال قید رکھا گیا۔ اس کے متعلق کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ شاید مہاراجہ نے معلوم کرلیا ہوگا کہ خفیہ خزانے کی کہانی غلط ہے۔ راج محل سے باہر آکر سردار بھاؤ نے پوچھا تو اس نے جواب دیا۔

''اس بات کو بھول جاؤ اور مجھے بھی شما کردو۔''

میں نے سردار بھاؤ کو گلے سے لگا لیا اور اشرفیوں کے دونوں توڑے اس کے قدموں میں رکھ دیئے۔ ''تم نے برے دنوں میں بھی میرے ساتھ اچھا برتاؤ کیا اور قید سے رہائی دلائی۔ یہ انعام میری طرف سے تم رکھ لو۔''

''برہان الدین! اگر مہاراج کو پتہ چل گیا کہ تم نے ان کا ڈنڈ (تاوان) اپنے پاس نہیں رکھا تو بگڑ جائیں گے۔''

سردار بھاؤ نے گوالیار میں ایک رات مجھے اپنا مہمان رکھا۔ دوسرے دن نئے کپڑوں کے ساتھ سفر کے لیے ایک گھوڑا دیا۔ میں نے اس سے دہلی کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا تھا۔ ''تم دہلی جا رہے ہو۔ وہاں جا کر سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ لو گے۔''

ان الفاظ کے ساتھ بھاؤ نے مجھے رخصت کیا اور میں کئی برس کے بعد گوالیار سے دہلی کی طرف روانہ ہوا۔

❁......❁......❁

تھی۔ میں سمجھ رہا تھا، وہ میری گرفتاری اور جدائی کا صدمہ برداشت کر کے اپنی بچی کے سہارے جی رہی ہو گی۔ لیکن جو خبر اسے سنائی گئی، وہ برداشت نہ کر سکی۔ اب مجھے بچی کی فکر تھی۔ حواس ذرا سنبھلے تو ڈوبتے لہجے میں کیونکہ میرا دل ابھی غوطے کھا رہا تھا، ان سے پوچھا۔ ''اور بچی؟''

''اس کی پرورش تمہاری ساس نے اپنے ذمے لے لی تھی جو خود بھی بیٹی کے صدمے سے دوچار تھی۔ مگر بے ماں کی بچی زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکی اور تیسرے مہینے اللہ کو پیاری ہو گئی۔''

اس اطلاع نے ایک اور بجلی گرا دی اور میرا رہا سہا وجود بھی غم کی آگ میں جھلس گیا۔ والدین پہلے ہی انتقال کر چکے تھے۔ میری گرفتاری اور نظر بندی کے تھوڑے ہی دنوں بعد بیوی اور بچی یکے بعد دیگرے چل بسیں۔ معلوم ہوا کہ ساس اور سسر بھی زندہ نہیں رہے۔ گویا پورا گھر تباہ و برباد ہو گیا اور میں کئی سال کی اسیری کے بعد بھی اس زندانِ اجل سے نکل آیا جہاں مجھ سے پہلے قیدی کا ڈھانچہ ہی پڑا رہ گیا تھا۔

یہ سب کچھ اس لیے پیش آیا کہ گرفتاری کے بعد میری ہلاکت کی خبر جان بوجھ کر پھیلائی گئی تھی تاکہ دہلی میں کسی کو میری خطرناک قید کا گمان بھی نہ ہو سکے جو شاہ عالم ثانی کے کسی خفیہ خزانے کا راز دریافت کرنے کے لیے مجھ پر مسلط کر دی گئی تھی۔ اس مصیبت کا باعث دہلی میں مرہٹہ کار خاص کا عملہ تھا جس نے چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں میرے گھر پر چھاپہ مارا اور مجھے گرفتار کر کے گوالیار بھیج دیا۔

میں نے زمین کے پیٹ میں اُترے ہوئے مہیب تہ خانے میں ہول ناک قید اس لیے قبول کر لی تھی کہ اوّل تو کسی خفیہ خزانے کے متعلق کچھ جانتا نہ تھا اور غلام علی قفل ساز کی کہانی کے حوالے سے جو عجیب و غریب باتیں میرے علم میں آ چکی تھیں، انہیں اس لیے بیان نہ کر سکا کہ کہیں مغل شہنشاہ پر کوئی نئی مصیبت نہ ٹوٹ پڑے جو پہلے ہی اپنی آنکھوں سے محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن مغلوں سے اس ہمدردی کا جو بھیانک خمیازہ مجھے بھگتنا پڑا، اس کا حاصل یہ تھا کہ میرا پورا گھر اُجڑ گیا۔ دنیا کے وہ عزیز ترین رشتے ٹوٹ گئے جو میری زندگی کا سہارا تھے اور میں تنہا رہ گیا۔

میرا خیال تھا، آگرے میں، میں ایک روز قیام کر کے دہلی کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔ سفر میں مجھے کہیں نہ کہیں قیام تو کرنا ہی تھا۔ جسمانی کمزوری کے باعث مسلسل سفر نہیں کر سکتا تھا اسی لیے آگرے میں چچا نصیرالدین کے گھر آ گیا۔ لیکن اب دہلی میں میرا کون رہ گیا تھا جس سے ملنے جاتا۔ بیوی، بیٹی، ساس، سسر کے انتقال کی خبر سن کر کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ وہ سید برہان الدین، جسے میں نے گوالیار کے بدترین قید خانے کے اندر بھی سنبھالے رکھا تھا، اس زندانِ اجل سے نکلنے کے بعد اپنے گھر کی لرزہ خیز بربادی کی روداد سن کر تنکوں کی طرح بکھر گیا۔

میں جسمانی طور پر کمزور اور ناتواں تو پہلے ہی تھا مگر کمزور جسم پر صدمات کی جو نئی بجلیاں گریں، انہوں نے مجھے جلا کر بھسم کر ڈالا اور میں بخار میں تپنے لگا۔ آدمی زندگی میں کئی مصیبتیں جھیلتا ہے۔ ایک مصیبت سے نکلتا ہے تو دوسری میں پھنس جاتا ہے لیکن میں تو جیسے عذاب پر عذاب بھگت رہا تھا۔ اور قدرت نے مجھے کچھ اس طرح نظر انداز کر دیا، گویا میں تھا ہی نہیں۔ یہ ایک ایسا دکھ تھا جس نے میری روح میں شگاف ڈال دیا اور میری حالت خراب سے خراب تر ہو گئی۔

چچا نصیرالدین بتاتے تھے، میں بیوی اور بچی کے انتقال کی خبر سن کر بے ہوش ہو گیا اور پورے دو پہر بے

پنجاب میں سکھ اور راجستھان کی مختلف ریاستوں میں مختلف راجوں کی حکمرانی تھی۔ فرنگی انہیں ایک دوسرے سے لڑاتا اور خود بھی مداخلت کرتا تھا۔ ماضی میں پورے ہندوستان پر مغلوں کی حکومت رہی تھی، جس کا پایۂ تخت دہلی تھا۔ اب انگریز دہلی کی مغلیہ سلطنت پر قدم جمار ہا تھا تاکہ پورے ملک پر قبضہ ہو سکے۔

یہ تھا اس دور کے ہندوستان کا سیاسی نقشہ۔ جب میں گوالیار سے رہا ہو کر آگرے پہنچا، میری عمر 43 برس کی ہو چکی تھی اور طویل اسیری کی وجہ سے صحت بہت گر گئی تھی۔ آگرے میں ایک عزیز سید نصیرالدین رہتے تھے جو رشتے میں میرے والد مرحوم کے چچیرے بھائی تھے۔ پندرہ سولہ برس کی عمر ہو گی جب میں والد کے ہمراہ ایک بار ان کے گھر آیا تھا۔ وہ گھر اور اس کا راستہ کسی خواب کی طرح میرے ذہن میں اُبھرا۔ چھبیس ستائیس برسوں میں اگرچہ بہت کچھ تبدیل ہو گیا تھا لیکن آخر میں اس حویلی کے دروازے پر پہنچ گیا جس میں ایک بار پہلے بھی داخل ہو چکا تھا۔ دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے کسی سے پوچھ لیا تھا کہ وہ سید نصیرالدین ہی کا مکان ہے۔ دروازہ بھی انہوں نے خود کھولا۔ مجھے دیکھ کر حیران ہوئے اور پہچان گئے۔ کیونکہ میری شکل اپنے والد سے بہت ملتی جلتی تھی۔ لیکن انہیں پہچاننے میں مجھے کچھ مشکل پیش آئی۔ پہلی بار جب ملا، وہ تینتیس چونتیس سال کے جوان تھے۔ دوسری بار والد صاحب کی وفات پر ان سے دہلی میں ملاقات ہوئی تھی۔ اور اب وہ ساٹھ اکسٹھ سال کے بوڑھے ہو چکے تھے۔ بے اختیار مجھے گلے سے لگا لیا۔ نوکر کو بلا کر گھوڑا اس کے سپرد کیا اور میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گئے۔

چچی بھی بوڑھی ہو چکی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس پر حیرت کا ایک سکتہ طاری ہو گیا اور بڑے غم زدہ لہجے میں پوچھنے لگی۔ ''تمہارے متعلق تو بہت بری خبر سنی تھی۔ کہاں چلے گئے تھے؟''

''میں گوالیار میں مہاراجہ سندھیا کی قید میں تھا۔ سیدھا وہاں سے آرہا ہوں۔''

چچا نصیرالدین نے حیرت پاش نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''ہم نے سنا تھا، تمہیں ڈاکو پکڑ کے لے گئے تھے۔ انہوں نے قتل کر کے تمہاری لاش کسی کھڈ میں پھینک دی تھی، اور بھی کئی بری خبریں ملیں اور ہم کلیجہ تھام کر رہ گئے۔''

''اور کون سی بری خبریں؟''

''بھئی تم خود سمجھ سکتے ہو۔ جب تمہارے قتل کی خبر گھر پہنچی تب بے چاری بہو پر کیا قیامت بیت گئی ہو گی۔ سنا تھا وہ پچھاڑ کھا کے گری اور مارے صدمے کے بے ہوش ہو گئی تھی۔''

میرے اندر ایک کوندا سا لپک گیا۔ ''پھر کیا ہوا؟''

''ہوتا کیا میاں! پڑوسنوں نے لاکھ جتن کیے مگر بہو کو ہوش نہ آیا۔ چوک سعد اللہ خاں میں جو بڑے حکیم صاحب رہتے ہیں، انہیں بلایا گیا مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی بہو کا انتقال ہو گیا۔''

میرے دل پر بجلی گری۔ ایک مہیب کڑاکا ہوا اور اسی مہیب کڑاکے میں جس نے میرا انجر پنجر ہلا دیا تھا، میں کسی پاگل اور دیوانے کی طرح تڑپ کر کھڑا ہو گیا، جیسے ہوش و حواس ساتھ چھوڑ گئے ہوں اور میرے اندر کا آدمی ٹوٹ پھوٹ کر بکھر گیا ہو۔ چچا نصیرالدین میری یہ حالت دیکھ کر گھبرا گئے اور مجھے سنبھالنے کے لیے فوراً اُٹھے کہ کہیں گر نہ جاؤں۔ انہوں نے پکڑ کے پھر چوبی مسند پر بٹھا دیا جس پر چاندنی بچھی تھی اور پیچھے گاؤ تکیہ رکھ دیا کہ میں سہارے سے بیٹھ جاؤں۔

ذہن کے ویرانے میں ابھی تک آندھیوں کا شور اور بگولوں کا رقص جاری تھا۔ میری بیوی بڑی باہمت خاتون

لیکن وہ بیمار تھے اور ان سے ملنے جُلنے پر پابندی تھی۔ قلعے میں کچھ مغل شہزادوں اور سرداروں سے جان پہچان تھی جنہیں مہاراجہ سندھیا کے خلاف اُکسانے کا الزام بھی مجھ پر عائد کیا گیا تھا۔ سوچا، چلو ایک مرتبہ انہی سے مل آؤں۔ پھر شاید کبھی قلعے میں جانے کا موقع نہ ملے۔ کیونکہ میرا ارادہ تجارت کرنے کا تھا۔

قلعے میں جن مغل شہزادوں سے ملاقات ہوئی، ان میں ولی عہد مرزا معین الدین، شہزادہ علی گوہر عرف نیلی، مرزا سراج ادین جو ظفر تخلص کرتے تھے اور شعر و شاعری سے دلچسپی رکھتے تھے اور ان کے بھائی مرزا سلیم جہانگیر خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ جب انہیں پتہ چلا، میں گوالیار میں قید تھا اور وجہ بھی بتائی تو حیرت زدہ رہ گئے۔ ''خفیہ خزانے'' والی کہانی کا ذکر جان بوجھ کر نہیں کیا جس کا کوئی سر پیر ہی نہیں تھا۔ ولی عہد مرزا معین الدین نے پیش کش کی کہ ایک بار پھر مغل دربار سے وابستہ ہو جاؤں۔ مجھے محررِ اعلیٰ کے عہدے پر فائز کر دیا جائے گا۔ مگر میں نے خاموشی ہی مناسب سمجھی۔

1806ء میں عالی گہر شاہ عالم ثانی کا انتقال ہو گیا۔ انہیں مہرولی میں قطب صاحب کے قریب ایک گڑھے میں سپردِ خاک کر دیا گیا جس پر بعد ازاں مقبرہ تعمیر ہوا۔ میری ان سے آخری ملاقات نہ ہو سکی۔ البتہ میں ان کے جنازے میں ضرور شریک ہوا۔ انہوں نے ایک خود مختار مغل سلطنت ورثے میں پائی تھی مگر ایک وظیفہ خوار مغل ریاست ورثے میں چھوڑ گئے جسے فرنگی اپنے دانتوں میں دبائے بیٹھا تھا۔ ولی عہد مرزا معین الدین کو اکبر شاہ ثانی کے لقب سے اس تخت پر بٹھایا گیا جس پر کمپنی سرکار کا منحوس نشان اپنا سایہ ڈال رہا تھا۔ تاہم جشنِ تخت نشینی دھوم دھام سے منایا گیا اور نئے بادشاہ کے اعزاز میں توپیں داغی گئیں۔ مغل دربار کے پرانے اہل کار کی حیثیت سے میں بھی وہاں موجود تھا۔ انگریز ریذیڈنٹ نے بادشاہ کی خدمت میں نذر پیش کی اور اسے نئے القابات سے نوازا گیا۔

❁......❁......❁

میں بتا چکا ہوں کہ درباری ملازمت کے بجائے مجھے تجارت سے دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس کی وجہ بھی سن لیں۔ دہلی میں سیٹھ رام گوپال ایک بہت بڑا جوہری تھا جس کا کاروبار دہلی کے شاہی خاندان کے علاوہ راجوں، مہاراجوں، نوابوں، رئیسوں سے چلتا اور صرف ہیرے جواہرات کا دھندا کرتا تھا، میری اس سے جان پہچان تھی۔ ایک دن میں نے اسے دونوں الماس دکھائے جو اجے ساؤ کے ڈھانچے سے برآمد ہوئے تھے۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ وہ قیمتی الماس مجھے کہاں سے ملے؟ میں نے کہا۔

''سیٹھ جی! اس پھیر میں نہ پڑو اور دام لگاؤ۔''

مجھے سیٹھ رام گوپال کی صاف گوئی پر حیرت ہوئی۔ کہنے لگا۔ ''یہ ہیرے انمول ہیں اور سچی بات پوچھتے ہو تو پچاس ہزار اشرفی میں بھی سستے ہیں۔''

میں سمجھتا تھا، سات آٹھ ہزار سے زیادہ کے نہیں ہوں گے۔ لیکن ''پچاس ہزار اشرفی'' کے الفاظ سن کر ہکا بکا رہ گیا۔ سیٹھ رام گوپال بتانے لگا۔

''یہ بادشاہوں، راجوں، مہاراجوں کے خریدنے کی چیز ہے۔ تم ان سے بات کرو گے تو چالیس ہزار بھی دینے پر راضی نہ ہوں گے۔ مگر میں ساٹھ ہزار سے کم میں نہیں بیچوں گا اور دس ہزار اشرفی کماؤں گا۔ میں اس بیوپار میں دھرم ایمان کو بیچ میں نہیں لایا کرتا۔ پھر بھی تم سے کوئی چھپاؤ نہیں کیا اور بھگوان کی سوگند کھا کر کہتا ہوں کہ ایسے

ہوش رہا تھا۔ ہوش آنے کے بعد بھی دیوانوں کی سی باتیں کرتا رہا کہ اب میرے لیے دنیا میں کچھ باقی نہیں رہ گیا۔ میرا بخار ہولے ہولے بڑھتا گیا۔ تیسرے روز بخار کی شدت میں ہذیانی کیفیت طاری ہوگئی اور میں کبھی خزانے کا، کبھی انسانی ڈھانچے کا، کبھی قیمتی ہیروں کا نام لیتا تھا۔ چچا اور گھر والوں نے ایک مہینے تک میری دیکھ بھال کی۔ خاص طور سے ان کی چھوٹی لڑکی مہ جمال جو چار ماہ قبل سسرال سے آئی اور تب سے میکے ہی میں تھی، میری بہت نگہداشت کرتی رہی۔ نگہداشت کا لفظ شاید مناسب نہیں۔ دراصل وہ میری خدمت کرتی تھی۔ ایک مہینے کے بعد میں چارپائی سے اُٹھنے اور چلنے پھرنے کے قابل ہوا تو مہ جمال کا شکریہ ادا کیا۔

ایک دن اچانک مجھے معلوم ہوا کہ وہ اکیس برس کی عمر میں بیوہ ہو چکی ہے۔ دو سال قبل شادی فرخ آباد کے ایک سید گھرانے میں ہوئی تھی۔ شادی کو ابھی ڈیڑھ سال ہوا تھا کہ خاوند ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ کوئی اولاد نہیں تھی۔ سسرال کو چھوڑ کر آگئی۔ یہ بات ہم دونوں کی دلچسپی کا باعث بنی۔ بیماری کے ایام میں وہ میرے بہت قریب آگئی۔ چچا نصیر الدین نے محسوس کر لیا تھا کہ میں بھی اسے پسند کرنے لگا ہوں۔ ڈیڑھ دو مہینے میں جب میں پوری طرح صحت یاب ہوگیا، اس سے شادی کر لی۔ وہ میری دوسری بیوی تھی۔ میں اس کا دوسرا خاوند تھا۔

مہ جمال میری زندگی کے اندھیروں میں واقعی حُسن کا چاند بن کر آئی اور میں ماضی کے دکھ بھول گیا۔ میرے پاس مہاراج سندھیا کے ادا کردہ تاوان کی دو ہزار اشرفیاں تھیں جو اس موقع پر بہت کام آئیں۔ میں اسی کے ظلم کا شکار ہوا تھا اور اسی کے بھرے ہوئے تاوان سے زندگی کی نئی راحتوں سے ہمکنار ہوا۔

❁......❁......❁

ابھی 1805ء کا سن ختم ہونے میں ایک ماہ باقی تھا کہ مجھے دہلی جانے کا خیال آیا۔ وہاں گھر میں میرا پرانا نوکر کلن مقیم تھا۔ اسے چٹھی بھیج دی۔ دہلی میں بھی بعض دوستوں کو پتہ چل گیا تھا کہ جن لوگوں نے مجھے گرفتار کیا تھا، انہوں نے میری زندگی نہیں چھینی اور میں کئی سال کی اسیری سے رہا ہو کر آگرہ پہنچ گیا ہوں، جہاں میں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ میری چٹھی ملنے پر نوکر نے مکان کو آراستہ کر دیا تھا۔ 15 دسمبر 1805ء کو جب میں مہ جمال کے ساتھ دہلی پہنچا تو دوستوں اور محلے والوں نے میرا پُر جوش استقبال کیا اور مجھے نئی زندگی پر مبارکباد دی۔

میں کئی برسوں کے بعد اس گھر میں داخل ہوا جہاں سے مجھے بڑے پراسرار طریقے سے گرفتار کر کے گوالیار پہنچا دیا گیا تھا۔ جیسا کہ میں بیان کر کے آیا ہوں، اس طویل عرصے میں بہت کچھ بدل گیا اور مغلیہ سلطنت پر ایک نیا دورِ زوال آ چکا تھا۔ سندھیا شاہی اور ہلکر شاہی مرہٹوں کے بعد فرنگی اب مغلوں کے ''سرپرست'' بن بیٹھے تھے اور دہلی میں کمپنی سرکار کے شاہی وکیل (ریذیڈنٹ) کا دفتر قائم ہو چکا تھا جو انصرامِ حکومت میں عالی جاہ کو مشورے دیتا تھا۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ عالم ثانی نے ایک مرتبہ فرنگی کے دامِ اقتدار سے نکلنے اور مغلیہ سلطنت کو آزاد کرانے کی کوشش کی تھی جس میں وہ کامیاب نہ ہو سکے۔ فرنگی نے مغل علاقے پر اپنی گرفت نہ صرف اور مضبوط کر لی بلکہ شاہ عالم کو ''شہنشاہ'' کے لقب سے بھی محروم کر دیا جو علامت کے طور پر چلا آتا تھا۔ اب ان کی حیثیت ایک معمولی بادشاہ سے زیادہ نہ تھی جن کی سلطنت کا انتظام انگریز کے ہاتھ میں تھا اور وہ خود صرف نام کے بادشاہ رہ گئے تھے۔

مجھے اب لال قلعے اور مغل دربار سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ اندھے بادشاہ سے ایک بار ضرور ملنا چاہتا تھا۔

اکبر شاہ ثانی پوری طرح انگریز کی گرفت میں تھے جس نے ان کی حیثیت کچھ اور گھٹا دی تھی۔ ان کے فرزند سراج الدین[1] (بہادر شاہ ظفر) اپنی شہزادگی کے زمانے ہی میں بوڑھے ہو گئے اور شعر و شاعری سے دل بہلاتے تھے۔ بادشاہت برائے نام تھی۔ مغل شہزادے جو کمپنی سرکار کے وظیفے پر پل رہے تھے، رقص و موسیقی کی محفلیں جماتے، مرغ بٹیر لڑاتے، پتنگیں اُڑاتے یا پھر شاعری کرتے تھے کہ اس دور میں شرفاء کے یہی مشاغل باقی رہ گئے تھے۔

1835ء میں شیخ خلیل یمنی کی رحلت کے بعد میرا کاروبار نرم پڑ گیا۔ لیکن میں اس عرصے میں اتنی دولت جمع کر چکا تھا کہ میری سات پیڑھیوں کے کام آ سکتی تھی۔ اس لیے مستقبل میں کسی پریشانی کا اندیشہ نہیں تھا۔ میں تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کا باپ بن چکا تھا جن کے لیے ہر راحت موجود تھی۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے، دونوں بڑے لڑکوں نے میرا کاروبار سنبھال لیا تھا اور اب وہ میرے آرام کا خیال رکھتے تھے۔

اکبر شاہ ثانی 1837ء میں فوت ہو گئے۔ وفات کے وقت ان کی عمر 82 سال اور ان کے جانشین سراج الدین کی عمر 63 برس تھی۔ جب کہ میں 75 کے پیٹے میں داخل ہو چکا تھا۔ اکبر شاہ ثانی کو ان کے مرحوم والد شاہ عالم ثانی کے مقبرے کے قریب مہرولی میں دفن کیا گیا۔ میں نے ان کے جنازے میں بھی شرکت کی اور ان کی میت کو اپنے ہاتھ سے لحد میں اُتارا۔ شاہ عالم کی طرح ان کی قبر ایک گہرے گڑھے یا تہ خانے میں تھی جس پر بعد ازاں مقبرہ بنا دیا گیا۔

میں نے اپنی زندگی میں تین مغل حکمرانوں عزیز الدین عالمگیر ثانی، عالی گہر شاہ عالم ثانی اور معین اکبر شاہ ثانی کو قبروں میں اُترتے دیکھا اور تین ہی مغل حکمرانوں کی تاج پوشی اور تخت نشینی کے جلوس دیکھے تھے۔ شاہ عالم ثانی پھر اکبر شاہ ثانی اور ان کے بوڑھے جانشین مرزا سراج الدین ظفر ''بہادر شاہ ثانی'' کے لقب سے 1837ء میں جلوس آراء ہوئے۔ اگرچہ انہوں نے تختِ طاؤس پر جلوس کیا تھا۔ لیکن اس تخت کے پایوں کو کمپنی سرکار کی دیمک چاٹ رہی تھی۔ بہادر شاہ ظفر خود شاعر تھے۔ ان کے دور میں شعر و شاعری کا بڑا چرچا رہا اور مشاعروں کو فروغ ملا۔ اس لیے تخت نشینی پر بھی شعراء نے ان کی مدح میں بڑے قصیدے لکھے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے وہ 30 ستمبر کی تاریخ اور ہفتے کا دن تھا جب وہ ایوانِ خاص میں تشریف لائے۔ جامع مسجد دہلی کے امام و خطیب مولانا میر احمد علی نے ان کے سر پر تاجِ شاہی رکھا تھا جس پر توپیں سر ہوئیں۔ کمپنی سرکار کے ریذیڈنٹ نے سب سے پہلے نذر پیش کی اور بادشاہ کو مبارک دی۔ پھر ولی عہد مرزا دارا بخت، مرزا فخر الدین اور علی الترتیب دوسرے شہزادوں نے نذریں دیں اور خلعت پائے۔ اس کے بعد شاہی امراء، رؤساء اور دیگر افراد کی باری آئی۔ میں نے بھی مغلیہ سلطنت کے قدیم نمک خوار کی حیثیت سے بادشاہ کو نذر پیش کی۔ سہ پارچہ خلعت کے ساتھ مجھے ''یمین الدولہ'' کا خطاب ملا۔ بہادر شاہ ظفر نے اس بات کو یاد رکھا تھا کہ میں شاہ عالم

---

[1] سراج الدین ظفر اکبر شاہ ثانی کے ولی عہد نہیں تھے۔ ولی عہدی کا اعزاز ان کے بھائی مرزا جہانگیر کے حصے میں آیا تھا مگر مرزا جہانگیر نے جوشِ جوانی میں انگریز ریذیڈنٹ پر طمنچہ داغ دیا تھا، جس کی پاداش میں انگریز نے انہیں الہ آباد کے قلعے میں قید کر دیا۔ اسی باعث ولی عہدی کا اعزاز بھی جاتا رہا اور اکبر شاہ ثانی کی رحلت پر مرزا سراج الدین، بہادر شاہ ظفر کے خطاب سے تخت نشین ہوئے۔

بڑھیا ہیرے میں نے آج تک نہیں دیکھے۔''

اس نے یہ بھی بتا دیا۔''جے پور کے مہاراج نایاب ہیروں کی پہچان رکھتے اور قدر کرتے ہیں۔ سب سے پہلے انہی کے پاس لے جاؤں گا۔ اب تم بتاؤ، کیا مرضی ہے؟''

میں اس کی باتوں سے بڑا متاثر ہوا۔ یہ خیال بھی آیا کہ خود کہاں بھٹکتا پھروں گا۔ ہو سکتا ہے، یہ پوچھ گچھ بھی ہو کہ مجھ جیسے آدمی کو اتنے گراں قیمت ہیرے ملے کہاں سے؟ اصل کہانی میں کسی کو بتا سکتا تھا نہ بتانا چاہتا تھا۔ اس لیے سیٹھ رام گوپال کی پیشکش قبول کر لی۔

ان دنوں یمن کا ایک تاجر شیخ خلیل یمنی ہر دوسرے سال دہلی آتا اور سرائے جہاں آرا بیگم[1] میں ٹھہرا کرتا تھا، میں نے پہلے اس سے دوستی پھر کاروبار میں شراکت کر لی۔ وہ یمن سے قیمتی موتی اور ہیرے لے کر آتا اور ہندوستان سے اگر، لوبان، قنوج کا عطر، بنارس کا کمخواب و اطلس اور ڈھاکے کی ململ لے جاتا۔ ان اشیاء کی عرب ملکوں میں بڑی مانگ تھی۔ شیخ خلیل کے ساتھ تجارت میں مجھے بڑا فائدہ ہوا۔ اگرچہ وہ ہیرے جو میں گوالیار سے لایا تھا، میرے لیے ایک خزانہ ثابت ہوئے تھے لیکن یمنی شیخ کی رفاقت اور شراکت سے میں بڑا مال دار تاجر بن گیا اور نوابوں، رئیسوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔

پہلی بیوی سے میری ایک بچی تھی جو ماں کے ساتھ اللہ کو پیاری ہو گئی۔ مہ جمال سے دو بیٹے ہوئے۔ خدا نے مجھے دنیا کی ہر نعمت دی اور ماضی کی مشکلوں اور مصیبتوں کے صلے میں راحتوں اور خوشیوں سے نوازا۔ میرا شمار دہلی کے رؤسا میں ہوتا تھا۔ میں خاص تقریبات کے موقع پر قلعے میں جاتا۔ بادشاہ کو نذر پیش کرتا اور مغل شہزادوں سے ملتا تھا۔

شاہ عالم ثانی کی طرح اکبر شاہ ثانی بھی کمپنی سرکار کے وظیفہ خوار تھے۔ ان کی حکومت اور بادشاہت 31 برس تک قائم رہی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے کلکتہ ہیڈ کوارٹر سے مغلیہ علاقوں کی نگرانی یا انتظامِ اعلیٰ کے لیے جو گورنر مقرر کیے جاتے، ان کا صدر دفتر آگرے میں قائم کیا گیا تھا جہاں سے وہ ایک طرف مرہٹہ ریاستوں میں اپنی سیاسی سازشوں کے دام بچھاتے اور دوسری جانب راجستھان کے راجوں، مہاراجوں پر بھی نظر رکھتے تھے۔

اکبر شاہ ثانی کے عہد میں سکھوں کے خلاف سید احمد شہید کی تحریکِ جہاد شروع ہوئی اور بالاکوٹ کا معرکہ پیش آیا تھا جس میں ان کے بہت سے ساتھی شہید ہو گئے۔ فرنگی نے کئی ہندوستانی علاقوں میں نئی فتوحات حاصل کیں۔ پیشوا بالا جی راؤ کی ریاست پر حملہ کر کے اسے بھی اپنا وظیفہ خوار بنا لیا۔ میسور میں علی حیدر سے شکست کھائی مگر نظام اور مرہٹوں کو سلطان ٹیپو سے اُلجھائے رکھا۔ پھر چند لڑائیوں کے بعد غداروں کی مدد سے میسور پر بھی قبضہ کر لیا۔ سلطان ٹیپو کی شہادت ہندوستان کی تاریخ کا ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ پھر انگریز کے سامنے کسی کے پاؤں نہ جم سکے اور وہ ہندوستان کی بڑی طاقت بن گیا۔

1۔ جہاں آرا بیگم کی مشہور سرائے بازار چاندنی چوک میں تھی۔ جنوبی دروازہ بازار میں کھلتا تھا۔ چاروں طرف دو منزلہ کمرے تھے جن کے سامنے خوب صورت غلام گردشیں تھیں۔ صحن میں دو کنوئیں تھے۔ عموماً عرب تاجر وہاں قیام کرتے تھے۔ 1857ء میں سرکار انگلشیہ نے سرائے مسمار کر کے وہاں دہلی انسٹی ٹیوٹ کی عمارت بنا دی۔ (قمر اجنالوی)

جائے۔ بادشاہ نے قلعہ خالی کرنے سے انکار کر دیا اور بعض انگریز افسروں کی سفارش سے یہ معاملہ دب گیا تھا کہ مرزا دارا بخت کی وفات پر ولی عہدی کا جھگڑا کھڑا ہو گیا۔

ان دنوں کمپنی سرکار کے گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی تھے۔ انہوں نے کمپنی کے ریجنٹ مقیم دہلی سر طامس مٹکاف کو ہدایت کر دی تھی کہ ولی عہد کی منظوری ان سے لی جائے۔ اسے بادشاہت کے لیے کسی خوش فہمی میں نہ رکھا جائے۔ نیز قلعہ خالی کرانے کی شرط عائد کر دی۔ کمپنی بتدریج مغلیہ بادشاہت کا خاتمہ چاہتی اور بادشاہ کے اختیارات بھی کم کرتی جا رہی تھی۔ بادشاہ نے شہزادہ جواں بخت کو ولی عہد بنایا تو کمپنی سرکار نے اس تقرر کو منظور نہ کیا اور قلعے کے انگریز کپتان نے شہزادہ مرزا فخر الدین فتح الملک سے ملاقات کی جو بادشاہ کے اعلان سے پہلے ہی آزردہ خاطر ہو رہے تھے کہ ان کی جگہ مرزا جواں بخت کو کیوں ولی عہد بنا دیا گیا ہے؟

فرنگی نے اس شرط پر مرزا فخر الدین کی ولی عہدی منظور کر لی کہ وہ قطب صاحب کے علاقے میں رہائش اختیار کر لیں گے اور مرزا فخرو نے یہ شرط رکھی کہ تخت نشینی پر اُنہیں بادشاہ کا خطاب دیا جائے گا اور وہ اپنی عماراتِ شاہی قائم کر سکیں گے۔ جب کمپنی کے مغربی اور شمالی علاقوں کے لیفٹیننٹ گورنر دہلی آئے تو قطب صاحب کے علاقے میں مرزا فخر الدین فتح الملک سے ملاقات ہوئی اور ان کی ولی عہدی کا معاملہ طے پا گیا جس سے اعلیٰ حضرت اور ان کی لاڈلی بیگم زینت محل کا منصوبہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔

زینت محل کے اُکسانے، بھڑکانے پر بادشاہ نے مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی جو کوششیں کیں، ان سے صاف پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنی چھوٹی بیگم کے آلہ کار بن گئے تھے۔ بیگم زینت محل بھی اپنے فرزند کو ولی عہد بنانے کے لیے کچھ ایسی دیوانی ہو رہی تھیں کہ بادشاہ کو چین نہ لینے دیا اور بیٹے کی ولی عہدی کی خاطر نت نئے حیلے کرتی رہیں۔

اعلیٰ حضرت نے مرزا جواں بخت کے ہاتھ کا نشان ایک درخواست کے ساتھ انگلستان کی ملکہ[1] وکٹوریہ کو بھیجا۔ نیز فارسی اور انگریزی زبانوں میں خط لکھا کہ وہ جواں بخت کا ہاتھ ملکہ کے ہاتھ میں دیتے اور دست گیری کی امید رکھتے ہیں۔ مگر وہاں سے بھی اُمید بر نہ آئی۔

جب قلعے کے فرنگی کپتان نے مرزا فخر الدین سے ملاقات کی اور انہیں ولی عہد بنانے کی حمایت کی تھی تو بادشاہ ان سے ناراض ہو گئے۔ بیٹے کو سخت سست کہا اور خطوط میں انہیں ''قرۃ العین'' لکھنا موقوف کر کے طرف ''برخوردار کامگار'' کے القاب پر اکتفا کیا۔ ساتھ ہی نظارتِ اعلیٰ کے عملے کو ہدایت کر دی کہ مرزا فخر الدین سے ملنا جُلنا ترک کر دے۔ بادشاہ کے وہ فرزند جو ''قرۃ العین'' کہلاتے تھے، ملکہ زینت محل کی وجہ سے ان کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگے۔

1۔ ولی عہدی کے اس جھگڑے کا ذکر مورخوں نے بھی کیا ہے۔ مولوی ذکاء اللہ کی تاریخ میں تفصیلات موجود ہیں۔ سر طامس مٹکاف نے اپنی ڈائری میں بادشاہ کے اس خط اور مرزا جواں بخت کے نشانِ پنجہ کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا ہے جو ملکہ وکٹوریہ کو بھیجا گیا تھا۔ اس داخلی شہادت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار حکومت انگلستان کے احکام کی پابند تھی اور غدر کے موقع پر انگریزی فوجوں نے ہندوستانیوں کا جو قتل عام کیا، حکومت انگلستان اس سے بری الذمہ قرار نہیں دی جا سکتی۔ (قمر اجنالوی)

ثانی کے عہد میں مغلوں سے وفاداری کی سزا بھگت چکا ہوں اور کئی سال گوالیار میں قید رہا ہوں۔

ان کی تخت نشینی کی تاریخ 1353 سن ہجری کے اعتبار سے ''چراغ دہلی'' نکلی اور وہ تاریخ ان اشعار میں لکھی گئی ہے ؂

از نشہ دولت بہادر شاہی
شد پر زمئے طرب ایاغ دہلی
تاریخ جلوس آں شہ والا قدر
آمد بہ لب خرد ''چراغ دہلی''

میں نے آپ لوگوں کو آخری مغل تاج دار سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے جلوسِ شاہی کا حال سنا دیا ہے۔ تختِ شاہی سے ان کی علیحدگی، زبوں حالی اور گرفتاری کے منظر آپ بچشمِ خود دیکھ چکے ہیں۔ سرکار کمپنی بہادر نے شاہ عالم ثانی کا جو وظیفہ مقرر کیا تھا، وہ اکبر شاہ ثانی کے عہد میں گھٹ گیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر کا دور شروع ہوا تو اس وظیفے کے ساتھ بادشاہ کا مرتبہ بھی کچھ کم ہو گیا۔ جس فرنگی نے انہیں تخت پر بٹھایا تھا، اسی نے ان کے قدموں کے نیچے سے وہ تخت کھینچ لیا۔ کیونکہ تخت کی حفاظت کرنے والی مغل تلواریں ایک عرصے سے کند ہو چکی تھیں۔

بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے پہلے حکمرانوں بالخصوص شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی سے بھی کمزور اور بے اختیار بادشاہ ثابت ہوئے، جن کی بادشاہت کا بیشتر وقت سرکار انگلشیہ سے ملنے والے وظیفہ میں اضافہ کرانے، اہلِ خاندان سے لڑنے اور ان کی باتیں سننے، ولی عہدی کے جھگڑے کھڑے کرنے، بزرگوں کے مزارات پر حاضری دینے، شعر کہنے اور اپنی شان میں قصیدے سننے میں گزر گیا۔ وہ مشکل معاملات سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے اور دوسروں کے آلہ کار بن جاتے تھے۔

جنوری 1849ء میں جب ولی عہدِ سلطنت دارا بخت کا انتقال ہو گیا تو ملکہ زینت محل کی خواہش تھی کہ بادشاہ کے دیگر تمام فرزندوں کو نظر انداز کر کے ان کے کمسن بیٹے جواں بخت کو ولی عہد نامزد کر دیا جائے۔ اس ضمن میں دلیل یہ دی گئی کہ بیگم زینت محل، نواب احمد قلی خان کی دختر اور احمد قلی خاں، احمد شاہ ابدالی شاہِ کابل کے خاندان سے ہیں۔ جبکہ بہادر شاہ ظفر کی نبضوں میں بابر، ہمایوں، اکبر جیسے عظیم مغلوں کا لہو گردش کر رہا ہے۔ اس طرح شہزادہ جواں بخت میں مغل اور افغان خون کی آمیزش ہو گئی ہے لہٰذا وہی ولی عہدی کا زیادہ حق دار ہے۔ چنانچہ زینت محل کے اُکسانے پر بادشاہ نے جواں بخت کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا جس کی عمر اس وقت دس گیارہ برس تھی۔ مختلف بیگمات سے بادشاہ کے دس مزید لڑکے تھے اور عمر کے اعتبار سے سبھی مرزا جواں بخت سے بڑے تھے جن میں مرزا فخر الدین فتح الملک (المعروف شہزادہ فخرو) سب سے بڑے اور دارا بخت کی رحلت کے موقع پر تیس سال کے جوان تھے۔ ولی عہدی پر ان کا حق فائق تھا۔

ادھر انگریز سرکار، بوڑھے بادشاہ کو ترغیب دے چکی تھی کہ وہ لال قلعہ خالی کر کے قطب صاحب کے مقدس علاقے میں آباد ہو جائیں جہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ جیسے ولی کی درگاہ ہے۔ ان کے دادا شاہ عالم ثانی اور والد اکبر شاہ ثانی کے مقبرے ہیں۔ ان کا اپنا عالی شان قصر ''ظفر محل'' ہے بلکہ اور بھی کئی اعلیٰ عمارتیں ہیں۔ مقصد یہ تھا کہ قلعہ فرنگی کے قبضے میں آ جائے اور مغلیہ خاندان کی نمائشی بادشاہت کا سلسلہ ختم کر دیا

روزنامچہ بغرضِ مطالعہ گھر بھی لے جانا چاہوں تو لے جا سکتا ہوں۔ اس طرح سرکاری ذمے داریوں سے بچ کر اپنا پورا وقت مطالعہ وتحریر میں صرف کرسکوں گا۔''

بادشاہ نے میری درخواست سے اتفاق کیا اور اسے بہ خوشی منظور کرلیا۔ پھر انہوں نے اپنی مہرِ شاہی سے کتب خانے کے ناظر کے نام مطلوبہ حکم جاری کر دیا کہ مابدولت نے سید برہان الدین یمین الدولہ کو دفترِ شاہی کے معاہدات، تمسکات، فرامین اور روزنامچے وغیرہ دیکھنے کی خصوصی اجازت مرحمت فرمائی ہے۔ ان کے کام میں ہرگز مداخلت نہ کی جائے۔ اعلیٰ حضرت نے مزید مہربانی یہ کی کہ مہتمم کتب خانہ کو میرے سامنے بلا کر حکم نامہ خود اس کے سپرد کیا اور زبانی تاکید بھی فرمائی کہ ایک اہم معاملے کے لیے مجھے پورے دفترِ شاہی کے مطالعے کا اختیار دیا گیا ہے۔

میں شاہ عالم ثانی کے دور میں محرر رہ چکا اور کئی بار دفترِ شاہی میں جا چکا تھا۔ مجھے علم تھا کہ دیوانی تمسکات اور فوجی حسابات کے کھاتے کہاں کہاں ہیں۔ نیز عہد ناموں، سرکاری دستاویزات اور دوسری اہم تحریروں کی کتابیں کہاں رکھی جاتی ہیں۔ دفترِ شاہی میں اگرچہ کچھ تبدیلیاں ہو چکی تھیں اور کتب خانے میں اضافے کی وجہ سے پرانے مسل اور کاغذات صندوقوں میں بند کر دیئے گئے تھے کیونکہ الماریوں میں ان کی گنجائش نہیں تھی، تاہم ان پر عہد اور سن وغیرہ درج تھے کہ کون سا صندوق کس زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ ان مقفل صندوقوں کو دفترِ شاہی کے عقبی کمرے میں جو مال خانہ کہلاتا تھا، رکھ دیا گیا تھا۔ البتہ احمد شاہ ابدالی کے حملے، پانی پت کی تیسری جنگ اور شاہ عالم ثانی اور ان کے بعد پیش آنے والے واقعات، دستاویزات اور عہد ناموں کے کاغذات چرمی جلدوں کی صورت میں موجود تھے۔ ناظر دفترِ شاہی نے مجھے الماریوں اور مال خانے کے صندوقوں کی چابیاں بھی دکھا دیں، جن پر صندوقوں اور الماریوں کے نمبر کھدے ہوئے تھے۔ میں اپنی ضرورت کے مطابق ناظر سے کہہ کر کسی بھی الماری یا صندوق کا قفل کھلوا سکتا یا خود کھول سکتا تھا۔ اعلیٰ حضرت کی خواہش کے مطابق میں نے شاہی ملازمت تو قبول نہ کی البتہ مغلوں کے دورِ زوال کی تاریخ لکھنے کی حامی بھر لی جس کے طفیل مجھے شاہی کتب خانے میں آنے جانے کی سہولت مل گئی مگر ساتھ ہی بادشاہ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اکبری آئین کی رُو سے مرزا فخر الدین پر ساقط الاعضاء ہونے کا جرم عائد نہ کریں کیونکہ آئین کی یہ شق سراسر اسلام کے خلاف ہے۔ جس پر وہ خاموش ہو گئے۔ مگر مرزا فخر الدین کے ولی عہد مقرر ہو جانے پر بیگم زینت محل ان سے ناراض ہو گئی تھیں اور یہ ناراضگی مرزا فخرو کی وفات تک قائم رہی۔

بہادر شاہ ظفر کے عہدِ انحطاط میں ولی عہدی کے جھگڑے کی جو بات نکل آئی، اس کا سبب بیگم زینت محل تھیں اور جب یہ بات چھڑ گئی ہے تو میں ضروری سمجھتا ہوں کہ ولی عہدی کے جھگڑے کی بات پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں۔

یہ جھگڑا مرزا جواں بخت کو ولی عہد بنانے کی کوشش سے شروع ہوا تھا اور اس فساد کی اصل جڑ ملکہ زینت محل تھیں جو ولی عہد مرزا فخر الدین کے خلاف بادشاہ کے کان بھرتی رہتی تھیں۔ حتیٰ کہ بادشاہ بھی اپنے ولی عہد فرزند مرزا فخرو سے ناراض اور کبیدہ خاطر رہتے تھے۔ 1856ء میں ہیضے کی وبا پھیل گئی اور مرزا فخر الدین چل بسے۔ دہلی میں خبر اُڑی کہ بیگم زینت محل نے اپنے حکیم محمد نقی خاں سے مل کر ولی عہد کو زہر دلایا ہے جو ان کا علاج کر رہا تھا تاکہ مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کا راستہ صاف ہو سکے۔ مجھے پتہ چلا کہ ولی عہد کے خسر نواب مرزا الٰہی بخش

اس قضیے کا یہ پہلو انتہائی افسوس ناک ہے کہ مرزا فخر الدین کی ولی عہدی کے خلاف ان کا مختون ہونا جرم قرار دیا گیا آئینِ اکبری کی رُو سے سرکارِ انگلشیہ پر دباؤ ڈالا گیا کہ انہوں نے اپنا ختنہ کرا کے اکبری آئین کی خلاف ورزی کی ہے لہٰذا انہیں ولی عہدی سے معطل کیا جائے۔

شہنشاہ اکبر کے عہد میں مغل حکمراں کا ختنہ[1] موقوف کر دیا گیا اور یہ عذر نکالا گیا کہ کوئی ساقط الاعضا شخص تخت پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اکبر کا خیال تھا، چھوٹی عمر میں بچے کو زخم لگانے سے تکلیف ہوتی ہے۔ تیرہ برس کی عمر میں بچے کو اختیار ہے کہ چاہے تو تکلیف اٹھائے، چاہے تو نہ اٹھائے۔ اس طرح مغلیہ خاندان میں ختنے کی رسم تقریباً ختم کر دی گئی تھی۔ کیونکہ ہر شہزادے کو بادشاہ بننے کی خواہش ہوتی تھی اور اکبری آئین کے مطابق کوئی مختون یا ساقط الاعضاء شہزادہ تخت نشین نہیں ہوسکتا تھا۔ قلعے میں مغل شہزادے عموماً قسم کھایا کرتے تھے...... ''اگر ایسا ہوا تو مجھے تخت نصیب نہ ہو۔''

بعض دیگر معاملات کے علاوہ وہ اس طرح بھی اپنے نامختون ہونے کا اظہار کرتے تھے لیکن جن شہزادوں کو اسلام سے محبت تھی، وہ ختنہ کراتے اور اپنے مذہب کے پابند رہتے تھے۔ مرزا فخر الدین فتح الملک نے ختنہ کروایا۔ وہ اس معاملے میں مذہب کے پابند تھے۔ علمائے کرام کے نزدیک یہ بات ان کے حق میں جاتی تھی۔ جب لوگوں کو پتہ چلا کہ شہزادہ فخر الدین پر اکبری آئین کی خلاف ورزی کا جرم عائد کر کے انہیں ولی عہدی سے محروم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے تو مذہبی حلقوں میں بادشاہ اور زینت محل کے خلاف ناراضی کی لہر حرکت کرنے لگی جس میں ہمارا سید گھرانہ بھی شامل تھا۔

انہی دنوں اعلیٰ حضرت نے مجھے قلعے میں طلب کیا۔ مقصد تو یہ تھا کہ میں ان کے خلاف اُٹھنے والی ناراضی کی لہر کو روک دوں مگر مجھے شاہی دفتر کے مہتمم کا عہدہ پیش کر کے یہ خواہش ظاہر کی کہ شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر عرش آشیاں کے بعد کی مغلیہ تاریخ رقم کروں۔

اس کا مقصد یہ تھا کہ اب میں فارغ ہوں (کیونکہ کاروبار میرے لڑکوں نے سنبھال لیا تھا) لہٰذا دربار سے وابستہ ہو جاؤں تو دفترِ شاہی میں محفوظ معاہدوں، فرامین اور اہم یادداشتوں کے ذریعے مغلوں کی تاریخ رقم کر سکوں گا۔ میں عالمگیر ثانی، شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کے عہد دیکھ چکا تھا بلکہ متعدد اہم واقعات میرے سامنے رونما ہوئے تھے، اس لیے میں ان حالات و واقعات کو بہتر طور سے جانتا تھا اور ان کی غایت سمجھتا تھا، جبھی مجھے اس عہد کی تاریخ لکھنے کی پیشکش کی گئی۔

یہ ایک ایسا معاملہ تھا جس سے میری دلچسپی بڑھی لیکن قلعے کی ملازمت کرنے اور دربارِ شاہی کا پابند ہونے سے گھبراتا تھا اس لیے درخواست کی کہ اعلیٰ حضرت کے فرمان کی تعمیل کرنا چاہتا ہوں مگر کسی عہدے وغیرہ کے بغیر۔ وہ حیران ہوئے۔ ''جب تم دفترِ شاہی کا اختیار خود نہیں سنبھالو گے تو پرانے فرامین، معاہدے اور یادداشتیں کیسے دیکھ سکو گے؟''

''اس مقصد کے لیے حضور کتب خانے کے ناظر کو حکم صادر فرما دیں کہ مجھے دفترِ شاہی میں بلا روک ٹوک آنے جانے اور پرانے روزنامچوں، مسلوں، کتابوں اور یادداشتوں کو دیکھنے کی خصوصی اجازت ہے۔ اگر میں کوئی مسل یا

[1] بحوالہ مولوی ذکاء اللہ کی ''تاریخ ہندوستان'' (عروج عہدِ انگلشیہ)

زمانہ انہیں پیچھے چھوڑ کر آگے چلا گیا ہے یا بوڑھا، مرد جوان اور حسین عورت کی چال کا مہرہ بن جاتا ہے، وہ عموماً پٹتا ہے۔

یوں تو مغلیہ خاندان کا ہر فرد اپنی شریانوں میں بابر، ہمایوں، اکبر جیسے عظیم مغلوں کے خون کی روانی کا دعویٰ کرتا رہا ہے لیکن شاہ عالم ثانی تک آتے آتے وہ خود سرد ہو چکا تھا۔ انہی کے دورِ حکومت میں مغل سلطنت کو کبھی روہیلوں، کبھی سندھیا شاہی مرہٹوں، کبھی ہلکر شاہی مرہٹوں، کبھی انگریزوں نے پامال کیا اور مغل ان کا مقابلہ نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ وہ کمپنی سرکار کے وظیفہ خوار بن گئے۔ اکبر شاہ ثانی اور بہادر شاہ ظفر کی حیثیت ان شاہی مہروں سے زیادہ نہیں تھی جو کمپنی سرکار کے احکامات اور دیوانی اختیارات کے وثیقوں پر لگائی جاتی تھیں۔''

یہ الم ناک حقیقت بیان کرنے کے بعد سید صاحب چند لمحوں کے لیے پھر خاموش ہو گئے اور میں ماضی کے دھندلے دنوں میں کھو گئی۔ جب مرزا دارا بخت فوت ہوئے، میں دس برس کی تھی اور سنا تھا، اعلیٰ حضرت نے بیگم زینت محل کی خواہش پر ان کے کم عمر فرزند شہزادہ جواں بخت کو ولی عہد مقرر کر دیا ہے۔ یہ سن کر مجھے حیرت ہوئی تھی مگر بعد ازاں پتہ چلا کہ سرکارِ انگلشیہ نے جواں بخت کی تقرری نامنظور کر دی اور مرزا فتح الملک بہادر کو ولی عہد تسلیم کر لیا ہے جس پر ملکہ ان سے ناراض ہو گئی تھیں۔

ان دنوں میں اور مغلانی بیگم بھی ملکہ زینت کے زیرِ عتاب اور ماموں اورنگ مرزا کے ساتھ خاص بازار کے مکان میں رہتی تھی۔ یہ بات آگے چل کر بتاؤں گی کہ ہم ماں بیٹی پر ان کا عتاب کیوں نازل ہوا تھا۔ البتہ سید صاحب نے ولی عہدی کے جھگڑے کا جو قصہ بیان کیا، وہ بالکل درست تھا اور میں ذاتی طور پر سب کچھ جانتی تھی مگر اکبری آئین کے مطابق کسی ''ناقص الاعضاء'' شہزادے کے تخت نشین ہو سکنے کی بات میں نے پہلی بار سنی اور میرے لیے کسی اچنبھے سے کم نہیں تھی۔

❁......❁......❁

نے حکیم احسن اللہ خاں کو بھی بلایا اور انہیں پچکاری دلوائی تھی۔ مگر مرزا فخر الدین اسی شام اور وہ 10 جولائی 1856ء کی شام تھی، انتقال کر گئے۔

اس الم ناک واقعے کے دوسرے ہی دن جب قلعے کی فضا سوگوار تھی، انگریز ریجنٹ سر طامس مٹکاف، اعلیٰ حضرت سے ملنے آیا۔ غالباً وہ مرزا فخر الدین کی وفات پر تعزیت کرنے آیا تھا کہ بادشاہ نے خواہش ظاہر کی۔ اب سرکارِ انگلشیہ مرزا جواں بخت کو ولی عہد مقرر کر دے۔ ساتھ ہی ایک محضر نامہ پیش کیا جس پر ان کے آٹھ بیٹوں کی مہریں اور دستخط ثبت تھے کہ مرزا جواں بخت دانائی، لیاقت اور علم میں ان سب سے بڑھ کر ہے۔ اگر وہ ولی مقرر ہو تو ہم خوش ہیں۔

بادشاہ نے اس تحریر پر زبردستی شہزادوں کی مہریں لگوائیں اور دستخط کروائے تھے۔ وظیفوں میں اضافہ کرنے اور روپیہ دینے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر مرزا قویاش نے جو مرزا فخر الدین کے بعد ولی عہدی کا حق رکھتے تھے، اگلے روز ریجنٹ کو درخواست پیش کی، جس میں یہ راز فاش کر دیا کہ محضر نامے پر دستخط نہ کرنے اور مہر نہ لگانے کی صورت میں بادشاہ نے وظیفہ بند کر دینے کی دھمکی دی تھی۔ میں حافظ قرآن، حاجی اور مرزا جواں بخت سے کہیں زیادہ لائق فائق ہوں۔ بادشاہ کا بڑا بیٹا ہونے کی وجہ سے ولی عہدی پر میرا حق ہے لہٰذا سرکارِ انگلشیہ سے حق رسی کی درخواست کرتا ہوں۔

کمپنی کے گورنر جنرل لارڈ کننگ اور ان کی کونسل نے مرزا قویاش کو ولی عہد تسلیم کر لیا مگر قلعہ خالی کرنے اور قطب صاحب کے علاقے میں منتقل ہونے کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی کہ انہیں بادشاہ کا خطاب نہیں دیا جائے گا۔ وہ صرف ''شہزادۂ عالی'' کہلائیں گے۔ اس تقرری کے ساتھ ہی بادشاہ کو ملنے والے وظیفے میں سے انہیں ولی عہدی کی تنخواہ کے پندرہ ہزار روپے الگ ملنے لگے۔

یہ بیگم زینت محل کی دوسری شکست تھی۔ اگر چہ وہ سرکارِ انگلشیہ کی خیر خواہ اور انگریز کا دم بھرتی تھیں لیکن کمپنی سرکار نے ان کے فرزندِ دل بند کو ولی عہدی کے اعزاز سے محروم رکھا، جس میں انگریز کی اپنی سیاسی حکمت اور مصلحت شامل تھی۔ مگر اس شکست نے اعلیٰ حضرت کو برہم کر دیا اور وہ اپنے دوسرے بیٹے سے بھی خفا ہو گئے۔ ان کا دل اولاد کی طرف سے کھٹا ہو گیا۔ یہ سب کیا دھرا بیگم زینت محل کا تھا جو اپنے بیٹے کو ولی عہد بنانے کی خاطر نہ صرف دوسرے شہزادوں کو حقیر سمجھتی رہیں بلکہ بادشاہ کی شکست کا بھی ذریعہ بنیں۔

یہ ہے ولی عہدی کے جھگڑے کی روداد جسے آپ لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہوں گے مگر میں نے یہ ذکر اس لیے ضروری سمجھا ہے تا کہ فرنگی کی طاقت، سیاست اور ہوشیاری کے ساتھ بادشاہ کی بے قدری اور بے تدبیری کا معاملہ بھی واضح ہو جائے جو چھوٹی بیگم کی ضد پوری کرنے کے لیے جوان اولاد سے جھگڑتے رہے۔

اب نہ تو بہادر شاہ ظفر بادشاہ رہے، نہ زینت محل ملکہ رہیں، نہ جواں بخت کی ولی عہدی کا جھگڑا رہا، نہ مغلیہ سلطنت رہی۔ اور آپ سوچتے ہوں گے پھر میں یہ سب کچھ کیوں دہرا رہا ہوں۔ مگر ہماری زندگی انہی باتوں سے عبارت ہوتی ہے۔ ہم گزرے دنوں میں کرتے اور آنے والے دنوں میں بھگتتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے خود کو بیگم زینت محل کی خواہش کا اس قدر پابند کر لیا تھا کہ ولی عہدی کے جھگڑے میں اپنے بیٹوں سے ناراض ہوئے اور فرنگی کی تضحیک کا بھی نشانہ بنے جو پہلے ہی انہیں بے وقار اور بے آبرو کرنے پر تلا ہوا تھا۔ مگر وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ

طرح ذہن کے حاشیے پر لپکی اور مجھے یاد آیا، ایک مرتبہ جب میں نے اندھے شہنشاہ شاہ عالم سے غلام علی قفل ساز کے بنائے ہوئے قفل ابجد کی بات چھیڑی تو انہوں نے بتایا تھا کہ غلام علی کو ایک ہزار اشرفیاں انوکھے قفل کی ایجاد پر دی گئی تھیں۔ انہوں نے ایک صندوقچے کو اپنے سامنے قفل ابجد لگوایا تھا جس میں بڑی اہم دستاویزات بند کی گئی تھیں اور اس کے نزدیک وہ دستاویزات کسی خزانے سے کم قیمتی نہ تھیں۔

میں اپنی سوداگری اور خوشحالی کے ایام میں شاہ عالم کے مبینہ خفیہ خانے، غلام علی کے قفلوں اور اس کی بیان کردہ کہانی کو ذہن سے بالکل محو کر چکا تھا۔ شاہ عالم کا زمانہ میری مشکلوں اور ہولناک مصیبتوں کا زمانہ تھا اور میں غلام علی قفل ساز کی عجیب وغیب طلسماتی کہانی ہی کے طفیل مبتلائے مصیبت ہوا تھا۔ مگر دفتر شاہی کے مال خانے میں بیٹھے بیٹھے اہم دستاویزات کے صندوقچے کی یاد ذہن کے بند ڈربے سے ناگہاں یوں نکل آئی جیسے انڈے سے چوزہ نکلتا ہے اور ذہن میں عجیب سی سرسراہٹ ہونے لگی۔ کیونکہ شہنشاہ نے اس صندوقچے کے قفل ابجد کا لفظِ کلید مجھے بتا دیا تھا اور وہ دو حرفی لفظ ''رخ'' تھا۔

میں جلدی سے یوں اُچھل کر کھڑا ہو گیا جیسے کسی زبردست طاقت یا دفتر شاہی کے فرش ہی نے مجھے اُچھال دیا ہو اور دل سے آواز آئی۔ 'شاہ عالم کا وہ صندوقچہ تلاش کرو اور دیکھو اس میں کون سی اہم دستاویزات محفوظ کی گئی ہیں۔'

پرانے دفتر کا مال خانہ (گودام) دو کمروں پر مشتمل تھا اور میرے اندازے کے مطابق شاہ عالم ثانی کا بند صندوقچہ دوسرے کمرے میں ہونا چاہئے تھا۔ حالانکہ ان کے عہد کا سارا دفتر (ریکارڈ) کتب خانے کی الماریوں میں محفوظ تھا۔ کیونکہ انہی کے دور میں مغلیہ سلطنت پر مہاراجہ سندھیا، جسونت راؤ ہلکر اور سرکار کمپنی بہادر کا سایہ پڑا تھا۔

پہلے کمرے کا دفتر اورنگ زیب عالمگیر اور دوسرے کمرے کا دفتر عزیزالدین عالمگیر ثانی کے عہد سے شروع ہوتا تھا۔ صندوقچے کی تلاشی سے شاہ عالم ثانی کے بیان کی تصدیق ہو گئی کہ دستاویزات کے صندوقچے کو غلام علی کا تیار کردہ انوکھا قفل لگوایا گیا تھا۔ اب مجھے اس قفل کو کھولنا اور ان اہم دستاویزات کو دیکھنا تھا۔ میں نے قفل کی کلید اسرار کے دو حروف ملا کر ''رخ'' کا لفظ بنایا تو قفل کھل گیا لیکن حرف ملا کر اسے جھٹکے سے کھولنا پڑا۔ تقریباً نصف صدی تک بند رہنے کی وجہ سے اس میں کچھ میل اور زنگ جم گیا تھا۔

صندوقچہ کھلا تو اس میں شاہ عالم کے دور کی دستاویزات اور واقعات پر مشتمل تین کتابیں بند تھیں۔ ایک کتاب یا روزنامچہ غلام قادر خاں روہیلے کے حملے سے قبل کی یادداشتوں پر مبنی تھا۔ دوسرے دونوں روزنامچوں میں اس حملے کے بعد پیش آنے والے واقعات سپردِ قلم کیے گئے تھے۔ میرا مطلوبہ روزنامچہ پہلا تھا جو غلام قادر روہیلے کی آمد سے پہلے صندوقچے میں بند کیا گیا اور جو شہنشاہ جنت مکانی کے بقول کسی خزانے سے زیادہ قیمتی تھا۔ میں نے چرمی جلد میں محفوظ دستاویزات کا وہی مسل نکال لیا اور دوسری دونوں کتابیں جو کافی وزنی اور بھاری تھیں، صندوقچے میں بند کر کے قفل ابجد کے حروف گڈمڈ کر دیئے۔ قفل بند ہو گیا اور اب لفظِ کلید کے بغیر نہ کھل سکتا تھا۔ جو شاید میرے علاوہ کسی کو معلوم نہ تھا۔

معاً خیال آیا، صندوقچے میں دو کتابیں شاہ عالم کی بینائی چھن جانے کے بعد رکھی گئیں جب وہ قفل ابجد خود

(13)
چہل تن، چہل من

خاموشی کا وقفہ ختم ہوا تو سید صاحب کہنے لگے۔
''میں نے بہادر شاہ ظفر کے دورِ زوال سے متعلق جو کچھ کہا، وہ اگرچہ انتہائی تکلیف دہ لیکن اس تاریخ کا حصہ ہے جو مستقبل میں لکھی جائے گی اور میں بھی اس ذکر کو یہیں چھوڑ کر اب مغلوں کے ادبار کی اس تاریخ کی طرف آتا ہوں جو حضرت اورنگ زیب عالمگیر کی رحلت کے بعد پیش آنے والے حالات وحوادث پر مشتمل تھی اور جسے تحریر کرنے کا فرض اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر نے مجھے سونپ دیا تھا۔
حقیقت یہ ہے کہ کسی قوم کے ادبار و زوال کی تاریخ لکھنا، ناخوشگوار فرض کے علاوہ ایک مشکل کام بھی ہے۔ کیونکہ زوال، صاحبِ اختیار افراد کی غلطیوں کا نتیجہ ہوتا ہے اور خاندان کے لوگ ان افراد کے ساتھ بندھے ہوئے رشتوں یا بعض مجبوریوں اور مصلحتوں کے باعث اپنے عزیزوں کی غلطیوں کا ذکر پسند نہیں کرتے۔ لیکن میں نے شہنشاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی، مرزا عالی گہر شاہ عالم ثانی، مرزا معین الدین اکبر شاہ ثانی کے زوال پذیر دور دیکھے اور ان کے بعد مرزا سراج الدین بہادر شاہ ثانی کا بدترین دور دیکھ رہا تھا۔ اس لیے چاہتا تھا جو کچھ میں نے دیکھا یا جو کچھ مجھ سے پہلے گزر چکا ہے، اسے پوری ذمے داری، فرض شناسی اور ثقہ حوالوں کے ساتھ رقم کروں تاکہ خود مغل بھی تاریخ کے اس آئینے میں اپنے زوال و ادبار کے اسباب اور اپنی سنگین غلطیوں کا نظارہ کر سکیں۔
سب سے پہلے مجھے پرانی دفتر شاہی کو دیکھنا تھا جس کا سلسلہ اورنگ زیب عالمگیر خلد آشیانی کی رحلت سے شروع ہوتا تھا اس لیے میرا زیادہ وقت مال خانے میں رکھے صندوقوں کی جانچ پڑتال میں صرف ہونے لگا۔ مغل حکمرانوں کی ایک خوبی کبھی نظرانداز نہیں کی جائے گی۔ وہ اپنے عہد کے حالات اور سوانح خود لکھتے یا لکھواتے تھے۔ اس سلسلے میں توزک بابری، ہمایوں نامہ، آئین اکبری، توزک جہانگیری کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ بہت سے مغل سرداروں نے بھی روزنامچے لکھے ہیں۔ مال خانے میں متعلقہ عہد کا بڑا قیمتی سرمایہ میرے سامنے صندوقوں میں بند پڑا تھا جس میں معاہدات اور دستاویزات کے علاوہ متعدد شاہی روزنامچے بھی تھے، جنہیں مغل شہنشاہوں نے قلمبند کرایا تھا۔
ایک روز میں فرخ سیر کے عہد کی ضروری دستاویزات دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک بھولی بسری بات کوندے کی

رسمی تخت نشینی کے تھوڑے ہی عرصے بعد احمد شاہ ابدالی نے پھر دہلی کا رخ کیا اور اس مرتبہ رحمت خاں روہیلہ، نجیب الدولہ بریلوی اور نواب شجاع الدولہ سے اتحاد کر کے جو ''اتحاد اربعہ'' کہلایا، پانی پت کے میدانوں میں مرہٹوں کو شکست فاش دی۔ مرہٹے جو دہلی چھوڑ کر پانی پت آ گئے تھے، تین لاکھ لاشیں میدانِ جنگ میں چھوڑ کر بھاگے جس کے ساتھ ہی مرہٹہ پیشوا بالا جی باجی راؤ کا پورے ہندوستان پر حکمرانی کا خواب بکھیر گیا۔

شاہ عالم کی یادداشتوں میں روہیلے سردار نجیب الدولہ اور رحمت خاں کے خلاف نفرت کا اظہار کیا گیا تھا جنہوں نے احمد شاہ ابدالی کو مشورہ دیا تھا کہ وہ ہندوستان کا تخت وتاج خود سنبھالے اور مغل سلطنت کا خاتمہ کر کے یہاں پھر افغان سلطنت کا احیا کرے۔ مگر ابدالی نے ان کی پیشکش مسترد کر دی اور ہندوستان کا تخت شاہ عالم کے لیے چھوڑ کر واپس کابل چلا گیا۔ شاہ عالم کو بنگال سے بلا کر تختِ دہلی پر بٹھایا گیا۔ وہ بنگال سے نجف خاں کو ساتھ لے کر آئے تھے جس نے انگریزوں سے مل کر مرہٹوں پر ایک کاری ضرب لگائی اور وزارت کا عہدہ حاصل کر لیا۔

یہ تمام واقعات بڑی تفصیل کے ساتھ لکھے گئے تھے جنہیں میں نے اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان میں جگہ جگہ افغانوں، مرہٹوں اور روہیلوں کے خلاف اظہارِ ناراضگی کیا گیا اور سخت زبان استعمال کی گئی تھی۔ اگر یہی اہم دستاویزات تھیں جنہیں شاہ عالم ثانی نے قفل ابجد کے اسرار میں بند کرنا ضروری سمجھا تھا تو ان میں کوئی بات ڈھکی چھپی نہ تھی۔ ہندوستان میں واقعات بالکل اسی طرح پیش آئے تھے جس طرح رقم کیے گئے۔ سوائے الفاظ کی تلخی کے ان میں کوئی واقعہ پردۂ اخفا میں رکھنے والا تھا ہی نہیں۔

میں ان یادداشتوں کا مطالعہ کر کے بڑا مایوس ہوا۔ آخر شہنشاہ کو یہ واقعات ایک صندوقچے میں بند کرنے اور اسے قفل ابجد کے اسرار میں رکھنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ میں بڑی شکستہ دلی کے ساتھ کتاب ساگوان کی چوکی پر رکھنے والا تھا کہ اچانک چرمی جلد کے ساتھ والا ورق کھل گیا جس پر چند سطور لکھی تھیں۔

وہ عبارت بھی فارسی ہی میں تحریر کی گئی تھی۔ جسے پڑھ کر معلوم ہوا کہ معرفت اور راہِ سلوک کا کوئی نوشتہ یا نسخہ ہے۔ عبارت یہ تھی۔

> ''رخ آں بہ سوئے چہل ابدال است و برمزار او چہل چراغ روشن اند بہ موجب چہل حدیث۔ درمکان معرفت دو درہا۔ یک در مانند در توبہ بازاست و یک دربند است خشتک ہائے ایام۔ دربند باز کن بہ حیلہ و کوشش و داخل و زینہ معرفت۔ از زینہ معرفت تاباب معرفت را سلوک چہل گام است۔ بست گام بہ سوئے راست و بست گام بہ سوئے یمین۔ ازاں بعد رسید برباب معرفت وآں درمقفو داست بگوکن فیکون۔ پیش تو طاقت توحید معرفت است و جانب یمن حجرۂ پنج تن است وآں حجرۂ مراد۔ ونماز ہا ادا کن ورایت تجلی خورشید۔''

> (اس کا رخ چالیس ابدال کی طرف ہے اور اس کے مزار پر چالیس چراغ چالیس حدیثوں کی طرح روشن ہیں۔ مکانِ معرفت کے دو دروازے ہیں۔ ایک درِ توبہ کی طرح کھلا دروازہ اور ایک دروازہ ایام کی چھوٹی اینٹوں سے بند ہے۔ بند دروازہ حیلہ وکوشش سے کھول اور زینۂ معرفت میں داخل ہو جا۔ زینۂ معرفت سے بابِ معرفت تک چالیس قدم

کھولنے کی صلاحیت کھو بیٹھے تھے۔ کیونکہ حرف ملائے بغیر قفل نہیں کھل سکتا تھا اور اندھے شہنشاہ یہ کام خود نہ کر سکتے تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا، ان کے علاوہ کوئی اور بھی لفظِ کلید سے آگاہ تھا اور وہ دوحرفی لفظ اسے شہنشاہ نے خود بتایا ہوگا۔ مگر وہ کون ہوسکتا ہے، جس پر انہوں نے قفل اسرار کا لفظِ کلید فاش کیا ہوگا؟

کیا مرزا معین الدین اکبر شاہ ثانی، مرزا علی گوہر یا کوئی اور؟ اور شاہ عالم اپنے بیٹوں سے خوش نہیں تھے۔ اچانک ذہن میں خادمِ خاص کا خیال گزرا جو ان کی وفات کے چند ماہ بعد فوت ہو گیا تھا۔ غالباً وہی ہوگا۔ شاہ عالم اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ جب وہ آنکھوں سے محروم ہو گئے تو خادمِ خاص ان کا محررِ راز بن گیا تھا۔

دفترِ شاہی سے مجھے کوئی بھی دستاویز، تحریر یا کتاب گھر لے جانے کی اجازت تھی تاکہ اطمینان سے اس کا مطالعہ کرسکوں۔ لیکن میں چاہتا تھا، شاہ عالم کی ان دستاویزات اور یادداشتوں کے متعلق کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکے کہ میں انہیں گھر لے گیا ہوں۔ یقیناً ان میں کوئی اہم راز بند ہوگا جو میں فی الحال اپنے ہی تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ میں نے اس چرمی کتاب کو اپنے انگرکھے اور کُرتے بلکہ صدری کے بھی نیچے سینے پر اس طرح باندھ لیا کہ کسی کو شبہ بھی نہ ہوسکتا تھا کہ میں کوئی کتاب چھپا کر لے جا رہا ہوں۔

اس طرح میں وہ یادداشتیں کتب خانے سے چرا لایا۔ گھر میں آکر ان کا مطالعہ شروع کیا تو حیران رہ گیا۔ شروع سے آخر تک اس روزنامچے میں کوئی راز کی بات نہ تھی جس کا میں متلاشی تھا۔ بلکہ زیادہ تر واقعات احمد شاہ ابدالی کے حملوں، افغانوں کی لوٹ مار، بنگال کی مہم، غازی الدین کی غداری، اپنے والد عزیز الدین عالمگیر ثانی کے وحشیانہ قتل اور پانی پت کی تیسری لڑائی کے بعد اپنی باقاعدہ تخت نشینی سے تعلق رکھتے تھے۔

ان یادداشتوں کے مطابق احمد شاہ ابدالی 1757ء میں دہلی آیا۔ اس کے افغانوں نے نادر شاہ درانی سے بچی کچھی دہلی کو پھر لوٹا اور خواتین کی بے حرمتی اور آبروریزی کی گئی۔ جس پر شاہ عالم نے شدید غصے کا اظہار کیا تھا۔ دہلی کو لوٹنے کے بعد احمد شاہ ابدالی، غازی الدین، نواب شجاع الدولہ والیٔ اودھ اور روہیلہ سردار نجیب الدولہ کو مغل شہنشاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی کا نگراں و محافظ بنا کر واپس چلا گیا مگر اس کی واپسی کے بعد غازی الدین نے جو مغل شہنشاہ سے شدید نفرت رکھتا تھا، مرہٹوں کی مدد سے دہلی پر اپنا تسلط جما لیا اور انہیں پنجاب کی طرف بھیج دیا۔ مرہٹوں نے پنجاب کو زیر کرلیا۔ مگر ابھی وہاں اپنے قدم بھی جما نہیں پائے تھے کہ احمد شاہ ابدالی پھر افغانوں کو لے کر پنجاب میں نمودار ہوا۔ مرہٹے وہاں سے راہِ فرار اختیار کرنے پر مجبور ہوئے مگر اس عرصے میں جبکہ عالی گہر شاہ عالم ولی عہد کی حیثیت سے نواب شجاع الدولہ کی مدد سے بنگال کی مہم سر کرنے گئے ہوئے تھے جہاں مرہٹوں نے اودھم مچا رکھا اور لوٹ مار کے علاوہ بنگالی عورتوں کی عزت بڑی بے دردی سے لوٹ رہے تھے، غازی الدین نے دہلی میں شہنشاہ عالمگیر ثانی کو دھوکے سے دریائے جمنا کے کنارے بلوا کر قتل کر دیا اور ان کی لاش دو روز دریا کی ریت پر پڑی رہی۔

عالی گہر شاہ عالم کو یہ الم ناک خبر عظیم آباد بنگال میں ملی۔ غازی الدین کے تسلط کی وجہ سے وہ دہلی نہیں آسکتے تھے اس لیے عظیم آباد ہی میں رسمی طور پر باپ کے جانشین کی حیثیت سے ان کی تاج پوشی ہوئی۔ بنگال کی مہم بھی ناکام ہوگئی۔ کیونکہ انگریزوں نے ان کا راستہ روک لیا تھا۔ ادھر غازی الدین کی وجہ سے مرہٹے دہلی کے ساتھ مغلیہ سلطنت پر چھائے ہوئے اور پورے ہندوستان پر حکمرانی کے خواب دیکھ رہے تھے۔ 1761ء میں شاہ عالم کی

رہے ہیں۔ اچانک ہم بائیں جانب مڑ گئے...... وہ سرنگ ایک دروازے پر ختم ہوئی۔ دروازہ عبور کر کے ہم کمرے میں داخل ہوئے جہاں میری آنکھوں پر سے پٹی کھولی گئی۔''

شاہ عالم کی فارسی عبارت میں بھی پہلے ایک دروازے، پھر دوسرے دروازے کا ذکر تھا جسے ''خشتک ہائے ایام'' نے بند کر دیا تھا۔ اس دروازے کے بعد ''زینۂ معرفت'' سے ''بابِ معرفت'' تک ''راہِ سلوک'' طے کرنے کے لیے سیدھا چلنے پر دائیں طرف مڑنے کی ہدایت کی گئی تھی اور ''بابِ معرفت'' کو کھول کر آدمی ''حجلۂ توحید و معرفت'' میں داخل ہو سکتا تھا۔ پھر ''حجرۂ پنج تن'' کی اصطلاح اس زمین دوز کمرے کے لیے استعمال کی گئی تھی جہاں غلام علی کے بقول پانچ صندوق مقفل کیے گئے تھے اور وہاں ''دس نمازیں'' ادا کرنے کا مطلب پانچ صندوقوں کے دس قفل کھولنا تھا۔

شاہ عالم کی تحریر میں خزانے کی بات معرفت وطریقت کی اصطلاحوں میں لپیٹ دی گئی تھی جبکہ غلام علی نے اسے صاف لفظوں میں بیان کیا تھا۔ دونوں کی اطلاع یا شہادت ایک ہی مدعا کے بارے میں تھی۔ شاہ عالم کی نوشت ایک امر واقعی کا اظہار اور غلام علی کا بیانِ تائیدی اس کی توثیق کرتا تھا۔ اب یہ بات بھی بالکل واضح ہوگئی کہ شہنشاہ نے اپنی یادداشتوں یا دستاویزات کو اس اہتمام سے کیوں محفوظ کیا تھا جو اسرار و رموز کے ذیل میں نہ آتی تھی کیونکہ انہوں نے احمد شاہ ابدالی کے افغان سپاہیوں کی لوٹ مار اور عورتوں کی عصمت دری کرنے یا اپنے والد مرحوم عالمگیر ثانی کے قتل اور غازی الدین کی بدفطرتی کے متعلق یا پھر نجیب الدولہ اور رحمت خاں روہیلہ کی مغل دشمنی کے بارے میں جو تلخ تفصیلات اور شہادتیں رقم کی تھیں، اکثر لوگ ان سے آگاہ تھے جنہیں کسی صندوقچے میں چھپانے اور اس صندوقچے کو قفل ابجد لگا کر دفترِ شاہی میں محفوظ کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ ان یادداشتوں میں راز کی بات صرف ایک تھی جو چرمی جلد سے ملحق ورق پر معرفت کی زبان میں لکھی گئی اور ان پانچ صندوقوں کے بارے میں تھی جنہیں غلام علی نے ابجد کے قفل لگائے تھے۔ دوسرے لفظوں میں وہ تحریر خفیہ خزانے کی کنجی تھی اور اسی لیے بڑی حفاظت سے دفترِ شاہی میں رکھی گئی تھی۔

میں یادداشتوں کی وہ کتاب اس لیے ساتھ لے آیا تھا کہ اس کے مندرجات کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد اسے دوبارہ دفترِ شاہی میں رکھ دوں گا۔ ''معرفت وسلوک'' کی عبارت ایک بہت بڑے سربستہ راز پر مشتمل تھی۔ میں نے وہ فارسی عبارت ایک علیحدہ کاغذ پر نقل کر لی۔ اسی اثنا میں صفحے کے اوپر بائیں کونے میں باریک قلم سے کچھ اعداد لکھے نظر آئے جن پر پہلے میں نے کوئی توجہ نہیں دی تھی۔ وہ اعداد اس طرح درج تھے۔ 437=84+353۔ میں حیران ہوا کہ یہ ہندسے کیوں لکھے گئے ہیں اور دو مختلف اعداد کو کس لیے جمع کیا گیا ہے؟ کہیں ان کا تعلق معرفت کی نوشت سے تو نہیں؟ خیال آیا شہنشاہ جنت مکانی قفل ابجد سے دلچسپی رکھتے تھے۔ ہوسکتا ہے یہ اعداد بھی ابجد کی زبان میں ''لفظی اشارے'' ہوں۔ جب اس پہلو سے غور کیا تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ حروفِ ابجد کے اعتبار سے 353 ''برہان الدین'' کے اعداد تھے جو میں نے اپنی یادداشت کی خاطر ایک کتاب پر لکھ رکھے تھے۔ کتاب نکال کر دیکھی تو 353 کے اعداد میں میرا ہی نام مستور تھا۔ 84 کے اعداد سے ''سیّد'' کا لفظ بنتا تھا اور کتاب میں یہ وضاحت بھی لکھی تھی کہ یائے تحتانی (ی) کا عدد 10 ''سیّد'' کے لقب میں دو مرتبہ جمع کیا جاتا ہے تاکہ ''ی'' پر تشدید کی علامت نمایاں ہو سکے اور وہ ''سید'' نہ پڑھا جائے۔

کی راہِ سلوک ہے۔ بیس قدم سیدھ میں اور بیس قدم دائیں طرف۔ اس کے بعد بابِ معرفت پر پہنچ اور وہ درِ مقصود ہے کہ ''ہو جا'' پس وہ ہو گیا (یا ہو جائے گا) اب تیرے سامنے توحید اور معرفت کا کمرہ ہے۔ دائیں جانب پنج تن کا حجرہ ہے اور وہ حجرۂ مراد ہے۔ دس نمازیں ادا کر اور سورج کی تجلی دیکھ۔)

میں جانتا تھا، شاہ عالم ثانی کو طریقت و سلوک سے دلچسپی تھی اور وہ اولیاء کے مزاروں پر سلام اور فاتحہ خوانی کے لیے جاتے تھے۔ یہ عبارت بھی اسی منزل کا کوئی روحانی عقیدہ تھا، جسے اپنی یادداشتوں کی کتاب پر لکھنا اور قفل ابجد کے اسرار میں بند کرنا ایک ناقابل فہم معمہ تھا۔

میں نے وہ عبارت دو تین بار پڑھی۔ معرفت دراصل شناخت اور پہچان کا علم ہے جس کے کئی ذریعے، وسیلے اور طریقے ہیں۔ شاہ عالم ثانی نے بھی کسی خاص طریقے کا ذکر کیا تھا جس میں زینۂ معرفت اور بابِ معرفت بڑے معنی رکھتے تھے۔ اس عبارت میں ایک حجرۂ توحید کا بھی ذکر تھا جس کی دائیں جانب ''حجرۂ پنج تن'' کی نشاندہی کے ساتھ دس نمازیں ادا کرنے کی ہدایت کی گئی تھی۔

''حجرۂ پنج تن'' اور ''دس نمازوں'' کے اشاروں نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے غلام علی قفل سازی کی جو الف لیلوی کہانی سنی تھی، اس میں تہ خانے کے کمرے کی دائیں جانب ایک حجرے کا ذکر تھا جس میں پانچ صندوق رکھے گئے اور انہیں ابجد کے دس قفل لگائے گئے تھے۔ پنج تن سے مراد کہیں وہ پانچ صندوق اور دس نمازیں ادا کرنے کا مطلب دس قفل کھولنا تو نہیں؟ اب جو میں نے عبارت کو غور سے پڑھا تو اس میں بند دروازے کو کھول کر تہ خانے کے زینے میں داخل ہونے، بیس قدم سیدھے چلنے، پھر دائیں جانب مڑنے اور بیس قدم بڑھنے کی ہدایت سے میرے ذہن کے کواڑ پوری طرح کھل گئے اور غلام علی قفل ساز نے تہ خانے کی جو بات کی تھی اس کا عقدہ حل ہو گیا۔ میں بڑی بے تابی کے ساتھ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا جیسے آدھی رات کو میں نے شاہ عالم کے خفیہ خزانے کا سراغ پا لیا تھا۔

❁......❁......❁

مغل شہنشاہ کی یادداشتوں یا تاریخی واقعات کی کتاب سے ''معرفت و سلوک'' کا بیان اور اس کی کلیدِ اسرار مل جانے پر میں حیرت و مسرت کی جس سنسنی سے دوچار ہوا، اس کا صحیح اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو کبھی اس قسم کی عجیب کیفیت سے گزرے ہوں۔

میں نے وہ رازِ سربستہ حاصل کر لیا تھا جسے غلام قادر روہیلہ حاصل نہ کر سکا اور جس کی خاطر مہاراجہ سندھیا نے مجھے کئی سال تک گوالیار کے زندانِ اجل میں قید رکھا تھا۔ اس سنسنی کا ایک حیرت انگیز پہلو یہ تھا کہ میں خود غلام علی قفل ساز کی کہانی کو بے اصل و بے حقیقت سمجھ کر اپنے ذہن سے فراموش کر چکا تھا لیکن اب وہی کہانی طلسم ہوشربا کی طرح میرے سامنے کھلی پڑی تھی۔

شاہ عالم کی تحریر کردہ ''راہِ سلوک'' اور ''حجلۂ معرفت'' تک پہنچنے کی فارسی نوشت پر غلام علی کے بیان کی روشنی میں غور کیا تو ہو بہو ایک ہی نقشہ تھا۔ اس نے اپنی کہانی میں بتایا تھا۔ ''ہم ایک دروازے میں داخل ہوئے، پھر دوسرا دروازہ آیا اور ہم ایک زینہ اُترنے لگے اور کسی تہ خانے میں پہنچ گئے۔ پھر مجھے محسوس ہوا کہ ہم سرنگ میں چل

اس قدر پیچیدہ اور پراسرار راستہ کیوں اختیار کیا؟ جب میں نے انہیں غلام علی قفل ساز کی کہانی سنائی اور اسے ملنے والی اشرفیوں کی حقیقت سے بھی آگاہ کر دیا تھا تو وہ مجھے اسی وقت شاہی دفینے سے مطلع کر سکتے تھے۔ جب میں نے اس زاویے سے معاملے پر توجہ دی تو ان کی دور اندیشی اور حکمت کی ایک نئی لہر میرے ذہن سے گزرنے لگی۔

غلام قادر روہیلے نے اسی پوشیدہ خزانے کے لیے مغل شہنشاہ کو ظلم و تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ مہاراجہ سندھیا نے اگرچہ ان سے ''رشتۂ فرزندی'' قائم کیا تھا لیکن مغل سلطنت کے دیوانی اختیارات حاصل کر کے اس بدلے کی بھاری قیمت وصول کر لی تھی۔ اگر اس کے کانوں میں خفیہ خزانے کی بھنک پڑ جاتی تو اس کا رویہ بدل سکتا تھا اور آپ لوگ سن ہی چکے ہیں کہ مہاراجہ سندھیا کو خزانے سے کتنی دلچسپی تھی۔ اس نے شہنشاہ سے تو پوچھ گچھ مناسب نہ سمجھی لیکن مجھے گوالیار کے زندانِ اجل میں قید رکھا تھا۔

دولت چیز ہی ایسی ہے کہ آدمی کی نیت بدل جاتی ہے اور دوستی دشمنی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اگر بات کسی خزانے کی ہو تو خون کی ندیاں بھی بہہ سکتی ہیں۔ آدمی دولت کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتا مگر دنیا میں دولت ہی سب سے بڑی بے وفا جنس ہے جو ایک جگہ ٹکتی نہیں۔ آج اس کے پاس ہے تو کل اس کے پاس ہوگی۔ پھر بھی دولت کے لیے انسان، انسان کا خون بہاتا ہے۔

غالباً اسی اندیشے اور خطرے کے پیشِ نظر کہ کہیں بے احتیاطی کرنے سے بات نکل نہ جائے اور مہاراجہ کے آدمی جو دہلی میں مرہٹہ مفادات کی نگرانی پر متعین تھے، سن نہ لیں، انہوں نے براہِ راست مجھے خزانے کی اطلاع نہیں دی اور وہ راز مجھ تک پہنچانے کے لیے ایک پیچیدہ اور پُراسرار راستہ اختیار کیا تھا مگر وہ جس خطرے سے ڈرتے تھے، مجھے پیش آ گیا تھا اور میں غلام علی قفل ساز کی کہانی جاننے کی پاداش میں جو مرہٹہ کار خاص کے افسرِ اعلیٰ تک بڑے غیر معتبر ذریعے سے پہنچی تھی، گوالیار میں نظر بند رہا تھا۔

اگر ایک طرف مہاراجہ جسونت راؤ ہلکر اور دوسری جانب فرنگی سرکار سے آویزش کے نتیجے میں سندھیا کو دہلی سے نکلنا نہ پڑتا تو میں بھی گوالیار کے ہولناک قید خانے سے باہر نہ آتا۔ اب یہ جان لینے کے بعد کہ اعلیٰ حضرت شاہ عالم ثانی درپردہ مجھے اصل معاملے سے آگاہ کر گئے تھے، میں خود پر افسوس کرنے لگا کہ گوالیار سے رہا ہوتے ہی سیدھا دہلی کیوں نہ پہنچا اور شہنشاہ سے کیوں نہ ملا؟ میں تو صرف ان کے جنازے میں شریک ہوا تھا۔ انہوں نے اپنے صندوقچے کے لفظِ کلید سے مجھے آگاہ کر دیا تھا کہ اسے کیسے کھول سکتا ہوں۔ پھر بھی میں اس صندوقچے سے ایک طویل عرصے تک غافل رہا جیسے وہ غیر اہم چیز تھی یا اس کا وجود ہی نہ تھا۔

ان کی رحلت کو پینتالیس سال گزر چکے تھے۔ لگ بھگ نصف صدی۔ اکبر شاہ ثانی بھی اکتیس برس حکومت یا انگریز کی غلامی کر کے آخرت کو سدھار گئے اور اپنے گڑھے میں اُتر گئے تھے۔ اس کے جانشین مرزا سراج الدین بہادر شاہ ظفر پر فرنگی کی گرفت کچھ اور مضبوط ہو گئی تھی اور ضابطے کی عام باتوں کے لیے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہیڈ کوارٹر کلکتہ سے گورنر جنرل کی منظوری لینا پڑتی تھی۔

❀......❀......❀

میں بتا چکا ہوں، شہنشاہ نے اپنی یادداشتوں کی کتاب پر جو سرِ نہاں رقم کیا وہ صرف میرے لیے تھا۔ ان کے بیٹے اکبر شاہ ثانی یا پوتے بہادر شاہ ظفر کے عہد میں وہ صندوقچہ کھولا ہی نہیں گیا تھا جس میں ان کی دستاویزات بند

یہ جان لینے کے بعد کہ 437 کا عدد میرے ہی نام اور لقب کا مجموعہ اور ''برہان الدین سیّد'' ہے مجھ پر حیرت کا ایک نیا سکتہ گزر گیا۔ یادداشتوں کی کتاب پر یہ اعداد سندھیا شاہی دور میں جب میں نے دوبارہ قلعے کی ملازمت کر لی تھی، کسی وقت لکھے گئے یا لکھوائے گئے ہوں گے۔ اس وقت شہنشاہ بینائی سے محروم ہو چکے اور خود نہیں لکھ سکتے تھے۔ لہٰذا یہ اعداد ان کے خادمِ خاص نے لکھے ہوں گے۔ ممکن ہے وہ معرفت کی نوشت کا مطلب بھی سمجھتا ہو۔ ممکن ہے نہ سمجھتا ہو۔ تاہم میرے نام اور لقب کے اعداد اسی نے درج کیے ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ انہوں نے خزانے کا بھید اپنے جانشین مرزا معین الدین اکبر شاہ ثانی اور ان کے بیٹوں پر بھی آشکار نہیں کیا اور صرف مجھ پر اعتماد کر لیا تھا۔ ایک دن میرے استفسار پر وہ غلام علی قفل ساز کی کہانی سے انکار کرنے اور اسے انعام دینے کی کوئی اور ہی وجہ بتاتے رہے تھے مگر باتوں باتوں میں اندھے شہنشاہ نے اپنی دستاویزات کے صندوقچے کو قفل ابجد لگوانے اور اسے دفتر شاہی میں رکھنے کی روداد سنائی تھی۔ پھر یہ اہم راز بھی مجھ پر منکشف کر دیا تھا کہ اس قفل کو کھولنے کا لفظِ کلید صرف دو حرفوں ''رخ'' پر مشتمل ہے اور مجھے یہ بات اس لیے بتا رہے ہیں کہ میں ایک محرم ہوں۔

لفظِ کلید بتا کر انہوں نے دراصل مجھے خفیہ خزانے کے راز میں شریک کر لیا تھا۔ گویا انکار میں اقرار اور نفی میں اثبات کو لپیٹ دیا تھا اور میرے سامنے ایک بڑی بلیغ، بڑی پُراسرار چال رکھ دی تھی کہ میں اس سے کھیلوں اور خزانے تک پہنچ جاؤں۔

یہ بات کس قدر حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھی کہ انہوں نے اپنی یادداشتوں کی کتاب کے ایک صفحے پر خزانے کا راز معرفت کی زبان میں درج کیا اور اسی صفحے پر میرے نام اور لقب کے اعداد لکھ کر اشارتاً یہ ہدایت کی تھی کہ میں ہی خزانے کے اسرار کو حل کر سکتا ہوں یا صرف مجھے اس خزانے کو دریافت کرنا اور استعمال میں لانا چاہئے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے میں مغل سلطنت کی بحالی چاہتا اور مغلوں کی عظمتِ رفتہ کا متلاشی ہوں۔ جبکہ ان کے جانشین اور خاندان کے دوسرے افراد صرف اپنے اجداد کی عظمتوں کے سائے بن کر رہ گئے تھے اور وہ سائے بھی بتدریج سمٹ رہے تھے۔

شہنشاہ جنت مکانی نے صندوقچے کا لفظِ کلید صرف مجھے بتایا تھا کہ میں ہی اسے کھولوں اور ان کی یادداشتوں کی کتاب سے خزانے کا راز حاصل کر کے اس تک پہنچ جاؤں۔ مجھ سے پہلے کسی نے وہ صندوقچہ کھولا بھی نہیں تھا۔ معرفت کی زبان میں تحریر کردہ خزانے کے اسرار صرف وہی آدمی جان سکتا تھا جس نے غلام علی قفل ساز کی کہانی سنی ہوتی اور پوری مغلیہ سلطنت میں وہ تنہا آدمی صرف میں تھا۔ ''برہان الدین سیّد'' جس پر اندھے شہنشاہ نے اپنے جانشینوں سے بڑھ کر اعتماد کیا تھا۔

اب یہ حقیقت مجھ پر پوری طرح آشکار ہو گئی کہ مقفل صندوقچے میں یادداشتوں کی وہ کتاب صرف میرے لیے محفوظ کی گئی تھی۔ اس لیے میں نے اسے دفتر شاہی میں لے جانے اور دوبارہ صندوقچے میں رکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ شاہ عالم ثانی جنت مکانی راز کی جو بات مجھ تک پہنچانا چاہتے تھے وہ پہنچ گئی تھی اور اب شاہی کتب خانے میں اس کتاب کا کردار ختم ہو گیا تھا۔

یہ معاملہ بڑا عجیب وغریب اور اُلجھا ہوا تھا کہ آخر انہوں نے مجھے خزانے کے راز سے آگاہ کرنے کے لیے

منطبق ہوتا تھا جن پر ہر شب چراغ جلائے جاتے تھے۔

مہر والی پرانے مقبروں، مزاروں اور قدیم قبرستانوں کا علاقہ ہے جہاں اگر عالی شان عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں تو دور دور تک قبرستان بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ جمعرات کی شام کو وہاں خاص مزاروں اور مقبروں پر دِیے روشن ہوتے ہیں اور ''چہل تن، چہل من'' کی چالیس قبروں پر بھی چالیس چراغ جلتے دکھائی دیتے ہیں اس لیے ''بر مزار او چہل چراغ روشن اند بہ موجب چہل حدیث'' کا مطلب سمجھ میں آ گیا اور یہ بات کھل گئی کہ وہ مقبرہ جہاں مجھے جانا تھا، مہرولی کے علاقے میں ''چہل تن، چہل من'' کے کہیں قریب ہی واقع ہے۔

گویا پورا معمہ حل ہو گیا اور راز کی ہر گرہ کھل گئی۔ چالیس قبروں کے اشارے سے اب مطلوبہ مقام کو ڈھونڈ لینا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ میں ایک بہت بڑی کامیابی سے ہمکنار ہونے والا تھا۔

❀......❀......❀

دوسرے روز میں نے گھوڑے پر زین ڈالی اور اللہ کا نام لے کر مہرولی کی طرف ہو لیا تاکہ ایک بار مطلوبہ مقبرے کو دیکھ آؤں۔ یہ بھی بتاتا چلوں کہ گوالیار کی بدترین جیل سے رہائی اور مہ جمال سے دوسری شادی کے بعد میں مہرولی کے علاقے میں صرف دو مرتبہ گیا تھا۔ وہ بھی ایک بار شاہ عالم ثانی اور دوسری بار اکبر شاہ ثانی کی تدفین کے موقع پر۔ مہرولی میں اگرچہ ''پھول والوں کی سیر'' کا میلہ ہر سال بڑی دھوم دھام سے لگتا تھا جس میں بادشاہ، بیگمات، شہزادے، شہزادیاں اور ہندو مسلمان سبھی شریک ہوتے تھے لیکن مجھے میلوں ٹھیلوں سے کوئی خاص رغبت نہیں۔ البتہ مہ جمال کو ''پھول والوں کی سیر'' بہت پسند تھی۔ پہلے وہ بیٹے بیٹیوں کے ساتھ اور بعد ازاں بیٹیوں اور بہوؤں کے ہمراہ ہر سال مہرولی جاتی اور میلے میں شریک ہوتی تھی بلکہ اس موقع پر نئے نئے ملبوسات بھی تیار ہوتے تھے۔

جب میں اکبر شاہ ثانی کی میت کے ہمراہ مہرولی میں گیا وہ 1837ء کا سن تھا اور جس وقت کی بات کر رہا ہوں، اس وقت دنیا 1851ء کی سن عیسوی سے گزر رہی تھی۔ گویا میں چودہ سال کے بعد ادھر جا رہا تھا۔ مجھے صرف بارہ میل ا فاصلہ طے کرنا تھا اور جب مہرولی میں داخل ہوا تو پہلی مرتبہ بڑے غور سے قبرستانوں، مقبروں اور مزاروں کا جائزہ لیا اور مجھے وہ علاقہ شاہ عالم ثانی کے دور سے جب میں ان کے جنازے میں شریک ہوا، بڑا بدلا بدلا نظر آیا۔ غالباً اس لیے کہ وہ 1806ء میں فوت ہوئے تھے اور گزشتہ پینتالیس برسوں میں وہاں بہت سی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں جن پر میں اکبر شاہ ثانی کی تدفین (1837ء) کے موقع پر توجہ نہیں دے سکا تھا۔

اب میرے سامنے ایک بدلا ہوا مہرولی تھا مگر اس تاریخی قصبے میں پانچ منزلہ قطب مینار اسی شان سے کھڑا اور پورے علاقے پر اپنی عظمت و بلندی کا سایہ ڈال رہا تھا۔ وہاں حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کی درگاہ مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ مغرب میں شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کے مدفن یا کنوئیں اور مشرق میں ''چہل تن، چہل من'' وہ چالیس قبریں جو ایک وسیع قبرستان میں ہیں۔

وہاں پہنچ کر گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے سب سے پہلے میں ان قبروں کو شمار کرنے لگا اور عجیب اتفاق یہ ہوا کہ وہ قبریں پہلی گنتی میں 39 اور دوسری گنتی میں 41 شمار ہوئیں۔ میں گھوڑے سے اُترا اور چالیس کنکریاں گن کر جمع کیں۔ پھر ہر کنکری ایک ایک قبر پر رکھتا چلا گیا اور چالیس کنکریاں چالیس قبروں پر پوری ہوئیں۔ میں جانتا تھا وہ

تھیں۔ شاید اس لیے کہ کسی کو اس کے حرفِ کلید کا پتہ ہی نہیں تھا۔ یہ میرے لیے بہت بڑا اعزاز تھا کہ جنت مکانی نے مجھ پر اعتماد کیا اور ایک اہم فرض مجھے سونپا تھا۔ میں نے وہ کتاب اپنے ذاتی صندوق میں محفوظ کر لی اور خدا کے حضور سجدہ ریز ہو کر عہد کیا کہ ان کے اعتماد پر پورا اُترنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کروں گا اور خفیہ خزانے کو مغلیہ سلطنت کی بحالی کے مصرف میں لاؤں گا۔ میرے نزدیک وہ خزانہ اسی مقصد کے لیے چھپایا گیا تھا لیکن سجدے سے سر اٹھایا تو ایک نئی پریشانی نے گھیر لیا۔

شہنشاہ نے اپنی نوشت میں تہ خانے اور اس زمین دوز حجرے کی نشاندہی ضرور کر دی تھی جہاں پانچ صندوق رکھے گئے تھے لیکن یہ تو بتایا ہی نہیں تھا کہ وہ خفیہ مقام یا تہ خانہ کس عمارت اور مقبرے میں ہے اور وہ مقبرہ کہاں واقع ہے؟ ظاہر ہے مطلوبہ عمارت کی نشان دہی کے بغیر میں خزانے تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

غلام علی قفل ساز کی کہانی کے مطابق وہ عمارت شہر سے کافی دور تھی جہاں اسے لے جایا گیا اور کوئی مقبرہ تھا۔ مگر غلام علی اس کی سمت اور فاصلے کا تعین نہیں کر سکا تھا۔ اب وہی مشکل مجھے درپیش تھی کہ مطلوبہ مقبرہ شہر سے کس رخ اور کتنے فاصلے پر ہے؟

یادداشتوں کی کتاب میں جسے میں نے محفوظ کر لیا تھا، معرفت کی زبان میں لکھی گئی پراسرار عبارت اور میرے نام اور لقب کے اعداد کے سوا اور کوئی اشارہ نہ تھا کہ وہ عمارت یا مقبرہ کہاں واقع ہے؟ اصل مدعا میرے ہاتھ آ گیا لیکن مقامِ مدعا نامعلوم تھا۔

اب میرا اضطراب بتدریج بڑھ رہا تھا کہ حالات کا دھارا مجھے ساحل کے آس پاس لے آیا ہے لیکن میں ساحل پر اُتر نہیں سکتا کیونکہ ساحل دکھائی نہیں دے رہا۔ منزل کے قریب پہنچ گیا ہوں مگر میرے چاروں طرف اندھیرا ہے اور منزل نظر نہیں آتی۔ اسی اضطراب کی کیفیت میں جیب سے فارسی عبارت نکال کر پڑھنے لگا، جسے میں نے الگ کاغذ پر نقل کر لیا تھا اور پہلے ہی فقرے پر چونک اُٹھا کہ ''رخ آں بہ سوئے چہل ابدال است۔''

''چہل ابدال'' کے الفاظ سے معاً ان چالیس قبروں کا خیال آیا جو مہرولی کے علاقے میں درگاہ حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ کے مشرق میں واقع اور ''چہل تن، چہل من''[1] کہلاتی ہیں۔ اندر سے آواز آئی کہ ''چہل ابدال'' کے الفاظ بھی چالیس درویشوں کی قبروں کی طرف اشارہ کر رہے ہیں جن کی زیارت کرنے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ ''رخ آں بہ سوئے چہل ابدال است'' کے فقرے کا مطلب یہی تھا کہ اس عمارت یا مقبرے کا دروازہ ''چہل من'' کی جانب ہے۔

اس انکشاف یا ادراک پر میں مسرت کے مارے اُچھل گیا۔ گویا شہنشاہ جنت مکانی نے اپنی فارسی تحریر میں اس عمارت یا مقبرے کی نشاندہی بھی کر دی تھی جہاں خزانہ رکھا گیا تھا۔ اس نوشت کے دوسرے فقرے ''بر مزار اوچہل چراغ روشن اند'' سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ وہ کسی بزرگ کا مزار ہے جس کا دروازہ ''چہل تن، چہل من'' کی جانب کھلتا ہے۔ مزار پر چراغ چالیس بہ موجب ''چالیس حدیث'' روشن ہونے کا اشارہ انہی چالیس قبروں پر

---

[1] قطب صاحب کے مشرق میں ''چہل تن، چہل من'' ان چالیس قبروں کو کہا جاتا ہے جنہیں اگر گنا جائے تو کبھی 39 اور کبھی 41 شمار ہوتی ہیں اور بیشتر لوگ ان کی گنتی میں غلطی کر جاتے ہیں۔ ایک کم گنتے ہیں یا ایک زیادہ جبکہ حقیقت میں وہ پوری چالیس ہیں۔ یہ عجیب بات جناب اخلاق احمد دہلوی نے بتائی۔ (قمر اجنالوی)

آپ لوگ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ایک رازِ سربستہ منکشف ہو جانے کے بعد اس کے اصل مقام کا نہ ملنا میرے لیے کتنی بڑی پریشانی اور مایوسی پیدا کر رہا تھا۔ گھر والے الگ حیران تھے کہ آخر میں ہر روز کدھر جاتا اور شام کو تھکا ہارا کہاں سے آتا ہوں؟ مجھے کون سی مشکل درپیش ہے؟ میری بیوی مہ جمال نے ایک دو بار پوچھا بھی مگر میں نے اسے ٹال دیا۔ آخر بتاتا بھی کیا۔ جس بھید کو شہنشاہ جنت مکانی نے اپنے جانشینوں سے چھپایا اور میرے لیے محفوظ رکھا تھا، اسے بیوی پر کیسے ظاہر کر دیتا؟

❁......❁......❁

ایک روز میں حسبِ سابق حویلی سے نکلنے والا تھا کہ مہ جمال بڑے لڑکے رکن الدین کے ساتھ میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ انہوں نے یہ تو معلوم کر لیا تھا کہ میں دہلی کے ویرانوں، خرابوں، کھنڈروں میں گھومتا اور عموماً مہرولی کی طرف جاتا ہوں لیکن میری ''آوارہ گردی'' کا سبب نہیں جانتے تھے۔ اب مہ جمال نے وہ سوال کیا جس کا جواب میں دینا نہیں چاہتا تھا اور پوچھا۔

''آپ ہر روز مہرولی جاتے اور قبرستانوں میں کچھ ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔ آخر آپ کو کس چیز کی تلاش ہے؟''

میں نے اپنی بیوی اور اولاد کے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جو بات انہیں بتانا نہ چاہتا، اس کا جواب ذومعنی الفاظ میں دیتا تھا تاکہ جھوٹ بولنے سے بچ جاؤں اور وہ بھی معاملے کی تہ کو نہ پہنچ سکیں۔ ذومعنی الفاظ کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ بات کھٹائی میں پڑ جائے اور اصل معاملہ نہ کھلے مگر اس روز میں نے ذومعنی الفاظ استعمال کرنے کی بجائے مہ جمال کے سوال کا بالکل صحیح جواب دیا اور کہا۔

''مجھے مہرولی میں ایک مقبرے کی تلاش ہے۔''

یہ صاف جواب سن کر دونوں ماں بیٹا حیرت زدہ رہ گئے اور میں نے بہ یک وقت دونوں کی زبان سے ایک ہی بات سنی۔ ''مقبرے کی تلاش؟''

میرا دوسرا جواب بھی اگرچہ درست تھا لیکن بات آپ سے آپ ایک ذومعنی رنگ اختیار کر گئی۔ ''بے شک مجھے ایک مقبرے کی تلاش ہے۔ مہرولی پرانے خرابوں، قبرستانوں، مقبروں اور مزاروں کی دنیا ہے۔ وہاں بہت سے تاریخی مقابر ہیں مگر کچھ عمارتیں، کچھ نشانیاں وقت کی گرد میں گم ہو گئی ہیں اور مجھے ایک ایسی ہی گمشدہ عمارت کی جستجو ہے۔''

دونوں میں سے کسی نے یہ تو نہیں پوچھا کہ مجھے کس عمارت یا مقبرے کی جستجو ہے اور کیوں؟ تاہم مہ جمال نے ایک ایسی بات بتائی جسے سن کر میں حیران و ششدر رہ گیا۔ اس نے کہا۔ ''ہوسکتا ہے وہ عمارت اس زلزلے میں ڈھے گئی ہو جو اکبر شاہ ثانی کے عہد میں آیا تھا۔ اس زلزلے میں بہت سی پرانی عمارتیں اور کچھ بوسیدہ مقبرے زمین بوس ہو گئے یا کھنڈروں میں بدل گئے تھے۔''

اس نے مجھے جس زلزلے کی یاد دلائی تھی، وہ تب آیا تھا جب ہم دونوں آگرہ میں تھے۔ کیونکہ مہ جمال زچگی کے ایام پورے کر رہی تھی۔ ہمارے ہاں پہلا بچہ رکن الدین پیدا ہوا تھا اور اس وقت وہی اپنی ماں کے ساتھ مجھے روکے کھڑا تھا۔ جب ہم آگرہ سے دہلی آئے تو سنا تھا کہ کہیں پرانی اور بوسیدہ عمارات ڈھے گئی ہیں۔ ویسے بھی وہ پرانی عمارتیں جن کی مرمت اور دیکھ بھال نہ ہو، مرورِ ایام اور موسموں کی شدت کا زیادہ عرصہ مقابلہ نہیں کر سکتیں اور

قبریں چالیس ہی ہیں پھر بھی ''چہل ابدال' والی شرط کو پورا کرنا ضروری سمجھا اور چالیس قبریں خود شمار کیں پھر چاروں اطراف کا جائزہ لیا کہ دیکھوں کون سے مقبرے کا دروازہ ''چہل ابدال'' کی جانب ہے تو ایک نئی اُلجھن سے دوچار ہوا۔

میرے اردگرد ایک وسیع قبرستان دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور قرب و جوار میں کوئی ایسا مقبرہ نہ تھا جس کی مجھے تلاش تھی۔ البتہ کچھ فاصلے پر معمولی روضے اور مزار واقع تھے۔ وہ کچھ اتنے پرانے بھی نہ تھے اور نہ ان میں سے کسی پر ''مقبرے'' کا اطلاق ہوتا تھا۔ بس بعض قبروں پر روضے تعمیر کر دیئے گئے تھے۔ بعض قبروں کے اردگرد چار دیواری کھڑی تھی۔ شمال کی جانب دور دور کچھ پرانے مقابر دکھائی دے رہے تھے۔ مغربی سمت بڑے وسیع رقبے پر قطب صاحب کی عظیم الشان درگاہ اور اس کی مزین دیوار تھی۔ پرے شاہ عالم ثانی اور اکبر شاہ ثانی کے مدفن تھے۔ ایک طرف ہٹ کر خلجی حکمرانوں کے قدیم مقبرے تھے جن کا سنگ مرمر شاہانِ اودھ نے اُکھاڑ لیا تھا اور وہ ''ننگے بچے'' ہو گئے تھے۔

وہ پرانے تاریخی مقابر بھی جو مہرولی کے میلوں تک پھیلے علاقے میں واقع ہیں، ''چہل تن، چہل من'' سے بہت دُور دُور تھے اور ان کا رخ یا تو دہلی کی جانب تھا یا درگاہ حضرت قطب صاحب کی طرف جو اس علاقے کا سب سے مقدس اور مرکزی مقام ہے جب کہ مجھے ایک ایسے قدیم مقبرے کی جستجو تھی جو ''چہل ابدال'' سے چند فرلانگ یا زیادہ سے زیادہ پون ایک میل کے فاصلے پر ہوتا۔

سوچا، مقبرہ خواہ دور ہی کیوں نہ ہو، اس کا رخ ''چہل تن چہل من'' کی جانب ہونا چاہئے۔ کیونکہ شہنشاہ کی فارسی نوشت میں کسی فاصلے کا ذکر تو نہیں کیا گیا۔ پھر بھی میرا دل اس توجیہہ کو پسند نہ کرتا اور کسی قریبی مقبرے کا متلاشی تھا جو آس پاس کہیں نہ تھی۔ اب ایک ہی صورت تھی کہ میں مہرولی کے علاقے میں گھوموں اور کوئی ایسا مقبرہ ڈھونڈوں جو بے شک دور ہو مگر اس کا دروازہ انہی چالیس قبروں کی جانب ہو۔

میں گھوڑے پر سوار ہو کر مطلوبہ مقبرے کو ڈھونڈنے نکلا۔ تین مقبرے دیکھے مگر تینوں کے رخ کسی اور جانب تھے۔ سہ پہر کے وقت مایوس و ناکام گھر لوٹا۔ تاہم ذہن میں پریشانی کے ساتھ ساتھ ایک لگن بھی تھی کہ مجھے بہر صورت وہ مقبرہ اور مقام تلاش کرنا ہے۔ یہ کام کوئی ایک دو دن کا نہیں تھا اور خواہ کتنا ہی عرصہ لگ جاتا، مجھے یہ مشکل اور اہم کام سرانجام دینا تھا۔

میں روز گھر سے نکلتا اور مہرولی کی خاک چھانتا رہا۔ خلجی اور لودھی سلاطین کے علاوہ سلطان التمش، ناصر الدین محمود اور مغل سرداروں اودھم خان اور عبدالرحیم خان خاناں کے مشہور مقبرے بھی دیکھ لیے جن پر ''رخ آں بہ سوئے چہل ابدال است' والی شرط پوری نہ اُترتی تھی۔ حتیٰ کہ میں ان غیر معروف مقبروں پر بھی گیا جو دہلی اور مہرولی کے درمیان کئی خرابوں میں دور و نزدیک واقع ہیں اور جہاں جانا محض بے کار تھا کیونکہ وہ مقبرے مہرولی کے اصل مقام سے کئی کئی میل دور تھے اور میرے مقصد سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا لیکن میرے سر پر اپنے مطلوبہ مقبرے کو ڈھونڈنے کی کچھ ایسی دُھن سوار تھی کہ میں دہلی کے اردگرد بیس بیس میل تک پھیلے خرابوں، ویرانوں اور کھنڈروں میں اس لیے گھومتا رہا کہ شاید ''چہل ابدال'' کے اشارے کا مطلب کچھ اور ہو لیکن لگاتار ایک ماہ کی تلاش کا حاصل صفر تھا۔

بکھری ہوئی ہے، کیوں نہ اس تاریخ کو جمع کیا جائے جس سے کیلو کھری اور مہرولی کے قدیم آثار پر ایک معلوماتی کتاب تیار ہوسکتی ہے۔

میں بلدیہ کے دفتر پہنچا تو مہتمم نے بڑی آؤ بھگت کی مگر جب اپنی آمد کا مقصد بیان کیا کہ مجھے مہرولی خاص طور پر ''چہل تن، چہل من'' کے گرد و نواح میں پرانے اور پیوند زمین ہو جانے والے مقابر کے متعلق معلومات درکار ہیں تو حیران سا رہ گیا اور بتانے لگا کہ اگر وہاں پرانے مقبرے بھی تھے جو ڈھے گئے تو ان کے بارے میں کچھ نہیں جانتا نہ دفتر میں ان کا کوئی اندراج ہے۔ البتہ چند مخصوص مقابر کی تعمیر و مرمت کے لیے بادشاہ کی طرف سے کبھی کبھار کچھ رقم ملتی ہے۔ ان مخصوص مقابر میں درگاہ حضرت قطب صاحب، درگاہ حضرت نظام الدین اولیا، درگاہ حضرت چراغ دہلی، درگاہ حضرت کالے صاحب، مزار حضرت امیر خسرو اور مقبرۂ ہمایوں وغیرہ شامل ہیں۔

یہ اطلاع مایوس کن تھی کہ بلدیہ کے پاس زمین بوس ہو جانے والے پرانے مقابر کا کوئی اندراج نہیں۔ اب مطلوبہ معلومات حاصل کرنے کا واحد ذریعہ آثارِ قدیمہ کا محکمہ تھا مگر بلدیہ کے مہتمم نے بتایا کہ وہاں بھی ایسے تباہ شدہ مقبروں کا کوئی ریکارڈ نہیں جن کی مجھے جستجو ہے۔ وہ خود چند سال محکمہ آثارِ قدیمہ میں کام کر چکا اور جانتا تھا کہ اس محکمے کو زیادہ تر قدیم سلاطین کی تعمیر کردہ عمارات، ان کے مقابر، پرانے زمانے میں استعمال ہونے والے ہتھیاروں، لباس اور قدیم نوادرات سے دلچسپی ہے اور وہ عام مقبروں کے بارے میں معلومات نہیں رکھتا۔

دہلی میں آثارِ قدیمہ کا محکمہ کمپنی سرکار نے اکبر شاہ ثانی کے دور میں قائم کیا تھا اور انگریز مسلم دور سے قبل قدیم ہندو تہذیب اور اس کے آثار سے زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ محکمہ آثارِ قدیمہ سے متعلق بلدیہ کے مہتمم کا بیان سن کر مجھے مزید مایوسی ہوئی۔ اس نے جو کچھ بتایا وہ درست تھا۔ سرکار انگلشیہ نے اسلامی دور کی صرف تاریخی عمارات کو اہمیت دی تھی جن میں دہلی کا قطب مینار، لال قلعہ، جامع مسجد، مقبرۂ ہمایوں اور چند عمارتیں شامل تھیں یا پھر آگرے کا تاج محل، فتح پور سیکری کا قلعہ، لاہور کا شاہی قلعہ، مقبرۂ جہانگیر وغیرہ قابل ذکر تھا۔ ورنہ دہلی اور ہندوستان کے دوسرے شہروں میں پرانی مغلیہ عمارات کسمپرسی کی حالت میں پڑی تھیں اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ لہٰذا مہرولی کے قبرستان میں ''چہل تن، چہل من'' کے گرد و نواح میں مسمار ہونے والے کسی مقبرے کے متعلق آثارِ قدیمہ کے محکمے سے معلومات ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

میں نے آثارِ قدیمہ کے محکمے میں جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اس کی ایک اہم وجہ یہ بھی تھی کہ کسی مسمار شدہ مقبرے کے بارے میں میری پوچھ گچھ یا تحقیق و تفتیش شبے کا باعث بھی بن سکتی تھی۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بلدیہ کے مہتمم نے پوچھ لیا۔

''مہرولی میں بیسیوں کھنڈر اور ٹیلے ہیں مگر معلوم ہوتا ہے آپ کسی خاص مقبرے یا اس کے آثار میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں اس دلچسپی کی وجہ دریافت کر سکتا ہوں؟''

میرے جسم میں سنسنی کی ایک لہر دوڑ گئی لیکن مہتمم کو بھی وہی جواب دیا جو پہلے بیوی اور بیٹے کو دے چکا تھا۔

''میں کیلو کھری اور مہرولی میں ایک گم شدہ تاریخ ڈھونڈ رہا ہوں۔''

وہ میرے جواب سے بڑا متاثر ہوا اور بولا۔ ''کاش! اس تلاش میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا۔''

میں وہاں سے بھی شکستہ دل ہو کر لوٹا اور سوچنے لگا، ممکن ہے ''چہل ابدال'' کا مطلب کچھ اور ہو جسے میں غلطی

آہستہ آہستہ اس درجہ کمزور ہو جاتی ہیں کہ بعض اوقات زلزلے کا ایک معمولی جھٹکا ہی انہیں پیوند زمین کر دیتا ہے۔

اب مجھے یاد آیا کہ آگرہ سے واپس آ کر میں نے اس قسم کی باتیں سنی تو تھیں لیکن کاروبار میں اس قدر مصروف تھا کہ مجھے ایسی باتوں پر توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ 1837ء میں جب میں اکبر شاہ ثانی کی میت کے ہمراہ مہرولی پہنچا جہاں انہیں شاہ عالم ثانی کے مقبرے کے قریب دفن کیا گیا تھا تو بھی اس علاقے میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کو نہ دیکھ سکا اور لوگوں کے ایک ہجوم کے ہمراہ شہر لوٹ آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کئی سال کے بعد مطلوبہ مقبرے کی تلاش میں مہرولی پہنچا تو وہ قصبہ مجھے بدلا بدلا نظر آیا تھا۔ درحقیقت وہاں کئی بوسیدہ مقبرے اور نیم شکستہ کھنڈر ملبے کا ڈھیر بن چکے تھے۔ میں نے مہرولی کے قبرستانوں میں جو روضے یا چھوٹی چھوٹی چار دیواریوں میں گھرے ہوئے مزار دیکھے، وہ سب زلزلے کے بعد تعمیر ہوئے تھے۔

مہ جمال کا خیال تھا کہ زلزلے کی یاد دہانی پر میں اس مقبرے کو بھول جاؤں گا جس کی تلاش میں مہرولی جاتا اور ایک مہینے سے بھٹکتا پھرتا ہوں۔ کیونکہ وہ بھی ڈھے گیا اور ملبے کا ڈھیر بن چکا ہوگا جس کی تلاش بے کار تھی۔ اس کی بات سن کر میں ایک نئی حیرت سے دوچار ہوا اور مجھے حیران و ششدر سا دیکھ کر وہ پوچھنے لگی۔ ''آپ کو کس مقبرے کی تلاش ہے؟''

میں اس سوال کا جواب دینا بھی چاہتا تو نہیں دے سکتا تھا۔ مجھے خود معلوم نہ تھا کہ وہ مقبرہ کس کا ہے؟ اب میں نے ایک نیا پہلو اختیار کیا۔ ''مہرولی اور کیلوکھری میں کئی اولیاء کے مزار، کئی سلاطین کے مقبرے، کئی مشہور ہستیوں کے مدفن ہیں۔ ہمارا ماضی انہی مزاروں، مقبروں، مدفنوں کی صورت بکھرا ہوا ہے۔ اگر وہاں گم ہو جانے والے مقبروں اور عمارتوں کو ڈھونڈ کر ان کے حالات رقم کیے جائیں تو ایک تاریخ تیار ہو سکتی ہے۔''

میں بنیادی طور پر ایک محرر تھا۔ اسی بنا پر بہادر شاہ ظفر نے بھی مجھ سے مغلوں کے آخری دور کی تاریخ لکھنے کے لیے کہا تھا جبھی بیوی اور بیٹے نے میری بات پر کسی تعجب کا اظہار نہ کیا البتہ رکن الدین نے کہا۔

''بابا جانی! اس مقصد کے لیے مہرولی کے خرابوں میں بھٹکنے کی کیا ضرورت ہے؟ بلدیہ دہلی کے محکمے میں تمام مقبروں کی فہرست ہوگی۔ محکمہ یہ بھی جانتا ہوگا، کون سا مقبرہ ڈھے چکا اور کون سی عمارت پیوند زمین ہو گئی ہے۔''

رکن الدین کی بات میرے دل کو لگی کہ بلدیہ کے محکمے میں خاص مزاروں اور مقبروں کا ریکارڈ ضرور ہوگا۔ بعض مشہور مقابر کی تعمیر و مرمت بھی ہوتی رہتی تھی اور شاہی اخراجات میں ان کی مرمت وغیرہ کے لیے کچھ رقم بھی مخصوص کی جاتی تھی اس لیے محکمے میں پرانے مقابر وغیرہ کا ریکارڈ ضرور ہونا چاہئے جس سے معلوم ہو سکے گا کہ کون کون سے مقابر شاہی فہرست میں شامل ہیں۔ شاہ عالم ثانی جنت مکانی نے جس مقبرے کو ایک اہم مقصد کے لیے منتخب کیا تھا، وہ کوئی معمولی مقبرہ نہیں ہوگا اور اب مجھے یہ معلوم کرنا تھا کہ مطلوبہ مقبرہ کب گرا اور اس کا ملبہ ''چہل ابدال'' کی کس جانب پڑا ہے؟

اچانک خیال آیا کہ بلدیہ کے علاوہ قدیم عمارات کا ریکارڈ تو آثارِ قدیمہ کے محکمے سے بھی دستیاب ہو سکتا ہے۔ تاہم پہلے بلدیہ دہلی ہی کے دفتر کا رخ کیا۔ میری بیوی اور بیٹا یہی سمجھے کہ میں ماضی کے آثار اور مقابر سے اس لیے دلچسپی رکھتا ہوں کہ ان کے بارے میں کچھ لکھ سکوں۔ یہ بات کچھ غلط بھی نہ تھی۔ مسلسل ایک مہینہ دہلی کے خرابوں، ویرانوں، قبرستانوں اور کھنڈروں میں بھٹکتے ہوئے میں نے کئی بار سوچا تھا کہ ان خرابوں میں عظیم تاریخ

(14)

تلاشِ بے سود

اب پھر مہرولی کا راستہ تھا مگر اس مرتبہ مہ جمال اور رکن الدین نے کوئی مزاحمت نہ کی۔ غالباً ماں بیٹے نے فیصلہ کر لیا تھا کہ میں ماضی کے گم شدہ اوراق تلاش کرنے میں سرگرم ہوں تو مجھے روکا نہ جائے۔ 88، 89 برف کے بوڑھے کی زندگی میں کسی دلچسپی اور سرگرمی کا ہونا ضروری ہے کیونکہ وہی سرگرمی اور تگ و دو اس کی بوڑھی نبضوں میں خون کی روانی قائم رکھتی ہے۔ ان کا یہ فیصلہ میرے حسبِ حال تھا۔

اب کے میں نے مہرولی کے قبرستان کا بغور جائزہ لیا اور کچھ شکستہ کھنڈر، ملبے کے ڈھیر اور ٹیلے دیکھے جن پر گزرے سالوں اور بیتے موسموں نے اپنے اثرات چھوڑے تھے۔ سنگ وخشت کے بعض ڈھیر خاموشی کی زبان میں اپنی بربادی پر خود ہی نوحہ کناں تھے۔ البتہ ٹیلوں پر گھاس اور جھاڑیاں اُگ رہی تھیں۔ میں اگرچہ پہلے بھی ان کے درمیان سے گزرا تھا مگر کبھی خیال ہی نہ آسکا کہ میرے مطلوبہ مقبرے کا ملبہ بھی ایسے ہی کسی ڈھیر یا ٹیلے میں تبدیل ہو چکا ہوگا۔ یہ بات تو اس زلزلے سے کھلی تھی جس کا ذکر مہ جمال نے کیا تھا۔

ہندوستان میں زلزلے اکثر آتے رہتے ہیں۔ بعض علاقوں میں شدید، بعض علاقوں میں ہلکے۔ مجھے یاد آیا، سلطان سکندر لودھی نے 1504ء میں آگرہ کی تعمیر شروع کرائی۔ شہر کی تکمیل پر اسے اپنا دارالسلطنت قرار دیا۔ مگر 1575ء میں ایک شدید بھونچال نے شہر کو تہ و بالا کر ڈالا جس پر آگرہ کی ازسرِنو تعمیر ہوئی تھی۔

مغلیہ دور میں بھی کئی شہروں کو زلزلوں سے نقصان پہنچا تھا۔ پھر شدید بارشوں سے کمزور عمارتیں بیٹھ جاتی تھیں۔ کیلوکھری اور مہرولی میں پرانی اور بوسیدہ عمارتیں زلزلوں اور بارشوں کا شکار ہوئیں اور کھنڈروں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ قطب مینار کی آخری منزل چھتری نما تھی مگر وہ بجلی گرنے سے تباہ ہوئی اور بعد ازاں اس کی مرمت کی گئی۔ حملہ آوروں کے علاوہ ارضی اور آسمانی آفات نے بھی دہلی کو کئی بار تباہ کیا تھا اسی لیے بیس بیس میل تک خرابے، ویرانے اور کھنڈر پھیلے تھے۔

''چہل تن، چہل من'' کے قبرستان میں جو دریائے جمنا کی جانب ہے، قبروں اور مٹی کی ٹوٹی پھوٹی ڈھیریوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ البتہ اس کے گرد و نواح میں کافی فاصلے پر کچھ ٹیلے بھی نظر آئے جو یقیناً ملبے کا ڈھیر اور مختلف اطراف میں واقع تھے۔ کوئی شمال میں تو کوئی مغرب میں۔ حتیٰ کہ سنگ وخشت کا ایک بڑا ڈھیر جنوب

سے ''چہل تن، چہل من'' سمجھ بیٹھا ہوں۔ تصوف کی اصطلاح میں دہلی کا سب بڑا درجہ قطب ہوتا ہے اور صوفیا کے نزدیک ابدال کا درجہ پانچواں ہے۔ وہ چھپا ولی ہوتا ہے۔ ابدال کی تعداد کے متعلق بھی اختلاف پایا جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے، ابدال چالیس ہوتے ہیں۔ کوئی ان کی تعداد ستر بتاتا ہے۔ کسی کے نزدیک ان کی تعداد تین سو ہے۔ تاہم ''چہل ابدال'' کی روایت زیادہ مشہور ہے اور جب دہلی میں کوئی شخص اس طرف اشارہ کرے گا تو اس کا مطلب لازماً ''چہل تن، چہل من'' ہوگا اور اشارے کے اعتبار سے میں نے جو نتیجہ اخذ کیا وہ غلط نہیں ہوسکتا تھا۔ البتہ ابدال کے اصل معنی بدل یا متبادل سے عبارت ہیں اور ''چہل ابدال'' سے کسی متبادل مقام کا تصور اس لیے ذہن میں نہیں آتا تھا کہ شاہ عالم ثانی کی ''تحریر معرفت'' میں کسی مقام کی نشان دہی نہیں کی گئی تھی۔ صرف ''چہل ابدال'' کا اشارہ دیا گیا تھا اور اس سے میرے نزدیک صرف ''چہل تن چہل من'' کا ذکر مقصود تھا۔

یہ سوچ کر میں مطمئن ہوگیا کہ میرا مطلوبہ مقبرہ جو یقیناً مسمار اور زمین بوس ہو چکا ہے ''چہل تن، چہل من'' ہی کے گرد و نواح میں ہونا چاہئے اور مجھے وہیں اس کا کھوج لگانا ہوگا۔

❁......❁......❁

سے مایوس ہو گئے تھے جبھی کسی بیٹے اور پوتے کو اس قابل نہیں سمجھا تھا کہ مرنے سے پہلے اسے ایک اہم راز سے آگاہ کر جاتے۔ بہادر شاہ ظفر کے بارے میں میری ذاتی رائے ہمیشہ یہی رہی ہے کہ حالات نے انہیں کئی رسیوں میں باندھ رکھا ہے اور وہ ان رسیوں سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتے۔ جو بادشاہ بیگمات کے زیر اثر ہو اور بے تدبیر وزیروں، مشیروں اور نا اہل خواجہ سراؤں میں گھرا رہے وہ کوئی بڑا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ فیصلہ کر بھی لے تو اس پر قائم نہیں رہتا۔ اس کے علاوہ بادشاہ میں کوئی ایسی خوبی اور خصوصیت بھی نظر نہیں آتی تھی جو خاندانِ تیمور کو ادبار کے بھنور سے نکال سکے۔

انہیں اپنے راز میں شریک کرنا اور حصولِ مقصد کے لیے مدد لینا کسی پہلو سے مناسب نہ تھا۔ اگر مدفون خزانہ مل جاتا تو تاج و تخت کا وارث ہونے کے ناتے وہ اس پر اپنا حق فائز سمجھتے اور ساری دولت بیگمات کی فرمائشوں، شہزادوں کے مطالبوں، قرض خواہوں کے تقاضوں اور اللوں تللوں میں ضائع ہو جاتی۔ پھر ان کے اردگرد انگریز کے خیر خواہ او جاسوس بکھرے رہتے بلکہ صلاح مشورہ بھی دیتے تھے۔ وہ انہیں سرکار انگلشیہ سے لڑنے کا مشورہ کس طرح دے سکتے تھے؟ اگر دیتے بھی تو خود ہی فرنگی سرکار کو سارے معاملے کی اطلاع بھی پہنچاتے۔ ان حالات میں بہادر شاہ ظفر کا نام اپنے ذہن سے خارج کر دیا۔

دوسری شخصیت جس سے میں مدد حاصل کر سکتا تھا، ولی عہد مرزا فخرالدین فتح الملک کی تھی جو اسلامی احکام سے دلچسپی رکھتے اور اپنے دوسرے بھائیوں سے مختلف تھے۔ اسی لیے میں انہیں پسند کرتا اور ولی عہدی کے جھگڑے میں ان کی حمایت کر چکا تھا۔ مگر مرزا فخرو پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ وہ فرنگی کی مدد سے ولی عہد بنے اور یہ وعدہ کر چکے تھے کہ اگر ان کے لیے بادشاہ کا خطاب برقرار رکھا گیا تو لال قلعہ خالی کر کے مہرولی میں آباد ہو جائیں گے اور وہیں اپنا دربار لگایا کریں گے۔

ایک ایسا شخص جو انگریز کے ذریعے بادشاہی حاصل کرنے کا طلب گار ہو اور اپنے بزرگوں کا قلعہ خالی کرنے پر تیار ہو جائے جس پر مغلیہ خاندان کی رہی سہی عزت کا انحصار تھا، سلطنت کی بحالی کی خاطر فرنگی کے خلاف آزادی کی جنگ نہیں لڑ سکتا تھا۔ پھر عیش و عشرت کے معاملے میں مرزا فخرالدین بھی دوسرے شہزادوں سے پیچھے نہیں تھے۔ ان باتوں کے علاوہ ایک بات سراسر ان کے خلاف جاتی تھی۔ وہ نواب شمس الدین خان لوہارو کی بیوہ بیگم شوکت محل سے شادی کر چکے تھے اور شوکت محل، نواب مرزا الٰہی بخش کی دختر ہیں جبکہ مرزا الٰہی بخش کا انگریز سے جو تعلق ہے وہ مجھ سے اوجھل نہیں تھا۔

مرزا الٰہی بخش سے دامادی کا رشتہ ولی عہد کی زندگی میں ایک ایسا سوراخ تھا جس سے ''فرنگی آنکھ'' ہر وقت ان کے اندر جھانک سکتی تھی اور مرزا الٰہی بخش انہیں کبھی سرکار انگلشیہ سے نبرد آزما نہ ہونے دیتا۔ اسی اندیشے کی وجہ سے میرے دل و دماغ نے اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کی طرح ولی عہد مرزا فخرو کو بھی شریک راز بنانے سے انکار کر دیا۔

بادشاہ کے بھائی مرزا جہانگیر سلیم کا خیال آیا۔ انہیں فرنگی سے شدید نفرت تھی اور اس سے چھٹکارا چاہتے تھے۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ اکبر شاہ ثانی دراصل انہی کو اپنا جانشین بنانا چاہتے تھے مگر مرزا جہانگیر نے ایک مرتبہ غصے میں انگریز ریذیڈنٹ سٹین صاحب پر گولی چلا دی اور اسے لولو (بے وقوف، احمق) کہا تھا جس پر

کی طرف بھی سر اٹھائے کھڑا تھا مگر میں یہ نہیں جانتا تھا کہ جس مسما شدہ مقبرے کی تلاش ہے وہ کس جانب واقع ہو گا؟''

اب مجھے عقل پر بھروسہ کرنا اور اس کی رہنمائی میں ایک ایسے خرابے تک پہنچنا تھا جہاں زیرِ زمین پانچ صندوق مقفل کیے گئے تھے۔ میری دانش نے سنگ وخشت کے اس ڈھیر کی طرف اشارہ کیا جو تقریباً پون میل جنوب میں کسی شکستہ اور تباہ شدہ مقبرے ہی کا نقشہ پیش کر رہا تھا۔ ادھر کچھ زرد چٹانیں اور درخت بھی تھے۔ میری سمجھ بوجھ کے مطابق ایسے ویران اور گنجان مقامات خفیہ مقاصد کے لیے بڑے موزوں ہوتے ہیں چنانچہ گھوڑے پر سوار اسی جانب ہو لیا۔

سنگ وخشت اور مٹی کا ڈھیر قطب صاحب کی درگاہ کے جنوب مشرق مگر ''چہل تن، چہل من'' کے عین جنوب میں تھا۔ پشت پر زرد چٹانیں تھیں اس لیے عقل کہہ رہی تھی اس کا دروازہ قبرستان ہی کے رخ بنا ہو گا۔ قریب جا کر دیکھا تو اس کی ساخت کا اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ ملبے نے بنیادوں کو پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا اور ملبہ ہٹا کر ہی معلوم کیا جا سکتا تھا کہ اس کے نیچے کوئی تہ خانہ ہے بھی یا نہیں؟ آثار وقرائن سے پتہ چلتا تھا کہ یہی میرا مطلوبہ مقبرہ ہے تاہم واپسی پر میں نے ان دونوں ٹیلوں کو بھی دیکھ لیا جو میرے مرکزی محل وقوع کے مغرب اور شمال میں واقع تھے۔ ان میں مغربی جانب والا ٹیلا کافی بڑا اور سرسبز تھا۔ اس پر مٹی کی موٹی تہ جم چکی تھی اور لمبی لمبی گھاس میں اینٹ پتھر چھپ گئے تھے۔ بنیاد کے ساتھ ایک گہری کھائی بن چکی تھی اور جھاڑ جھنکاڑ سے بھری تھی۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا کہ وہ عمارت شاید شاہ عالم ثانی جنت مکانی کے عہدِ حکومت سے بھی بہت پہلے پیوند زمین ہو چکی تھی۔ ٹیلے کی ہیئت بتا رہی تھی کہ اس پر برسات کے اسّی نوّے موسم ضرور گزر چکے ہوں گے۔ ظاہر ہے اتنا پرانا ٹیلا میرے دائرۂ عمل سے باہر تھا۔ مجھے تو کسی ایسی عمارت یا مقبرے کے خرابے سے دلچسپی ہو سکتی تھی جو شاہ عالم کی رحلت کے بعد اکبر شاہ ثانی کے دور میں زمین بوس ہوا ہو۔

میرے محل وقوع کا شمالی ٹیلہ مہرولی سے دہلی جانے والی سڑک سے تقریباً ایک میل ہٹ کر جانب مشرق تھا اور ملبے کے اس ڈھیر پر بھی کہیں کہیں جڑی بوٹیاں اور آک کے پودے اُگ چکے تھے۔ ان تینوں خرابوں یا ڈھیریوں کو دیکھ کر میں لوٹ آیا اور محسوس کرنے لگا کہ اب مجھے ایک ایسے ساتھی کی ضرورت ہے جو حصولِ مقصد میں میری مدد کر سکے اور اس کی شخصیت ایسی ہو کہ مہرولی میں کھدائی کا کام ہو تو کوئی طاقت اس کام میں حارج نہ ہو سکے۔

ظاہر ہے دہلی میں ایسی شخصیت اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کے علاوہ اور کوئی نہ تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے کئی سال چھوٹے ہیں مگر چھوٹی عمر ہی سے مہرولی میں آتے جاتے رہے اور اس علاقے میں مدفون بزرگانِ دین سے بڑی عقیدت رکھتے ہیں۔ مغلیہ سلطنت پر نہ سہی لیکن دہلی پر ان کا حکم چلتا تھا۔ علاوہ ازیں وہ کسی ایسے مقبرے اور اس کے نام سے بھی ضرور واقف ہوں گے جو شاہ عالم ثانی کی وفات تک قائم رہا لیکن اکبر شاہ ثانی کے دور میں زمیں بوس ہو گیا ہو۔ ان کے ذریعے میں اپنے مطلوبہ مقام تک با آسانی پہنچ سکتا تھا مگر بادشاہ سے مدد حاصل کرنے کا مطلب انہیں اپنے راز میں شریک کرنا تھا اور یہ بات مجھے پسند نہ تھی۔

شاہ عالم نے اپنی زندگی ہی میں مغل شہزادوں اور سرداروں کے متعلق کچھ معلومات حاصل کر لی تھیں اور ان

رکھتے تھے کہ بادشاہ کسی مجبور و بے بس پرندے کی طرح فرنگی طاقت کے پنجرے میں بند اور صرف ''وظیفے کی چُوری'' کھاتے ہیں۔ البتہ تعلیم یافتہ اور باشعور افراد حقیقتِ حال سے پوری طرح واقف اور جانتے تھے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار جس کے پیچھے انگلستان کی زبردست بحری طاقت کھڑی تھی، کس طرح ہندوستانی سلطنتوں اور ریاستوں کو غلامی کے شکنجے میں کستی جا رہی ہے۔

چھ ماہ کے اندر تقریباً ایک سو آدمی میرے ہم خیال بن چکے تھے۔ کسی بھی خفیہ تحریک کے لیے رازداری پہلی شرط ہوتی ہے اور ہم لوگ اس معاملے میں بڑے محتاط تھے۔ آدمیوں کی ایک قسم ہوتی ہے جو بولتی ہے۔ آدمیوں کی دوسری قسم ہوتی ہے جو سنتی ہے۔ مگر آدمیوں کی ایک تیسری قسم بھی ہوتی ہے جو نہ بولتی ہے، نہ سنتی ہے بلکہ صرف کام کرتی ہے اور کسی بھی تحریک کو آخر الذکر آدمیوں کی ضرورت ہوتی ہے جو گونگے بہرے بن کر اپنے مقصد کی دھن میں لگے رہیں۔ میرے ساتھی ایسے ہی تھے۔

میں اس عرصے میں کبھی کبھار مہرولی جاتا اور ملبے کے اس پرانے ڈھیر کا جائزہ لیتا رہا جسے میری دانش نے مقام مدعا ٹھہرایا تھا۔ جنوری (1852ء) میں جب کڑاکے کی سردی پڑتی ہے اور راتوں کو لوگ لحافوں میں پڑے رہتے ہیں، میں نے خفیہ طور پر اس ٹیلے کی کھدائی کا فیصلہ کرلیا۔ محمد صادق بریلوی کی نگرانی میں جو میرے معتمد ساتھی اور ایلچی تھے، اس کام پر صرف دس آدمی لگائے گئے جنہیں صرف راتوں کو کام کرنا تھا۔

میں نے صادق ایلچی کو اصل بات نہ بتائی۔ صرف یہ کہا تھا کہ اس ڈھیر کے نیچے کسی سرنگ یا تہ خانے کی تلاش مقصود ہے اور جونہی اس قسم کے آثار ملیں مجھے فوراً اطلاع کردی جائے۔ میرا خیال تھا کہ آٹھ دس روز میں کسی سرنگ کا نشان مل جائے گا۔ لیکن آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ بڑی رازداری کے ساتھ کھدائی ایک مہینہ جاری رہی اور کسی زیرِ زمین تعمیر کا کھوج نہ مل سکا۔ ماضی کے اُس ڈھیر کے نیچے کوئی تہ خانہ تھا نہ کوئی سرنگ۔ آخر اس ڈھیر کو چھوڑ دیا تھا۔

اس ناکامی سے مجھے جو مایوسی ہوئی، وہ بیان نہیں کرسکتا۔ میرے ساتھی میری مایوسی کا اندازہ نہیں لگا سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں کسی ایسے خفیہ راستے کی تلاش میں ہوں جو زمین کے اندر ہی اندر شہر یا قلعے کے اندر جا نکلتا ہو۔ صادق نے مجھے توجہ دلائی کہ قلعے سے کوئی خفیہ سرنگ شاہدرے کی طرف ضرور جاتی ہوگی مگر میری خاموشی نے اس پر واضح کردیا کہ میں کسی خفیہ راستے کی تلاش میں نہیں بلکہ معاملہ کچھ اور ہے۔

مہرولی کے قبرستان میں مطلوبہ مقبرے کے متعلق میرا پہلا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا مگر شاہ عالم ثانی جنت مکانی کی ''تحریرِ معرفت'' کے مطابق وہ مقام کہیں آس پاس ہی ہونا چاہئے تھا او اس کی تلاش کے بغیر ہماری تحریک نہ آگے بڑھ سکتی اور نہ کوئی مقصد حاصل کرسکتی تھی۔ میں ایک بار پھر مہرولی میں بھٹکنے لگا۔ اب صادق میری آوارہ گردی کا مطلب کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا کہ مجھے ''چہل تن، چہل من'' کے گرد و نواح میں ایک ایسے مقبرے کی تلاش ہے جو اکبر شاہ ثانی کے زمانے میں زمین بوس ہوگیا تھا۔

محل وقوع کے مطابق دوسرا ٹیلا سڑک سے کوئی ایک میل مشرق کی جانب واقع تھا اور اب میری توجہ اس پر تھی۔ مگر ایک روز صادق نے یہ انکشاف کر کے مجھے دم بہ خود کردیا کہ وہاں کسی زمانے میں مندر تھا اور وہ مندر شاہ عالم ثانی کے زمانے میں شدید بارش سے ڈھے گیا تھا۔ شہنشاہ نے اس کی تعمیرِ نو کے لیے ہندوؤں کو رقم دی تھی مگر

کمپنی سرکار اپنے ریذیڈنٹ کی توہین برداشت نہ کر سکی اور مرزا جہانگیر کو الہ آباد جیل میں بھیج دیا گیا تھا۔ اسی بنا پر وہ ولی عہد مقرر نہ ہو سکے اور اکبر شاہ کی رحلت پر سراج الدین بہادر شاہ ظفر بادشاہ مقرر ہوئے۔

مغل شہزادوں میں مرزا جہانگیر میرے مقصد کے لیے سب سے موزوں آدمی تھے۔ اکبر شاہ ثانی کے فرزند اور بہادر شاہ ظفر کے بھائی ہونے کے ناتے لوگ انہیں عزیز رکھتے اور یہ بھی جانتے تھے کہ وہ انگریزی راج پسند نہیں کرتے مگر متلون مزاج شاہر تھے۔ پھر فرنگی کے خلاف آزادی کی جنگ شروع کرنے سے پہلے ضروری تھا کہ بہادر شاہ ظفر کی جگہ انہیں بادشاہ بنایا جاتا اور تخت و تاج کا یہ جھگڑا خاندان میں ایک نئی کشیدگی پیدا کر سکتا تھا۔ مرزا جہانگیر بھائی کے حقِ بادشاہت کو تسلیم کر چکے تھے تاہم اس معاملے سے بھی پہلے اصل بات مطلوبہ خرابے کے تعین اور وہاں سے مدفون خزانہ حاصل کرنے کی تھی جو میرے نزدیک صرف مغلیہ سلطنت کی بحالی کے لیے محفوظ کیا گیا تھا۔

اگر مرزا جہانگیر کو شریک راز بنا کر مہرولی میں کسی مسمار شدہ مقبرے کی کھدائی شروع ہوتی تو بادشاہ کے علاوہ کئی شہزادے بھی ضرور چونکتے اور اس کی وجہ دریافت کرتے۔ میں یہ بھی بتاتا چلوں کہ لوگوں میں شاہ عالم ثانی کے خفیہ خزانے کے بارے میں کچھ غلط ملط باتیں مشہور ہو گئی تھیں اور کبھی کبھار شاہی خاندان میں بھی ان کا ذکر ہوتا تھا اگرچہ خاندان کے ثقہ لوگ ایسی باتوں پر یقین نہیں رکھتے اور انہیں من گھڑت قرار دیتے تھے اس کے باوجود بعض شہزادوں میں تجسس پایا جاتا تھا کہ کیا عجب خفیہ خزانے کی بات[1] درست ہو، وہ اس کی تلاش میں بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ مگر خزانے کا بھید ایسے اسرار میں لپٹا ہوا تھا کہ کسی کا ان اسرار تک پہنچنا مشکل بلکہ ناممکن تھا۔

ان حالات میں کسی خرابے کی کھدائی جو مشکلات اور پریشانیاں پیدا کر سکتی تھی، میں انہیں کسی صورت نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ میرے نزدیک کسی کو اس بات کا وہم و گمان بھی نہیں ہونا چاہئے تھا کہ مہرولی میں کسی ٹیلے کی کھدائی ہو رہی ہے۔ دنیا میں ہر بیماری کا علاج ہے حتیٰ کہ پاگل پن اور دیوانگی کا بھی لیکن وہم کا کوئی علاج نہیں۔ پھر وہم بھی ایسا جو سو حقیقتوں پر بھاری ہو۔ عقل کہتی تھی میں کسی کو اس سرنہاں کی ہوا بھی نہ لگنے دوں جو مجھے قدرت کی مہربانی سے معلوم ہو گیا تھا۔ ورنہ سب کچھ میرے ہاتھ سے نکل جائے گا۔

❁......❁......❁

میں کئی روز اسی سوچ بچار میں گم رہا کہ حصولِ مقصد کے لیے کیا طریقہ اختیار کروں؟ آخر اس فیصلے پر پہنچا کہ عجلت سے کام لینے کی ضرورت نہیں۔ سب سے پہلے مجھے ایسے لوگوں کو تلاش کرنا ہو گا جو آزادی کا جذبہ رکھتے اور اس کے لیے قربانی دینے پر تیار ہو۔ منزل کا تعین کر لینے کے بعد وہاں پہنچنے کا راستہ بھی تلاش کر لیا جائے گا۔ چنانچہ دو تین مہینے کی جدوجہد کے بعد میں چند ایسے ساتھی جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا جو فرنگی کو ہندوستان سے نکال دینا چاہتے تھے۔

اس اثنا میں یہ بھی معلوم ہوا کہ دہلی کے اَن پڑھ اور بادشاہ پرست لوگوں کی اکثریت ابھی تک اس غلط فہمی میں مبتلا تھی کہ ان پر مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر ہی حکومت کرتے ہیں اور انگریزوں کی ایسٹ انڈیا کمپنی صرف انصرامِ سلطنت میں ان کی مدد کرتی ہے جس کا معاوضہ اسے دیا جاتا ہے۔ وہ اس حقیقت کو سمجھنے کی استعداد ہی نہیں

---

[1] شاہ عالم ثانی کے خفیہ خزانے کی باتیں 1857ء کے بعد بھی بعض لوگوں میں مشہور رہی ہیں مگر اس دور کے مصنّفین کے نزدیک جن میں خواجہ حسن نظامی بھی شامل ہیں، یہ باتیں قصے کہانی سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتیں۔

ریاستوں کی طرح وہ ہماری سلطنت پر بھی اپنا مکمل حکم و اختیار نافذ کرنے کی سوچ رہا ہے اور ہمیں یہ دکھ کھائے جاتا ہے کہ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کا خاتمہ ہمارے نام پر ہو گا۔''

میں نے محسوس کیا کہ ان کے پیکر میں ایک بوڑھا مغل بول رہا ہے جو مغلوں کے زوال پر دُکھی ہے لیکن کچھ کر نہیں سکتا۔ کیونکہ سیاست اور قوت کی بساط پر مغل اپنی بازی ہار چکے تھے اور سب کچھ کمپنی سرکار کے ہاتھ میں چلا گیا تھا۔

ان دنوں لارڈ ڈلہوزی ہندوستان کا گورنر جنرل تھا جو 1848ء میں اس عہدے پر فائز ہوا۔ اسی نے پنجاب میں سکھوں کی حکومت ختم کی۔ برما کو انگریز کی عملداری کا حصہ بنایا اور کمپنی کی حکومت کے ساتھ ہندوستانی ریاستوں اور علاقوں کے الحاق کا منصوبہ رائج کیا۔ الحاق کے اس منصوبے کا ایک عجیب و غریب دستور یہ بھی تھا کہ جس ریاست کے حکمران کی نرینہ اولاد نہ ہو گی، اس کی وفات پر وہ ریاست خود بہ خود دولت انگلشیہ کا حصہ بن جائے گی۔

کمپنی سرکار نے بہت سی ریاستوں کو حیلے سے غصب کر لیا تھا۔ چنانچہ ستارہ، بنگال کی جنوب مغربی ریاست سنبھل پور، ناگ پور اور جھانسی کی ریاستیں کمپنی کی لوٹ کھسوٹ کا شکار ہوئی تھیں۔ ناگ پور اور جھانسی کا الحاق 1853ء میں ہوا تھا اور اب اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر بتا رہے تھے کہ دہلی کی باری بھی آنے والی ہے۔ میں نے مشورہ دیا۔

''اعلیٰ حضرت! کیا یہ ممکن نہیں کہ جس طرح اودھ میں نواب واجد علی شاہ نے اپنی فوج میں نادری پلٹن اور اختری پلٹن کا اضافہ کیا تھا، اسی طرح حضور بھی اپنی سپاہ میں اضافہ کریں؟''

بادشاہ کے پاس جو محدود سی فوج تھی وہ سیاہ پلٹن، اگرئی پلٹن، بچھیری پلٹن، خاصہ برداروں اور رسالہ داروں پر مشتمل تھی۔ قلعے میں اسلحہ خانہ، توپ خانہ، ماہی مراتب، بخشی خانہ فوج اور صیغہ علاقہ عسکری کے کارخانے بھی تھے مگر اس فوج کی حیثیت زیادہ تر نمائشی یا انتظامی نوعیت کی تھی جو جلوسِ شاہی یا کسی خاص تقریب کے موقع پر سلامی دیتی اور اپنی نمائش کرتی تھی۔ اسلحے میں صرف تلواریں، بھالے اور پرانی توڑے دار بندوقیں تھیں۔ توپیں عموماً سلامی کے گولے داغنے کے کام آتی تھیں۔ یہ مختصر سی فوج نہ تو کسی طاقت ور دشمن کا مقابلہ کر سکتی تھی نہ قدم جما کر کسی میدان میں لڑ سکتی تھی۔ بالخصوص کمپنی سرکار کی تربیت یافتہ فوج کے سامنے تو وہ کسی قطار شمار میں نہ تھی۔

میں نے نواب واجد علی شاہ کے حوالے سے فوج میں اضافے کا مشورہ دیا تو اعلیٰ حضرت شش و پنج میں پڑ گئے۔ سوچا، شاید سلطنت کے مصارف جن کا انتظام فرنگی کے ہاتھ میں تھا، فوج میں اضافے کی اجازت نہیں دیتے لیکن میں ان کا جواب سن کر حیران رہ گیا۔

''برہان الدین! کمپنی سرکار ہماری فوج میں اضافہ کبھی گوارا نہیں کرے گی۔ ہم نے تو سنا ہے کہ کلکتے کے انگریزی اخبار اودھ کی نادری پلٹن اور اختری پلٹن پر نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ انہوں نے لکھا ہے، جب اودھ کی حفاظت کمپنی سرکار کے ذمے ہے تو نواب کو نئی پلٹیں قائم کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ لہٰذا دونوں دیسی پلٹنیں توڑ دی جائیں گی۔ ہمیں یہ بھی خبر ملی ہے کہ کمپنی سرکار اس معاملے میں نواب واجد علی شاہ سے مراسلت کرنے والی ہے۔''

انہوں نے تباہ شدہ مندر دوبارہ تعمیر نہیں کیا بلکہ وہ روپیہ جو شہنشاہ سے ملا، مہرولی میں جوگ مایا مندر پر لگا دیا اور ڈھے جانے والے مندر کا خرابہ اسی حالت میں چھوڑ دیا تھا۔

محمد صادق نے یہ معلومات لالہ شیولال سے حاصل کی تھیں جو بہادر شاہ ظفر کے دفترِ خاص کا محرر رہ چکا تھا۔ شیوٗ لال نے بتایا کہ ہندوؤں کو مندر کی تعمیرِ نو کے لیے روپیہ اس کے دادا کی معرفت ملا تھا جو ان دنوں شہنشاہ کا سرشتہ دار تھا۔ مجھے یاد آیا کہ شاہ عالم ثانی کے دربار میں ایک ہندو محرر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ غالبًا وہی لالہ شیولال کا دادا تھا۔ بہرحال صادق نے دوسرے ٹیلے کے متعلق یہ بتا کر کہ وہ دراصل ایک پرانے مندر کا خرابہ ہے جو شاہ عالم ثانی ہی کے زمانے میں پیوندِ زمیں ہو گیا تھا، میری مایوسیوں اور پریشانیوں میں مزید اضافہ کر دیا اور میں حیران تھا کہ آخر اس مقبرے کا ملبہ کہاں غائب ہو گیا جس کی مجھے تلاش ہے؟

اب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ''چہل ابدال'' کا مطلب سمجھنے اور مطلوبہ مقبرے کے محل وقوع کا اندازہ لگانے میں مجھ سے بھول ہوگئی ہے اور جب تک میں اس مقام کا صحیح پتہ معلوم نہ کرلوں، میرا مہرولی میں مارے مارے پھرنا بے کار ہے۔ منزل پر پہنچنے کے لیے مجھے اس کی سمت اور راستہ معلوم ہونا چاہیے۔

ایک رات میں نے شاہ عالم ثانی کی یادداشتوں پر مشتمل کتاب اپنے صندوق سے نکالی اور اس کی چرمی جلد سے ملحق اوراق کو بہ غور دیکھا کہ شاید کوئی نیا اشارہ مل سکے لیکن کوئی نیا لفظ یا نیا اشارہ نہ مل سکا۔ وہی کتاب تھی، وہی اوراق تھے۔ چرمی جلد سے ملحق آخری صفحے پر وہی فارسی نوشت تھی۔ ایک کونے میں وہی 437=84+353 کے اعداد تھے۔

فارسی نوشت کو لفظاً لفظاً دوبارہ پڑھا اور ''رخ آں بہ سوئے چہل ابدال است'' کا جو مطلب پہلے اخذ کیا تھا وہی اب ذہن میں گرد باد کی طرح چکر کاٹنے لگا گویا اس جملے کے کوئی دوسرے معنی ہو ہی نہیں سکتے تھے مگر ان کا نتیجہ ناکامی اور مایوسی کے سوا اور کیا نکلا تھا؟

❁......❁......❁

دسمبر 1854ء میں اعلیٰ حضرت نے مجھے پھر طلب کیا اور اس تاریخ کے بارے میں پوچھا جس کے لکھنے کی انہوں نے فرمائش کی تھی۔ میں نے بتایا کہ اورنگ زیب عالمگیر عرش آشیانی سے لے کر شہنشاہ عالمگیر ثانی فدوس مکانی تک تحقیقات مکمل ہو چکی ہیں۔ البتہ شاہ عالم ثانی جنت مکانی کے عہد میں رونما ہونے والے حوادث ابھی زیرِ تحقیق ہیں۔ اسی دور سے چونکہ مغلیہ تاریخ ایک نیا رخ اختیار کرتی ہے لہٰذا اس پر زیادہ محنت اور توجہ کی ضرورت ہے اور عنقریب یہ کام بھی مکمل ہو جائے گا۔

اس عرصے میں جب کہ مہرولی کے خرابوں اور ویرانوں میں بھٹکنے کا سلسلہ شروع ہوا تھا، میں کبھی کبھار دفترِ شاہی میں بھی جاتا اور مجوزہ کتاب کے لیے تاریخی معلومات حاصل کرتا رہا تھا۔ چنانچہ جب بادشاہ کا بلاوا آیا تو میں جانتا تھا کہ انہوں نے کیوں طلب کیا ہے اس لیے ضروری معلومات اور یادداشتیں جو میں نے دفترِ شاہی میں جمع کی تھیں، اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اعلیٰ حضرت نے انہیں دیکھ کر خوشنودی کا اظہار کیا کہ میں فی الواقع بڑی محنت کر رہا ہوں۔ مگر وہ کمپنی سرکار کے سلوک سے بڑے افسردہ خاطر ہو رہے تھے۔ کہنے لگے۔

''برہان الدین! انگریز چاہتا ہے کہ مغلوں کی بادشاہت کا سلسلہ ختم ہو جائے۔ پیشوا اور مرہٹوں کی دوسری

میرے حوالے کر دیا۔ میں آداب بجالایا اور عرض گزار ہوا۔ ''اس شقے کا حال کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''
''فکر نہ کرو۔ یہ صرف ہمارا تمہارا معاملہ ہے۔''

اس یقین کے ساتھ انہوں نے مجھے رخصت کیا۔ میں قلعے سے نکلا تو اپنی حویلی کی طرف جانے کے بجائے چاندنی چوک بازار کی جانب ہولیا جہاں سرائے بیگم جہاں آرا کے ایک عقبی مکان میں میرا ایلچی صادق اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ مقیم تھا۔ صادق آپ کے ساتھ یہیں موجود ہے اور میری ہر بات کی تصدیق کر سکتا ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ بادشاہ کے حکم پر مجھے آگرے اور لکھنؤ جانے کا مطلب تھا، نواب واجد علی شاہ سے ملاقات۔ جن پر کلکتہ کے اخبارات میں نکتہ چینی ہو رہی تھی۔ کلکتہ ایسٹ انڈیا کمپنی سرکار کا ہیڈ کوارٹر تھا اور ممالک محروسہ کے لیے گورنر جنرل کے احکامات وہیں سے جاری ہوتے تھے جس نے حال ہی میں کانپور، گوالیار، ناگ پور اور جھانسی کی ریاستوں کا الحاق کر کے مرہٹوں کو ناراض کر لیا تھا۔ صادق نے مجھے مشورہ دیا کہ میں اس دورے میں پیشوا باجی راؤ دوم آں جہانی (جس نے 1851ء میں وفات پائی تھی) کے متبنیٰ نانا صاحب سے ضرور ملوں اور مولوی عظیم اللہ[1] کے ذریعے نانا صاحب سے رابطہ ہو سکتا ہے۔ لکھنؤ سے واپسی پر بریلی میں خاں بہادر خاں سے بھی ملاقات ضروری ہے۔

بہادر خاں روہیلہ سردار رحمت خاں مرحوم کا پوتا تھا جس نے ماضی میں احمد شاہ ابدالی، شجاع الدولہ اور نجیب الدولہ کے ساتھ مل کر پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی تھی۔ لیکن رحمت خاں کی وفات اور روہیل کھنڈ کے سلطنتِ اودھ میں شامل ہو جانے کے بعد حالات کی صورت بالکل تبدیل ہو چکی تھی اور اب رحمت خاں مرحوم کا پوتا خاں بہادر خاں بریلی میں سرکار انگلشیہ کی طرف سے جج[2] کے عہدے پر فائز تھا۔ میں صادق کے مشورے پر حیرت زدہ رہ گیا۔ ''تم مجھے انگریز کے ایک نمک خوار سے ملاقات کا مشورہ دے رہے ہو؟''

صادق کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تیر گئی اور مجھے بتانے لگا۔ ''سید صاحب! میں بریلی کا رہنے والا اور بہادر خان کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کی ججی پر نہ جائیے۔ جب آپ اسے ملیں گے تو میرے ہی جیسا پائیں گے۔''

پھر اس نے چاندی کا ایک چھوٹا سا تمغہ نکالا اور میری ہتھیلی پر رکھ دیا جس پر صرف چاند ستارا بنا ہوا تھا اور کہا۔ ''آپ اسے تنہائی میں ملیں گے اور یہ تمغہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیں گے جس طرح میں نے آپ کی ہتھیلی پر رکھا ہے۔ پھر وہ آپ کے لیے اور آپ اس کے لیے اجنبی نہیں ہوں گے۔ اگر اس تمغے کے بغیر ملاقات ہوئی تو وہ آپ سے بھی انگریز کے لہجے میں بات کرے گا۔ یہی تمغہ میرے اور اس کے درمیان تحریک آزادی کا رابطہ ہے۔ جب آپ نے مجھے بریلی سے بلایا اور اپنے مقصد سے آگاہ کیا تو میں نے ایسا ہی ایک تمغہ اسے بھیج دیا تھا۔ وہ اس کی اہمیت کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ لیکن ابھی بہادر خاں کو جج کا لباس اوڑھے رکھنا چاہیے۔''

صادق کی زبان سے یہ باتیں سن کر مجھ پر ایک مسرت انگیز سی حیرت گزر گئی کہ رحمت خاں روہیلے کا پوتا خفیہ

---

[1] عظیم اللہ نانا فرنویس کا انتہائی خوش گفتار، خوش شکل اور قابل مشیر اور وکیل تھا جس نے کانپور میں ریاست کے نظم و نسق میں اہم کردار ادا کیا اور لندن جا کر نانا صاحب کا مقدمہ لڑا۔ لندن کی کئی خواتین اس کی والہ و شیفتہ ہو گئی تھیں۔

[2] رحمت خاں روہیلے کا پوتا بہادر خاں ان دنوں بریلی میں انگریز کی طرف سے فوجداری حاکم تھا۔ (تاریخ ہندوستان)

اس جواب پر میں بادشاہ کی مجبوری کو سمجھ گیا۔ سرکار انگلشیہ کے پاس گھڑا گھڑایا جواب موجود تھا کہ جب مغلیہ علاقے کی حفاظت کمپنی کی فوجیں کر رہی ہیں تو بادشاہ کو اپنی فوج میں اضافہ کرنے اور بے جا مصارف اٹھانے سے کیا حاصل ہوگا۔ جبکہ ملکی مصارف پہلے ہی زیادہ اور آمدنی کم ہے۔

بادشاہ کی حیثیت بس یہ رہ گئی تھی کہ کمپنی سرکار سے اپنی کوئی بات منوا نہ سکتے اور خود اس کی مرضی کے بغیر کچھ کر نہ سکتے تھے۔ اچانک انہوں نے مجھ پر حیرت کا ایک سکتہ طاری کر دیا اور کہنے لگے۔ ''ہم نے تمہیں بلوایا تو اسی بہانے ہے کہ لکھی جانے والی تاریخ پر گفتگو کریں۔ مگر اصل مقصد یہ ہے کہ تم ایک جوہری کی حیثیت سے آگرے جاؤ پھر لکھنؤ جاؤ اور وہاں کے حالات معلوم کرو۔ ناگ پور اور جھانسی کے الحاق پر لوگ سرکار انگلشیہ سے بڑے بدظن ہو رہے ہیں۔ ہمیں اندیشہ ہے کہ کلکتہ کے انگریزی اخبارات اور ان کی نکتہ چینی کی آڑ میں کمپنی کہیں اودھ کے الحاق کی تیاری نہ کر رہی ہو۔''

ان کی بات سن کر ایک دم میرا ماتھا ٹھنکا۔ جہاں تک میں فرنگی کی سیاست کو سمجھا تھا، وہ مختصر الفاظ میں یوں ہے کہ جو کام اسے آج کرنا ہوتا ہے وہ اس کی تیاری کئی سال پہلے کرتا اور ہر مرحلے سے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق گزرتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا یہ اندیشہ بے جا نہیں ہوسکتا تھا کہ اخبارات میں اودھ کی نئی پلٹنوں پر نکتہ چینی کہیں اودھ کے الحاق کا شاخسانہ نہ ہو۔ اگر کمپنی فی الواقع وہی چاہتی تھی جو عالی جاہ نے سوچا تو کیا اسے روکا جا سکتا ہے؟

یہ سوال بہرصورت بعد کا تھا۔ فی الحال تو یہ معلوم کرنے کی ضرورت تھی کہ ناگ پور، جھانسی اور گوالیار کے لوگ کمپنی سرکار کے خلاف کیا سوچ رہے ہیں اور خود کمپنی اودھ کے بارے میں کیا ارادہ رکھتی ہے؟ ان معلومات سے مغلیہ سلطنت کو کوئی فائدہ پہنچتا یا نہیں لیکن ہندوستان کی تمام ریاستیں اور سلطنتیں ایک ہی اندھی طاقت کی زد میں تھیں اور فرنگی کے خلاف سب کا درد مشترک تھا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ بادشاہ یہ معلومات کیوں حاصل کرنا چاہتے اور کیا سوچ رہے تھے؟ تاہم میں ان کے الفاظ میں چھپا ہوا ایک کرب ضرور محسوس کر رہا تھا۔

انہی ایام میں مہرولی کے معاملے نے مجھے بے حد پریشان کر رکھا تھا۔ میری تمام امیدیں، آرزوئیں اور کوششیں ایک ہی نقطے اور ایک ہی محو کے گرد گھوم رہی تھیں کہ شاہ عالم ثانی کی فارسی نوشت کا معمہ کیسے حل ہو؟ حالات کی اس صورت میں جس کا نقشہ میں نے بیان کیا ہے، مدفون خزانے کی تلاش اور بھی ضروری ہوگئی تھی تاکہ اسے اجنبی طاقت کے خلاف استعمال کیا جا سکے۔ خزانہ ڈھونڈنے اور استعمال کرنے کا اس سے بہت وقت شاید کوئی اور نہ تھا جب کہ آزادی کے کچھ متوالے اور مجاہد بھی میرے مقصد میں شریک ہو چکے تھے لیکن فارسی نوشت کی گتھی کچھ ایسی اُلجھ گئی کہ کھلنے کے باوجود کھل نہیں رہی تھی اور اب اسے کھولنے کے لیے کسی انگشتِ غیب کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے، جب تک میں اس عقدۂ لاینحل کو پوری طرح حل نہ کر لیتا، مہرولی میں کوئی نیا اقدام لاحاصل تھا۔ لہٰذا اعلیٰ حضرت کی فرمائش قبول کر لی اور کہا۔

''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ میں ایک دو روز میں دہلی سے روانہ ہو جاؤں گا۔ اگر حضور مجھے ایک شقہ (رقعہ) عنایت فرما دیں تو میرا کام کچھ آسان ہو جائے گا۔''

انہوں نے بلا تامل اس مضمون کا ایک شقہ تحریر فرمایا کہ سید برہان الدین ہمارے بھروسے کا جوہری ہے اور

(15)
لکھنؤ کا سفر

جب ہم آگرے پہنچے، 1855ء کا سن شروع ہو چکا تھا۔

مہ جمال اور میں خود کئی سال کے بعد آگرے گئے تھے اس لیے ہمارا وہاں غیر معمولی استقبال ہوا۔ کئی دن دعوتیں ہوتی رہیں۔ مہ جمال کے بھائی بھاوج اور دوسرے عزیزوں نے ان کی دل کھول کر میزبانی کی۔ ہر روز ''روزِ عید'' اور ہر شب ''شبِ برات'' کی ضرب المثل تازہ ہوگئی۔

آپ لوگ سن چکے ہیں کہ میرے سفر کا مقصد کیا تھا مگر میں نے وہ مقصد بیوی پر ظاہر نہیں کیا تھا مبادا وہ کسی اندیشے میں مبتلا ہو جائے۔ میری جوانی کے زمانے میں گوالیار کی بھیانک قید کا سانحہ کسی طور اسے بھولتا ہی نہیں تھا جس نے مجھے کئی سال زندہ درگور رکھا تھا۔ اس لیے جب کبھی مجھے کوئی سفر درپیش ہوتا وہ سانحہ اسے کسی نئے اندیشے میں مبتلا کر دیتا اور میرا راستہ روکتی تھی۔ کم از کم تنہا ہرگز نہ جانے دیتی۔

میں نے آگرے میں مرہٹہ ریاستوں کے متعلق بہت سی باتیں سن لی تھیں اور لوگوں کے جذبات بھی معلوم کر لیے تھے۔ ان ریاستوں کے محروم الوارث گھرانوں، رانیوں، ان کے رشتے داروں اور متعلقہ افراد سے جن کی شاہی حیثیت ختم کر دی گئی، سب کو ہمدردی تھی۔ لوگ کمپنی سرکار کی لوٹ کھسوٹ اور نادر شاہی احکام پر ناراض تھے اور سمجھتے تھے کہ انگریز یکے بعد دیگرے سب ریاستوں پر قبضہ کر کے ہندوستان میں اپنی شہنشاہیت قائم کرنا چاہتا ہے اور یہی بات کیا مسلمان کیا ہندو، ہر شخص کو ناگوار گزری تھی۔ میں یہی معلومات حاصل کرنے آگرے آیا اور اب مجھے لکھنؤ جانا تھا۔ چنانچہ گیارہویں روز کوچوان اور دونوں محافظوں کو لکھنؤ کی جانب سفر کی تیاری کا حکم دیا۔

مہ جمال اس روانگی پر حیران رہ گئی۔ سفر بھی واپسی کا نہیں بلکہ آگے کا تھا اور وہ اس سفر میں شریک تھی۔ پریشان سی ہو کر پوچھنے لگی۔ ''یہ ایکا ایکی آپ کو لکھنؤ جانے کا خیال کیسے آ گیا؟''

میں نے اب بھی اسے اپنے اصل مقصد سے آگاہ کرنا ضروری نہ سمجھا اور اس پر مصلحت کا پردہ ڈالتے ہوئے بتانے لگا کہ آگرہ میرے راستے کا ایک پڑاؤ تھا۔ اصل منزل لکھنؤ ہے اور یہ سفر لکھنؤ کے لیے کیا گیا تھا۔

وہ مزید حیران ہوئی۔ ''لکھنؤ کے لیے کیوں؟''

''نواب واجد علی شاہ کو اپنی ملکہ حضرت محل اور دوسری بیگمات کے لیے کچھ قیمتی جواہرات کی ضرورت ہے۔ میں ایک جوہری کی حیثیت سے لکھنؤ کاروبار کرنے جا رہا ہوں۔ شاہی پسند کے ہیرے جواہر ساتھ لے کر آیا ہوں۔''

اس کی تسلی کے لیے اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کا شقہ نکال کر دکھایا جس پر صاف لفظوں میں تحریر تھا کہ سیّد

طور پر ہماری تحریکِ آزادی سے دلچسپی رکھتا ہے۔ اب لکھنؤ کے سفر میں بریلی سے گزرنا اور بہادر خاں سے ملنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔ میں نے دہلی میں اپنے ساتھیوں کے متعلق صادق کو کچھ ہدایات دیں حالانکہ ان کی ضرورت نہ تھی۔ یہ ساری باتیں وہ بہتر طور سے سمجھتا تھا جن پر ان لوگوں کو میری عدم موجودگی میں عمل کرنا تھا۔

صادق سے مل کر اور اسے اپنے سفر کی اطلاع دے کر میں چاندنی چوک بازار سے نکلا اور اپنی حویلی میں آیا۔ جب مہ جمال کو پتہ چلا کہ کل میں آگرے جا رہا ہوں اور وہ بھی میرے ساتھ چلے گی تو حیران رہ گئی۔ اسے آگرے گئے ایک عرصہ ہو گیا تھا۔ ماں باپ فوت ہو چکے تھے۔ اب وہاں بھائی بھاوج رہتے تھے جو بوڑھے ہو گئے مگر ملنے کے لیے تڑپتے تھے۔ ان دنوں مہ جمال خود چھیاسٹھ برس کی بڑھیا اور جوان بلکہ شادی شدہ اولاد کی ماں تھی اس لیے گھر سے نکلنا نہیں ہوتا تھا مگر مجھے آمادۂ سفر دیکھا تو فوراً تیار ہو گئی۔

دوسرے دن میں نے بڑے بیٹے رکن الدین کو بھی کچھ ہدایات دیں اور پورا حفاظتی سامان لے کر کیونکہ میں یہ سفر ایک جوہری کی حیثیت سے کر رہا تھا، بیوی کے ساتھ بگھی میں بیٹھا اور عازمِ آگرہ ہوا۔ اس سفر میں دو مسلح محافظ بھی ہمارے ہمراہ تھے۔

❁......❁......❁

سکی کہ سات سمندر پار کے لوگ ہندوستان میں کیوں آئے تھے؟ اور اگر آ گئے تو اب واپس کیوں نہیں جاتے؟

اپنے تینوں ملازموں کے اس مختصر سے تعارف کے بعد میں اپنے سفر لکھنؤ پر آتا ہوں جو آگرے سے شروع ہوا۔ میں نے اپنے ذہن میں اس سفر کا ایک نقشہ پہلے ہی تیار کر لیا تھا اور ہمیں اسی نقشے کے مطابق سفر کرنا تھا۔ آگرے سے ایک سڑک سیدھی لکھنؤ کو جاتی ہے مگر دریائے جمنا کا پل عبور کرتے ہی میں نے کلّو خاں سے کہا کہ وہ گھوڑوں کی لگامیں روہیل کھنڈ کی جانب موڑ لے۔

کلّو کے ساتھ رستم خاں اور عظمت بیگ نے بھی حیرت کی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان کی نظریں سوال کر رہی تھیں۔ ''روہیل کھنڈ کی طرف کیوں؟''

میں نے بتایا۔ ''پہلے ہم بریلی جائیں گے۔''

وہ تینوں سمجھ گئے کہ اس سفر کا کوئی اہم مقصد ہوگا۔ کیونکہ میں مقصد کے بغیر راستے تبدیل نہیں کرتا۔ آگرے سے ایک راستہ بریلی کی طرف جاتا ہے۔ اب بگھی لکھنؤ کے بجائے بریلی کے راستے پر جا رہی تھی۔

کسی زمانے میں روہیل کھنڈ آزاد و خود مختار سمجھا جاتا تھا جہاں روہیلے افغانوں کی دو ریاستیں تھیں۔ بریلی اور نجیب آباد۔ نواب شجاع الدولہ نے فرنگی کے ساتھ مل کر روہیل کھنڈ پر حملہ کیا اور اس علاقے کو اودھ میں شامل کر لیا تھا۔ انگریز کی حکمتِ عملی کا تقاضا تھا کہ اودھ کے نوابوں کو، جو مغلیہ سلطنت کے وزیر کہلاتے تھے، ''شاہ'' تسلیم کر کے دہلی سے ان کی وابستگی توڑ دے۔ چنانچہ کمپنی سرکار نے یہ وابستگی توڑ کر شاہانِ اودھ سے پنجاہ سالہ تعاون کا معاہدہ[1] کر لیا تھا۔ بریلی رحمت خاں روہیلہ کی ریاست تھی جو فرنگی کے خلاف جنگ لڑتا ہوا شہید ہو گیا تھا۔ فرنگی سرکار حقِ وراثت کے طور پر اس کی اولاد کو پنشن دیتی تھی۔ وہ پنشن اب رحمت خاں کا پوتا خاں بہادر خاں وصول کرتا اور سرکار کی طرف سے بریلی کا فوجداری حاکم بھی تھا۔ میں بریلی کیوں جا رہا تھا؟ یہ آپ لوگ سمجھ گئے ہوں گے۔

روہیل کھنڈ میں دوسری روہیلہ ریاست نجیب آباد، روہیلہ سردار نجیب الدولہ کے نام پر قائم ہوئی تھی۔ روہیل کھنڈ کو اودھ میں شامل کر لینے کے بعد اس کی حیثیت بھی ختم ہو گئی تھی۔ سردار نجیب الدولہ مرحوم کا پوتا محمود خاں زندہ تھا مگر میں نہیں جانتا تھا کہ وہ کہاں رہتا ہے؟ اپنے محافظ رستم خاں سے پوچھا جو نجیب آباد ہی کا رہنے والا تھا مگر اس کا جواب واضح نہیں تھا۔

''میں نہیں جانتا، آج کل اس کا قیام کہاں ہے۔ اگر نجیب آباد میں نہ ہوا تو بجنور میں ہوگا۔''

اب رستم خاں میرے روہیل کھنڈ کے سفر کا مقصد کچھ سمجھ گیا تھا۔ آگرے سے بریلی تک سارا علاقہ بے حد سرسبز و شاداب ہے۔ تیسرے دن ہم بریلی پہنچ گئے اور ایک ہوٹل میں قیام کیا جو شہر کی نئی آبادی میں واقع ہے۔ اگلے روز ہوٹل کے منتظم سے خاں بہادر خاں کے گھر کا پتہ معلوم کیا۔ وہ بریلی کا ایک مشہور آدمی تھا۔ پتہ چلا کہ اس کا بنگلہ فوجداری عدالت کے پیچھے تھوڑی دور ہے۔

اس کی ملاقات کے لیے میں نے رات نو بجے کا وقت مناسب سمجھا جب وہ یقینی طور پر گھر میں موجود ہو۔ پھر رستم خاں کو ساتھ لیا اور اس کے بنگلے پر پہنچ گیا۔ دروازے پر سنتری موجود تھا جو مجھ سفید ریش بوڑھے کو دیکھ کر بڑے ادب سے پیش آیا اور میرے آنے کی اطلاع دینے چلا گیا۔ میں نے سنتری کو اپنا نام نہیں بتایا، صرف یہ

---

[1] یہ معاہدہ 1801ء میں ہوا تھا۔ (مصنف)

برہان الدین بڑے قابل اعتماد اور ہمارے بھروسے کے جوہری ہیں۔ بادشاہ کی وہ تحریر مہ جمال کی حیرت کے ساتھ تسلی کا بھی باعث ہوئی۔ اس عبارت میں ''جوہری'' کا لفظ ذومعنی اور بڑی حکمت سے استعمال کیا گیا تھا جس سے مراد یہ تھی کہ میں سیاسی جوہرشناس اور شاہِ دہلی کا قابل اعتماد آدمی ہوں مگر میری بیوی کے نزدیک وہ میرے قابل اعتماد جوہری ہونے کی سند تھی اور میں نے لکھنؤ جانے کا جو مقصد بیان کیا تھا وہ شقہ اس کی کامیابی کا ذریعہ ہو گا۔ اب اس نے صرف یہ دریافت کرنا ضروری سمجھا۔ ''لکھنؤ سے واپسی کب ہوگی؟''

میں جس کام کے لیے جا رہا تھا، اس میں تین چار مہینے بلکہ کچھ زیادہ عرصہ لگ سکتا تھا۔ میرے مدِنظر بعض اور معاملات بھی تھے۔ پھر بھی جواب دینے میں احتیاط ملحوظ رکھی۔ ''جس قدر ہو سکا جلد لوٹنے کی کوشش کروں گا۔ اگر دیر ہوگئی تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ محافظ میرے ساتھ ہیں۔''

میرے محافظ نشانے کے بڑے پکے اور انتہائی جاں نثار ہیں۔ میں خود بھی اس بڑھاپے میں مضبوط قویٰ کا مالک اور اندھیرے میں آواز پر نشانہ لگا سکتا ہوں۔ اسی اطمینان کے ساتھ مہ جمال نے مجھے خوش دلی سے رخصت کیا۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اپنے محافظوں اور کوچوان کے بارے میں کچھ بتاتا چلوں جو میرے شریکِ سفر تھے۔ کیونکہ آگے چل کر آپ لوگوں کا بھی ان سے واسطہ پڑے گا۔ محافظوں میں ایک کا نام رستم خاں ہے جو نجیب آباد کا رہنے والا اور دشمن کو چھوڑ دینے یا معاف کرنے کا عادی نہیں۔ اگر اس کے بس میں ہو تو سانپ کی طرح رینگ کر بند دروازوں سے بھی گزر جائے۔ مگر یہ ممکن نہیں اس لیے بند دروازے کو ایک ہی ضرب سے توڑ دیتا ہے۔ نشانے کا اتنا ماہر ہے کہ بھاگنے والا جنگل کا جانور ہو یا کوئی آدمی، اس کی گولی سے نہیں بچ سکتا۔ کئی سال سے میرا ذاتی ملازم ہے اور اپنے فرض میں ذرا سی غفلت اور کوتاہی نہیں کرتا۔

دوسرا محافظ عظمت بیگ نسلاً سلجوقی ترک بڑا دلیر اور جاں نثار ہے لیکن حوادث کا مارا اور اپنے لوگوں کا ستایا ہوا ہے۔ جب سراج الدین بہادر شاہ ظفر تخت نشیں ہوئے تھے، ملازمت کی تلاش میں جہانگیر آباد سے دہلی آیا۔ جہانگیر آباد، ضلع دہلی میں واقع ہے۔ رام پور سے دہلی آئیں یا دہلی سے رام پور جائیں تو راستے میں پڑتا ہے۔ اس کا ارادہ تھا کہ اگر کوئی سفارش مل جائے تو بادشاہ کی سواری کے ساتھ چلنے والے قلاروں میں بھرتی ہو جائے۔ میرا کاروبار ان دنوں خوب چل رہا تھا۔ مجھے ایک اور محافظ کی ضرورت تھی۔ دہلی میں اتفاقاً عظمت بیگ سے ملاقات ہوگئی جو ملازمت سے بالکل مایوس ہو چکا اور پیٹ کی خاطر معمولی قسم کی خدمت پر بھی تیار تھا۔ میں نے اس کا قد کاٹھ دیکھ کر ملازم رکھ لیا۔ وہ میری توقع سے بڑھ کر میرے اعتماد پر پورا اُترا۔ انتہائی وفادار اور ہر قسم کا ہتھیار چلانے میں ماہر ہے۔

کوچوان کا نام کلّو خاں ہے۔ وہ اور اس کا باپ بھی رتھ بان تھا۔ میں بتا چکا ہوں، مہ جمال بچوں کے ساتھ ہر سال ''پھول والوں کی سیر'' دیکھنے مہرولی ضرور جاتی تھی۔ رتھ، بال بچوں کی سواری کے لیے خریدا اور کلّو خاں کو ملازم رکھا۔ بعد ازاں چار پہیوں کی بگھی بنوائی، اسے بھی کلّو خاں چلاتا ہے۔ وہ رتھ بان، کوچوان اور سائیس سب کچھ ہے۔ بھالا مارنے کا فن جانتا ہے۔ بندوق چلانا میرے بیٹے رکن الدین نے سکھائی اور اب اس فن میں بھی خوب طاق ہے۔ اپنے بال بچوں سمیت ہماری حویلی کے غلام پیشہ میں رہتا اور گھر کا ایک فرد سمجھا جاتا ہے۔ میرے پسینے کی جگہ خون بہانے پر تیار رہتا اور فرنگی سے خدا واسطے کا بیر رکھتا ہے۔ یہ بات کبھی اس کی سمجھ میں نہیں آ

اور جھانسی کی ریاستوں سے کر چکی ہے؟''
''حالات یہی بتا رہے ہیں۔''
''مگر واجد علی شاہ زندہ ہیں اور لاولد بھی نہیں۔ پھر کمپنی اودھ پر کیسے قبضہ کر سکتی ہے؟''
''جبھی تو ایسی شرطیں پیش کی جائیں گی جنہیں وہ قبول نہیں کریں گے اور کمپنی ان کے انکار کو بہانہ بنا کر فوجی کارروائی کرے گی۔''
خاں بہادر خاں، فرنگی کے قریب رہ کر اس کی چالوں کو سمجھتا تھا۔ جو کچھ اس نے کہا، وہ کمپنی سرکار کی سیاسی منطق کے عین مطابق تھا۔ میں نے سوال کیا۔ ''کیا مسلمان اودھ پر فرنگی کا قبضہ برداشت کر لیں گے؟''
''برداشت کی ایک حد ہوتی ہے۔ جب بات اس حد سے آگے بڑھ جائے تو کمزور آدمی بھی بغاوت کر دیتا ہے۔ مگر اس وقت سے پہلے ہم آپ کے فیصلے کا انتظار کریں گے۔''
''فیصلہ تو ہر انسان کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ پھر بھی قومی فیصلے مل کر کیے جاتے ہیں اور تمہیں اس فیصلے سے آگاہ کر دیا جائے گا۔''
اس کے ساتھ ہی میں نے اچانک بات کا رخ بدل دیا۔ ''بہادر خاں! محمود خاں کے بارے میں کچھ جانتے ہو؟''
''نجیب آباد والے محمود خاں نا؟''
''ہاں...... وہی......''
''سنا ہے وہ آج کل کانپور گئے ہوئے ہیں۔ معلوم نہیں کیوں۔''
مگر میں سمجھ گیا۔ محمود خاں جو فرنگی کے سخت خلاف تھا، کانپور کیوں گیا ہوگا۔ لہٰذا اس کے ذکر کو وہیں چھوڑا اور بہادر خاں سے رخصت چاہی مگر اس نے میرا دیا ہوا تمغہ واپس نہ کیا بلکہ ایک الماری سے بالکل ویسا ہی دوسرا تمغہ نکالا اور میری طرف بڑھا دیا۔ دونوں تمغوں میں بال برابر فرق نہ تھا۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔ ''یہ کیوں؟''
اس کا جواب میری معلومات میں ایک اضافہ ثابت ہوا۔ ''شاید صادق نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ اس کا بھیجا ہوا تمغہ میں رکھ لوں گا اور اس کی جگہ اپنا تمغہ آپ کو دوں گا۔ یہ تمغے ہمارے درمیان اسی طرح بدلتے رہتے ہیں۔''
واقعی صادق نے یہ بات مجھے نہیں بتائی تھی۔ میں نے اس کا دیا ہوا تمغہ جیب میں رکھ لیا تو اس نے رخصتی مصافحہ کرتے ہوئے میرے ہاتھ پر عقیدت کا بوسہ دیا۔ پھر میرے ساتھ باہر نکلا اور گیٹ تک آیا جہاں رستم خاں سنتری کے پاس کھڑا میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے خاں بہادر خاں کو جن نظروں سے دیکھا ان میں احترام کی بجائے کچھ اور تھا۔ پھر بھی اسے رسمی سلام کیا۔ میں بہادر خاں کو ''خدا حافظ'' کہہ کر گیٹ سے نکلا تو اس نے گویا مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''سیّد صاحب! گھبرایئے گا نہیں۔ آپ کا کام ہو جائے گا۔''
میں ایک پل کے لیے چونکا کہ میں نے تو اسے کوئی کام نہیں سونپا۔ پھر ''کام ہو جائے گا۔'' کا کیا مطلب؟ معاً خیال آیا کہ وہ سنتری کو بتانا چاہتا ہے کہ میں کسی کام کے لیے اس کی سفارش حاصل کرنے آیا تھا تا کہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو سکے کہ میں کسی خاص مقصد کے تحت اس سے ملا ہوں۔ میں نے دل ہی دل میں خاں بہادر کی اس احتیاط اور دور اندیشی کو سراہا۔ دراصل جو لوگ دوہرا کردار ادا کرتے ہیں انہیں ہر معاملے کا آگا پیچھا سوچنا پڑتا ہے۔
ابھی ہم تھوڑی دور آگے بڑھے تھے کہ رستم خاں کے دل میں جو کھد بد ہوتی رہی تھی، زبان پر آ گئی۔ ''آپ کو

پیغام دیا تھا کہ آگرے سے ایک سید صاحب ملنے آئے ہیں لیکن رستم خاں بڑا حیران بلکہ پریشان نظر آتا تھا کہ آخر میں ایک ایسے شخص سے ملنے کیوں آیا ہوں جو انگریز کا وفادار ہے؟

خاں بہادر خاں نے اپنے ملاقات کے کمرے میں کسی انگریز کی طرح بڑی رعونت سے میرا استقبال کیا اور چشمِ حیرت سے مجھے دیکھتا رہا۔ میں خود ہی مصافحے کے لیے آگے بڑھا۔ وہ متعجب تھا کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں؟ میں نے یہ استعجاب جلد دور کر دیا اور جب مصافحہ کر چکا تو چاندی کا وہ تمغہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا جو میرے ایلچی محمد صادق بریلوی نے دیا تھا۔ میں اس کیفیت کو الفاظ میں بیان نہیں کر سکتا جو تمغہ دیکھ کر اس پر کسی طلسم ہوش ربا کی طرح گزر گئی۔ پہلے تو تمغے کو بغور دیکھا۔ جب شناخت کر لیا تو حیرت اس کی آنکھوں کے آخری کناروں تک اُمڈ آئی۔ چہرے پر سکتہ سا طاری ہو گیا۔ اسی کیفیت میں جیسے کسی پر جادو کر دیا گیا ہو، ہونٹ لرزنے کپکپانے لگے اور میری طرف نگاہ اٹھا کر صرف ایک لفظ کہہ سکا۔ ''آپ......؟''

میں اس کا سوال سمجھ گیا جو ''آپ؟'' کے لفظ میں مضمر تھا اور جواب میں صرف اپنا نام بتایا۔

''سیّد برہان الدین۔''

نام سنتے ہی وہ فرطِ عقیدت سے جھک گیا اور میرے پاؤں چھونے لگا۔ میں نے جلدی سے اپنے دونوں پیر پیچھے ہٹا لیے۔ ''رحمت خاں کے پوتے کو یہ بات زیب نہیں دیتی کہ وہ کسی کے پیروں کو ہاتھ لگائے۔''

''آپ پیر و مرشد ہیں۔''

''میں نے ایسا دعویٰ کبھی نہیں کیا۔''

اب وہ بالکل بدل گیا اور اپنے اوپر پڑا ہوا فرنگی غلاف اُتار کر ایک محبِّ وطن کے روپ میں میرے سامنے کھڑا تھا۔ ''آپ آزادی کے راہنما ہیں اور میں آپ کے پاؤں چھونا اپنے لیے باعثِ عزت سمجھتا ہوں۔''

''بہادر خاں! آزادی کسی کے پاؤں چھونے سے نہیں ملتی۔ اسے حاصل کرنے کے لیے آدمی کے ہاتھ میں بل ہونا چاہئے۔''

''میں اس دن کا منتظر ہوں جب آزادی کا دھارا دشمن کے ذلیل ساحلوں سے ٹکرائے گا اور میرے ہاتھوں کو اپنا زور دکھانے کا موقع ملے گا۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہاتھوں سے میرے ہاتھ تھام لیے اور مجھے کاؤچ پر بٹھایا۔ خود دوسرے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ اس نے جو کچھ کہا ہے، وہی کرے گا۔ اب میں نے اپنے مطلب کی بات چھیڑ دی۔

''کچھ معلوم بھی ہے، تمہاری سرکار انگلشیہ اودھ کے بارے میں کیا ارادہ رکھتی ہے؟''

''ابھی کوئی بات واضح نہیں۔ لیکن میں سرکار کا ارادہ سمجھتا ہوں۔ وہ نواب کے سامنے کچھ نئی شرائط پیش کرے گی۔''

''کیا واجد علی شاہ اس کی شرائط مان لیں گے؟''

''جب طاقتور کسی کمزور کے سامنے شرطیں پیش کرتا ہے تو اس کی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں مان لیا جائے۔ اگر کوئی شرط کڑی اور ناقابلِ قبول ہو تو بات چیت میں ذرا لچک پیدا کر کے اسے بھی قابلِ قبول بنا دیتا ہے۔ لیکن کمپنی گورنمنٹ شرطیں اس لیے پیش کرتی ہے کہ مانی نہ جائیں اور اسے اپنی اندھی طاقت کے اظہار کا موقع ملے۔''

''تمہارے نزدیک کمپنی اودھ کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گی جو ستارا، ناگ پور، کان پور، سنبھل، گوالیار

میں نے حسین مرزا کی بات توجہ سے سنی اور پوچھا۔ ''پھر واجد علی شاہ سے میری ملاقات کس طرح ہو سکتی ہے؟''
''اس کام کے لیے وزیراعظم علی نقی خاں سے ملنا ہوگا'' وہ ایک پل سوچ کر بولے۔ ''اگر آپ کے پاس وزیراعظم کو دینے کے لیے کوئی تحفہ ہے تو نہ صرف ملاقات کا بندوبست ہو جائے گا بلکہ وہ ہیرے جواہرات کی فروخت میں بھی آپ کے کام آئیں گے۔ کیونکہ بیگمات کے مزاج کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔''

میں جانتا تھا، علی نقی خاں کس قسم کا وزیراعظم اور اپنے فائدے کے لیے کیا کچھ کر سکتا تھا۔ کمپنی سرکار کی طرح اس کا اپنا مفاد بھی اسی امر میں مضمر تھا کہ واجد علی شاہ کو عیش و آرام میں مصروف رہنے دیا جائے اور وہ شاہی محلات کی رنگین خلوتوں سے نہ نکل سکیں۔ میں نے حسین مرزا کو بتایا۔ ''وزیراعظم کو دینے کے لیے میرے پاس ایک عمدہ تحفہ ہے اور ایسے نادر تحفے میں اپنے پاس رکھتا ہوں۔''

حسین مرزا نے وزیراعظم علی نقی خاں تک رسائی حاصل کی۔ میں نے اسے ایک قیمتی تحفہ نذر کیا اور شاہِ دہلی بہادر شاہ ظفر کا شقہ دکھایا۔ جس پر اس نے یقین دلایا کہ وہ موقع ملتے ہی جان عالم سے میری ملاقات کرا دے گا۔ پھر بھی اس ملاقات کے لیے کئی روز انتظار کرنا پڑا۔ آخر ایک دن مجھے شاہی محلات میں حاضری کا بلاوا آ گیا اور میں علی نقی خاں کے ہمراہ اودھ کے رنگین مزاج حکمران واجد علی شاہ کے محلِ خاص کی طرف روانہ ہوا۔ شاہی محلات میں واجد علی شاہ ''اختر پیا جان عالم'' کے نام سے یاد کیے جاتے تھے۔ ''اختر'' ان کا تخلص تھا۔ شاعری بھی کرتے تھے اور سید مظفر علی خاں آسیر ان کے استاد تھے جنہیں ''تدبیر الدولہ'' اور ''مدبر الملک'' کے خطابات سے نوازا گیا تھا۔

اودھ کے شاہی محلات کی رنگینیوں کے بارے میں جو کہانیاں میں نے سنی تھیں وہاں انہیں حقیقت کے روپ میں چلتے پھرتے دیکھا۔ میں شام کے ملگجے اندھیرے میں وہاں داخل ہوا تھا جب کمروں میں فانوس روشن ہو چکے تھے اور شاہی غلام گردشوں میں قندیلوں کی روشنی کسی خوابِ طلسم کا سا منظر پیش کر رہی تھی۔ محلات میں حسین لونڈیوں باندیوں کے جمگھٹے پرستان کی مثال تھے جو اپنی اپنی بیگم کے حُسن و جمال اور آرائش و زیبائش کے گُن گاتی اور ''پیا جان عالم'' پر صدقے واری ہوتی تھیں۔

کئی غلام گردشوں سے گزرتا میں وزیراعظم علی نقی خاں کے ہمراہ واجد علی شاہ کے خاص محل کے دروازے پر پہنچا جہاں ایک خاص باندی نے انہیں ہمارے آنے کی اطلاع دی۔

ہم خاص کمرے میں داخل ہوئے اور دستور کے مطابق مجبرا بجا لائے۔ مجبرا قبول ہوا تو میں نے سونے کی ایک فٹ لمبی کشتی جو شاہی کمروں میں آرائش کے لیے رکھی جاتی ہے، بطور نذر پیش کی۔ واجد علی شاہ پہلے سے کچھ فربہ ہو گئے تھے مگر چہرے پر فکر و تردّد کا کوئی سایہ نہیں تھا۔ انہوں نے سونے کی کشتی کو جس کا مستول اور بادبان چاندی کے اور سونے کے تاروں سے باہم ملے ہوئے تھے، انتہائی پسندیدگی سے دیکھا اور اس کی تعریف کی۔

ان کے اردگرد چند باندیاں اور خواجہ سرا تھے نہوں نے اپنے ''پیا جان عالم'' کی زبان سے تعریف کے الفاظ سنتے ہی بہ یک زبان ''ہائے سبحان اللہ'' کی آواز اٹھائی اور کشتی زر میں چاندی کے مستول اور بادبانوں کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانا شروع کر دیئے۔ شاید استاد ابراہیم ذوق مرحوم نے بھی اپنے کسی قصیدے میں ایسے خوب صورت الفاظ، ایسی نازک تشبیہات اور ایسے حسین استعارے استعمال نہ کیے ہوں گے جو میں نے واجد علی شاہ کی باندیوں اور خواجہ سراؤں کی زبان سے سنے۔ یوں تو دہلی کے لال قلعے کی زبان ''اُردوئے معلٰی'' کہلاتی

معلوم ہے بہادر خاں انگریز کا ملازم اور وفادار ہے۔''

''یہ تو میں بہت عرصے سے جانتا ہوں کہ وہ انگریز کا ملازم بلکہ وظیفہ خوار بھی ہے۔''

وہ ناگوار لہجے میں پوچھنے لگا۔ ''پھر آپ اس کے پاس کیوں آئے تھے؟''

''رستم خاں! تمہارا سوال کڑوا ہے مگر میرا جواب کڑوا نہیں ہوگا۔ میں خاں بہادر خاں کے پاس کسی کام کے لیے نہیں، صرف اس لیے ملنے آیا تھا کہ وہ حافظ رحمت خاں کا پوتا ہے۔''

''رحمت خاں جیسے غیرت مند آدمی کا پوتا ہمارے راستے کا پتھر بن چکا ہے۔''

''تم یہ دیکھتے ہو کہ وہ فرنگی کا ملازم اور وظیفہ خوار ہے مگر یہ نہیں جانتے کہ شعلہ پتھر کے اندر رہتا اور کبھی نہیں مرتا۔''

رستم خاں میری بات سن کر حیرت زدہ رہ گیا۔ غالباً وہ سوچ رہا تھا کہ بہادر خاں سے میرا ملنا کسی کام کے سلسلے میں نہیں تو کسی مقصد کے تحت ضرور ہوگا۔

''اب تمہیں ایک نصیحت کرتا ہوں۔ کسی کو یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ میں خاں بہادر خاں سے ملنے گیا تھا۔''

پھر اس نے کوئی سوال نہ کیا اور چپ چاپ میرے ساتھ چلتا رہا۔ بریلی میں تین روز مزید قیام رہا اور مولوی احمد اللہ کے بارے میں کچھ باتیں سنیں جو فیض آباد کے متعلق داروں میں شمار ہوتے اور آزادی کا جذبہ رکھتے تھے۔ دراصل وہاں فرنگی راج کے خلاف درپردہ ایک تحریک فکری بیداری کی علامت تھی۔

❁......❁......❁

چھٹے دن ہم لکھنؤ کی طرف روانہ ہوئے اور ایک روز شاہ جہان پور میں ٹھہرے۔ وہاں بھی لوگوں میں ایک بے چینی سی پائی جاتی تھی۔ شاہ جہان پور سے لکھنؤ کو دو راستے جاتے ہیں اور دونوں کا فاصلہ کم و بیش یکساں ہے۔ ہم نے سیتا پور کا راستہ اختیار کیا۔

لکھنؤ میں حسین مرزا سے میری واقفیت تھی جو دربارِ لکھنؤ میں کتاب خوانی پر مامور اور وہاں کے اہم لوگوں سے میل جول رکھتے تھے، انھی کے ہاں قیام کیا۔ وہ میری اچانک آمد پر بے حد خوش ہوئے اور میرے اعزاز میں دعوت دی جس میں کئی معززینِ شہر کو مدعو کیا اور ان سے میری ملاقات کرائی۔ دعوت میں اودھ اور کمپنی سرکار کے معاملات پر بھی گفت و شنید ہوتی رہی۔

رات کو میں نے حسین مرزا سے اپنی آمد کا معاملہ چھیڑا اور بتایا کہ میں کچھ قیمتی جواہرات لے کر آیا ہوں اور شاہِ اودھ سے ملاقات کا ارادہ رکھتا ہوں۔ شاید وہ بیگمات کے لیے کچھ جواہرات خرید لیں۔ مگر یہاں آ کر معلوم ہوا کہ سلطنت کے حالات بگڑے ہوئے اور فرنگی واجد علی شاہ سے ناخوش ہیں۔ اب انہیں ہیرے جواہرات کی خریداری سے کیا دلچسپی ہوگی۔

حسین مرزا نے جواب دیا۔ ''سیّد صاحب! معاملات بے شک خراب ہیں۔ کلکتہ کے انگریزی اخبار جان عالم کے خلاف اُلٹی سیدھی ہانک رہے تھے۔ ''کلکتہ ریویو' نے تو ان کی نجی زندگی کے بارے میں بڑی خرافات شائع کی ہیں اور کمپنی کو مشورہ دیا ہے کہ اودھ کو ایسے حکمراں سے نجات دلائی جائے اور اس کا دولت انگلشیہ سے الحاق کیا جائے۔ مگر آپ جانتے ہیں، اودھ کے حالات ستارا، ناگ پور اور جھانسی جیسے نہیں۔ جان عالم بھی جانتے ہیں کہ اس قسم کے مشورے ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ لہٰذا آپ جس ارادے سے آئے ہیں، اس پر عمل کریں۔''

واجد علی شاہ کے چہرے پر بے چینی کی جو ہلکی سی لہر تھرائی تھی، وزیر اعظم کی زبان سے اپنی تعریف سن کر پھر غائب ہوگئی اور چہرے پر رنگینیوں کے عکس کچھ اور فروزاں ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ جس سنگین خطرے کی طرف اشارہ کیا گیا تھا، اس کی طرف دونوں میں سے کسی نے توجہ ہی نہیں دی تھی جیسے سب کچھ ٹھیک تھا۔ اس کے ساتھ ہی وہاں ایک عجیب سی خاموشی چھا گئی۔

جب الفاظ اپنے معنی اور مفہوم کھو دیتے ہیں تو خاموشی سمجھ میں آ جاتی ہے اور میں بھی اس خاموشی کا مطلب سمجھ رہا تھا کہ واجد علی شاہ نے اپنی ذات کے گرد خود فریبی کا ایک حلقہ قائم کر لیا تھا اور وزیر اعظم کی خواہش یہ تھی کہ وہ اسی خود فریبی کے حلقے میں اسیر رہیں۔ میں نے بھی یہ سوچ کر بات آگے نہ چلائی کہ مجھ پر ''مدعی سست اور گواہ چست'' والی مثل صادق آئے گی۔

وہ باندیاں جو اپنی بیگمات کی طرف جواہرات لے کر گئی تھیں، ان کی خوشنودی اور منظوری لے کر لوٹ آئیں اور جان عالم کو ان کی پسند سے آگاہ کیا تو جتنے جواہرات پسند کیے گئے تھے، میں نے ان کی قیمت ایک کاغذ پر لکھ کر کاغذ جان عالم کی طرف بڑھایا جو باندیوں سے جواہرات کی تعریف سن رہے تھے۔ انہوں نے قیمتوں پر سرسری سی نظر ڈالی اور ''بالکل مناسب'' کہہ کر کاغذ وزیر اعظم کو دے دیا۔ ''رقم ادا کر دی جائے۔''

علی نقی خاں نے توجہ دلائی کہ حضور اس پر رقم کی ادائیگی کا حکم تحریر فرمائیں اور اپنی مہر ثبت کر دیں۔ چنانچہ اس کارروائی کے بعد ہم نے اجازت لی اور محل سرا سے نکلے جہاں رنگین عشرتیں جان عالم کا انتظار کر رہی تھیں۔ باہر دونوں محافظ اور کلّو خاں بگھی سمیت میرا انتظار کر رہے تھے۔ علی نقی خاں نے بتایا کہ ایک دو روز میں رقم مجھے ادا کر دی جائے گی اور اس سے رخصت کے دوران مجھے یوں لگا کہ ہندوستان کا سب سے قیمتی ہیرا اودھ بھی بِک جائے گا یا چھین لیا جائے گا۔

❀......❀......❀

میرا خیال تھا، رقم کی وصولی کے بعد میں کان پور سے ہوتا ہوا گوالیار جاؤں گا اور وہاں سے آگرے کا رخ کروں گا۔ اول تو کمپنی کی انگریزی مملکت کے ساتھ ان ریاستوں کے الحاق کا نتیجہ دیکھنا اور لوگوں کے خیالات معلوم کرنا چاہتا تھا۔ دوسرے اطلاع ملی تھی کہ گوالیار کے قلعے میں قید خانے کے گرد جو اونچی دیواریں کھڑی تھیں، انہیں گرا دیا گیا ہے۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہاں وہ زیر زمین زندانِ اجل بھی مسمار کر دیا گیا ہے یا نہیں جہاں میں کئی سال قید رہا تھا؟

مہاراجہ سندھیا کی وفات کے بعد جب گوالیار کا راج، مہارانی کے اختیار میں آ گیا تھا تو فرنگی فوجوں کے ساتھ تین لڑائیوں میں مرہٹہ لشکروں نے شکست کھائی اور گوالیار کی پہلی سی حیثیت باقی نہ رہی تھی۔ اگر چہ سندھیا خاندان ہی کے ایک شخص کو گدی پر بٹھایا گیا لیکن امورِ سلطنت میں راجہ کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اصل حکومت انگریز کی تھی اور سب کام اسی کی مرضی سے طے ہوتے تھے۔

مجھے گوالیار کی قید سے رہا ہوئے پوری نصف صدی گزر چکی تھی اور میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اس عرصے میں وہاں کیا کچھ بدل گیا ہے؟ رستم خاں، عظمت بیگ اور کلّو خاں بھی گوالیار کا قلعہ دیکھنے کے خواہش مند اور ہر روز روانگی کی تیاری کرتے تھے لیکن وزیر اعظم علی نقی خاں کی طرف سے رقم کی ادائیگی میں تاخیر ہو رہی تھی۔

تھی لیکن وہ زبان، جو میں نے لکھنؤ کے شاہی محل میں سنی، بڑی شستہ ورفتہ اور مرصع تھی۔

کشتی سے زیادہ اگر چہ وہ ستائش ''اختر پیا جان عالم'' کی تھی لیکن میں نے محسوس کیا وہ ستائش لکھنؤ کے شاہی محلات کی روایت بن چکی اور جان عالم کی خوشنودی کے لیے ضروری ہے۔ کشتی کے نذرانے اور اس کی تعریف و ستائش کے بعد جواہرات پیش کرنے کا حکم ہوا۔

یہ بات مجھے وزیراعظم علی نقی خاں نے پہلے ہی بتا دی تھی کہ جان عالم اپنی کسی محبوبہ کے لیے جواہرات خریدیں گے۔ لیکن بیگمات الماس، زمرد اور مختلف رنگوں کے یاقوت پسند کرتی ہیں اس لیے پہلے میں بیش قیمت ہیرے (اماس) دکھاؤں کیونکہ واجد علی شاہ کو ذاتی طور پر الماس پسند ہیں۔ اس لیے چند بیش قیمت ہیرے (الماس) ہی دکھائے۔ بڑے نادر ہیرے تھے۔ انہیں دیکھ کر شاہِ اودھ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں اور اسی حالت میں پہلے میری طرف، پھر وزیراعظم کی جانب دیکھا۔ ''علی نقی خاں! آپ نے یہی کہا تھا نا کہ سیّد برہان الدین، سراج الدین بہادر شاہ ظفر شاہِ دہلی کے قابل اعتماد جوہری ہیں؟''

''بے شک جان عالم!'' علی نقی خاں کمر تک جھک گیا۔

میں نے بادشاہ کا شقہ نکال کر دکھایا۔ اب واجد علی شاہ نے مجھے مخاطب کیا۔ ''آپ خود قابل اعتماد اور آپ کے الماس قابل تعریف ہیں۔''

پھر انہوں نے دو ہم وزن اور ہم ساخت الماس پسند کر لیے اور باندیوں کو دکھائے جنہوں نے ان کی خاطر خواہ تعریف کی۔ پھر دو باندیاں وہ الماس لے کر پس پردہ غائب ہو گئیں اور چند لمحوں میں خوش خوش لوٹ آئیں۔ واجد علی شاہ جس کسی کے لیے بھی وہ الماس خریدنا چاہتے تھے، اس نے پسند کر لیے تھے۔ فوراً ہی میں نے اپنی صندوقچی سے کچھ زمرد اور کچھ یاقوت نکال کر دکھائے۔ انہوں نے سرخ رنگ کا ایک چمکتا دمکتا یاقوت اُٹھا لیا اور جیسے اپنے آپ سے پوچھنے لگے۔ ''یہ یاقوت، حضرت محل کی گردن میں کیسا لگے گا؟''

''ہائے سبحان اللہ!'' بیگم حضرت محل کی ایک چہیتی باندی نے آواز اُٹھائی۔ ''یہ تو گوہرِ شبِ چراغ ہے۔ ان کی گردن میں لولئ فلک (زہرہ) کی طرح جگمگائے گا۔''

نواب واجد علی شاہ نے مختلف رنگوں کی مناسبت سے اپنی دوسری بیگمات کے لیے کچھ یاقوت اور زمرد پسند کیے کہ یہ فلاں بیگم کی پیشانی کے جھومر میں چمکے گا اور یہ فلاں بیگم کے کانوں میں بہار دے گا۔ پھر باندیوں کے ہاتھ وہ ہیرے بیگمات کو بھجوا دیئے کہ وہ بھی پسند کر لیں۔ اس اثناء میں مجھے ان سے سرگوشی کرنے کا موقع مل گیا اور صورتِ حال کی مناسبت سے عرض کیا۔

''جانِ عالم! ہندوستان کی کان میں اودھ سب سے قیمتی ہیرا ہے اور دشمن کی آنکھ اسی ہیرے پر لگی ہے۔''

واجد علی شاہ کے چہرے پر حسین عشرتوں اور رنگینیوں کے جو عکس سایہ فگن تھے، ان میں بے چینی کی ایک ہلکی سی لہر تھرتھرائی اور میں نے ان کی آواز سنی۔ ''آپ نے جو کچھ کہا ہم نے سمجھ لیا ہے اس لیے جواب دینے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ وہ قیمتی ہیرا ہم ہیں۔''

یہ کہہ کر علی نقی خاں کی طرف دیکھا گویا اس کی تائید چاہی اور وزیراعظم نے فوراً ستائش شروع کر دی۔ ''اس میں کیا شک ہے جان عالم! عقل و دانش میں، جاہ وحشمت میں، جلال و مرتبے میں کوئی حضور کا ثانی نہیں۔''

دفترسوم

لالہ رُخ کی کہانی

ایک روز حسین مرزا سے پتہ چلا کہ میں نے جواہرات کی مناسب قیمت لگائی تھی اور اس بات کا خیال نہیں رکھا تھا کہ ان کے منافع میں سے وزیراعظم کو بھی حصہ دینا ہے۔ مجھے علم نہیں تھا کہ علی نقی خاں یہ کاروبار بھی کرتا ہے۔ میں نے حسین مرزا کے ذریعے اپنے منافع میں سے تیسرا حصہ اسے دینا منظور کر لیا اور دوسرے دن وہ حصہ کاٹ کر رقم مجھے ادا کر دی گئی۔ میں سوچنے لگا، شاید ایک دن وزیراعظم علی نقی خاں اودھ کو فروخت کرنے کا کمیشن بھی وصول کر لے گا۔

رقم کی وصولی میں پورے پندرہ دن ضائع ہو گئے۔ اب ہمیں گوالیار کا رخ کرنا تھا۔ مگر اسی شام ایک اجنبی شخص نے حسین مرزا کتاب خواں کے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں اسے نہیں جانتا تھا اس لیے جب اسے ملنے دروازے پر آیا تو رستم خاں میرے پیچھے تھا جس کی جیب میں بھرا ہوا طمنچہ اور دایاں ہاتھ جیب کے اندر اس طمنچے پر تھا۔ میرے ساتھ میرے محافظ کو دیکھ کر نووارد مسکرایا اور بولا۔

''سیّد صاحب! میں آپ سے علیحدگی میں بات کرنا چاہتا ہوں۔''

میں حیران ہوا کہ آخر ایسی کون سی بات ہے جو علیحدگی میں کرنے والی ہے؟ میں نے پوچھا۔ ''کہاں سے آئے ہو؟''

''یہ بھی تخلیے میں بتاؤں گا۔''

میری حیرت اور دلچسپی پہلے سے بھی بڑھ گئی۔ میں نے رستم خاں کو وہیں ٹھہرنے کے لیے کہا اور خود اجنبی کو لے کر ایک گوشۂ تنہائی میں چلا گیا۔ اس تخلیے میں نووارد نے اپنی جیب سے چاندی کا ایک تمغہ نکال کر میری ہتھیلی پر رکھ دیا اور میں چشمِ حیرت سے اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔

یہ وہی تمغہ تھا، جو میں بریلی میں خاں بہادر خاں کو دے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ انہی کا قاصد اور میرے لیے ایک پیغام لے کر آیا ہے۔

اب میں نے بھی اسے مسکراتی نظروں سے دیکھا اور ہمہ تن گوش ہو گیا۔ وہ کہنے لگا۔

''انہوں نے پیغام دیا ہے کہ آپ جلد از جلد اودھ سے آگرہ یا دہلی لوٹ جائیں۔''

میں ہکا بکا رہ گیا۔ ''آخر کیوں؟''

''آپ نے علی نقی خاں کی موجودگی میں واجد علی شاہ سے کہا تھا کہ اودھ ہندوستان کا سب سے قیمتی ہیرا ہے اور دشمن کی آنکھ اس ہیرے پر لگی ہے۔ یہ بات انگریز ریذیڈنٹ تک پہنچ گئی ہے۔ ہو سکتا ہے اودھ میں آپ کو کوئی اندیشہ لاحق ہو جائے۔''

مجھ پر حیرت کا ایک سکتہ گزر گیا اور یہ حقیقت کھل گئی کہ وزیراعظم علی نقی خاں، واجد علی شاہ کا نہیں، کمپنی سرکار کا آدمی ہے۔ میں نے دل ہی دل میں خاں بہادر خاں کی اطلاع رسانی پر آفریں کہی، قاصد کا اور بہادر خاں کا شکریہ ادا کیا اور کہا۔ ''انہیں بتا دینا، میں کل آگرے کی طرف لوٹ رہا ہوں۔''

پھر میں نے اس کا دیا ہوا تمغہ جیب میں رکھ لیا اور دوسرا تمغہ جو خاں بہادر خاں نے مجھے دیا تھا، اس کے حوالے کر دیا۔ قاصد نے تمغہ سنبھالا اور ''خدا حافظ'' کہہ کر اسی وقت لوٹ گیا۔

دوسرے دن ہماری بگھی گوالیار کے بجائے آگرے کی طرف واپس جا رہی تھی۔

❁......❁......❁

کیونکہ لنکا اگر گھر کے بھیدی سے مل کر ڈھائی جاتی ہے تو مغلوں کی دہلی بھی ان کے گھر کے بھیدیوں نے دشمن سے مل کر لٹوائی تھی۔ اس لیے تو مغلیہ خاندان کی المیہ داستان میری زبانی سننا چاہتا ہے تاکہ دنیا کو بتائے کہ دہلی کے کھنڈروں میں تیری ملاقات ایک تیرہ بخت مغل شہزادی سے ہوئی تھی۔ اسی نے تجھے لال قلعے کے داخلی حالات سنائے تھے جو مغلوں کو سیلاب کے بپھرے ہوئے دھاروں کی طرح بہا کر لے گئے اور ہندوستان سے رہی سہی حکومت کے ساتھ ان کی عزت دناموس بھی جاتی رہی۔

تو میرے حوالے اور میرا نام لے کر جو حالات وحوادث رقم کرے گا یا جن اسباب وعلل کو مغلوں کے ہولناک انجام کی وجہ ٹھہرائے گا، وہی معتبر سمجھے جائیں گے۔ دانشوروں کے نزدیک گھر کے اندر سے نکلی ہوئی بات ہمیشہ معتبر ہوتی ہے کیونکہ برتن سے وہی کچھ نکلتا ہے جو اس کے اندر ہوتا ہے۔ مغلوں کے اندر تو انجینئر کا پیٹ تھا جس کی تصویر میں تجھے دکھاؤں گی اور تجھ پر بہت سے اندرونی راز منکشف ہو جائیں گے۔ اس طرح 1857ء کے حالات اور مغلیہ خاندان کی تباہی پر دوسرے مصنفوں اور وقائع نویسوں کی بہ نسبت تیری تحریر کو فوقیت حاصل ہو گی اور تیرا لکھا مستند سمجھا جائے گا۔

میرے مہمانِ عزیز!

میں دہلی کے ان کھنڈروں[1] میں جہاں دن کے اُجالے میں بھی موت کی ویرانیاں برستی اور کسی بھی سیاح کو پریشان وغمزدہ کر سکتی ہیں، تیری آمد کا مقصد اچھی طرح سمجھتی ہوں۔ میں تجھے اپنی داستانِ حیرت سنانے کا وعدہ ضرور پورا کروں گی اور مغلوں کی لرزہ خیز تباہی کا خونیں افسانہ اپنی ہی زبان سے سناؤں گی۔ بھلا جو بات ہو گزری اور زمانے کی آنکھوں نے دیکھ لی، مجھے اس کے بیان کرنے میں کیا عذر ہو سکتا ہے؟ اب تو یہی ایک کام باقی رہ گیا ہے جو مجھے اس دنیا میں پورا کرنا ہے ورنہ مرزا اسد اللہ خاں کے بقول ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میں کوئی واقعہ، کوئی بات جو مجھے معلوم ہے، تجھ سے چھپا کے نہیں رکھوں گی بلکہ ہر وہ غلطی جو لائق تعزیر تھی، ہر وہ ملامت جو پیش آئی، تیرے گوش گزار کروں گی۔ اگرچہ خطاؤں کا اعتراف بعد از وقت ہے کیونکہ مغلوں کو ان خطاؤں کی سزا تو مل چکی پھر بھی زمانہ جان لے گا کہ انسان کی غلطیوں کا جوا اس کے اپنے کندھوں پر ہوتا ہے۔ میں نے اٹھارہویں اور اُنیسویں صدی کے یورپ اور انگلستان کی تہذیب کے افسانے دوسروں کی زبان سے سنے ہیں مگر ہندوستان میں دم توڑتی ہوئی مغل تہذیب کی آخری ہچکیوں کی کہانی تو میری زبانی سنے گا۔

تجھے نہ تو ہماری جدوجہدِ آزادی سے کوئی دلچسپی ہو گی جس کا نتیجہ ابھی تک صفر ہے نہ تیرے لیے شاہ عالم ثانی کے مخفی خزانے میں کوئی کشش ہو سکتی ہے۔ دنیا میں شاہی خزانوں اور دفینوں کی کئی کہانیاں بھوتوں یا پریشان

---

[1] 1857ء میں دہلی کی تباہی و بربادی کے بعد جب مولانا حالی نے ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا کہ ؎

لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح!
دیکھ لے اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

تو مرزا داغ دہلوی شعر سن کر حالی کے پاؤں سے لپٹ گئے اور دیر تک روتے رہے۔ (قمر اجنالوی)

(16)

محبت یا آوارگی

اے ارضِ دہلی کے مسافر!

میرے وقائع نویس مہمان!

تُو نے سیّد برہان الدین کی اسرار و تحیر میں لپٹی ہوئی عجیب و غریب داستان سنی اور اس داستان کے دریچوں سے مغلوں کے زوال و ادبار کے ساتھ ساتھ افغانوں، روہیلوں، سکھوں، مرہٹوں اور انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ کے کچھ ایسے مناظر دیکھے، جو میں تجھے نہیں دکھا سکتی تھی کیونکہ بعض واقعات میرے علم میں نہیں تھے۔

سیّد صاحب نے اپنی کمسنی ہی میں مغلوں کا زوال پذیر دور دیکھا تھا جب ہندوستان کی تاریخ کے نقشے تبدیل ہو رہے تھے۔ شاہ عالم ثانی جنت مکانی کے عہد میں وہ مغل دربار سے وابستہ ہوئے اور شاہی محرر بن گئے تھے۔ ان کی رُوداد سے پتہ چلتا ہے کہ شہنشاہ کے بہت قریب ہو گئے تھے۔ اسی قریبی تعلق کے باعث کچھ اہم واقعات صرف انہی کی ذات تک محدود رہے، جن کا علم کسی اور کو نہ ہو سکا۔

ان واقعات میں شاہ عالم کے مخفی خزانے کا واقعہ اگرچہ الف لیلیٰ کی کسی طلسمی حکایت سے کم ہوشربا نہیں جو قفل ابجد کے حوالے سے شروع ہوتی ہے۔ لیکن یہ دنیا بجائے خود حیرتوں اور عجائبات کا ایک طلسم خانہ ہے اور یہاں ایسے ایسے واقعات و حادثات پیش آتے ہیں جو بڑے انہونے، محیر العقل اور سحر و جادو سے کہیں بڑھ کر ناقابلِ فہم ہوتے ہیں۔ سیّد صاحب ایک قفل کے لفظِ کلید سے، جس کا انکشاف خود اندھے شہنشاہ نے ان پر کر دیا تھا، شاہی دستاویزات کے رجسٹر (دفتری کتاب) سے ایک ایسی تحریر معرفت تک پہنچ گئے تھے جو تمثیل اور استعارے کی زبان میں شاہی دفینے کی نشاندہی کرتی یا صاف اور سیدھے لفظوں میں خزانے کی کنجی تھی لیکن تلاش بسیار کے باوجود اس مخفی خزانے تک نہ پہنچ سکے جس کا ذکر وہ بڑے یقین کے ساتھ کرنے لگے تھے۔

میں نے سیّد صاحب کی جو رُوداد بیان کی ہے اس کا ایک مقصد تھا۔ پھر ان حالات میں جو بالکل ناگہاں اور غیر متوقع طور پر ہمیں پیش آ گئے تھے، اس مقصد کی اہمیت کچھ اور بڑھ جاتی ہے۔ مگر میں جانتی ہوں تجھے اس مقصد سے بڑھ کر مغلوں کی تباہی و بربادی سے زیادہ دلچسپی ہو گی جس کے چشم دید حالات سننے کے لیے تو یہاں آیا اور جاننا چاہتا ہے کہ آلِ تیمور کی بربادی میں فرنگی کی سازشوں کے علاوہ اپنوں کی بے وفائی اور غداری کا کتنا دخل ہے۔

دہلی میں بھی ایک الم ناک سانحۂ مرگ رونما ہوا اور ولی عہد بہادر مرزا فخر الدین فتح الملک عین جوانی میں دنیا سے ناگہاں چل بسے تھے۔

الحاقِ اودھ کا واقعہ اگر چہ ان کے انتقال سے پہلے ہو گزرا تھا اور لوگ سمجھ گئے تھے کہ انگریز پورے ہندوستان کو اپنا غلام بنا لینا چاہتا ہے مگر میں الحاق کا واقعہ بعد میں اور ولی عہد کے سانحۂ ارتحال کا حال پہلے بیان کروں گی۔ اس سے واقعات کی ترتیب ضرور بدل جائے گی تاہم اس تبدیلی کا ایک خاص مقصد ہے کہ ایک چھوٹی سی بے ترتیبی سے اصل کہانی کی ترتیب درست ہو جائے۔

❀......❀......❀

تُو نے اس وقت تک مغلیہ خاندان کے جو حالات سنے ہیں، ان میں ولی عہدی کا ایک جھگڑا بھی شامل ہے، جو صریحاً بیگم زینت محل نے کھڑا کیا تھا۔ ولی عہد اوّل مرزا دارا بخت کی وفات کے بعد سرکارِ انگلشیہ نے بہ لحاظِ عمر سب سے بڑے صاحبزادے مرزا فخر الدین فتح الملک کو ولی عہد تسلیم کر لیا تو بیگم زینت محل نہ صرف ان سے سخت ناراض ہو گئیں بلکہ ہر اُس فرد سے کدورت رکھتی تھیں جس کا ولی عہد کے ساتھ نزدیک یا دور کا کوئی رشتہ تھا۔ حتیٰ کہ ان کے کردار پر بھی انگلی اُٹھایا کرتی تھیں۔

متعدد لوگ جانتے ہیں کہ ان دنوں لال قلعہ خانگی بدچلنی میں کچھ زیادہ ہی بدنام تھا۔ میں اس پر اخفا کا پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ وہ دور ہی ایسا تھا کہ مغل شہزادے، سلاطین، امراء اور رؤسا شعر و شاعری، شاہد و شراب اور عشق و عاشقی میں بڑی دلچسپی لیتے بلکہ ان کے سہ آتشہ خمار میں غرق رہتے تھے۔ طوائفوں کے ہاں جانا، مجرا سننا، ان سے لگاوَ رکھنا اگر اس دور کی تہذیب کا حصہ سمجھا جاتا تھا تو غزل، شراب اور عاشقانہ مزاجی بھی اسی تہذیبی رواج میں شامل تھی، جو بیوی کے علاوہ طوائف اور داشتہ کے ساتھ تعلقات میں مانع نہیں تھا۔ حد یہ تھی کہ اپنی عاشقانہ مزاجی، نجی آوارگی اور شاہد بازی کی حکایات بڑے فخر سے ایک دوسرے کو سنائی جاتی تھیں۔

قلعہ معلّٰی کے اندر باندیوں اور لونڈیوں کے ساتھ بھی تعلقات رکھے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ بعض سلاطین اور شہزادوں تک محدود نہ تھا بلکہ اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کا سب سے چھوٹا لڑکا قسمت بیگ ایک لونڈی کے بطن سے اس وقت پیدا ہوا تھا جب بادشاہ سلامت 78 برس کے تھے۔ 1857ء میں مرزا قسمت بیگ[1] کی عمر صرف دس برس کی تھی۔ اعلیٰ حضر 88 سال کو پہنچ چکے تھے اور کسی باعث لونڈی سے قطع تعلق کر بیٹھے تھے جو قسمت بیگ کے ساتھ خاص بازار میں رہتی تھی۔

یہ واقعہ بیان کرنے کا مقصد صرف لال قلعے کی تہذیب کا نقشہ بیان کرنا ہے اور کچھ نہیں۔ ورنہ کئی شہزادوں کے لونڈیوں سے تعلقات تھے۔ میں اپنی داستان کے آغاز ہی میں بتا چکی ہوں کہ مرزا ظہیر الدین مغل کی بیٹی لالہ رخ بھی ایک لونڈی کے بطن سے تھی مگر بیگم زینت محل صرف ولی عہد مرزا فخر الدین کو موردِ الزام ٹھہرایا کرتی تھیں۔ صاحب عالم جو ''مرزا فخرو'' کے نام سے یاد کیے جاتے تھے، لڑکپن ہی سے دین دار اور شرعی معاملات سے لگاوَ رکھتے تھے۔ انہوں نے آئینِ اکبری کے برعکس ختنہ بھی کروایا تھا۔ اس آئین کی رُو سے تخت پر بیٹھنے والے مغل

---

[1] خواجہ حسن نظامی کے مطابق جب انگریز نے اس اَمر کی تحقیق کر لی کہ قسمت بیگ، بہادر شاہ ظفر کا بیٹا ہے جو لونڈی کے بطن سے پیدا ہوا تو اس کا دس روپے وظیفہ مقرر کر دیا تھا۔

خوابوں کی طرح جن کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی، لوگوں کے ذہنوں میں چکر کاٹتی رہتی ہیں۔ پھر ایسا خزانہ کس کام کا جو ڈوبتی ہوئی مغل سلطنت کو نہ بچا سکا۔ انگریز نے تیموری گھرانے کا درخت جڑوں سمیت اُکھاڑ پھینکا، مغل شہزادوں کی لاشیں سولیوں پر لٹکا دیں۔ بہت سے جیلوں میں ڈال دیئے گئے جہاں ان کے جنازے نکلتے تو ضرور دیکھے گئے مگر کوئی زندہ باہر نہ نکل سکا۔ جو شہزادے اور ''سلاطین'' روپوش ہو گئے اور فرنگی کے ہاتھ نہ آسکے وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے رہے۔ جنہوں نے انگریز کی غلامی قبول کر لی اور اس کی چوکھٹ پر سر رکھ دیئے، ان کے دس دس، پانچ پانچ روپلی کے وظیفے بندھے۔

یہ سب کچھ اسی طرح ہوا تھا جس طرح میں نے بیان کیا ہے۔ مغلوں کے لیے زندگی اور اس کی راحتیں ختم ہو گئی تھیں۔ جیسا کہ میں تجھے بتا چکی ہوں، یہ دنیا حیرتوں اور عجائبات کا ایک طلسم خانہ ہے۔ یہاں کبھی کبھی پریشان خوابوں کو بھی تعبیر مل جاتی ہے اور بعض مہر بند اسرار تقدیر کی طرح ناگہاں اس طرح کھلتے ہیں کہ ایک زمانہ دنگ رہ جاتا ہے۔ پھر بھی میں شاہ عالم ثانی کے خانے کا ذکر اور سیّد بران الدین کی کہانی ختم کرتی ہوں اور تو جن واقعات کے بارے میں تجسّس رکھتا ہے کہ وہ کس طرح پیش آئے تھے، انہیں بیان کرتی ہوں۔

بادشاہ کی فرمائش پر سید صاحب جوہری کی حیثیت سے یہ معلوم کرنے کے لیے لکھنؤ گئے تھے کہ کمپنی سرکار اودھ کے متعلق کیا ارادہ رکھتی ہے یا جن مرہٹہ ریاستوں کو فرنگی نے اپنے محروسہ اور مقبوضہ علاقے میں شامل کر لیا ہے ان کے باشندے انگریز کے بارے میں کیا سوچتے ہیں؟

اگر تو سمجھتا ہے کہ بادشاہ، نواب واجد علی شاہ اور مرہٹہ ریاستوں کے معزول حکمرانوں کے ساتھ مل کر فرنگی کے خلاف کوئی جنگ لڑنا اور اپنی بچی کھچی سلطنت کو بچانا چاہتے تھے، بالکل غلط ہے۔ اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر مغلیہ خاندان کے سب سے کمزور اور بے اختیار حکمران تھے جن کے پَر و بال فرنگی نے باندھ رکھے تھے۔ ان میں نہ تو دشمن سے لڑنے کی طاقت تھی نہ ان کے کسی منصوبے کو روک دینے کی صلاحیت۔ اودھ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی غرض و غایت غالباً یہ تھی کہ اگر کمپنی سرکار اپنے محروسہ علاقے سے اودھ کا بھی الحاق کر لیتی اور اس کی علیحدہ حیثیت ختم کر دیتی ہے تو پھر سلطنتِ دہلی کی باری کب آئے گی اور وہ خود مزید کتنا عرصہ بادشاہی کی تہمت اُٹھا سکیں گے؟

لکھنؤ سے واپسی پر سیّد صاحب نے اودھ کے بارے میں جو رپورٹ اعلیٰ حضرت کو پیش کی وہ انہی واقعات پر مشتمل تھی جن کی تفصیل تو پہلے ہی سن چکا ہے۔ ان واقعات میں یا تو بریلی میں خان بہادر خان سے ان کی ملاقات بڑی حیرت انگیز تھی یا پھر لکھنؤ میں وزیراعظم علی نقی خاں کا رویّہ اودھ اور شاہ اودھ نواب واجد علی شاہ سے غداری کے مترادف تھا اور سیّد صاحب کو لکھنؤ سے اس لیے بھاگنا پڑا تھا کہ انگریز افسر کو شبہ ہو گیا تھا کہ وہ اودھ کے داخلی حالات کی ٹوہ لگاتے پھر رہے ہیں یا ان پر دربارِ لکھنؤ کے وزیراعظم کی اصل حیثیت کھل گئی تھی۔ مگر یہ واقعات ان معلومات کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے جو مجھے دربارِ لکھنؤ اور الحاقِ اودھ کے سلسلے میں معلوم ہو چکی تھیں۔ اس لیے میں انہی معلومات کا اظہار کروں گی، جو چونکا دینے والی ہیں۔

اودھ کے الحاق کا حادثہ 1856ء میں پیش آیا تھا جسے 1857ء کی جنگ آزادی یا غدر کا دیباچہ کہا جا سکتا ہے۔ یہ الحاق دراصل وہ پرندہ تھا جو ہمیشہ طوفان کے آگے پرواز کرتا اور تباہی کے آنے کی خبر دیتا ہے۔ اسی سال

جدا ہو کر آموں کے درختوں کی طرف نکل جاتے (جہاں مغل عورتیں جھولے ڈالتی تھیں) یا ان ویران مقبروں میں غائب ہو جاتے تھے، جہاں ان کی رنگین محفلیں جمتی تھیں۔

❁......❁......❁

یہ 1836ء کے موسم برسات کا واقعہ ہے۔ ماموں مرزا کے بقول وہ دونوں بہن بھائی ''پھول والوں کی سیر'' کے ہنگامے پیچھے چھوڑ کر تغلق آباد کے قلعے کی طرف جانے والی سڑک پر ہو لیے جو قطب مینار کے مشرق میں واقع ہے۔ اس سڑک پر دو تین کوٹھڑیاں ہیں جو ''حویلیاں'' کہلاتی ہیں۔ ان کے علاوہ وہاں اور کوئی عمارت نہیں۔ حضرت قطب صاحب رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی زندگی وہیں بسر کی تھی۔ وہ دونوں ابھی ''حویلیوں'' میں پہنچے ہی تھے کہ صاحب عالم بھی ان کے پیچھے اچانک وہاں پہنچ گئے۔ کسی تعارف کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر صاحب عالم، سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے فرزند تھے تو ماموں اورنگ مرزا بھی ان دنوں روزنامچہ نویسی میں شہرت رکھتے تھے اور جانے پہچانے جاتے تھے۔

نواب حسام الدین حیدر کے چھوٹے بیٹے نواب حسین مرزا، شاہی قلعے میں نظارت کے عہدے پر فائز تھے۔ ماموں اورنگ مرزا کی ان سے اچھی خاصی راہ و رسم تھی اور ان سے کہہ رکھا تھا، اگر کسی نواب، شہزادے کو روزنامچہ نویس کی ضرورت ہو تو ان کی سفارش کر دیں۔ حسین مرزا نے صاحب عالم کی سفارش کی تھی یا نہیں البتہ انہوں نے ماموں مرزا کے سامنے یہی ضرورت بیان کی کہ ان سے روزنامچہ لکھوانا چاہتے ہیں۔

یہاں میں یہ وضاحت کر دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ ماموں اورنگ مرزا اور بی مغلانی سلجوقی مغلوں کے گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ قلعے میں مغلانیوں اور ترکینوں کی اصطلاح اگرچہ خواصوں کے لیے استعمال ہونے لگی تھی لیکن مغل گھرانے کی خواتین بھی مغلانیاں کہلاتی تھیں۔ بعض گھروں میں تو لڑکی کا نام بھی مغلانی رکھا جاتا تھا۔ ''بی مغلانی'' بھی ایک نام تھا جو صاحب عالم نے اپنے دل کی لوح پر لکھ لیا تھا۔

سلجوقی مغلوں کا یہ گھرانا کبھی بڑا نامور اور معزز تھا۔ شہنشاہ عزیز الدین عالمگیر ثانی کی زندگی میں جب شہزادہ عالی گہر مرہٹوں کی سرکوبی کے لیے جو بنگال کو بار بار لوٹتے اور شہریوں کا قتل عام کرتے تھے، بنگال کی مہم پر روانہ ہوئے تو اس سلجوقی گھرانے کا آخری مغل سردار بھی شہزادہ عالی گہر کے ساتھ تھا۔ مگر عالمگیر کے قتل، پانی پت کی تیسری جنگ اور احمد شاہ ابدالی کی واپسی کے بعد شہزادہ عالی گہر جو عظیم آباد (بنگال) میں شاہ عالم ثانی کے لقب سے رسمی طور پر اپنے والد کے جانشین بنا دیئے گئے تھے کچھ عرصے بعد جب عظیم آباد سے دہلی واپس آئے تو سلجوقی سردار ان کے ساتھ نہیں تھا بلکہ مغل لشکر بھی نہیں تھے۔

وہ مرہٹوں کے خلاف اس جنگ میں لڑتا ہوا مارا گیا تھا جو نواب نجف خاں نے شاہ عالم کی طرف سے انگریز کے ساتھ مل کر لڑی اور مرہٹوں کو شکست دی تھی۔ نجف خاں، مغل شہنشاہ کے ساتھ ہی بنگال سے دہلی آ گیا اور اپنی اعلیٰ قابلیت کے باعث وزیر سلطنت مقرر ہوا تھا۔ اس نے سلجوقی مغل سردار کی بیوہ اور اس کے کمسن بیٹے کا دربار سے وظیفہ لگوا دیا تھا مگر نجف خاں کی رحلت کے بعد زمانے نے نیا ورق اُلٹا۔ دہلی کو کبھی جاٹوں، کبھی روہیلوں، کبھی مرہٹوں، کبھی سکھوں، کبھی انگریزوں نے لوٹا۔ غلام قادر روہیلے کی وحشت و بربریت کے بعد (جس نے مغل شہنشاہ کی آنکھیں نکلوا دی تھیں) جب مہاراجہ مادھو راؤ سندھیا نے دہلی میں روہیلوں کا قتل عام کیا اور قادر خاں کو

شہزادوں کے لیے ختنہ ممنوع قرار دے دیا گیا تھا تا کہ وہ ساقط الاعضا نہ ہو جائیں جیسا کہ سیّد برہان الدین اپنی سرگزشت میں بیان کر چکے ہیں۔ یہی بات اعلیٰ حضرت اور بیگم زینت محل نے ان کی ولی عہدی کے خلاف بطور ثبوت پیش کی تھی جسے انگریز نے کوئی اہمیت نہ دی مگر شرع سے دلچسپی رکھنے کے باوجود صاحبِ عالم خود کو اس دور کی مروّجہ تہذیب یا عشق پرستی سے نہیں بچا سکے تھے۔

قلعے کی بیگمات، کہارنوں اور پالکی اُٹھانے والیوں میں ان کے لڑکپن کا ایک عشق اس وقت مشہور ہو گیا تھا جب ان کی عمر صرف تیرہ برس تھی اور وہ اکبر شاہ ثانی عرش آشیانہ کی ایک منظورِ نظر کہارن کی خوبصورت لڑکی پر عاشق ہو گئے تھے۔ کہارن کو پتہ چلا کہ صاحبِ عالم غمِ عشق میں بستر سے آ لگے ہیں تو اپنی بیٹی کو قلعے میں بلا لیا لیکن کم عمری کے باعث وہ لڑکی کے ساتھ کوئی ڈھنگ کی بات بھی نہ کر سکتے تھے۔ تاہم ان کی عمر چودہ ساڑھے چودہ سال اور لڑکی سترہ برس کی ہو گی جب اس عاشقانہ غلطی کا نتیجہ مرزا تیغ جمال کی صورت میں برآمد ہوا۔

مرزا تیغ جمال[1] اپنی ماں اور نانی کے ہاں ''خانم بازار'' کے ایک مکان میں پرورش پانے لگا جہاں ماں بیٹی رہتی تھیں۔ جب چھ برس کا ہوا تو صاحب عالم کے پاس لال قلعے میں لایا گیا جو اس عرصے میں دو شادیاں کر چکے تھے مگر نہ تو اسے شہزادہ تسلیم کیا گیا نہ بادشاہ کی طرف سے اس کا وظیفہ لگا۔ سبب یہ تھا کہ کہارن کی بیٹی سے صاحب عالم کی شادی نہیں ہوئی تھی اور معاملے کو خفیہ رکھا گیا تھا۔ حالانکہ دستور یہ تھا کہ جس کے ساتھ تعلق ہو جائے اسے بیوی یا داشتہ بنا کے رکھا جاتا تھا اور داشتہ رکھنا معیوب نہ تھا۔

صاحب عالم سترہ اٹھارہ برس کے ہوئے تو ان کی محبت کا نیا سلسلہ بی مغلانی کے ساتھ چلا، جس کا بعد ازاں مجھے ماموں اورنگ مرزا سے پتہ چلا کہ وہ دلچسپ واقعہ ''پھول والوں کی سیر'' کے میلے پر مہرولی میں پیش آیا تھا۔ برسات کے مقررہ ایام میں ''پھول والوں کی سیر[2]'' نے ایک تہوار کی شکل اختیار کر لی تھی جس میں مسلمان اور ہندو سب اکٹھے شریک ہوا کرتے تھے۔ میں بتا چکی ہوں کہ ایک مقام سے اگر مسلمان قطار در قطار حضرت قطب صاحب کے مزار کی طرف جاتے، جن کی قیادت یا رہنمائی خود بادشاہ کرتے تھے تو ہندو بھی گاتے بجاتے جوگ مایا کے مندر کو چلے جاتے تھے۔

اعلیٰ حضرت جب حضرت قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کی حاضری دیتے تو مرشدزادے اور امرائے سلطنت ہمراہ ہوتے تھے۔ پھر بادشاہ درگاہ کی مغربی دیوار کے باہر مغلوں کی بنائی ہوئی سنگ مرمر کی موتی مسجد میں چلے جاتے یا اپنے تعمیر کردہ ظفر محل کا رخ کرتے (جو ان کی آخری تعمیر تھی) بعد ازاں شاہی خیمے میں آ جاتے تھے۔ اس موقع پر مہرولی میں خیمے لگتے تھے۔ گانا بجانا بھی ہوتا تھا۔ تب مرشدزادے اور سلاطین ان سے

---

[1] خواجہ حسن نظامی نے مرزا فخر الدین صاحب عالم کے عشق اور مرزا تیغ جمال کی پیدائش کا واقعہ بھی یہاں لکھا ہے۔ جو باپ کی طرف سے تیموری مغل اور ماں کی جانب سے کہارن کا بیٹا تھا۔ وہ غدر کے بعد طویل عرصے تک زندہ رہا۔ (بیگمات کے آنسو)

[2] ''انوار صفیا'' کے مؤلفین نے لکھا ہے ''پھول والوں کی سیر'' ایک قسم کا میلہ تھا، جس میں مغل اپنے عیش خانے ساتھ لے کر آتے اور شرمناک عیاشیاں کرتے حتیٰ کہ پرانے مقبروں اور مزاروں کے اندر رہ کر برسات میں عیش و عشرت مناتے تھے۔

والوں سے اور وہاں رہنے والوں کی ضرورتیں ان لوگوں سے پوری ہوتی تھیں۔ ساری آبادیاں بڑی پُر رونق تھیں جہاں ہر وقت خلقت کا اژدھام رہتا تھا۔

ماموں اورنگ مرزا بی مغلانی اور ایک خادمہ مہرو کے ساتھ خاص بازار کے آبائی مکان میں رہتے تھے جو پُرشکوہ نہ سہی پھر بھی اچھا خاصا اور باپ دادا کی یادگار تھا۔ انہوں نے بخشی خانے کی ملازمت نہیں کی۔ اپنے دماغ کی صلاحیت، قلم کی برش اور قسمت کی یاوری پر بھروسہ کیا تھا۔ اگرچہ کسی نواب یا رئیس کی سرکار سے وابستہ نہیں ہوئے تھے مگر چند رئیسوں اور امیروں کے خاندانی سوانح، حالاتِ زندگی، تذکرے اور تاریخی واقعات لکھ کر اپنی تحریر کا لوہا منوالیا تھا۔ اس طرح بخشی خانے کی اسامی سے کچھ زیادہ ہی یافت ہو جاتی تھی اور اب اس کوشش میں تھے کہ کسی نواب یا بڑے رئیس کی سرکار سے وابستہ ہو جائیں کہ 1836ء میں ''پھول والوں کی سیر'' ایک نیا مژدہ لے کر آئی۔

ان کا خیال تھا، صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر آٹھ دس روز میں حاضری کا بلاوا بھیج دیں گے مگر بلاوا توقع سے بہت پہلے آ گیا۔ تعجب کی بات یہ ہوئی کہ صاحب عالم نے حاضری کا پیغام کسی خادم، اہلکار، خواجہ سرا اور متصدی (منشی یا نقل نویس) کے ہاتھ نہیں بھیجا بلکہ تیرے ہی دن خاص بازار والے مکان کے سامنے بہ نفس نفیس خود پالکی سے اُترے تھے اور ماموں اورنگ مرزا، بی مغلانی، مہرو سب کے لیے ایک اچیرج (اچنبھا) ہوا تھا۔

کیا وہ جانتے تھے کہ اورنگ مرزا، خاص بازار میں رہتے ہیں یا حسین مرزا سے ان کے مکان کا اتا پتہ پوچھ لیا تھا؟ بہرحال کسی پیغام رساں کو بھیجنے کے بجائے ان کا خود پہنچ جانا بالکل خلافِ توقع بلکہ ناقابل یقین تھا لیکن یہ انہونی بات ہو گئی تھی اور ایک ایسا آدمی گھر تک آ گیا تھا جس کے لیے گھر کے ساتھ انہیں اپنے دل کا دروازہ بھی کھولنا پڑا۔

ماموں اورنگ مرزا نے کھلے دل سے خیر مقدم کیا اور شہزادہ عالی کی آمد کو اپنی اقبال مندی قرار دیا۔ گھر کا دیوان خانہ چھوٹا تھا مگر ضرورت کے سامان سے آراستہ اور شریفوں کے بیٹھنے کے لائق تھا۔ حسب توفیق خاطر مدارات کے بعد پان کی گلوری پیش کی اور کہا۔

''حضور نے خود کیوں تکلیف فرمائی؟ کسی خادم کے ہاتھ پیغام بھیج دیا ہوتا۔ میں حاضر ہو جاتا۔ نیاز مند نے روزنامچہ لکھنے سے انکار نہیں کیا تھا۔ میرے لیے یہ امر سعادت کا باعث ہے کہ صاحب عالم کی سرکار سے وابستہ ہوتا ہوں۔''

''وہ تو آپ ہو گئے اور ہم نے روزنامچہ نویسی کا فرض آپ کو سونپ دیا۔ مگر آج کی آمد کسی اور ضمن میں ہے۔''

اور جب یہ ''ضمنی'' کھلی تو ماموں اورنگ مرزا پر حیرت کا ایک نیا سکتہ گزر گیا۔ صاحب عالم مرزا فتح الملک بہادر انہیں گھر والوں سمیت اپنے باغ میں سیر و تفریح کی دعوت دینے آئے تھے۔ ابھی دو روز پیشتر اگرچہ وہ ''پھول والوں کی سیر'' سے لوٹے تھے لیکن شہزادے کے بقول وہ ایک اجتماعی سیر تھی اور سیر بھی کہاں، میلہ تھا۔ بعض لوگ مہرولی کے میلے میں رسماً شریک ہوتے ہیں کہ اس سے شاہی خاندان کی ایک یاد وابستہ ہے ورنہ ان کی تنہائی پسند طبیعت بھیڑ بھاڑ گوارا نہیں کرتی اور سیر کے لیے بھی علیحدہ گوشہ چاہتی ہے۔ ''پھول والوں کی سیر'' میں وہ بن بھائی بھی لوگوں کے ہجوم سے نکل کر حویلیوں کی جانب چلے گئے تھے کہ انہیں بھیڑ بھاڑ پسند نہ تھی۔ اس لیے

ہلاک کر کے اندھے شاہ عالم ثانی کو اپنی تحویل میں لے لیا تو مغلیہ سلطنت کا دیوانی بندوبست بھی مرہٹوں کے ہاتھ میں چلا گیا تھا جنہوں نے سلطنت کے اخراجات کم کرنے کے لیے بعض وظیفے بالکل بند کر دیئے تھے اور بعض میں کٹوتی کر کے رقم گھٹا دی تھی۔

اس عرصے میں سلجوقی مغل سردار کی بیوہ بوڑھی ہوگئی اور اس کا کمسن بیٹا جوان ہو چکا تھا۔ سندھیا کے مرہٹہ سردار نے جو اس کی طرف سے دربارِ دہلی کا نگراں تھا، سلجوقی گھر کا وظیفہ بند کر دیا مگر جوان لڑکے کو بخشی خانے میں نوکری مل گئی تھی۔ مرہٹوں کے بعد فرنگی کا عہد آیا تو مغل حکمران خود وظیفہ خوار بن گئے اور نہ صرف سرکاری وظیفوں میں مزید کٹوتیاں ہوئیں بلکہ امورِ سلطنت میں بھی بہت سی تبدیلیاں آ گئیں۔ تین نسلوں تک سلجوقی گھرانے کے لوگ بخشی خانے کی ملازمت پر گزر بسر کرتے آ رہے تھے مگر سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے دور میں بخشی اور بخشی خانے کی حالت کچھ اور ابتر ہوگئی تھی۔ ماموں اورنگ مرزا نے اس ملازمت پر لات ماری اور زمانے کے دستور کے مطابق روزنامچہ نویسی میں مہارت حاصل کر لی۔ نواب، شہزادے، راجے، مہاراجے، حتیٰ کہ امراء و رؤسا بھی اپنے روزنامچے لکھوانے کا شوق رکھتے تھے۔ اس شوق کی وجہ سے بڑے لوگوں سے میل جول رہتا اور ہر واقعہ یا معاملہ علم میں آ جاتا تھا۔ ویسے بھی یہ شوق، پیشہ یا فن ان کی طبیعت کے عین مطابق تھا۔ وہ تاریخ کے گزرے واقعات اور پیش آنے والے حالات سے دلچسپی رکھتے اور اس ہنر کو ترقی کا وسیلہ سمجھتے تھے۔

جب ماموں اورنگ مرزا کو معلوم ہوا کہ بادشاہ کے فرزند انہیں روزنامچہ نویسی کی خدمت سونپنا چاہتے ہیں اور شاید ناظر قلعہ حسین مرزا کی سفارش کام کر گئی ہے کہ صاحب عالم خود اتنی دور تک ان کے پیچھے آئے تو انہیں کس قدر خوشی ہوئی ہوگی؟ کوئی اس بات کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

انہوں نے یہ خدمت بخوشی قبول کر لی اور دریافت کیا کہ وہ صاحب عالم کی سرکار میں کب حاضر ہو جائیں؟

جواب ملا۔ ''ہم خود اطلاع کرا دیں گے، بہت جلد۔''

یہ کہہ کر مرزا فخر الدین نے ایک نظر اورنگ مرزا کو دیکھا۔ دوسری نظر بی مغلانی پر ڈالی اور لوٹ گئے۔ بہت مختصر سی ملاقات تھی۔ جیسے بجز روزنامچہ نویسی کوئی کام، کوئی مطلب، کوئی مقصد نہیں تھا۔ ان دونوں کے نزدیک شہزادے سے ملاقات خوش بختی کی علامت تھی یا تقدیر کا لکھا تھا لیکن اس خط کا مضمون تو تیسرے روز کھلا اور یوں کھلا جیسے کوئی عقدہ کھلتا ہے۔

❁ ...... ❁ ...... ❁

لال قلعے[1] کے باہر لال ڈگی سے پرے اردو بازار (جو فوج کا بازار کہلاتا تھا)، خاص بازار، خانم کا بازار جو سراوگیوں کے مندر تک چلا گیا تھا، بلاقی بیگم کا کوچہ، خاں دوراں کی حویلی، گلیوں کا بازار، چوک سعید اللہ خاں وہ آبادیاں تھیں جہاں عموماً قلعے کے متعلقین، ملازمین اور وہ رئیس و امیر رہتے تھے، جن کا قلعے میں آنا جانا تھا۔ یا پھر وہ لوگ آباد تھے جن کی روزی قلعے سے بندھی تھی۔ علاوہ ازیں ان آبادیوں، محلوں، بازاروں، کوچوں میں اہل حرفہ، ہر قسم کے پیشے، کسب، کاری گری اور محنت مزدوری کرنے والے لوگ بھی آ بسے تھے جن کی روزی وہاں رہنے

[1] لال قلعہ کے قرب میں کوچہ چہل امیران بھی تھا جو چالیس امیروں کی حویلیوں کی وجہ سے کوچہ چہل امیران کہلاتا تھا جس کا نام بگڑتے بگڑتے کوچہ چہل ایران سے کوچہ چہلان اور پھر کوچہ چیلان اور اب چیلوں کا کوچہ ہے۔

صاحب عالم کی طرف سے ہوا تھا۔ جو کچھ میں سن چکی ہوں، اس کے مطابق وہ سارا دن سیر وتفریح میں گزر گیا۔ رکاب دار نے ایسے کھانے تیار کیے تھے جو صرف شاہی دستر خوان پر چنے جاتے ہیں۔ تیسرے پہر شام کو واپسی ہوئی اور وہ اس وقت خاص بازار پہنچے جب شام کے سائے دہلی پر اُتر آئے تھے۔

سیر وتفریح کی اصل غایت باہمی قربت اور بے تکلفی تھی۔ اس مقصد کے لیے صاحب عالم نے جو بازی بچھائی اور جو چال کھیلی، اس میں ان کی جیت لازمی تھی۔ اس بساط اور اس نقشے پر وہ اور بھی کئی بازیاں کھیلتے اور سیر وتفریح کے کئی پروگرام بناتے رہے۔ اپنے باغ کے علاوہ کبھی مقبرۂ ہمایوں، کبھی دریائے جمنا اور کبھی مہرولی میں آموں کے درختوں کی کئی سیریں ہو چکی تھیں۔ دو تین مہینے میں بے تکلفی نے محبت کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اب صرف ایک چال سے بساط کا نقشہ بدل جانے والا تھا اور وہ چال صاحب عالم نے سوچ لی تھی۔

ماموں اورنگ مرزا ان کی آمد ورفت، سیر وتفریح اور نوازش ومہربانی کا مطلب اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اس عرصے میں انہوں نے صاحب عالم کی سرکار میں روزنامچہ نویسی کا کام بھی سنبھال لیا تھا جو بالکل سرسری بلکہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس التفات کی وجہ کچھ اور تھی اور انہیں معاملے کی اس نوعیت پر بھی کوئی اعتراض نہ تھا۔ بس ان کی ایک ہی شرط تھی کہ صاحب عالم بی مغلانی سے باقاعدہ شادی کر لیں، جس کے لیے انہیں اعلیٰ حضرت سے اجازت حاصل کرنا تھی۔ شہزادے کا خیال تھا، وہ بادشاہ سے اجازت حاصل کر لیں گے۔ اب کے معاملہ کسی کہارن کی بیٹی کا نہیں تھا بلکہ سلجوقی مغل گھرانے کی ایک لڑکی کا تھا جس کے آباء واجداد نے مغل سلطنت کے لیے جنگیں لڑیں اور تلواریں ماری تھیں مگر جب بات اعلیٰ حضرت تک پہنچی، انہوں نے اپنے خاندان سے باہر شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا جس سے معاملے کی صورت بالکل بدل گئی۔

❁......❁......❁

یہ بات سب جانتے تھے کہ کئی سلاطین اور کئی شہزادوں نے خاندان سے باہر شادیاں کی تھیں۔ خود بادشاہ نے احمد قلی خان[1] کی بیٹی سے جو احمد شاہ ابدالی کے خاندان سے تھے، شادی کی اور ان کی بیٹی کو زینت محل کا خطاب دیا۔ مگر صاحب عالم مرزا فخر الدین کے لیے حکم صادر ہوا کہ اپنے خاندان سے باہر شادی نہیں کر سکتے۔ پتہ چلا کہ زینت محل اور کچھ بیگمات نے اس شادی کی مخالفت کی اور صاحب عالم کی نئی محبت کو ان کی ''نئی آوارگی'' قرار دیا تھا۔ عرضِ مطلب کے لیے وہ خود عالی جاہ کے سامنے نہیں گئے تھے بلکہ کسی کے ذریعے بات کہلوائی تھی لیکن انکار سن کر بڑے آزردہ خاطر ہو گئے۔ حالانکہ دو تین بیگمات کے سوا بات کہیں نہ پہنچی تھی پھر بھی انہوں نے یہی سمجھا کہ انکار ہو جانے سے وہ سارے قلعے میں رُسوا ہو گئے ہیں۔

انہیں بڑی بہن شہزادی احمدی بیگم پر بڑا اعتماد تھا جو اپنے شوہر نواب مرزا مینڈھو کے ساتھ ''خانم کا بازار'' کی ایک عالی شان حویلی میں رہتی تھیں جہاں ہر وقت پالکی نالکی لگی رہتی تھی۔ دہلی میں نواب مینڈھو مرزا بڑے کلے ٹھلے کے آدمی تھے۔ حویلی کی طرح ان کی سرکار بھی بڑی تھی۔ بیسیوں آدمی ان کے ساتھ دستر خوان میں شریک ہوتے اور ان کا دیا کھاتے تھے۔ مرزا مینڈھو کی حویلی اور سرکار ہی بڑی نہ تھی، دل بھی بڑا تھا اور ساتھ ساتھ کنبہ بھی بڑا تھا۔

---

[1] ملکہ زینت محل کی طرح ان کے والد نواب احمد قلی خاں کے بارے میں بھی کہا جاتا ہے کہ انگریز کے خیر خواہ تھے لیکن سقوطِ دہلی کے بعد گرفتار ہوئے۔ جیل میں ڈالے گئے اور جیل میں ہی فوت ہو گئے۔ (قمر اجنالوی)

صاحب عالم نے ان کی سیر و تفریح کا بندوبست اپنے نجی باغ میں کیا تھا اور خاص بازار میں ان کی آمد اسی ضمن میں تھی۔

اب ماموں مرزا معاملے کی نزاکت کو سمجھنے لگے۔ صاحب عالم نے ذاتی باغ میں سیر کی دعوت اس طرح دی تھی کہ انکار ممکن نہ تھا ورنہ ان کی توہین کا پہلو نکلتا۔ اس لیے ماموں اورنگ مرزا نے سیر کی ہامی بھر لی۔ صاحب عالم گھر تک آئے تھے۔ وہ ان کے باغ تک جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ نجی باغ کی بساط پر سیر کی چال بھی شہزادے کی تھی اور اس چال کا نقشہ بھی انہی کا تھا۔ ماموں مرزا کو صرف یہ دیکھنا تھا کہ صاحب عالم اس چال کے مہروں کو بساط کے کس کس خانے میں رکھتے ہیں اور ان کی اپنی بساط کہاں تک ہے؟

دعوت قبول کر لی گئی تھی۔ وہ اگلے دن باغ میں آنے کی تاکید کر کے رخصت ہو گئے کہ ان کے جاتے ہی ماموں مرزا زنان خانے میں گئے۔ بی مغلانی کو شہزادے کی آمد کا مقصد بتایا اور اس کا اپنا عندیہ معلوم کیا کہ کیا کہتی ہے؟ مغلانی نے جو دروازے سے لگ کر صاحب عالم کی سب گفتگو پہلے ہی سمجھ چکی تھی، کسی حیرت کا اظہار نہ کیا اور کہا۔ ''جب تم نے سیر پر جانے کی ہامی بھر لی ہے تو اب مجھ سے کیا پوچھتے ہو؟''

بھائی کا خیال تھا، شاید بہن اس بات پر احتجاج کرے گی کہ اس نے آپ سے آپ سیر کی ہامی کیوں بھری؟ مگر اس کے لہجے میں کوئی احتجاج نہ تھا۔ اگر کچھ تھا تو اس پر اشتیاق غالب نظر آیا تھا۔ ماموں اورنگ مرزا نے محسوس کیا کہ ہوا موافق چل رہی ہے اور مطلع بھی صاف ہے تو کترا کر نکل گئے۔

صاحب عالم مرزا فخر الدین کا باغ دہلی سے باہر قلعہ سلیم گڑھ کی جانب تھا۔ کبھی کبھی شہزادے وہاں اکٹھے ہو کر تیر اندازی اور نشانے بازی کی مشق کیا کرتے تھے یا پھر برسات اور برشگال میں عیش و نشاط کی کوئی محفل سجائی جاتی تھی۔ تفریح اور راحت و عشرت کے لیے ایک عمدہ عمارت تھی۔ باغ کی دیکھ بھال کرنے والے مالی اور رکھوالوں کے حجرے الگ تھلگ تھے۔

خاص بازار سے باغ چار پانچ میل کے فاصلے پر تھا۔ دوسرے دن صاحب عالم نے ایک رتھ بھجوا دیا تھا تاکہ سفر میں پریشانی نہ ہو۔ اس مرتبہ مہرو بھی ساتھ تھی۔ جب رتھ دہلی دروازے سے نکل کر باغ میں پہنچا، صاحب عالم پہلے سے وہاں موجود تھے مگر ان کے ہمراہ چوب داروں اور خدمت گاروں کی وہ بھیڑ نہ تھی جیسے شہزادوں کے آس پاس اس وقت ہوتی تھی، جب وہ سیر و شکار یا تفریح کے لیے نکلتے تھے۔ وہاں صاحب عالم تھے۔ ان کا خادمِ خاص، ایک رکابدار یا پھر مالی اور باغ کے رکھوالے تھے، چوب داروں کی بھیڑ نہ سہی پھر بھی خاصی رونق تھی۔

مہرولی کے مقابلے میں جہاں چاروں طرف مقبرے، مزار، تکیے اور قبرستان میں لال قلعے اور قلعہ سلیم گڑھ کے درمیان واقع باغ کا منظر بہت خوبصورت تھا۔ قلعہ سلیم گڑھ کے آس پاس بھی پرانی دہلی کے آثار، کھنڈر اور کچھ پرانی یادگاریں موجود ہیں۔ لیکن مہرولی کی طرح وہاں حد نظر تک قبرستان اور قبروں کی ڈھیریاں نہیں جو حدِ شمار سے باہر ہیں۔ مہرولی کو دیکھ کر عالمِ برزخ کا نقشہ نظروں میں گھوم جاتا ہے۔ جبکہ صاحب عالم کے باغ میں داخل ہو کر یوں لگتا تھا جیسے انسان عالمِ برزخ سے نکل کر بہشت میں پہنچ جائے۔

یہ بات میں اس لیے کہتی ہوں کہ خود بھی کئی بار وہاں سیر کر چکی اور جانتی ہوں کہ وہ باغ فی الواقع بہشت کا منظر پیش کرتا تھا۔ ماموں اورنگ مرزا کے علاوہ مہرو نے بھی مجھے میل ملاقات کی کہانی سنائی تھی جس کا آغاز

دیں۔ مگر ان کا جواب یہ تھا۔ ''محبت کے گزرے ہوئے لمحوں کے سوا ہماری زندگی میں کوئی راحت، کوئی خوشی باقی نہیں ہے اور ہم اپنی محبت ترک نہیں کر سکتے۔''

انہیں نصیحت کرنے سے کچھ حاصل تھا نہ سمجھانے کا کوئی فائدہ۔ وہ نصیحت سنتے تھے، نہ کوئی بات سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ کوئی بات ان کی سمجھ میں آ ہی نہیں رہی تھی۔ ویسے بھی آدمی کی فطرت ہے کہ جو چیز اس سے چھیننے کی کوشش کی جائے، وہ اسے حاصل کرنے پر تل جاتا ہے اور اس کے حصول کی خاطر بغاوت کرنے سے بھی باز نہیں آتا۔ ان کی یہ کیفیت دیکھ کر نواب صاحب نے مشورہ دیا کہ وہ کسی سے ذکر نہ کریں اور چپ چاپ شادی کر لیں۔ مناسب وقت پر اعلیٰ حضرت کی طبیعت شگفتہ اور مزاج خوشگوار ہو گا، انہیں شادی سے آگاہ کر دیا جائے گا اور اس وقت وہ ایک ایسی حقیقت سے انکار نہ کر سکیں گے جو عالم وجود میں آ چکی ہو گی۔

شہزادی احمدی بیگم نے بھی نواب صاحب کی ہاں میں ہاں ملائی مگر صاحب عالم کو کھٹکا یہ لگ رہا تھا کہ اعلیٰ حضرت نے نہ تو ان کی پہلی محبت کو سمجھا نہ ان کے پہلے فرزند مرزا تیغ جمال کو شہزادہ تسلیم کیا تھا۔ حتیٰ کہ اسے برائے نام بھی وظیفہ نہیں دیا جاتا تھا۔ ہو سکتا ہے وہ ان کی دوسری شادی کو بھی تسلیم نہ کریں اور ان کی دوسری محبت بھی برباد ہو جائے۔

مرزا مینڈھو نے ایک نکتہ نکالا۔ ''جب کہارن کی بیٹی سے آپ کا نکاح ہی نہیں ہوا تھا تو اس کے بطن سے ہونے والے لڑکے کو ''شہزادہ'' کیسے تسلیم کر لیا جاتا؟ اور اس رشتے کو کون مانتا؟ مگر بی مغلانی سے تو آپ کا باقاعدہ نکاح ہو گا۔ اس عقد کے لیے ہم دونوں میاں بیوی گواہ ہوں گے۔ پھر نکاح خواہ مولوی بھی ایسی حیثیت کا ہو گا جس سے کوئی شخص انکار نہ کر سکے گا اور اس کی شہادت کے بعد اعلیٰ حضرت کو سچائی ماننا پڑے گی، خواہ وہ کتنی ہی کڑوی ہو۔

معاملے کا یہ پہلو تسلی بخش اور حوصلہ افزا تھا۔ شہزادی احمدی بیگم اور نواب مینڈھو کی ضمانت پر صاحب عالم خفیہ شادی کے لیے تیار ہو گئے۔ لیکن جب یہ تجویز ماموں اورنگ کے سامنے رکھی گئی تو انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ بادشاہ بی مغلانی کو اپنی بہو تسلیم کریں ورنہ بیکار ہے۔ ان کے انکار پر صاحب عالم کی دنیا تاریک ہو گئی تو نواب صاحب نے ماموں مرزا کو اپنی حویلی میں بلایا اور گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر سمجھایا کہ موجودہ حالات میں تیموری گھرانے سے ان کے رشتہ وتعلق کا یہی ایک ذریعہ ہے کہ پہلے خفیہ شادی کر دی جائے پھر کچھ عرصے بعد اس کا اظہار یوں کیا جائے جس سے کوئی بھی انکار نہ کر سکے۔

انہوں نے یہ وضاحت بھی ضروری سمجھی کہ چوری چھپے شادی کرنا بلاشبہ ایک ناپسندیدہ کھیل یا ناٹک ہے۔ کیونکہ شادی تو اصل میں نام ہی باہمی تعلق کے اظہار اور اعلان کا ہے۔ لیکن جب اس کھیل سے پردہ اُٹھے گا تو شادی کے ناٹک کا انجام اس انجام سے مختلف نہیں ہو گا، جو ہم نے سوچ رکھا ہے۔ شہزادی احمدی بیگم نے بھی بی مغلانی سے کہہ دیا کہ اگر وہ صاحب عالم کی حرم بننا چاہتی ہیں تو اس کا وہی طریقہ ہے جو بتا دیا گیا ہے۔ ورنہ ندی کے دو کناروں کی طرح وہ ایک دوسرے سے کبھی نہ مل سکیں گے۔

بات ماموں اورنگ مرزا اور بی مغلانی کی سمجھ میں آ گئی کہ جب اعلیٰ حضرت کی بیٹی اور دُولہا شادی کی ذمے داری قبول کرتے اور نکاح خوانی کی ضمانت دیتے ہیں تو پھر خطرے کا کیا احتمال ہے۔

صاحب عالم مرزا فخر الدین جانتے تھے کہ وقت اور زمانے کو کوئی تبدیل نہیں کرسکتا۔ کیونکہ وہ صرف خدا کے حکم سے تبدیل ہوتے ہیں لیکن دہلی میں اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کی رائے اور مرضی کو تبدیل کرنے والے کچھ لوگ موجود تھے جن میں شہزادی احمدی بیگم اور مرزا مینڈھو کے نام بھی شامل تھے۔ بادشاہ کا مزاج شاعرانہ تھا اور خود کسی پختہ عزم کے مالک نہ تھے۔ ان کی شاعری اگر فریاد و فغاں پر مشتمل تھی تو پوری زندگی ایک طویل مرثیے سے عبارت تھی۔ جس طرح دنیا بے ثبات اور زندگی ناپائیدار ہے، اسی طرح اعلیٰ حضرت کی رائے بھی ضعیف اور کمزور تھی جو مرغِ بادنما کی طرح اپنا رخ بدلتی رہتی تھی۔

دراصل وہ فرنگی کے وظیفہ خوار تھے جس نے مغلوں سے ان کی شان و شوکت چھین لی اور مغل سلطنت کو ایک کھنڈر یا ایسے ویران مکان میں تبدیل کر دیا تھا جس کے دروازوں کی دہلیزیں اور کواڑ نہیں ہوتے فقط خالی چوکھٹے باقی رہ جاتے ہیں۔ ان خالی چوکھٹوں سے ہوا کبھی اس طرف، کبھی اُس طرف گزرتی ہے۔ اعلیٰ حضرت سراج الدین بہادر شاہ ظفر بھی ایسے ہی ایک خالی چوکھٹے میں کھڑے تھے، جن کی رائے کو بدلنے کے لیے مرزا فتح الملک نے شہزادی احمدی بیگم اور مرزا مینڈھو کا سہارا لینا ضروری سمجھا۔

وہ دونوں صاحب عالم کی نئی محبت یا لال قلعے کی اصطلاح میں ''نئی آوارگی'' کا حال سن کر کچھ حیران، کچھ پریشان ہوئے۔ کیونکہ بادشاہ اس آوارگی کو قیدِ شریعت میں لانے سے انکار کر چکے تھے۔ ادھر احمدی بیگم اور مرزا مینڈھو چند ہی روز قبل ولی عہد مرزا دارا بخت ظفر الملک اور ان کی حرم محمدی بیگم کی کسی معاملے میں اعلیٰ حضرت سے سفارش کر چکے تھے جو مسترد کر دی گئی تھی۔ ان دنوں بادشاہوں کے قلب و ذہن پر چھوٹی بیگم زینت محل کا غلبہ تھا اور بادشاہ ان کی مرضی سے اختلاف نہ کرتے تھے۔ جو اطلاع صاحب عالم تک پہنچی تھی اس کے مطابق غیر خاندان میں ان کی شادی سے انکار بادشاہ اور زینت محل دونوں نے کیا تھا۔ ان حالات میں شہزادی احمدی بیگم اور نواب مرزا مینڈھو کی سفارشیں بھی دور ہو سکتی تھیں۔

نواب صاحب نے تو اس معاملے میں چپ ہی بھلی سمجھی مگر شہزادی احمدی بیگم کو صاحب عالم سے جو پیار تھا، وہ انہیں کشاں کشاں قلعے میں اعلیٰ حضرت کی اقامت گاہ موتی محل میں لے گیا اور شہزادی نے دبے لفظوں میں بات چلائی کہ ''سنا ہے مرزا فخرو شادی کرنا چاہتے ہیں۔''

بادشاہ غالباً پہلے ہی کسی بات سے بھڑکے ہوئے تھے، شادی کی بات سنتے ہی آپے سے باہر ہو گئے اور بولے۔ ''وہ خاندان سے باہر شادی کرنا چاہتا ہے۔ اگر اس نے نافرمانی کی تو اپنے خاندان کے شجرے اور رشتوں سے کٹ جائے گا۔''

اس کے بعد احمدی بیگم کو بھی مزید کچھ کہنے سننے کا یارا نہ ہوا اور کچھ دیر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے کے بعد موتی محل سے لوٹ آئیں۔ صاحب عالم نے خاندان کے شجرے اور رشتوں سے کٹنے کی بات سنی تو بگڑ گئے۔ ''کیا اعلیٰ حضرت خود زینت محل سے شادی کر کے، جو مغل نہیں، افغانی ہیں، تیموری خاندان کے شجرے سے کٹ گئے ہیں؟'' شہزادی نے انہیں توجہ دلائی۔ ''وہ بادشاہ ہیں اور شاہی مصلحت کے تحت کسی بھی خاندان میں شادی کر سکتے ہیں۔''

اب نواب مرزا مینڈھو، صاحب عالم کو سمجھانے لگے کہ وہ غیر خاندان میں شادی کرنے کا خیال ترک کر

(17)

لال قلعے میں داخلہ

نواب مرزا شمس الدین خاں[1] فیروز پور جھرکہ اور لوہارو کے والی کی شادی نواب مرزا الٰہی بخش کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اس شادی کا حاصل نواب مرزا داغ تھے۔ مگر 1837ء میں میں جب داغ ابھی سات برس کے ہوں گے، ان کے والد مرزا شمس الدین خاں کو فریزر صاحب کے قتل کے الزام میں پھانسی ہوگئی اور ان کی والدہ جو ابھی جوان ہی تھیں، اپنے کم سن بیٹے کو لے کر دہلی کے لال قلعے میں آگئیں۔ مغلیہ خاندان سے تعلق کے باعث مرزا الٰہی بخش کا شمار ''سلاطین'' میں ہوتا اور دُور کے رشتے میں وہ اعلیٰ حضرت سراج الدین بہادر شاہ ظفر کا چچا لگتا تھا۔

مرزا الٰہی بخش کی بیٹی پر جو مصیبت ٹوٹی، اس میں کچھ حصہ اعلیٰ حضرت کا بھی تھا۔ انہوں نے قلعے کے مولویوں سے نواب مرزا شمس الدین کے قتل کا فتویٰ تیار کروایا تھا، جس پر مرحوم کو پھانسی دی گئی تھی۔ اس مصیبت کی تلافی کے لیے مرزا الٰہی بخش نے تجویز پیش کی کہ اس کی بیوہ بیٹی کا عقدِ ثانی بادشاہ کے فرزند مرزا فخر الدین الملک سے کر دیا جائے۔

صاحب عالم اٹھارہ سال کے تھے اور ابھی ''کنوارے'' ہی سمجھے جاتے تھے۔ اس بات کا کسی کو علم نہیں تھا کہ وہ خفیہ شادی کر چکے ہیں۔ بادشاہ مرزا الٰہی بخش اور اس کی بیوہ لڑکی کی دل جوئی چاہتے تھے۔ غالباً انہیں یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا کہ مرزا فخرو 13 برس کے تھے جب کہارن کی بیٹی کو دل دے بیٹھے اور ابھی کچھ ہی عرصہ قبل

---

[1] نواب مرزا شمس الدین کا اپنے سوتیلے بھائیوں نواب امین الدین اور نواب ضیاء الدین سے جاگیر اور جائیداد کا جھگڑا تھا۔ فریزر صاحب نے امین الدین خاں کو یقین دلایا کہ اگر وہ نواب شمس الدین کے خلاف گورنر جنرل سے اپیل کریں تو ان کی سفارش پر ریاست انہیں مل جائے گی۔ فریزر گورنر جنرل کے مزاج میں بڑا دخل رکھتا تھا۔ اس سازش کی اطلاع نواب شمس الدین کو ہوگئی اور چند روز کے بعد مسٹر فریزر کو قتل کر دیا گیا۔ الزام مرزا شمس الدین پر آیا جس پر انہیں گرفتار کر لیا گیا اور پھانسی کی سزا ہوگئی۔ انگریز کے ایما پر بہادر شاہ ظفر نے لال قلعے سے تعلق رکھنے والے مولویوں سے فقہ کا یہ مسئلہ یا فتویٰ لکھوایا تھا کہ غیر مسلم کے مسلم قاتل یا محرک قاتل سے قصاص لینا واجب ہے۔ اسی فتوے کی بنا پر نواب مرزا شمس الدین کو پھانسی دی گئی تھی۔

(غالب از مولانا غلام رسول مہر)

ان کے راضی ہوتے ہی ''خانم کا بازار'' کی اسی بڑی حویلی میں خفیہ شادی کا ناٹک اس طرح شروع ہو گیا کہ کسی غیر متعلق فرد کو کانوں کان خبر نہ ہو سکی۔ کھیل کا پہلا حصہ (ایکٹ) بالکل ویسا ہی تھا، جیسے نواب مینڈھو نے بیان کیا تھا۔ یعنی بڑے دیوان خانے سے ملحق حویلی کے ایک کمرے میں چاندنی بچھی تھی، کافوری شمعیں روشن تھیں اور گاؤ تکیوں کے سہارے گنتی کے چند افراد یوں چپ چاپ اور سحر زدہ بیٹھے تھے گویا وہ کسی عامل کے معمول تھے اور اسی کے اشارۂ طلسم پر حرکت کرتے یا بولتے تھے۔ ان میں شہزادی احمدی بیگم، نواب مینڈھو مرزا، صاحب عالم، مرزا فخر الدین، فتح الملک، ماموں اورنگ مرزا، بی مغلانی، خادمہ مہرو اور صاحب عالم کی کنیز عنبری بھی تھی، جو انہوں نے اسی روز بی مغلانی کو سونپ دی تھی۔

ان سات افراد کے علاوہ وہاں ایک آٹھواں آدمی بھی تھا جسے ان سب کا عامل کہنا چاہئے۔ وہ تھا مولوی محمد حیات کی مسجد کا پیش امام جو نکاح خوانی کا فریضہ ادا کرنے کے لیے بلایا گیا تھا۔ مولوی محمد حیات کی مسجد لال قلعے کے قریب ہی واقع تھی۔ جس کے مولوی کو قرب و جوار میں بڑا معتبر سمجھا جاتا تھا اور قلعے کے ملازمین بھی کبھی کبھار شادی بیاہ کی کسی تقریب یا رسوماتِ میت ادا کرنے کے لیے ان کی خدمت حاصل کرتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ایک معروف اور شادی کا معتبر گواہ تھا جسے نواب صاحب نے سارا معاملہ پہلے ہی سمجھا دیا تھا۔ چنانچہ اس نے طے شدہ منصوبے کے مطابق نکاح کا مسنون خطبہ پڑھا، ایجاب و قبول کا فرض ادا ہوا، نکاح کے چھوہارے بانٹے گئے، شیرینی تقسیم ہوئی۔ اس طرح بڑی خاموشی اور رازداری سے بی مغلانی کا صاحب عالم سے عقد ہو گیا۔

نکاح اور بیاہ چونکہ خفیہ ہوا تھا اس لیے شہزادۂ عالی دلہن کو قلعے کے اندر اپنے محل میں نہیں لے جا سکتے تھے۔ انہوں نے بی مغلانی کو خاص دربار میں ماموں اورنگ مرزا کے آبائی مکان ہی میں رکھا اور خود وہیں آتے جاتے تھے۔

یہ تھا صاحب عالم اور بی مغلانی کی خفیہ شادی کا واقعہ اور یہ اپنی نوعیت کا کوئی انوکھا اور منفرد واقعہ نہیں تھا۔ لال قلعے میں جہاں خانگی بدچلنی میں بتدریج اضافہ ہو رہا تھا، تقریباً ایک صدی سے اس قسم کی خفیہ شادیاں روایت بن گئی تھیں، جن میں 95 فیصد بے نتیجہ اور لاحاصل ہوتی تھیں۔ لیکن یہ شادی خفیہ ہونے کے باوجود ان شادیوں سے مختلف اور نتیجہ خیز تھی۔ اس واقعے کے ایک سال بعد میں پیدا ہوئی۔ صاحب عالم میری پیدائش پر بے حد خوش تھے اور چاہتے تھے کہ اپنی شادی کا جلد از جلد انکشاف اور اظہار کر دیں کہ اسی سال ایک اور عجیب واقعہ پیش آیا جس نے ہماری آئندہ زندگی کا نقشہ بالکل تبدیل کر دیا اور ماں کے ساتھ مجھے بھی ایام کی گردش سے گزرنا پڑا۔

❁......❁......❁

دیا کہ شادی تو وہ کر چکے ہیں پھر بی مغلانی کے ساتھ اپنے تعلق اور خفیہ عقد کا ذکر کیا اور خواہش کی کہ وہ بی مغلانی کے معاملے میں ان کا تعاون چاہتے ہیں۔ شوکت محل نے شادی کی پہلی ہی رات جو کچھ سنا، وہ ذہن کو پریشان اور دل کو آزردہ کر دینے والا تھا۔

اکثر یوں ہوتا ہے کہ عورت، عورت کے معاملے میں تعاون نہیں کرتی۔ دو عورتیں بالخصوص دو سوکنوں کے مزاج پروائی اور پچھیاؤ کی طرح ہوتی ہیں۔ ان کی منزل ایک سہی پھر بھی وہ ایک راہ پر نہیں چلتیں اور منزل پر پہنچنے کے الگ الگ راستے اختیار کرتی ہیں۔ یوں تو سفر میں بھی مخالف سمتوں کو چلنے والی ہوائیں باہم بھِڑی رہتی ہیں لیکن منزل پر یا منزل کے قریب پہنچ کر ان کے درمیان ٹکراؤ اکثر لازمی ہوتا ہے اور پھر وہ کسی تیز رفتار آندھی کے جھکڑ یا اُڑتے، چکراتے بگولے کی صورت (جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ ان میں مرنے والے پاپی ہندوؤں کے مسان اُڑتے ہیں) پوری تیزی اور تندی سے ایک دوسرے پر جھپٹتی ہیں۔

صاحب عالم کی بیان کردہ کہانی کے مطابق شوکت محل ان کی دوسری بیگم تھیں جو جوانی کی عمر ہی میں زمانے کے کئی نشیب و فراز دیکھ چکی تھیں۔ زندگی کے تجربات نے جو کچھ سکھایا، اس کے مطابق شوکت محل نے بی مغلانی کو نہ صرف اپنے دل اور ذہن کے ساتھ قبول کیا بلکہ صاحب عالم سے پورا تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئیں۔ ویسے بھی یہ کوئی ایسی غلطی نہیں تھی جو نظر انداز یا معاف کر دی جاتی۔ دنیا میں ہر خطا انسان سے شروع ہوتی ہے اور ہر گناہ اس کے کھاتے میں لکھا جاتا ہے کیونکہ خطا اور گناہ اس کے انسان ہونے کی علامت ہے۔ لیکن شوکت محل کے نزدیک صاحب عالم نے کوئی گناہ نہیں کیا بلکہ گناہ سے بچنے کا خفیہ راستہ نکالا تھا۔ ان کی غلطی یا خطا صرف یہ تھی کہ انہوں نے اپنی محبت کی خاطر بادشاہ کا حکم نہ مانا اور بی مغلانی سے چوری چھپے عقد کر لیا تھا جس کے کئی گواہ موجود تھے اور یہ سب کچھ جائز تھا۔ غلطی یا خطا تو بادشاہ کی تھی کہ خاندان سے باہر شادی کی اجازت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

یہ بڑی عجیب بات تھی کہ صاحب عالم مرزا فخر الدین ہی کو خصوصیت کے ساتھ غیر خاندان میں شادی سے روکا گیا جبکہ مغلوں میں جو سیّد، افغان اور راجپوت گھرانوں میں بھی شادیاں کرتے رہتے تھے، ایسی کوئی روایت نہیں تھی۔ خود اعلیٰ حضرت کے مرشد شاہ نصیر الدین عرف میاں کالے صاحب نے جو ذات کے سیّد تھے، ایک مغل شہزادی ملکہ بیگم سے شادی کی تھی جس سے ان کا ایک بیٹا بھی تھا۔ بادشاہ نے میاں کالے کو گلی قاسم جان میں ایک بڑی حویلی نذر کر دی تھی جو ''احاطہ کالے صاحب[1]'' کے نام سے مشہور ہوئی۔

حویلی بہت بڑی اور لاکھوں روپے مالیت کی تھی۔ اندر ایک باغ تھا، نہر تھی، شاہانہ مکانات تھے اور بہت سے لوگوں کے رہنے کی گنجائش تھی۔ شاہی خزانے سے انہیں لاکھوں روپے کے نذرانے ملتے تھے، جن سے کالے صاحب بڑے صاحب جائیداد ہو گئے تھے۔

بادشاہ سلامت ہفتے میں ایک دن ضرور اپنے مرشد کی حاضری دیتے اور انہیں سلام کرنے گلی قاسم جان کی

---

[1] ''فخر الطالبین''، ''آثار الصنادید'' اور ''لال قلعے کی ایک جھلک'' میں حضرت شاہ نصیر الدین عرف کالے صاحب کے ذاتی اور خاندانی حالات تفصیل سے ملتے ہیں۔ مرزا غالب کو بھی ان سے لگاؤ تھا۔ چنانچہ جیل سے رہا ہونے کے بعد انہی کی حویلی گلی قاسم جان میں جا ٹھہرے تھے۔ وہ جو ایک خط میں لکھا ہے کہ پہلے گورے کی قید میں تھا، اب کالے کی قید میں ہوں، تو اس سے شاہ نصیر الدین کالے میاں مراد ہیں۔ (قمر اجنالوی)

سلجوقی گھرانے کی کسی لڑکی سے شادی کے طلب گار تھے جس کی اجازت دینے سے انہوں نے انکار کر دیا تھا اور خاندان کے اندر شادی کی پابندی لگا دی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا، اب مرزا فخرو کی شادی ضرور ہو جانی چاہئے۔ لڑکی خواہ بیوہ اور صاحب اولاد سہی، تھی تو مغلیہ خاندان کی اور جوان و رعنا۔ انہوں نے مرزا الٰہی بخش کی تجویز مان لی بلکہ اس پر نواب زینت محل بیگم اور نواب تاج محل بیگم کی تائید بھی حاصل کر لی۔ پھر دوسرے دن صاحب عالم کو اپنے حضور طلب کیا اور بتایا کہ ان کی شادی نواب مرزا شمس الدین کی بیوہ اور نواب الٰہی بخش کی دختر سے طے کر دی گئی ہے۔

یہ سن کر مارے حیرت کے صاحب عالم کی زبان ان کے ہونٹوں کے درمیان اور پتلیاں آنکھوں کے اندر حرکت کرنا بھول گئیں۔ بادشاہ ان کی حیرت کو بھانپ گئے اور خاموشی کا مطلب سمجھ کر بولے۔

''سورج کے طلوع ہونے سے غروب ہونے تک ایک دن ہوتا ہے اور سورج کے غروب ہونے سے طلوع ہونے تک ایک رات گزرتی ہے۔ تمہارے پاس سوچنے اور غور کرنے کے لیے بڑا وقت ہے۔ کل سویرے ہمیں اپنے فیصلے سے آگاہ کر دینا۔

صاحب عالم نے غور کیا تو پتہ چلا کہ انکار کی کوئی گنجائش نہیں۔ اعلیٰ حضرت باپ بیٹی کی تالیف قلب چاہتے اور شادی کا فیصلہ کر چکے تھے۔ مرزا الٰہی بخش کے ساتھ مرشد زادے کے اپنے مراسم بھی تھے اور مغلیہ خاندان کی عزت کا مسئلہ بھی تھا۔ پھر قلعے کی محل سراؤں، حویلیوں، بیگموں اور خواصوں میں یہ بات مشہور ہو گئی کہ صاحب عالم کی شادی مرزا الٰہی بخش کی دختر بلند اختر سے ہو رہی ہے۔ فی الواقع یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہو گئی اور شہزادۂ عالی انکار نہ کر سکے۔ بادشاہ نے دلہن کو نواب شوکت محل بیگم کا خطاب دیا۔ مرزا فخر الدین فتح الملک کے محل میں ان کی شاندار پذیرائی ہوئی۔ جہاں وہ بی مغلانی کو لانا چاہتے تھے، وہاں بیگم شوکت محل آن براجی تھیں اور صاحب عالم کو ان کے کمسن بیٹے مرزا داغ کا سرپرست مقرر کر دیا گیا۔

اس موقع پر ماموں اور نگ مرزا نے اصرار کیا کہ خفیہ عقد کا بھید کھول دیا جائے اور بادشاہ پہلی شادی کو تسلیم کریں۔ لیکن نواب مینڈھو مرزا کے خیال میں کسی قسم کا انکشاف اور اظہار اعلیٰ حضرت کی شدید ناراضی کا باعث ہو سکتا تھا۔ وہ اگر غصے میں خفیہ شادی سے انکار کر دیتے اور خاندان کی بدنامی کا سبب ٹھہراتے تو پھر معاملہ بالکل ہی بگڑ جاتا۔ لہٰذا مصلحتاً خاموشی اختیار کر لی گئی۔ مجبوری کی اس حالت میں اگر بی مغلانی کی آنکھوں میں آنسو آئے بھی ہوں گے تو اس کے آنسو دیکھنے والا کون تھا؟

حالات کی رفتار اور مصلحت کی زبان کہہ رہی تھی کہ ابھی خفیہ شادی پر اسرار و اخفا کا پردہ پڑا رہنے دو۔ لیکن صاحب عالم نے بیگ شوکت محل پر یہ بات شب اوّل ہی واضح کر دی تھی کہ جس طرح آسمان اور زمین کے درمیان وسیع اور کشادہ فضا میں چار ہوائیں، چار سمتوں میں چلتی ہیں جو کبھی کبھار باہم اُلجھتی اور ٹکراتی بھی رہتی ہیں، اسی طرح مرد کو دنیا میں چار ہوائیں باندھنے یا پھر چار شادیاں کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔

بیگم شوکت محل نے مرد کے اس اختیار سے انکار نہیں کیا اور اجازت دے دی کہ اگر وہ ان کا حقِ زوجیت ادا کرتے رہیں گے تو تین اور شادیاں کر سکتے ہیں۔ بیگم کا خیال تھا، شاید وہ مستقبل میں کوئی نئی شادی کرنا چاہتے ہیں جس کے لیے ابھی سے زمین ہموار کر رہے ہیں۔ لیکن صاحب عالم نے یہ کہہ کر انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال

میں بتا چکی ہوں، نواب مینڈھو مرزا نے صاحب عالم کو مشورہ دیا تھا کہ اس موقع پر وہ اپنی خفیہ شادی کا اظہار کر سکتے ہیں اور اپنے حکم و اختیار سے ماں بیٹی کو جنہیں خاص بازار کے مکان میں رکھا گیا تھا، شاہی قلعے میں لا سکتے ہیں۔ دراصل خدا ہی سربستہ رازوں کو کھولنے والا اور اپنے بندوں کی مشکل کشائی کرنے والا ہے۔ صاحب عالم کو جو ولی عہد کی حیثیت سے اب بادشاہ سلامت کے بعد دوسرے درجے پر آ گئے تھے، مرزا مینڈھو کا مشورہ پسند آیا۔ انہوں نے نہ صرف اعلیٰ حضرت کو اس شادی سے آگاہ کر دیا جس پر کئی سال اخفا کا پردہ پڑا رہا تھا بلکہ ہمارے لیے لال قلعے کی ایک حویلی کا دروازہ بھی کھل گیا جو نو محلے میں واقع تھی اور ہم پانچ افراد (بی مغلانی، ماموں اورنگ مرزا، مہرو اور عنبری) خاص بازار سے شاہی قلعے میں منتقل ہو گئے۔

اعلیٰ حضرت کو اس بات کا قلق تھا کہ صاحب عالم نے ولی عہدی کے معاملے میں ان سے بغاوت کی اور انگریز نے انہیں مغلوں کا ہونے والا بادشاہ تسلیم کر لیا مگر خفیہ شادی کے اظہار و انکشاف نے ان کے دل پر صدمے کی ایک اور ضرب لگائی کہ سلجوقی گھرانے کی جس لڑکی کے ساتھ عقد سے روکا گیا تھا، اخفا کے پردے سے وہی لڑکی برآمد ہوئی ہے۔ ان کے نزدیک یہ صریحاً نافرمانی تھی۔ ولی عہدی کے مقدمے میں شکست کا دھکا ابھی تازہ تھا اس لیے غصے میں شادی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اسے صاحب عالم کی خانگی آوارگی قرار دیا، جسے اس زمانے میں کوئی حیثیت اور اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔

خفیہ شادی سے انکار پر ولی عہد نے شہزادی احمدی بیگم کی حویلی میں ایک خصوصی محفل کا اہتمام کیا، جس میں اعلیٰ حضرت کو مدعو کیا گیا۔ وہاں شہزادی احمدی بیگم، نواب مینڈھو مرزا، ماموں اورنگ مرزا اور مولوی حیات محمد کی مسجد کے نکاح خواں نے شہادت دی کہ صاحب عالم اور بی مغلانی کا نکاح شریعت کے مطابق ہوا تھا۔ لیکن صرف اعلیٰ حضرت کی ناراضگی کے خیال سے پوشیدہ رکھا گیا۔ وہ ان شہادتوں کو مسترد نہیں کر سکتے تھے تاہم ان پر حیرت کا ایک سکتہ گزر گیا۔ کسی حقیقت کا ناگہاں اور غیر موقع انکشاف بھی انسان کو دم بخود کر دیتا ہے۔ اسی عالمِ استعجاب میں شہزادی احمدی بیگم نے مجھے عالی جاہ کے حضور مجرا بجا لانے کے لیے پیش کیا اور بتایا کہ میں ان کی پوتی ہوں۔ نام لالہ رخ ہے۔

ہمارا معاملہ ابھی تک اعلیٰ حضرت، ولی عہد بہادر، نواب زینت محل، نواب تاج محل، شہزادی احمدی بیگم، نواب مینڈھو مرزا، ماموں اورنگ مرزا، نکاح خواں مولوی اور نواب شوکت محل تک محدود تھا۔ بادشاہ معاملے کی اصل نوعیت سے آگاہ ہو گئے تھے پھر بھی انہوں نے حکم دیا کہ ابھی اس رشتہ و تعلق کو مشتہر نہ کیا جائے اور بادل نخواستہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔

سرکار انگلشیہ نے بہ لحاظ عمر صاحب عالم مرزا فخر الدین کو ولی عہد مقرر کر دیا تھا۔ ان کی تنخواہ بھی (پندرہ ہزار روپے ماہوار) الگ کر دی گئی تھی، اعلیٰ حضرت اور بیگم زینت محل نے بظاہر انہیں ولی عہد تسلیم کر لیا تھا ورنہ سرکار انگلشیہ سے ملنے والا وظیفہ بند ہو جاتا۔ لیکن اندر سے مخالفت کا سلسلہ ابھی تک جاری تھا۔

آدمی کے دشمن کہیں باہر سے نہیں آتے، اس کے اپنے ہی خاندان بلکہ اپنے ہی گھر میں پیدا ہوتے ہیں۔ صاحب عالم کے ولی عہد مقرر ہوتے ہی مغلیہ گھرانے میں ان کی دشمنیاں بڑھ گئی تھیں اور انہیں قسم قسم کی پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ بیگم زینت محل تو دشمنِ جاں بنی ہوئی تھیں۔ اعلیٰ حضرت کی ناراضگی اور کدورت کا

حویلی میں جاتے تھے۔ ایک بار صاحب عالم کو خیال آیا کہ کیوں نہ وہ شاہ صاحب سے ملیں اور انہیں صورتِ حال سے آگاہ کریں۔ میری پیدائش کے بعد وہ خفیہ شادی کے اظہار پر بڑے بے چین رہتے تھے۔ جب نواب شوکت محل بیگم سے اس بارے میں مشورہ کیا تو انہوں نے حضرت کالے صاحب تک یہ بات پہنچانے کی مخالفت کی۔ ان کے نزدیک یہ مرشد سے ان کے مرید کی شکایت بھی تھی اور غیبت بھی جس کے باعث بادشاہ حضرت شاہ نصیرالدین کی نظروں میں گر جاتے۔ کیونکہ انہوں نے صاحب عالم پر جو پابندی لگائی وہ خلافِ اسلام تھی جس پر مرشد انہیں ڈانٹتے اور بادشاہ کی سبکی ہوتی۔ بیگم شوکت محل چاہتی تھیں، کوئی ایسی صورت ہو کہ اعلیٰ حضرت کی بے عزتی نہ ہو اور بات بھی بن جائے۔

صاحب عالم نے معاملہ شاہ نصیرالدین میاں کالے صاحب تک پہنچانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ ادھر نواب شوکت محل نے یہ ذمہ لیا کہ عیدین، شب برات اور پھول والوں کی سیر کے تہواروں پر جب بادشاہ سلامت مغلیہ خاندان کی بیگمات، خواتین اور شہزادیوں سے ملاقات کرنے آتے تھے، وہ بی مغلانی کو اپنے ساتھ لے جایا کریں گی۔ اس سے بھی پہلے انہوں نے کئی بار ہم دونوں کو اپنے محل میں بلایا اور قلعے میں آنا جانا شروع ہو گیا۔ ان سے ملنے جلنے والی بیگموں سے ہمارا تعارف ان کے قریبی عزیزوں کے طور پر ہوتا رہا۔ حتیٰ کہ ان کے ہمراہ کئی بار بادشاہ کو مجرا کرنے بھی گئیں اور کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ اصل معاملے کا کسی کو بھی علم نہ تھا۔ اسی طرح وقت گزرتا گیا۔

❁......❁......❁

جنوری 1849ء میں جب ولی عہد مرزا دارا بخت ظفر الملک قضائے الٰہی سے فوت ہو گئے تو بادشاہ نے زینت محل کے اُکسانے پر ان کے گیارہ سالہ فرزند مرزا جواں بخت کی ولی عہدی کا اعلان کر دیا۔ مگر انگریز گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے جواں بخت کو ولی عہد منظور نہیں کیا اور دہلی میں سرکار انگلشیہ کے ایجنٹ سر طامس مٹکاف نے بادشاہ کے بڑے فرزند صاحب عالم مرزا فخرالدین فتح الملک سے ملاقات کی جو اس وقت 30 برس کے ہو چکے تھے اور انہیں ولی عہد بنانے کی گفتگو ہوئی۔

میرے مہمانِ عزیز!

میں ولی عہدی کے قضیئے کی تفصیلات سیّد برہان الدین کی زبانی پہلے بیان کر آئی ہوں لہٰذا انہیں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ جو ہوا، سو ہوا۔ البتہ یہاں ولی عہدی کے جھگڑے کا ذکر اس لیے نکل آیا ہے کہ نواب مینڈھو مرزا بھی شہزادہ جواں بخت کو بطور ولی عہد پسند نہیں کرتے تھے اور ان کے نزدیک یہی موقع تھا جب صاحب عالم کو اپنی خفیہ شادی سے مصلحت کا پردہ اُٹھا دینا اور اس کا اظہار و اعلان کرنا تھا۔

ولی عہدی کا مقدمہ جس کا عرضی دعویٰ ایسٹ انڈیا کمپنی کی کورٹ آف ڈائریکٹرز کے علاوہ انگلستان کی ملکہ وکٹوریہ تک پہنچا۔ ایک سال کے اوپر چلتا رہا، جس میں سراج الدین بہادر شاہ ظفر نے صاحب عالم مرزا فخرالدین کے خلاف اسلامی دستور کے مطابق مختون ہونے اور شہزادہ جواں بخت کے حق میں گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے مرزا فخرالدین فتح الملک بہادر کے ولی عہد ہونے کا باقاعدہ علاج کر دیا جس پر نواب زینت محل کی امیدوں کے سارے رنگ محل چکنا چور ہو گئے اور بادشاہ کی ساکھ یا عزت کچھ اور گھٹ گئی۔

سے ولی عہد بہادر کے پیغام کی تصدیق یا تردید چاہی۔

مرزا فخر الملک مرحوم کے نائب سرشتہ دار رام جی داس نے ولی عہد کے پیغام کی تصدیق کی اور بتایا کہ وہی بنگالی جوتشی کالی داس کو ان کی سرکار میں لے کر آیا تھا اور جب اس نے شہزادہ عالی مرزا جواں بخت کا زائچہ نکال کر پیش گوئی کی تھی، اس وقت وہاں موجود تھا۔ رام جی داس نے اس بات کی بھی گواہی دی کہ کالی داس نے مدراسی نجومی کھٹالے کی کتاب کا حوالہ دیا تھا کہ از روئے نجوم شہزادہ جواں بخت مغل بادشاہ کے جانشین نہیں ہو سکتے۔ ان دنوں علم نجوم سے دلچسپی رکھنے والوں میں کھٹالے اور اس کی کتاب کا بڑا چرچا تھا۔ رام جی داس نے بھی اس پر اپنے وشواس کا اظہار کیا۔ بیگم زینت محل یہ شہادت سن کر بے حد پریشان ہوگئیں۔ پھر اسے کچھ دے دلا کر اس بات کی سوگند لے لی کہ وہ اس پیش گوئی کا ذکر اور کسی سے نہیں کرے گا۔

رام جی داس معاملے کی نوعیت کو سمجھتا اور جوتش پر وشواس رکھتا تھا مگر نواب زینت محل نے اس یقین کو کمزور کرنے کے لیے تاکہ وہ خود بھی پیش گوئی کو کوئی اہمیت نہ دے، شخصیت کے ساتھ اس پر اپنے الفاظ کا عکس بھی ڈالا اور کہا۔ ''باز بے شک بڑی اونچی پرواز کرتا ہے لیکن جس طرح اس کی پرواز معین کی حدوبست (فضا) سے باہر نہیں ہوتی، اسی طرح نجومی خواہ کتنا ہی بڑا ہو، خود کسی ستارے میں قیام نہیں کرتا، نہ قطعی یقین کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہے کہ جو کچھ اس نے کہہ دیا، وہ اٹل ہے۔ کیونکہ اہل علم کہتے ہیں، ستاروں کی رفتار کے ساتھ ان کے اثرات اور شگون بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔''

یہ بات عنبری نے ملک زینت محل کی ایک قلماقنی (پہرے دار عورت) سے سنی، جو اس کی جاننے والی تھی اور مجھے بتائی۔ وہ قلماقنی اپنی ملکہ کے ہمراہ روز لال کنوئیں سے لال قلعے تک آتی اور سہ پہرے وقت ان کے ساتھ ہی واپس جاتی تھی۔

تجھے یہ سن کر تعجب ہوگا کہ نواب زینت محل لال قلعے کے بجائے لال کنوئیں کے ذاتی محل میں رہتی تھی۔ البتہ نو دس بجے کے درمیان ان کی پالکی کنوئیں سے قلعے کی طرف روانہ ہو جاتی تھی۔ جہاں وہ دن بھر بادشاہ کے ساتھ رہتی تھیں اور شام سے قبل پھر لال کنوئیں کو لوٹ جاتی تھیں۔ قلعے کی طرف آتے یا واپس جاتے وقت ڈھنڈورچی ان کی پالکی کے آگے آگے نقارہ پیٹتے اور ڈنکا بجاتے ہوئے چلتے تھے تاکہ لوگ پالکی کے لیے راستہ چھوڑ دیں۔ پالکی کے ساتھ قماقنیاں سبھی چلتی تھیں۔ ڈنکا بجنے کی آواز سن کر لوگ سمجھ جاتے تھے کہ زینت محل کی سواری آ رہی ہے اس لیے وہ دہلی میں ''ڈنکا بیگم'' کے نام سے مشہور ہوگئی تھیں۔ بعض لوگ طنزاً بھی انہیں ''ڈنکا بیگم'' کہتے تھے کہ جس طرح نقارے یا دھونے پر چوب پڑتی اور شور بلند ہوتا ہے، سو وہی حالت بیگم کی ہے۔ یعنی خالی دھوم ہی دھوم ہے اور کچھ نہیں۔ وہ مغلیہ خاندان کا رہا سہا ورثہ اپنے فرزند جواں بخت کے حق میں محفوظ کر لینا چاہتی تھیں لیکن اس میں بھی ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

پیش کار رام جی داس نے بھی ولی عہد بہادر کو بتا دیا تھا کہ اسے لال کنوئیں میں کیوں طلب کیا گیا تھا اور اس نے وہاں کیا گواہی دی۔ صاحب عالم اب اپنے اختیارات استعمال کر رہے تھے۔ ہم لوگ نو محلے کی حویلی میں جہاں ولی عہد کبھی کبھار آتے تھے، بڑی محتاط زندگی گزارتے اور کسی لینے دینے میں نہیں تھے۔ اگرچہ خاندان کے بعض افراد پر ہمارا معاملہ کھل گیا، پھر بھی نو محلے میں ہمیں نواب شوکت محل بیگم کے عزیز سمجھا جاتا تھا۔ قلعے میں ہمارا

یہ عالم تھا کہ خطوط و مراسلات میں انہیں ''قرۃ العین'' لکھنا بند کر دیا اور دوسرے شہزادوں کی طرح صرف ''برخوردار کامگار'' لکھتے تھے۔ عملہ نظارت کے افسروں اور اہلکاروں کو حکم جاری کر دیا تھا کہ مرزا فخرالدین سے میل جول نہ رکھیں۔ انہیں غصہ اس بات پر تھا کہ بادشاہ ہیں مگران کے حکم کی تعمیل نہیں ہوئی نہ کسی امر پر ان کا اختیار ہے اور اپنی مرضی کا ولی عہد بھی مقرر نہیں کر سکتے۔ یہ تو فرنگی کی چال تھی کہ بادشاہ کا مرتبہ و اختیار کم کر دیا جائے لیکن ولی عہدی کے چکر میں زینت محل بیگم نے بھی انہیں خوار کیا تھا۔

بہت عرصہ قبل عالی جاہ حکومت کے ناظروں اور کارندوں کو یہ ہدایت جاری کر چکے تھے کہ سرکاری عہد ناموں اور تمسکات پر نواب زینت محل بیگم کی مہر[1] ہونا ضروری ہے۔ جس دستاویز پر ان کی مہر نہیں ہو گی، وہ لائق اعتبار نہیں سمجھی جائے گی۔ اسی اختیار کی بنا پر زینت محل یہ سمجھتی تھیں کہ جب تک وہ منظور نہیں کریں گی، اس وقت تک نہ تو وہ شادی قانونی سمجھی جائے گی، نہ میں بادشاہ کی پوتی اور شہزادی کہلا سکوں گی۔ انہوں نے ایک ذریعے سے خفیہ طور پر یہ بات ولی عہد تک پہنچائی کہ اگر وہ مرزا جواں بخت کے حق میں ولی عہدی سے دستبردار ہو جائیں تو نہ صرف ان کی خفیہ شادی کو تسلیم کر لیں گی بلکہ لالہ رخ کی شادی بھی آلِ تیمور کے کسی نامور شہزادے سے کر دیں گی۔ مگر ولی عہد نے انہیں یاد دلایا کہ شادی کوئی سرکاری تمسک نہیں، جو ان کی مہر کے بغیر لائق اعتبار نہ ہو بلکہ ایک شرعی فریضہ ہے جس کے لیے صرف گواہوں اور نکاح خواں کا ہونا ضروری ہے اور یہ شہادتیں وہ پیش کر چکے ہیں۔

اس جواب کے ساتھ انہوں نے زینت محل بیگم کو پیغام بھیجا تھا کہ مغل بادشاہ کا ولی عہد یا جانشین ہونا ان کے فرزند کی قسمت میں نہیں لکھا چنانچہ ایک بنگالی جوتشی کالی داس سے جو پچھلے دنوں دہلی آیا تھا، مرزا جواں بخت کا زائچہ نکلوایا گیا۔ تب یہ بات معلوم ہوئی۔ کالی داس نے جنوبی ہند کے مشہور ماہر نجوم کھٹالے کی کتاب کا بھی حوالہ دیا تھا جو مدراس میں چھپ چکی تھی۔ کھٹالے کا علم نجوم بھی یہی بتاتا تھا کہ مرزا جواں بخت کا مقدر یاور نہیں۔ بنگالی جوتشی کالی داس اگرچہ واپس جا چکا ہے تاہم اگر انہیں زائچے والی بات پر شک ہو تو فخر الملک مرزا دارا بخت مرحوم کے پیش کار رام جی داس سے تصدیق کر سکتی ہیں۔ کیونکہ جوتشی کو اسی کے ذریعے بلایا گیا اور اس کی موجودگی میں مرزا جواں بخت کا زائچہ نکلوایا گیا تھا۔

یہ ایک ایسا پیغام تھا جس نے زینت محل بیگم کے دل و دماغ و اتھل پتھل کر دیا۔ بنگالی جوتشی کی پیش گوئی ان کی آرزوؤں کا چمن ویران کر دینے کے مترادف تھی۔ انہوں نے مرحوم ولی عہد کے پیش کار رام جی داس کو اپنی خاص حویلی میں بلوایا، جو لال کنوئیں میں سڑک کے کنارے ''زینت محل[2]'' کے نام سے واقع ہے اور وہاں اس

1۔ سراج الدین بہادر شاہ کا روزنامچہ بابت 2 جولائی 1847ء

2۔ بہادر شاہ ظفر نے اپنی لاڈلی بیگم کے لیے یہ محل 1846ء میں تعمیر کروایا تھا جس کے اندر کئی محل سرائیں تھیں۔ اس کی تاریخ ''زینت محل'' نکلتی تھی۔ بادشاہ کبھی کبھار وہاں دربار بھی لگاتا تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق نے اپنا مشہور قصیدہ اسی محل میں پڑھا تھا، جس کا مطلع ہے ؎

زہے نشاط اگر کیجئے اسے تحریر
عیاں ہو خامہ سے تحریر نغمہ جائے صریر

(قمر اجنالوی)

کیں۔ ایجنٹ نے اعلیٰ حضرت کو معاملے کی اطلاع دی جس پر حضورِ والا نے سر طامس مٹکاف کو لکھ دیا کہ وہی ان کی پرورش کرتے ہیں۔ ادھر صاحب زادوں پر لعن طعن کی کہ ''کم بختو! ایجنٹ سے ہماری شکایت کرتے ہو، ہم تو خود تمہارے وظیفے لگانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

دراصل بادشاہ ضعیف العمر ہو گئے اور یہ بات بھول رہے تھے کہ جنگل میں شیر اسی وقت گرجتا اور دھاڑتا ہے جب اسے شکار نہیں ملتا اور وہ بھوکا ہو۔ لال قلعہ مغلیہ خاندان کے بھوکے شیروں، چیتوں اور لگڑ بھگوں کا جنگل تھا کیونکہ مغل سلاطین اور شہزادوں کی تعداد جو وظیفے کا حق رکھتے تھے، ایک سو سے اوپر ہو گئی تھی اور بادشاہ کو سرکارِ انگلشیہ سے ملنے والی تنخواہ اور باغات واراضی سے ہونے والی آمدنی مل کر بھی ان کی ضرورتوں کے مقابلے میں کم تھی، اس لیے بھوکے شہزادے عموماً گرجتے رہتے تھے۔

میں نے مرزا کالے کو سمجھایا کہ اگر انہیں کوئی شکایت تھی تو وہ اعلیٰ حضرت سے خود ملتے اور ان کے سامنے اپنی مشکل کا اظہار کرتے۔ ایجنٹ کو عرضی دینے کی کیا ضرورت تھی؟ اس وقت بادشاہ سلامت ہی مغلوں کی عزت و شوکت کا نشان ہیں اور اگر کسی شہزادے کے ہونٹ ایجنٹ سے ان کی برائی کریں گے، تو وہ خود برا لگے گا۔

مرزا کالے جو بڑے تیز وطرار تھے، میری بات سن کر ناراض ہو گئے۔ پھر انہوں نے کبھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کی۔ میں نہیں جانتی، ان سے میری جو بات چیت ہوئی، اس کی اطلاع اعلیٰ حضرت تک کس نے پہنچائی۔ لال قلعے میں مغل شہزادے اپنے ہی بکھیڑوں میں اُلجھے رہتے تھے اور کسی کو دوسرے سے غرض نہ تھی کہ وہ کیا کرتا ہے۔ اس سے خود غرضی کا پہلو بھی نکلتا تھا۔ تاہم جب بادشاہ کو پتہ چلا کہ میں نے انہیں مغلیہ عزت وشوکت کا نشان قرار دیا اور مرزا کالے کو سمجھایا تھا کہ انگریز ایجنٹ کو عرضی دینا ان کی غلطی تھی تو حضورِ والا میرے متعلق معلومات حاصل کرنے لگے تھے۔

جلد ہی انہیں پتہ چل گیا کہ میں 12 برس کی عمر میں توزک تیموری، تاریخ مغلیہ (تیمور صاحب قران سے شاہ عالم ثانی تک)، جامع الحکایات، بدر منیر، گلستان اور دیوانِ میر تقی میر پڑھ چکی ہوں اور ''سراج الاخبار'' کا (جو ہر ہفتے شائع ہوتا اور دراصل اعلیٰ حضرت شاہ دہلی کا روزنامچہ تھا) باقاعدگی سے مطالعہ کرتی ہوں تو بے حد خوش ہوئے اور مجھے موتی محل میں طلب کیا۔

اس وقت میرے ہمراہ نواب شوکت محل اور بی مغلانی بھی تھیں۔ ملاقات کے وقت داروغہ کشمیرن مہتاب موجود تھیں۔ اعلیٰ حضرت کیکری کٹاؤ کے گاؤ تکیے کے سہارے تشریف فرما تھے۔ دو خواجہ سرا مورچھل جھل رہے تھے۔ بدن پر لکھنؤ کی چکن کا کُرتہ تھا جس کی دونوں جانب تکمے گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں اور دہلی کا کمر بند اور نیچے سفید بڑا پاجامہ، پاؤں میں مخملی کفش پائیاں تھیں۔ وہ گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھے بھنڈہ (حقہ) نوش فرمارہے تھے۔ مجھے شفقت سے اپنے قریب بٹھایا اور کہا۔

''اگر ہمیں کوئی شکایت ہے تو مرزا فخرالدین سے ہوگی۔ تم سے نہیں۔''

میں نے عرض کی۔ ''ظلِ سبحانی! میری تو ایک ہی خواہش ہے کہ مغلیہ خاندان کا نام روشن کروں۔ مجھے حضور کی دعا چاہئے۔''

میری چھوٹی سی بات انہیں بہت بڑی لگی۔ فرمایا۔ ''لالہ رخ! ہماری دعا ہے کہ تم تیموری آسمان پر زہرہ وناہید

آنا جانا انہی کے قصر تک تھا۔ بادشاہ کے چچا اور عرش آرام گاہی شاہ اکبر ثانی کے بھائی قصر مرزا نے بھی ہماری بڑی دل جوئی کی تھی یا پھر اعلیٰ حضرت کے بھتیجے مرزا محمود شاہ جو بے چارے گٹھیا (جوڑوں) کے درد میں مبتلا تھے، ہمارا بہت احترام کرتے تھے۔

قلعے کے باہر ہمارا تعلق ''خانم بازار'' میں نواب مینڈھو مرزا کی حویلی سے تھا، جہاں شہزادی احمدی بیگم اور ان کے بچوں کی طرف سے ہمیں بڑا پیار ملا تھا۔ 1850ء سے ہمارا وظیفہ مقرر ہو گیا، جو ولی عہد کی طرف سے ہر مہینے باقاعدہ ملتا تھا۔ قلعے میں آ کر مجھے بیگم شوکت کے ذریعے مرزا قوباش، مرزا ظہیرالدین مغل، مرزا ابوبکر اور مرزا محمد شاہ رخ مرحوم کے صاحب زادوں مرزا محمد عبداللہ شاہ، مرزا محمد بخت، مرزا محمد خرم اور ان کی بہن نرگس نظر سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جنہیں بیگم شوکت محل نے ''راز کی بات'' بتا دی تھی اور سب نے ایک حیرت انگیز مسرت کے ساتھ مجھے اپنی محبت سے حصہ دیا تھا۔ مرزا مغل کو جو ولی عہد بہادر مرزا فخرالدین سے تیسرے درجے پر تھا، میرا نام بہت پسند آیا۔ ان کی اپنی صاحب زادی کا نام بھی لالہ رخ تھا جو مجھ سے چھوٹی تھی اور جس کا ذکر میں پہلے بھی کر چکی ہوں۔ اس طرح قلعے میں آہستہ آہستہ میرے رشتے ناتے آگے بڑھے۔

ولی عہد مرزا دارا بخت، ظفرالملک مرحوم کی بیوہ محمدی بیگم اور ان کے چند لڑکوں مرزا کالے، مرزا ابو مرزا جھجو اور مرزا احمد سے بھی ملاقات ہوئی۔ دارا بخت مرحوم کو اچھے گھوڑے پالنے کا شوق تھا اور ان کا اصطبل بھی بہت بڑا تھا۔ مگر ان کی وفات کے بعد بادشاہ نے صاحب زادوں کو صرف ایک گھوڑا سواری کے لیے دیا۔ مرحوم کے چودہ لڑکے تھے اور انہیں شکوہ تھا کہ بادشاہ نے ان کے والد کا ترکہ خود سنبھال لیا ہے۔ مرحوم کا کچھ قیمتی اثاثہ ایک کمرے میں مقفل تھا جس کی کنجی بادشاہ کے پاس تھی۔ صاحب زادوں نے دوسری کنجی سے قفل کھولا اور سامان نکال کر لے گئے۔ اعلیٰ حضرت کو پتہ چلا تو چوب دار بھیجے، جو صاحب زادوں سے سارا سامان واپس لے آئے جس پر لڑکوں نے انگریز ایجنٹ سر طامس مٹکاف کو عرضی دی کہ سامان ہمارے والد مرحوم کا تھا اور ہم اس کے وارث ہیں۔ اعلیٰ حضرت نے وہ سامان ہم سے کیوں لے لیا؟

یہ واقعہ میں نے بیان کرنا ضروری سمجھا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ پہلے ولی عہد کے لڑکوں سے عالی جاہ کا سلوک کیا تھا اور عالی جاہ کے صاحب زادوں نے کیا رویہ اختیار کر لیا تھا۔ مرزا دارا بخت کی رحلت کے بعد ان کے گھرانے کی تنخواہوں یا وظیفوں کا سوال اٹھا۔ ولی عہدی کی تنخواہ کے پندرہ ہزار روپے نئے ولی عہد کے لیے موقف ہو گئے تھے اور مرحوم کے صاحب زادوں اور بیواؤں کا خرچہ یا وظیفہ بادشاہ کو ملنے والے ایک لاکھ روپے ماہانہ یا شاہی اراضی، باغات اور کرایوں کی آمدنی میں سے نکلنا تھا جس کی ادائیگی ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ صاحب زادوں کا خیال تھا، اعلیٰ حضرت نے یہاں بھی ان کے ساتھ زیادتی کی ہے۔

اس حقیقت سے کوئی انگریز بھی انکار نہیں کر سکتا کہ مغلوں کا گھر کا دروازہ کسی نے بند نہیں کیا۔ جو بھی آیا، کھلے دروازے کچھ نہ کچھ لوٹ کر لے گیا اور اس گھر میں لٹیروں کو روکنے اور پکڑنے والے محافظ نہیں رہے تھے۔ مغلوں کا مال تقریباً ڈیڑھ صدی سے لوٹا جا رہا تھا اور لوٹ کے مال کا کچھ حصہ مغلوں ہی کے خاندان میں وظیفوں کے طور پر بانٹا جاتا تھا جس کی ادائیگی اور نگرانی کا ذمے دار ان دنوں دہلی کا انگریز ایجنٹ سر طامس مٹکاف تھا۔ چنانچہ صاحب زادوں نے مٹکاف صاحب کو عرضی لکھی، جس میں شکایت کی کہ بادشاہ نے ان کی تنخواہیں مقرر نہیں

(18)

صفدر مرزا

اب میں لال قلعے میں گزرے ہوئے اپنی عمر کے چند سال پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھتی اور زندگی کی اس منزل میں داخل ہوتی ہوں، جہاں ہر لڑکی اپنے ماضی سے رخصت ہوتی اور آنے والے حسین دنوں کے خواب دیکھتی ہے یا اپنے مستقبل کے تانے بانے بُنتی ہے۔

تیموری گھرانے کی بیشتر لڑکیاں پندرہ سولہ یا سترہ برس کی عمر میں بیاہ دی جاتی تھیں۔لڑکوں کی شادی کا پیمانہ سترہ، اٹھارہ اور اُنیس برس مقرر تھا۔ قلعے میں ہر سال دو تین شادیاں ضرور ہوتی تھیں۔ زینت محل بیگم کے لاڈلے فرزند مرزا جواں بخت پندرہ سولہ رس کے ہوں گے جب ان کی شادی مرزا تیمور حسین کی صاحبزادی کشور آرا سے ہوئی اور اس دھوم دھام سے ہوئی جس کا ذکر صرف قصے کہانیوں میں ملتا ہے یا پھر لوگ ایسی شادیوں کے خواب ہی دیکھتے ہیں۔کم از کم میں نے اپنی زندگی میں ایسی دھوم دھام سے شادی نہیں دیکھی۔ قلعے میں پورے بارہ یوم رقص وسرود کی محفلیں ہوتی رہیں اور دہلی، آگرے کی طوائفوں نے مجرے کیے۔

حضرت اقدس کے استاد اور دربار کے شاعر شیخ ابراہیم جنہیں قصیدہ گوئی میں ''خاقانِ ہند'' کا خطاب اصل تھا، اپنی علالت کے باعث مرزا جواں بخت کا سہرا نہ لکھ سکے اور شہزادے کا سہرا مرزا اسد اللہ خاں غالب نے لکھا ؎

خوش ہو اے بخت کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پر سہرا

اس کے مقطع میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرف دار نہیں
دیکھیں اس سہرے سے کہہ دے کوئی بڑھ کر سہرا

بات استاد ذوق تک پہنچی۔ وہ سمجھے کہ اس سہرے سے بڑھیا سہرا نہ کہہ سکنے کا طعنہ یا آوازہ انہی پر پھینکا گیا ہے۔انہوں نے اسی زمین میں جوابی سہرا لکھا اور حق بات یہ ہے کہ بڑھ چڑھ کر لکھا۔ مقطع میں مرزا غالب کے مقطع کا جواب دیا ؎

بن کر جگمگاؤ۔''

کچھ دیر دلچسپ باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے رخصت کی اجازت لی تو انہوں نے میری پیشانی پر بوسہ دیا، پھر کہنے لگے۔ ''تمہارے دل میں تحصیلِ علم کا شوق اور خاندان کو سر بلند کرنے کا جذبہ ہے۔ یہ دونوں باتیں دوسری لڑکیوں میں نہیں۔ اگر مغلوں نے ان باتوں کا خیال رکھا ہوتا تو آج ہم مصیبت میں مبتلا نہ ہوتے۔

اعلیٰ حضرت دراصل سادہ دل، فقیر منش، دھیمے مزاج کے آدمی اور ہر شخص کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ جو لوگ ان کے قریب تھے، وہ انہیں لائق اعتبار سمجھتے اور ان کی ہر بات پر یقین کر لیتے تھے۔ بادشاہ کے نزدیک وہ لوگ انہیں دھوکا تو کیا، کوئی غلط مشورہ بھی نہیں دے سکتے تھے۔ یہی ان کی حد سے بڑھی ہوئی خوش فہمی تھیں جو اکثر دھوکے دیتی رہی۔ وہ نواب زینت محل، خواجہ سرا محبوب علی، حکیم احسن اللہ اور مرزا الٰہی بخش پر بڑا بھروسہ کرتے اور انہی کو اپنے خیر خواہ سمجھتے تھے۔ وہ لوگ بھی جو چاہتے ان سے منوا لیتے تھے۔

بادشاہ ولی عہد بہادر سے اس لیے ناراض ہو گئے تھے کہ انہوں نے اپنا حق زینت محل بیگم کے بیٹے کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔ میرے متعلق بھی ان کے دل میں بڑی بدگمانیاں پیدا کر دی گئی تھیں۔ لیکن وہ ساری بدگمانیاں ایک ہی ملاقات میں جاتی رہیں اور یوں محسوس ہونے لگا، وہ مجھے پسند ہی نہیں کرتے بلکہ دل سے چاہتے ہیں اور یہ بات غلط نہ تھی۔ صرف زینت محل کی وجہ سے وہ مجھے دُور رکھتے تھے ورنہ میں ان کے بہت قریب پہنچ گئی تھی۔

❁......❁......❁

ہماری جانب سے دولہا دُلہن کو جو تحائف اور جوڑے دیئے گئے، وہ ولی عہد بہادر کے گھرانے ے شایانِ شان تھے اور دیکھنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ ان تحفوں اور جوڑوں کے لیے رقم تو صاحب عالم نے دی تھی لیکن انہیں پیش کرنے کا حوصلہ، طریقہ اور سلیقہ ہمارا اپنا تھا۔ جواب میں ہمیں بھی شاہی جوڑے بھیجے گئے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ قلعے اور خاندان میں ہمارے متعلق وہ بیگانگی اور غیریت جاتی رہی تھی، جس کا مظاہرہ ابتدا میں ہوا تھا۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ ولی عہد بہادر اپنے حق کی خاطر شہزادہ جاں بخت کے راستے کی دیوار بن گئے تھے اور ان کے لیے زینت محل بیگم کا دل الماس کی طرح سخت تھا۔ تاہم میرے اور بی مغلانی کی خاطر ان کے رویّے میں تھوڑی سی لچک اور نرمی پیدا ہوگئی تھی۔ عورت، عورت کے لیے کبھی کبھی پتھر دل اور کبھی کبھی نرم دل ہو جاتی ہے۔

اس طرح بہت سی ناخوشگوار باتوں سے اُلجھتی اور بہت سی خوشگوار یادوں سے گزرتی میں اس عمر کو پہنچی جو لال قلعہ میں شادی کے لیے انتہائی موزوں سمجھی جاتی تھی۔ وہی شاعر کے بقول ''برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن'' بلکہ میں تو اس سن سے آگے نکل گئی تھی لیکن نہ کوئی خواب دیکھا، نہ کبھی اپنی عمر کے مسئلے پر توجہ دی۔

مرزا دارا کی بیٹی گل بانو جو میری ہم عمر تھی، میرے چچا مرزا خضر سلطان کے فرزند مرزا دارا شکوہ سے محبت کرتی اور اسی کے ساتھ بیاہی جا چکی تھی۔ مرزا شاہ رخ مرحوم کی بیٹی نرگس نظر میری سہیلی بھی تھی اور رشتے میں چچا زاد بہن تھی۔ سنا تھا دختر شاہ، شہزادی کلثوم زمانی جو نواب مرزا ضیاء الدین کی حرم تھیں، نرگس نظر کا عقد اپنی سسرال کے ایک نواب زادے سے کرنا چاہتی تھیں اور اعلیٰ حضرت کے بہنوئی مرزا عمر سلطان بھی اپنے کسی عزیز کے نوجوان فرزند کے لیے اس کے رشتے کے طلب گار تھے۔ لیکن نہ بادشاہ نے اس سلسلے میں کوئی جواب دیا تھا نہ نرگس نظر کے بھائیوں سے کوئی مشورہ کیا تھا۔

دراصل کبھی کبھی وہ خواب جن کی تعبیر کے لیے انسان مارا مارا پھرتا ہے، پورے نہیں ہوتے اور آسمانوں کے درمیان گردش کرتی ہوئی تقدیر بلائے ناگہاں کی طرح زمین پر نازل ہو جاتی ہے۔ بھلا کون جانتا تھا کہ دہلی ایک بار پھر اُجڑنے والی ہے اور اس کے اندھیروں میں نرگس کی طرح ہزاروں کنواریاں لٹ جائیں گی۔

قلعے کی بیگموں، محلاؤں، شہزادیوں کو ملک کے سیاسی حالات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ راضی بہ رضا ہو کر لال قلعے ہی کو ''مغلیہ سلطنت'' سمجھ رہی تھیں اور ان کی ساری سیاست قلعے تک محدود تھی مگر مجھے ہندوستان، ہندوستان کی سیاست، بچی کچھی مغل سلطنت اور مغلیہ خاندان کے حالات سے دلچسپی تھی۔ شاید اسی لیے میں محبت کے بکھیڑوں میں نہیں پڑی، نہ مجھے یہ احساس ہو سکا کہ میں شادی کے قابل ہوگئی ہوں۔

بیگموں، شہزادیوں میں حسد، رقابت اور لگاوٹ کا سلسلہ بھی چلتا تھا۔ ہر لونڈی، باندی، مہری اور خواجہ سرا کو اپنی بی بی کی عزت عزیز تھی۔ اس لیے کبھی کبھار ان کے درمیان بھی نوک جھوک، کھٹ پٹ، تُوتکار ہو جاتی تھی۔ ہر کوئی اپنی چہیتی بی بی کے لیے پھپھولا جلاتی۔ قلعے کی مخصوص زبان میں ایک دوسری کو غیبانی (گالی) سناتی اور وہ بیراکھیری (عداوت) کی باتیں ہوتیں کہ توبہ توبہ۔

عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، عید میلاد، شب برات، جشنِ نوروز، بسنت، دیوالی، سلونو کے تہوار قلعے میں بڑی دھوم دھام سے منائے جاتے تھے۔ مینا بازار بھی لگتے تھے۔ دعوتیں بھی ہوتی تھیں۔ ایک دوسرے کو تحفے تحائف بھیجے

جس کو دعویٰ ہو سخن کا یہ بتا دے اس کو
دیکھ اس طرح سے کہتے ہیں سخن ور سہرا

قلعے میں استاد کے سہرے کی دھوم مچ گئی۔ یہ اشعار تو بالخصوص بڑے مشہور ہوئے ۔

آج وہ دن ہے کہ لائے درِ انجم سے فلک
کشتی زر میں مہ نو کی لگا کر سہرا
وہ کہے صلِ علیٰ ، یہ کہے سبحان اللہ
دیکھیں مکھڑے پہ جو تیرے مہ و اختر سہرا
تابنی اور بنے میں رہے اخلاص بہم
گوندھیے سورۂ اخلاص کو پڑھ کر سہرا

استاد ذوق کے جوابی سہرے پر مرزا غالب کو بادشاہ کے حضور معذرت کے ساتھ سخن گسترانہ بات کہنی پڑی ۔

منظور ہے گزارش احوال واقعی
اپنا بیان حُسنِ طبیعت نہیں مجھے
سو پشت سے ہے پیشہ آبا سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزت نہیں مجھے
استاد شاعری سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب ، یہ مجال ، یہ طاقت نہیں مجھے
رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ
سودا نہیں ، جنوں نہیں ، وحشت نہیں مجھے
صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

میں نے مرزا جواں بخت کی شادی کا ذکر خصوصیت کے ساتھ اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ اس موقع پر اُردو کے دو بلند پایہ شاعروں میں ایک شاعرانہ چشمک ہوئی تھی جس کا خاتمہ ''صادق ہوں اپنے قول میں غالب خدا گواہ'' پر ہوا۔ دوسرے اس حوالے سے میں یہ بھی بتانا چاہتی ہوں کہ صاحب عالم مرزا فخر الدین ولی عہد بہادر خود بھی شاعر اور استاد ذوق ہی کے شاگرد تھے۔ جب انہوں نے ذوق کا جوابی سہرا سنا تو بڑے خوش ہو کر بولے۔

''استاد نے میدان مار لیا۔''

اسی حوالے سے یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ صاحب عالم نے نواب شوکت محل بیگم کے صاحبزادے مرزا داغ کو، جن کے وہ سرپرست اور ولی تھے، استاد ذوق ہی کی شاگردی میں بٹھایا تھا اور آخر میں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہ پہلا موقع تھا جب بی مغلانی، میں اور ماموں اورنگ مرزا شاہی خاندان کی کسی تقریب میں مدعو کیے گئے تھے۔ ملکہ زینت محل کی طرف سے خاندان کے دیگر گھرانوں اور افراد کی طرح ہمارا نام پہلی بار تورہ بندی (شاہی کھانوں کی تقسیم) میں آیا اور کھانوں کے خوان نو محلے کی حویلی میں بھیجے گئے۔

کو لوٹا تھا۔ وہ ریاستوں کو ضبط کرتے اور شہروں کو ان کے حاکموں سے چھین لیتے تھے۔ انہوں نے اپنے بوٹوں سے راجوں، مہاراجوں، نوابوں کے سروں کو ٹھوکریں ماری تھیں اور انہی بوٹوں سمیت ان کے رنگ محلوں اور خلوت خانوں میں قدم رکھے تھے، جہاں کوئی پرندہ پَر نہیں مار سکتا تھا۔

جب میں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھا، پورے ہندوستان پر برا وقت تھا کیونکہ فرنگی ہندوستان کے تمام دروازوں پر آ بیٹھا تھا۔ بیشتر سلطنتیں اور ریاستیں ان کے وظیفوں پر پل رہی تھیں اور یہی سوچ میری جوانی کے حسین خوابوں کو درہم برہم کر دیا کرتی تھی کہ ہندوستان غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جا رہا ہے۔

❁......❁......❁

اے جہاں گرد!

میرے وقائع نویس مہمان!

میں تجھے بتا چکی ہوں کہ اٹھارہ برس کی عمر تک میری زندگی کی کتاب میں محبت کے نام کا کوئی ورق نہیں تھا۔ لیکن محبت بہر حال ایک ایسا لفظ ہے جو ہر جوان لڑکی کے دل میں کیف آور سی سنسنی پیدا کر دیتا اور خون کے ساتھ پورے جسم میں اُتر جاتا ہے۔ میری زندگی میں بھی وہ لمحہ آنے والا تھا جب میں محبت کی لطیف دھڑکنوں سے دوچار ہوتی مگر آنے والے لمحے سے مکمل طور پہ بے خبر تھی۔

وہ مارچ 1856ء کے دن تھے جب صاحب عالم ولی عہد بہادر کی طبیعت نصیبِ دشمناں اچانک بگڑ گئی اور علاج معالجے سے پھر سنبھل گئی تھی۔ ابھی ایک روز قبل میں مغلانی کے ہمراہ ان سے مل کر آئی تھی۔ وہ صحت یاب ہو گئے تھے۔ اور اگرچہ ابھی معمول کے کام کاج سے پرہیز تھا، پھر بھی اپنی سرکار سے وابستہ کچھ لوگوں سے ملاقات کرنے لگے تھے۔ اچانک نواب شوکت محل کی ایک کنیز پیغام لے کر آئی کہ صاحب عالم نے مجھے یاد فرمایا ہے۔ بی مغلانی نے کہا۔ میں ماموں اورنگ مرزا کو ساتھ لے جاؤں اور صاحب عالم سے مل آؤں۔ میں ماموں مرزا کو بے حد پسند کرتی تھی لیکن وہ پالکی والکی کو ناپسند کرتے اور اس بات پر زور دیتے تھے کہ پالکی پر سفر کرنے کے بجائے پیدل چلنا بہتر ہے۔ چلنے پھرنے سے ہاتھ پاؤں کھلتے ہیں اور جسم میں خون صحیح طور سے گردش کرتا ہے۔

دراصل وہ مجھے مغل شہزادیوں کی طرح نازک مزاج اور چوچی (نرکل کی نلی) نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ کہا کرتے تھے کہ چاند بی بی کی طرح مجھے دوسری عورتوں سے مختلف ہونا چاہئے۔ انہوں نے میری تعلیم و تربیت میں غیر معمولی دلچسپی لی۔ مجھے مغلیہ تاریخ، ہندوستان کے حالات اور کمپنی سرکار کی ریشہ دوانیوں سے آگاہ کیا تھا۔ میرے ماموں، اتالیق راہبر و راہنما سب وہی تھے مگر اس روز ماموں مرزا کے بجائے میں نے عنبری کو ساتھ لیا اور قصر ولی عہد میں پہنچی۔

نواب شوکت محل کا خواجہ سرا میری آمد کی اطلاع لے کر دیوان میں گیا اور لوٹ کے آیا تو پتہ چلا کہ کچھ لوگ صاحب عالم کی مزاج پرسی کے لیے آئے بیٹھے ہیں۔ میرے لیے حکم ہوا کہ پانچ منٹ کے بعد حاضر ہو سکتی ہوں۔ میں نے سوچا مزاج پرسی کے لیے آنے والے انگریز ایجنٹ سر طامس کے گماشتے ہوں گے۔ جب سے صاحب عالم ولی عہد مقرر ہوئے تھے سرکارِ انگلشیہ کا ایجنٹ بادشاہ پر کم اور ان پر زیادہ توجہ دینے لگا تھا۔ اس کے دیسی گماشتے اکثر ولی عہد بہادر کے حضور آتے جاتے رہتے اور انہیں مشورے دیا کرتے تھے کہ وہ ابھی سے مہر ولی کو

جاتے تھے۔ ماہ طلعت شہزادیاں اور نواب زادیاں زرق برق پوشاکیں پہن کر اپنی مہریوں باندیوں کے ہمراہ نکلتیں، بڑوں کو مجرا (سلام) ہوتا تھا۔ ان تہواروں پر لٹے پٹے مغل گھرانے بھی اپنی خاندانی روایت کے مطابق نمود و نمائش کرتے تھے۔

شہزادوں، سلاطین، شہزادیوں اور بیگمات کو بادشاہ کی طرف سے جو وظیفے ملتے تھے، ان کی رقم اتنی محدود ہوتی تھی کہ اس سے شاہی اللّے تللّے پورے نہ ہو سکتے تھے۔ بعض کے کچھ ذاتی جائیدادیں تھیں جن کی آمدنی سے اخراجات اور روایتی چونچلے چلتے تھے اور بعض کو ناک اونچی رکھنے کی خاطر مہاجنوں سے قرض لینا پڑتا تھا۔

یہ ساری باتیں میں تجھے اس لیے بتا رہی ہوں کہ فرنگی کی عملداری میں اگرچہ ہندوستانی معاشرت اپنا رنگ بدل رہی تھی مگر لال قلعے اور دہلی کے پرانے گھرانے چغتائی تمدن اور مغلیہ تہذیب کے مرکز تھے جس میں تیموری اور راجپوتی پیوند لگے ہوئے تھے۔ دہلی اور قلعے میں اسی گنگا جمنی تہذیب کی پاسداری ہوتی تھی۔ اگر عیدین اور شب برات کے تہواروں پر خوشی کا اظہار ہوتا اور رقص و سرود کی محفلیں جمتی تھیں تو دیوالی پر مستعانیاں، دھوبنیں، مالنیں، کہاریاں، حلال خوریاں، تین تین دن تک محلے سے باہر نہ نکلتی تھیں کہ کوئی جادو ٹونا نہ کر دے۔ مگر دیوالی کا پہلا دیا جلتے ہی قلعے کے برجوں میں روشنی ہوتی۔ نوبت بجتی۔ بادشاہ کو سونے چاندی میں تول کر سونا چاندی غریبوں میں بانٹا جاتا۔ کہاریاں، جسولیناں (چوب دار عورتیں) گھر گھر کھیلیں بتاشے تقسیم کرتی پھرتی تھیں۔ دیوالی کے تہوار پر بیلوں کو باغات کی کارچوبی جھولوں سے سجایا جاتا تھا۔ پاؤں پر مہندی کا رنگ اور سینگوں پر قلعی کا ملمع ہوتا تھا۔ پھر سینگوں پر پیتل اور چاندی کی سنگوٹیاں چڑھائی جاتی تھیں۔

سلونو (راکھی باندھنے کا تہوار) شاہ عالم ثانی جنت مکانی کے وقت سے چلا آ رہا تھا۔ نمک حرام وزیر غازی الدین خاں کے بھیجے ہوئے آدمیوں نے جب شہنشاہِ ہند اعلیٰ حضرت عزیز الدین عالمگیر ثانی عرش آشیانی کو قتل کر کے ان کی لاش دریائے جمنا کی ریتی پر پھینک دی تھی تو ایک برہمن عورت رام کور جو اشنان کرنے وہاں پہنچی تھی، ساری رات شہنشاہ کی لاش کے پاس بیٹھی رہی تھیں کہ کہیں کوئی جانور لاش نہ کھا جائے۔ اس خدمت کے عوض رام کور عالمگیر ثانی کے فرزند شاہ عالم ثانی کی بہن قرار پائی۔ اس نے ہندو رواج کے مطابق اپنے شہنشاہ بھائی کے ہاتھ پر راکھی باندھی تھی اور شہنشاہ نے اپنی ہندو بہن کو ہیرے جواہرات انعام میں دیئے تھے۔ تب سے رام کور کے خاندان کا بہناپا مغلیہ خاندان سے قائم ہوا تھا۔ برہمن خاندان کی لڑکی شاہِ دہلی کے ہاتھ پر راکھی باندھتی اور دستور کے مطابق ہیرے موتی، سونا چاندی انعام میں لیتی تھی۔

سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے عہد میں بھی سلونو کی رسم بڑی شان سے منائی جاتی تھی۔ ساون کے مہینے میں کئی کئی دن پہلے اس کی تیاریاں ہوتی تھیں اور باغوں میں جھولے پڑتے تھے۔

میں نے لال قلعے کی زندگی میں ان باتوں پر خصوصی توجہ دی تھی۔ تب کہیں جا کر یہ نکتہ سمجھ میں آیا کہ وہ گنگا جمنی تہذیب جو ایک طرف راجپوتوں اور دوسری جانب مغلوں کے دامن سے بندھی تھی، دراصل ہندو مسلم اتحاد کی علامت تھی، جسے فرنگی الگ الگ کر رہا تھا۔ کیونکہ وہ ہندوستانیوں کے تفرقے سے طاقت حاصل کرتا اور انہیں ایک دوسرے سے لڑا کر کمزور کر دیتا تھا تاکہ خود ان پر غلبہ حاصل کر سکے۔

یہی اس کی اب تک کی کامیابیوں کا راز تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز سوداگروں نے اسی طرح والیانِ ہند

شیر اپنے شکار کے بازو کندھوں سمیت کھالیتا ہے تو ٹانگیں اس کے بھاگنے کے لیے نہیں چھوڑ دیتا بلکہ اگلے دن کے لیے بچا رکھتا ہے۔ اسی طرح کیا کوئی خدا کی گرفت سے بھاگ سکا ہے جو مغل بھاگ جائیں گے؟''

میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ وہ اپنے ہی خاندان کے متعلق اتنی سختی بلکہ بے رحمی سے بات کریں گے۔ ان کے الفاظ سن کر میرے ہونٹوں سے آہ نکل گئی اور الفاظ کی دہشت خون میں دوڑنے لگی۔ انہوں نے محسوس کیا کہ ان کی گفتگو سے میرے دل کو صدمہ پہنچا ہے مگر وہ اپنی ادھوری بات پوری کرتے ہوئے کہنے لگے۔ ''ہم جانتے ہیں اعلیٰ حضرت کی ذات پر یا پھر ہماری ذات پر مغلیہ خاندان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ ہم تو فرنگی کے شکار کی وہ ٹانگیں ہیں جنہیں اس نے کل کے لیے محفوظ کر لیا ہے۔''

یہ بات اتنی خوف ناک تھی کہ میں بدحواسی کے عالم میں کھڑی ہو گئی اور دہشت سے جسم کانپنے لگا۔ انہوں نے خود کو وہ پس خوردہ شکار قرار دیا تھا جسے فرنگی بہر حال اپنے معدے میں اُتارنے والا تھا۔ کوئی بیٹی اپنے باپ کے بارے میں اس قسم کے الفاظ نہیں سن سکتی۔ اس سے پہلے کہ میں ان خوف ناک الفاظ پر احتجاج کرتی یا کچھ کہتی، انہوں نے کہا۔ ''لالہ رخ! جو کچھ تم نے سنا وہ سچ ہے اور سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اس لیے اگر تمہیں ہماری بات کڑوی لگی ہے تو ہم معذرت چاہتے ہیں۔''

پھر انہوں نے مجھے بیٹھنے کے لیے کہا اور تسلی کے لہجے میں کہنے لگے۔ ''اگر مغلوں کو بچانے کی کوئی ترکیب ہو سکتی ہے تو اس کے بارے میں ضرور سوچنا چاہئے۔ بعض اوقات ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی ہوتا ہے اور وہ غرق ہونے سے بچ جاتا ہے لیکن مغلوں کے متعلق سوچنے کے علاوہ تمہیں اپنے بارے میں بھی سوچنا چاہئے۔ اٹھارہ برس کی ہو چکی ہو اور اب تک تمہارا بیاہ ہو جانا چاہئے تھا۔''

میں کچھ نہ کہہ سکی اور شرم سے اپنی نشست پر ڈھے گئی۔ اس روز وہ صرف میرے متعلق گفتگو کرتے رہے کیونکہ ان کے نزدیک میں شادی کی عمر سے تجاوز کر رہی تھی۔ جب انہیں معلوم ہو گیا کہ میں نے کبھی اپنے بارے میں سوچا ہی نہیں تو اس کا مطلب تھا، میں کسی نوجوان سے دلچسپی نہیں رکھتی یا دوسرے لفظوں میں ابھی محبت کے آزار میں مبتلا نہیں ہوئی۔ میں نے ان کا اور انہوں نے میرا مطلب سمجھ لیا تھا۔ پھر دبے لفظوں میں بولے۔

''تمہارے پھوپھا نواب مینڈھو مرزا نے تمہارے لیے ایک نوجوان کی سفارش کی ہے اور ہم اس کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔ پھر بھی تمہاری مرضی اور تمہاری پسند کو ترجیح دیں گے۔''

یہ کہہ کر انہوں نے ایک پل خاموشی اختیار کی، پھر کہا۔ ''زندگی ایک سفر ہے۔ منزل کبھی نزدیک اور کبھی دور ہوتی ہے۔ لیکن رفیقِ سفر مرضی کا ہو تو سفر آسانی سے کٹ جاتا ہے۔''

ان کی باتیں سن کر پہلی بار محسوس ہوا کہ وہ میری ذات اور میری پسند کو کتنی اہمیت دیتے ہیں۔ مجھے میری مرضی ہی پوچھنے کے لیے طلب کیا گیا تھا مگر اپنے دل کی گلی تو ویران پڑی تھی اور اس میں ابھی تک کسی کے قدموں کی چاپ نہیں اُبھری تھی۔ انہوں نے اپنا مدعا بے شک ظاہر کر دیا اور ایک نوجوان کا ذکر بھی کیا جس کے لیے نواب مینڈھو مرزا نے سفارش کی تھی لیکن اس کے بارے میں مزید کوئی بات نہیں کی۔

جب انہوں نے مجھے رخصت کیا، اس وقت بھی یہی تاکید کی کہ میں اپنے بارے میں سوچوں اور انہیں اپنی پسند سے آگاہ کروں یا پھر ان کا فیصلہ قبول کر لوں جس کے لیے مجھے تین ماہ کی مہلت دی تھی۔

آباد کریں۔ کمپنی سرکار نے اعلیٰ حضرت کے بعد جو کافی ضعیف العمر ہو چکے تھے، ولی عہد بہادر کو اس شرط پر بادشاہ تسلیم کرنے کی حامی بھری تھی کہ وہ لال قلعہ خالی کر دیں گے اور اپنا دربار قطب صاحب کے علاقے مہرولی میں لگایا کریں گے۔

میں نے خواجہ سرا سے پوچھنا مناسب نہ سمجھا کہ مزاج پرسی کے لیے آنے والے کون لوگ ہیں۔ پانچ منٹ کے بعد جب خود دیوان خانے میں داخل ہوئی تو ملاقاتی جا چکے تھے۔ صاحب عالم جن کی طبیعت مزید بہتر ہو گئی تھی، گاؤ تکیے کے سہارے نیم دراز تھے۔ مجھے دیکھتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئے اور بڑی محبت و شفقت سے پیش آئے۔ میں نے مجرا ادا کیا اور پرسش احوال کے بعد اچانک طلبی کا سبب پوچھا تو مسکرا کے بولے۔

''لالہ رخ بیٹی! تم ہماری قرۃ العین ہو مگر ہمیں افسوس ہے کہ اپنی بعض مصروفیات کے باعث تم پر پوری توجہ نہیں دے سکے۔ شاید تمہیں ہم سے شکایت بھی ہو گی۔''

''شکایت کیسی ابا جانی! آپ نے مجھے بیٹی کا پورا مان دیا ہے۔ قلعے میں بھی میری بڑی عزت ہے۔''

''پھر بھی ہم تمہاری جانب سے کچھ غافل ہو گئے تھے۔''

''نہیں تو۔ آپ نے ہمیشہ میرا خیال رکھا ہے۔''

انہوں نے میرا ایک سرسری سا جائزہ لیا اور کہا۔ ''لالہ رخ! یہ ہماری غفلت ہی تو ہے کہ تم اتنی بڑی ہو گئیں اور ہم ابھی تک تمہارے فرض سے سبکدوش نہیں ہو سکے۔''

میں یہ بات سن کر مارے شرم کے پانی پانی ہو گئی۔ لاج کی آنکھ جہاز سے بھاری ہوتی ہے اور میری آنکھ بھی لاج سے اوپر نہ اٹھ سکی۔ مجھے اس معاملے سے کوئی دلچسپی نہ تھی جس کا ذکر انہوں نے چھیڑ دیا تھا۔ بس ان کے سامنے یوں چپ بیٹھی رہی جیسے پوری کائنات اپنے خالق کے حضور خاموش ہو جاتی ہے۔ میں سمجھی کہ میری شرم اور خاموشی کو دیکھ کر وہ خود ہی موضوع بدل دیں گے مگر اس روز شاید میں انہیں اپنے قد سے بھی بڑی نظر آ رہی تھی۔ اور بڑی نظر کیوں نہ آتی۔ اٹھارہ برس کی تو ہو چکی تھی۔ وہ میری شرم اور خاموشی دونوں کو نظر انداز کر کے کہنے لگے۔

''آج تمہیں تنہائی میں بلانے کا مقصد یہ ہے کہ ہم تمہاری مرضی اور پسند معلوم کریں۔ ہر لڑکی اپنے مستقبل کے بارے میں سوچتی ہے۔ یہ دنیا کا رواج اور دستور ہے۔ اس رواج کے مطابق اگر تمہیں کسی نوجوان سے دلچسپی ہے تو ہم اس کا نام معلوم کرنا چاہتے ہیں۔''

انہوں نے بڑی خوبصورتی اور بڑے محتاط الفاظ میں مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ میں کسی سے محبت کرتی ہوں یا نہیں؟ ان کا مطلب سمجھ کر پہلے تو میں دم بہ خود سی رہ گئی، پھر ذرا جرأت سے کام لے کر تاکہ گفتگو کا سلسلہ ختم ہو، انہیں بتایا۔ ''ابا جانی! میں نے اپنے بارے میں کبھی نہیں سوچا۔ صرف مغلوں کے بارے میں سوچتی ہوں۔''

انہوں نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ ''مغلوں کے بارے میں کیا سوچتی ہو؟''

''یہی کہ ان کی گزری ہوئی شان و شوکت کس طرح واپس آ سکتی ہے۔''

اس پر جو کچھ انہوں نے کہا، جو کچھ میں نے سنا وہ حیران اور ششدر کر دینے والا تھا۔ اور یہ کہا۔

''لالہ رخ بیٹی! مغلوں پر اس سے خراب دن کبھی نہیں آئے اور خراب دنوں میں پیش گوئیاں کرنے والے نجومی اور جوتشی بھی خاموش رہتے ہیں مگر تم نے ہمیں وہ بات کہنے پر مجبور کر دیا ہے جو ہم نہیں کہنا چاہتے تھے۔ جب

کی سرخیاں مزید گہری ہو رہی تھیں اور ان سرخیوں کے عکس میرے عقب میں بہت دور دیوانِ عام، دیوانِ خاص، جل محل، موتی محل، شاہی قصروں اور موتی مسجد کے گنبد و مینار کے علاوہ درختوں کی چوٹیوں اور چھتریوں پر رنگ بکھیر رہے تھے۔

نو محلے کی جانب مالتی اور سوسن کی جھاڑیاں ایک دیوار کی طرح دور تک چلی گئی تھیں اور مجھے ان جھاڑیوں کے اوپر سے گزر کر نو محلے کا رخ کرنا تھا مگر جب میں اس دیوار کی دوسری جانب اُتر گئی، جھاڑیوں کی اوٹ سے نکل کر کسی نے اچانک میرا راستہ کاٹا۔ نہ صرف راستہ کاٹا بلکہ میری کلائی پر ہاتھ بھی ڈال دیا۔ میں اس دیدہ دلیری پر بوکھلا کے رہ گئی اور بالکل غیر اختیاری سی ایک چیخ ہونٹوں پر تڑپ گئی جو خوف کی علامت تھی۔ فوراً ہی دوسرا ہاتھ میرے ہونٹوں پر آیا اور کسی نے میری آواز دبانے کی کوشش کی اور ساتھ ہی ایک تیز سرگوشی سنائی دی۔

''لالہ رخ! اتنی پریشانی کس لیے؟''

اس کی آواز اور لہجے کی بے ساختگی سے مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ اب جو حملہ آور کو غور سے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ وہ مردانہ حُسن و دل آویزی کا ایک بے مثال مرقع نظر آیا۔ بغیر جان پہچان کے میری کلائی پر ہاتھ ڈالنے کا مطلب تھا کہ دلیر اور بہادر بھی ہے۔ ایسی دلیری کا مظاہرہ کوئی مغل شہزادہ ہی کر سکتا تھا لیکن قلعے میں کوئی مغل شہزادہ اس قدر حسین اور دلکش نہ تھا۔

ایسے ہی آفریدہ جمال، دلیر، بہادر اور جانباز عاشق شہزادیوں کے دل کی سُونی کی گلیوں کو آباد کرتے ہیں اور خود ان کے دل کی دھڑکن بن جاتے ہیں۔ میرے سینے میں ایک جوار بھاٹا سا اُٹھنے لگا اور ذہن میں سنسناہٹ سی ہونے لگی۔ ''لالہ رخ! آج میری خوش بختی کا دن ہے۔ اب مجھے بھی اپنے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

اس اثنا میں یگانہ مرد نے جس کی عمر تیئس، چوبیس سال سے زیادہ نہ تھی، اپنا ہاتھ میرے ہونٹوں سے ہٹا لیا بلکہ میری کلائی بھی چھوڑ دی اور سر جھکا کر کہنے لگا۔ ''میں اس گستاخی کی معافی چاہتا ہوں لیکن اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ جس دن سے آپ کو دیکھا ہے، اسی دن سے اپنے آپ سے بچھڑ گیا ہوں۔''

میں نے الفاظ پر غور کیا۔ جن میں اس کے دل کی بے قراریاں مچل رہی تھیں۔ گویا میری بے خبری میں کہیں مجھے دیکھ چکا اور خود کو کھو بیٹھا اور حق بات یہ تھی کہ اسے دیکھ کر میرا دل پہلو سے نکلا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی شرافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے، جو اس نے میری کلائی چھوڑ کر اور معافی مانگ کر دکھائی تھی، پوچھا۔ ''کون ہیں آپ؟''

''صفدر مرزا ہے میرا نام۔ صرف ایک مہینہ ہوا، آگرے سے لوٹا ہوں۔''

میں نے نام پر غور کیا۔ اس کے اعداد نکالے۔ یہ بھی بتا دوں کہ میں حروفِ ابجد کے اعتبار سے کسی نام کا نمبر نکالنے اور علم الاعداد کے مطابق اس کا ستارہ معلوم کرنے میں بڑی مہارت رکھتی ہوں۔ دس برس کی تھی جب ماموں اورنگ مرزا مجھے ابجد، ہوز، حطی، کلمن، سعفص، قرشت، ثخذ، ضظغ کی گردان رٹایا کرتے تھے۔

صفدر مرزا کے اعداد 622 ہوئے اور ان اعداد کا حاصل 2+2+6 نکلا جس کا مفرد نمبر ایک ہوا اور یہ شمس کا نمبر ہے۔ جبکہ میرے اپنے لالہ رخ کے اعداد 866 ہوتے ہیں اور ان کا حاصل جمع 20=6+6+8 جس کا مفرد نمبر 2 ہے اور یہ قمر کا نمبر ہے۔

گویا عملی اصطلاح میں صفدر مرزا اور لالہ رخ، شمس و قمر کی جوڑی تھی۔ جب یہ سب کچھ جس کا میں نے ذکر کیا

ولی عہد کا محل موتی محل کی طرح شاندار اور دوسرے تمام محلوں، قصروں، کوشکوں سے زیادہ عالی شان تھا جس کے دروازے پر ہر وقت پالکی موجود رہتی تھی۔ لیکن واپسی پر میں نے پالکی نہیں لی۔ عنبری کے ساتھ باغ حیات بخش میں جل محل کی طرف ہولی۔ خیال تھا کچھ دیر نرگس نظر کے پاس بیٹھوں گی اور وہاں سے نو محلے کے لیے پالکی مل جائے گی۔

انسان کی زندگی میں بعض دن بڑے اہم اور مفید ہوتے ہیں ان میں اس کی مخفی تمناؤں کے دروازے آپ سے آپ کھلتے چلے جاتے ہیں۔ میرے لیے بھی وہ دن بڑا اہم تھا۔ عنبری کے آگے آگے چلتی میں اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ کبھی اپنے بارے میں کیوں نہیں سوچا۔ حالانکہ سوچنا چاہئے تھا اور یہ کوئی معیوب بات نہیں تھی۔

انہی خیالات میں محو میں باغِ حیات بخش میں داخل ہوئی اور ابھی نہر بہشت کی طرف بڑھ رہی تھی جس کے پل سے گزر کر مجھے جل محل میں جانا تھا کہ ناگہاں مرزا خرم سے مڈبھیڑ ہوگئی جو نہر کا پل عبور کر کے اسی طرف آ رہے تھے۔ میں پہلے کہیں بتا آئی ہوں کہ مرزا خرم، مرزا شاہ رخ مرحوم کے چھوٹے فرزند اور نرگس نظر کے بھائی تھے مگر یہ ابھی تک نہیں بتایا وہ ایک پلٹن کی بخشی گری کے عہدے پر فائز اور ایک یکہ از شہ سوار تھے۔ پورا نام مع خطاب مغیث الدولہ محی الزماں مرزا محمد خرم بخت بہادر تھا۔

میں ان سے ایک بار پہلے بھی مل چکی تھی مگر اس دن اچانک آمنا سامنا یوں ہوا جیسے کسی آسمانی برج میں دو ستارے ایک ہی وقت میں داخل ہوتے ہیں۔ انہوں نے کچھ ایسی بھرپور نظروں سے میرا جائزہ لیا کہ میں گھبرا گئی مگر یہ قران السعدین نہیں تھا۔ مجھے اور کچھ نہ سوجھا تو نرگس نظر کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ نور محل بیگم سے ملنے گئی ہیں اور آیا ہی چاہتی ہیں۔ میں چاہوں تو چند گھڑیاں انتظار کرلوں۔ جل محل میں مہریاں، باندیاں موجود تھیں لیکن نرگس نظر نہیں تھی تو میرا جل محل میں کیا کام تھا۔ وہیں سے واپس ہولی اور مرزا خرم حیران و پریشان سے دیکھتے ہی رہ گئے۔

جل محل میں بھی اس وقت کوئی پالکی نہیں تھی۔ میں عنبری کے ہمراہ دن کی فرار ہوتی روشنی میں پیادہ شاہی ایوانِ عام کے سامنے سے نکلی اور ایک روش پر نو محلے کی جانب ہولی۔

جن لوگوں نے لال قلعہ نہیں دیکھا وہ اس کی وسعت و فراخی کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ قلعے کا طول ایک ہزار گز سے کچھ اوپر اور عرض چھ سو گز ہے۔ اس کی تین اطراف خندق کا محیط 3600 ہزار گز ہے جبکہ دریا کی جانب قلعے کی مجموعی زمین چھ لاکھ گز شمار کی گئی ہے اور اتنے وسیع رقبے پر آباد وہ کوئی محلّہ نہیں بلکہ تیموری شہر تھا۔

نو محلے کی آبادی شاہی محلات اور امراء کی حویلیوں سے جن کا سلسلہ جنوبی فصیل تک چلا گیا تھا، کافی فاصلے پر تھی اور پالکی کے بغیر اتنا فاصلہ طے کرنا دوبھر ہوتا تھا مگر اس روز وہ فاصلہ کچھ بھی نہ لگا۔ شاید اس لیے کہ وہ دن میری زندگی کا ایک یادگار دن تھا۔

شام کی ہوا میرے بالوں سے کھیلتی اور دل کے کواڑ کو چھوتی گزر رہی تھی۔ سورج مغرب کے غاروں میں اُتر چکا اور پورا اُفق خونِ کبوتر کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ میں نے آسمان پر اتنی سرخیاں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ اس خلافِ معمول نظارے کو بڑے شوق اور تعجب سے دیکھتی ہوئی اپنی دھن میں مست چلتی رہی۔ عنبری کی زیرپائی ادھڑ جانے سے وہ ٹھیک سے چل نہ سکتی تھی اور مجھ سے بت پیچھے رہ گئی تھی۔ جوں جوں شام کا ملگجا منظر پھیل رہا تھا، شفق

(19)

انتقال

اس رات میں نے بڑا عجیب خواب دیکھا۔ خواب کہاں، بس کچھ بکھرے بکھرے منظر دیکھے۔ شفق کے منظر، سرخیوں کے منظر۔ جس جانب نظر اُٹھی، شفق ہی شفق تھی۔ جدھر دیکھا، سرخیاں ہی سرخیاں تھیں۔ جیسے سرخیوں کی ایک جھیل ہو۔ جس کے کنارے حدِ نظر تک چلے گئے تھے۔ ان کے درمیان صفدر مرزا کا ہیولا یوں نمودار ہوا تھا، جیسے جھیل میں کنول کا پھول پانی کی سطح سے اونچا ہوتا ہے۔

صفدر مرزا میرے خوابوں، خیالوں، حتیٰ کہ میری زندگی کے شب و روز میں اس طرح اچانک داخل ہوئے تھے جیسے شعبدہ ظہور میں آتا ہے۔

میں نے کہا تھا، صفدر مرزا کے بارے میں تجھ سے کچھ نہیں چھپاؤں گی اسی لیے پہلی ملاقات میں جو کچھ پیش آیا، ہو بہو اسی طرح بیان کر دیا ہے۔ پہلی بار انہیں دیکھ کر اور ان کا نام سن کر دل میں جو سنسنی پیدا ہوئی تھی، وہ خون کے ساتھ پورے جسم میں اُتر گئی۔ بالکل یوں لگا گویا میں غیر ارادی یا غیر اختیاری طور پر انہی کا انتظار کر رہی تھی اور کسی دوسرے کی خاطر اپنے دل کا دروازہ اس لیے نہ کھول سکی تھی کہ گھر کا اصل مالک آنے والا تھا۔ اور ایک شام جب آسمان شفق کی سرخیوں سے لالہ زار ہو رہا تھا، وہ ناگہاں آ گیا تھا۔

یہ بھی ایک عجیب اتفاق تھا کہ قلعے میں آئے اگرچہ چھ سال کا عرصہ ہو گیا تھا لیکن اس عرصے میں مجھے کسی شہزادے یا خاندان کے کسی دوسرے فرد سے نجی دلچسپی نہیں ہوئی تھی۔ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ میں ہندوستان کی تاریخ اور مغلوں کے حالات میں کھوئی رہتی تھی اور میرا بیشتر وقت تحصیلِ علم میں گزرتا تھا۔ پھر ماموں اورنگ مرزا جو میرے استاد اور اتالیق تھے، مجھے زیادہ تر تعلیم میں مصروف رکھتے تھے اور میرے کانوں میں یہ بات پھونکتے رہتے تھے کہ تمہیں لال قلعے کی دلچسپیوں سے دور رہنا اور اپنے آپ کو تمام شہزادیوں سے مختلف اور نمایاں ثابت کرنا ہے۔

میں پیدا ہوتے ہی چونکہ غیر معمولی حالات سے گزری تھی اس لیے ماموں مرزا کی یہ بات میرے دل میں گھر کر گئی تھی کہ میں ایک غیر معمولی مغل شہزادی بننے کی کوشش کروں۔ یہی وجہ تھی کہ نہ میں نے اپنی ذات کے بارے میں سوچا نہ کبھی نوجوانی کے چاؤ چونچلوں پر توجہ دی تھی۔ میری تمام تر دلچسپیوں کا محور مغلوں کا ماضی اور

ہے، میرے ذہن سے گزر رہا تھا، صفدر مرزا پر حیرت کا ایک سکتہ طاری تھا کہ نہ جانے میں کیا سوچ رہی ہوں اور ان کے اظہارِ محبت کا کیا جواب دوں گی؟ اگر صفدر مرزا کا نام میرے لیے مبارک تھا تو وہ خود ایک صاحب جمال، وجیہ اور پُرکشش آدمی تھے اور میرے پاس ان کے ہر سوال کا جواب اثبات میں تھا۔ لیکن میں ان کے بارے میں کچھ بھی تو نہیں جانتی تھی۔

شام کی ہوا کے ایک تیز جھونکے نے میرے دل کے کواڑ کھول دیئے اور وہ اس کھلے دروازے سے دل میں داخل ہو گئے۔ پھر بھی مجھے ان کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ وہ منتظر تھے کہ شاید میں کچھ کہوں گی لیکن جب میں خاموش رہی تو انہوں نے سوال کیا۔ ''کہیں میری گستاخی لائق سزا تو نہیں؟''

اسی اثنا میں عنبری مالتی اور سون کی جھاڑیوں کے پاس سے نمودار ہوئی اور مجھے ایک اجنبی نوجوان کے ساتھ کھڑی دیکھ کر وہیں ٹھٹک گئی۔ میں نے اس کی حیرت کو بھانپ لیا اور آواز دی۔ ''آگے آ جا عنبری! یہ صفدر مرزا ہیں، جو آگرے سے آئے ہیں۔''

اسی لمحے صفدر مرزا کی سرگوشی سنائی دی۔ ''اور میرے سوال کا جواب؟''

''کل ملے گا۔''

''کہاں؟'' صفدر مرزا کی آواز کپکپا رہی تھی۔

نو محلے کی جس آبادی میں ہم رہتے ہیں، اس کے عقب میں ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا۔ میں نے اسی کا حوالہ دیا۔

''حویلی کے عقبی باغیچے میں۔''

''کب؟'' سوال بہت مختصر تھا۔

میں نے بھی مختصر جواب دیا۔ ''کل شام۔''

اس طرح میری اور صفدر مرزا کی پہلی ملاقات ختم ہوئی جو ہماری محبت کا ایک حسین دیباچہ تھی اور میں عنبری کے ساتھ نو محلے کی طرف بڑھی۔ اب کے چلنے کی رفتار تیز تھی کیونکہ دل بھی سینے کے اندر تیزی سے دھڑک رہا تھا اور آسمان پر شفق کی سرخیاں شام کے اندھیرے میں تحلیل ہو رہی تھیں۔ چلتے چلتے عنبری نے طنز کا تیر چلایا۔

''قربانت شوم، صفدر مرزا کے ساتھ کب سے جان پہچان ہے؟''

عنبری کو معلوم تھا اس دن سے پہلے میں نے صفدر مرزا کا نام تک نہیں سنا تھا لہٰذا اس کا بے ہودہ سوال کسی جواب کے لائق نہ تھا۔ البتہ میں نے ایک انوکھا حکم دے کر اسے حیرت زدہ کر دیا۔ ''عنبری! کل شام سے پہلے مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ صفدر مرزا کون ہے؟ آگرے سے دہلی کیوں آیا ہے؟ اور قلعے میں کس کے ہاں مقیم ہے؟''

میں نے حویلی میں یہ بات کسی کو نہیں بتائی کہ صاحب عالم ولی عہد بہادر نے مجھے کیوں طلب کیا تھا اور وہ میرے بارے میں کیا ارادہ رکھتے ہیں۔ اگر کچھ بتایا تو یہی کہ میں مغلیہ خاندان کی عظمت وشوکت کی واپسی کے خواب دیکھتی رہی ہوں مگر صاحب عالم کہتے ہیں، مغلوں کے دن مقررہ ایام کی طرح گنے اور لکھے جا چکے ہیں جو گھٹ یا بڑھ نہیں سکتے۔ اس بات نے سب کو پریشان کر دیا۔

❁......❁......❁

سلطان اودھ نواب واجد علی شاہ کو بھی انگریز سے کئی شکایات ہیں، جو انہیں بے اختیار کر دینا چاہتا ہے۔ ایک پوشیدہ خبر یہ ہے کہ شاہِ دہلی اور سلطانِ اودھ نے مل کر شاہِ ایران کی جانب ایک خفیہ پیغام بھیجا ہے اور ان سے درخواست کی ہے کہ وہ انگریز کے خلاف ان کی مدد کریں۔

بادشاہ سلامت کے شیعہ عقائد کی طرف جھکاؤ کی اصل وجہ یہی ہے کہ وہ نواب واجد علی شاہ کے ساتھ مل کر شاہِ ایران کی حمایت چاہتے تھے۔ اس ضمن میں سنی علماء میں تشویش پائی جاتی ہے کہ وہ شیعہ ہو گئے ہیں مگر صفدر مرزا اگرچہ شہزادہ حیدر اور ان کے پدر مرزا خان بخش کے احسان مند اور انہی کے ایما پر کسی خاص مقصد کے لیے دہلی میں آئے ہیں تاہم ان کے متعلق اس امر کی تصدیق ہوگئی ہے کہ ایک راسخ الاعتقاد سنی ہیں۔

❀......❀......❀

یہ معلومات دلچسپی سے خالی نہ تھیں۔ اسی شام وعدے کے مطابق جب میں اپنی حویلی کے عقبی باغیچے میں صفدر مرزا سے ملی تو ان کے بارے میں بہت کچھ جان چکی تھی اور عنبری بھی، جس نے یہ سب باتیں معلوم کی تھیں، مجھ سے کچھ فاصلے پر باغیچے میں موجود تھی۔

ہماری ملاقات کا وہی وقت تھا جب دن رات یا اُجالا اندھیرا ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ ویسی ہی شام تھی جیسی کل تھی۔ آسمان پر کل کی طرح آج بھی شفق کی خوں رنگ سرخیاں پھیلی تھیں۔ جیسے آسمان پر زمین کی اَن گنت آرزوؤں کا خون اُنڈیل دیا گیا ہو۔ نو محلے کی اونچی عمارتوں کے علاوہ باغیچے کے سروؤں اور صنوبروں پر بھی شفق کی سرخیاں منعکس ہو رہی تھیں۔ شام کے اس منظر میں صفدر مرزا اس سوال کا جواب لینے آئے تھے، جو انہوں نے مجھ سے کل کیا تھا۔

کسی پہلی اور ناگہانی ملاقات پر جب ایک یگانہ مرد کے سوال کا جواب دوسری ملاقات پر ٹال دیا جائے تو سمجھا جاتا ہے کہ لڑکی کا جواب اثبات میں ہوگا۔ اور میں بتا چکی ہوں، صفدر مرزا کے لیے میرے دل کا دروازہ خود بخود کھل گیا تھا اور وہ اس کھلے دروازے سے میرے دل کے آنگن میں داخل ہو چکے تھے۔ اگر گستاخی کے جرم میں سزا کے حوالے سے انہوں نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ ان کے اقبالِ جرم کی طرح میں بھی محبت کا اعتراف کرتی ہوں یا نہیں تو میرے ذہن میں بجز اعتراف اور کچھ نہیں تھا۔ ہونٹوں پر ایک ہی لفظ بار بار مچل جاتا تھا اور وہ لفظ تھا...... ''ہاں'' ...... اس ایک لفظ کے سوا مجھے اور کچھ نہیں کہنا تھا۔ دوسری ملاقات کا مقصد وہ بھی جانتے تھے، میں بھی جانتی تھی۔ اس کے علاوہ ملگجی شام کے سایوں میں سروؤں اور صنوبروں کے درمیان ہم ایک دوسرے کی طرف بڑھے تو دونوں کے دل بری طرح دھڑک رہے تھے۔

شام کا ملگجا اندھیرا آہستہ آہستہ گہرا ہو رہا تھا۔ اس ملگجے اندھیرے میں جب ہم ایک دوسرے کے قریب آئے تو ناگہاں میری آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی لہرائی۔ پھر وہ بجلی میری پیشانی کے قریب چمکی جس طرح کوئی کوندا لپک جاتا ہے۔ وہ چمک دراصل مرزا کے تیز دھار والے خنجر کی تھی اور جب تک میں پیچھے ہٹتی یا سنبھلتی، پلک جھپکنے کے وقفے میں میری ایک زلف کٹ کر ان کے ہاتھ میں پہنچ گئی تھی۔ میرا دل اس تیزی سے دھڑک رہا تھا گویا کوئی تیز رفتار ہرنی بھاگی جا رہی ہو۔ بدن پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ پھر میرے کانوں سے ان کی آواز ٹکرائی، ایسی تھی وہ آواز جیسے خنجر کو غلاف سے کھینچتے وقت پیدا ہوتی ہے اور میں نے صفدر مرزا کے الفاظ سنے۔

مستقبل تھا۔ لیکن صاحبِ عالم کی زبان سے یہ الفاظ سن کر کہ مغلوں کے دن گنے اور لکھے جا چکے ہیں، امیدوں کے چراغ بجھ گئے تھے اور میرے اندر ایک اندھیرا اچھل گیا تھا۔

اس اندھیرے میں نور کی ایک شعاع اس وقت پھوٹی تھی جب صفدر مرزا نے مالتی اور سوسن کی جھاڑیوں سے نکل کر ناگہاں میرا راستہ کاٹا تھا اور میری کلائی پکڑ لی تھی۔ جو کچھ ہوا آناً فاناً ہو گیا تھا۔ مگر وہ عجیب واقعہ ولی عہد بہادر کے اس سوال کا جواب تھا جو انہوں نے لال قلعہ میں کسی سے میری دلچسپی یا محبت کے بارے میں پوچھا تھا۔ اس وقت جب انہوں نے میری مرضی اور پسند معلوم کرنے کے لیے مجھے ایوان میں طلب کیا تھا، میں ان کا سوال سن کر پسینہ پسینہ ہو گئی تھی کیونکہ کسی ایسے مرحلے سے گزری ہی نہیں تھی جس کے بارے میں وہ مجھ سے پوچھ رہے تھے۔ لیکن اب میرے پاس ان کے سوال کا جواب موجود تھا۔ اس لیے کہ میری زندگی کی کتاب میں محبت کا ورق شامل ہو گیا تھا اور میرے دل پر ایک نام لکھا جا چکا تھا اور وہ نام تھا...... صفدر مرزا......

❁......❁......❁

دوسرے روز عنبری نے صفدر مرزا کے بارے میں حیرت انگیز معلومات فراہم کیں۔ اس نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یوں تھا کہ صفدر مرزا، دہلی ہی کے ایک مغل گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام حیدر مرزا تھا۔ والدہ اودھ کی ایک امیر زادی اور مولوی احمد اللہ شاہ کے خاندان سے تعلق رکھتی تھیں جو فیض آباد کے ایک تعلقہ دار ہیں۔ (فیض آباد کے مولوی احمد اللہ شاہ کا ذکر سیّد برہان الدین کی روداد میں بھی آ چکا ہے) بچپن ہی میں صفدر مرزا کے سر سے والدین کا سایہ اُٹھ گیا تھا مگر ان کے والد حیدر مرزا، بادشاہ سلامت کے بھتیجے، شہزادہ مرزا حیدر کے ہم نام ہی نہیں بلکہ دوست بھی تھے۔ اپنے دولت کی رحلت کے بعد شہزادہ حیدر نے دوست کے بیٹے صفدر مرزا کو فیض آباد اپنی ننھیال میں نہ جانے دیا بلکہ اپنی کفالت میں لے لیا اور بادشاہ سے سفارش کر کے قلعہ معلیٰ میں رکھوا دیا تھا۔

مرزا سلطان شکوہ کی طرح مرزا خان بخش اور ان کے دونوں فرزند مرزا حیدر اور مرزا نجف، شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ انہوں نے لکھنؤ میں واجد علی شاہ کے دربار کی ملازمت کر لی تھی۔ مرزا حیدر کو وہاں سے ایک ہزار روپے ماہوار وظیفہ ملتا تھا اور ان کا نواب واجد علی شاہ کے علاوہ لکھنؤ کے شیعہ مجتہد پر بڑا اثر تھا۔ لکھنؤ میں ان کی بات مانی جاتی تھی۔ چند سال قبل شہزادہ حیدر نے صفدر مرزا کو اپنے پاس لکھنؤ بلوا لیا۔ وہ انہیں اودھ کی فوج میں کوئی عہدہ دلانا چاہتے تھے۔ صفدر مرزا ایک سپاہی زادہ تھے اور انہیں سپاہیانہ زندگی پسند تھی۔ وہ واجد علی شاہ کی اختری پلٹن میں ایک اہم عہدے پر فائز کر دیئے گئے اور وہیں کام کرتے رہے۔ لیکن جب اودھ کے حالات خراب ہونے لگے تو شہزادہ حیدر نے انہیں کسی اہم مقصد کے لیے پہلے لکھنؤ سے آگرے بھیجا پھر آگرے سے دہلی بھیج دیا۔ قلعے میں اعلیٰ حضرت بادشاہ سلامت نے خود انہیں اپنے فرزند صاحب عالی مرزا ظہیر الدین مغل کے ہاں ٹھہرایا تھا۔

یہ اطلاع بڑی حیرت انگیز تھی کہ اعلیٰ حضرت کے بھتیجے مرزا حیدر پچھلے دنوں جب خود دہلی آئے تو بعض کاغذات پر ان کی شاہی مہریں لگوا کر لکھنؤ لے گئے تھے۔ دہلی میں کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ مرزا حیدر کے ایما پر بادشاہ سلامت نے بھی شیعہ مذہب قبول کر لیا ہے۔ ایک ذریعے سے یہ بھی پتہ چلا ہے کہ جس طرح حضرت اقدس شہزادہ جواں بخت کو اپنا ولی عہد مقرر نہ کرنے پر کمپنی سرکار اور انگریز گورنر جنرل سے ناراض ہیں، اسی طرح

ولی عہد بہادر مرزا فتح الملک کو میری جرأت ناگوار گزرے۔"

میں اگر چہ ان کی طرف سے مطمئن تھی، انہوں نے خود ہی مجھے پسند کا اظہار کرنے کے لیے تین ماہ کی مہلت دی تھی یا پھر دوسری صورت میں مجھے ان کا فیصلہ قبول کرنا تھا اور میں اس عرصے میں انہیں اپنی دلچسپی سے بخوبی آگاہ کر سکتی تھی۔ لیکن اچانک ذہن میں ایک وہم نے سر اٹھایا۔ نواب مینڈھو مرزا نے ان سے میرے لیے ایک نوجوان کی سفارش کی تھی اور نواب مینڈھو مرزا اس طاقت کا نام تھا جو بادشاہ اور ولی عہد کے فیصلے بدل دینے کی قدرت رکھتی تھی۔ بس انہی کی طرف سے خطرہ تھا۔ پھر بھی میں نے اس خیال کا اظہار مناسب نہ سمجھا اور خاموشی اختیار کر لی۔ انہوں نے بھی اپنی بات نظر انداز کر دی اور ایک نیا سوال کیا۔

"آپ شہزادی ہیں اور میرا شاہی خاندان سے کوئی واسطہ نہیں۔ اس لیے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ گفتگو میں آپ کو کس صیغے اور کس حیثیت سے مخاطب کرنا مناسب ہوگا؟ ......"آپ یا "تم" سے......؟"

"یہ تو آپ کے اپنے مزاج اور اپنی پسند پر منحصر ہے۔

"مگر ہر شہزادی کو اپنے مرتبے کا خیال ہوتا ہے اور وہ چاہتی ہے اس کے لیے اعلیٰ اور قیمتی الفاظ استعمال کیے جائیں۔"

میں حیران تھی وہ حفظ مراتب کی بحث کیوں نکال بیٹھے ہیں؟ کہیں میرا امتحان تو نہیں لے رہے؟ مگر مغلوں کے پاس مرتبے ہی کہاں رہ گئے تھے؟ میں نے مختصر لیکن معنی خیز جواب دیا۔ "جس تھیلی میں سوراخ ہو جائیں، اس میں نقدی نہیں ڈالتے۔"

صفدر مرزا نے جواب سنا، چونک کر مجھے دیکھا اور پریشانی میں میرا ہاتھ چھوڑ دیا۔ میں نے ان کی پریشانی کو بھانپ لیا اور کہا۔ "آپ مجھے "تم" سے مخاطب کر سکتے ہیں...... خدا حافظ!"

یہ کہہ کر میں مڑی اور صفدر مرزا کو حیرت زدہ سا چھوڑ کر عنبری کے پاس پہنچ گئی۔ پھر باغیچے سے بھی نکلی اور گہری شام میں جب شفق کی سرخیوں پر سیاہی غالب آ رہی تھی، تیز تیز چلتی حویلی میں پہنچ گئی۔ ماموں اورنگ مرزا ابھی ابھی باہر سے آئے اور بی مغلانی کو بتا رہے تھے کہ لکھنؤ کے حالات بہت بگڑ گئے ہیں۔ اودھ کے لوگوں میں خوف و ہراس پایا جاتا ہے۔ ان کا خیال ہے، انگریز اودھ پر قبضہ کرنا چاہتا ہے اور نواب واجد علی شاہ کے ساتھ بھی وہی سلوک کرے گا، جو ہندوستان کے بیشتر حکمرانوں کے ساتھ کر چکا ہے۔

عام لوگوں کی بہ نسبت وہ ملکی حالات کی زیادہ خبر رکھتے اور اکثر کہا کرتے تھے۔ "اپنی قسمت نے یا فرنگی نے ہندوستانیوں سے سب کچھ چھین لیا ہے۔ لہٰذا اب اس کے خلاف جنگ کے سوا کوئی چارہ نہیں۔"

اس کے ساتھ وہ ایک چھوٹے سے فقرے کا اضافہ بھی کر دیا کرتے تھے کہ "اپنی قسمت کے خلاف لڑنے والا جنگ ہار جاتا ہے۔"

ان کے نزدیک قسمت یا تقدیر آدمی سے زبردست ہوتی ہے اور کوئی اسے شکست نہیں دے سکتا۔ تھوڑی دیر پہلے جب اودھ کے بارے میں تشویش ناک خبر آئی، وہ مرزا ظہیر الدین مغل کے ایوان میں تھے اور خبر سن کر انہوں نے یہی کہا تھا کہ "قسمت یا انگریز کے خلاف جنگ ناگزیر ہوگئی ہے لیکن جیت قسمت کی ہوگی۔" جس پر مرزا مغل نے کہا تھا۔ "اس مرتبہ لکھنؤ اور دہلی کی قسمت پھر جائے گی۔"

''لالہ رخ! مغل روایات کے مطابق آج سے تم میری ہو۔''

ان کے الفاظ میں بھی تلوار کی سی جھنکار سرسرا رہی تھی۔ مغل اور ترک امیرزادے جب کسی دوشیزہ سے اظہارِ محبت کرتے تو خنجر سے محبوبہ کے بالوں کی ایک لٹ کاٹ کر نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھ لیتے تھے۔ یہ رسم دریائے آمو کی وادیوں اور سمرقند و بخارا کے مرغزاروں سے مغلوں اور ترکوں کے ساتھ ہی ہندوستان میں آئی تھی۔ لیکن امتدادِ زمانہ یا پھر ہندوستانی سماج کی پریم گھاتوں میں کھو جانے کے بعد کسی کو یاد بھی نہیں رہی ہو گی تاہم صفدر مرزا نے اسی روایت کے مطابق اظہارِ محبت کیا تھا۔

میں وہ حسین و دل افروز لمحہ کبھی فراموش نہیں کر سکتی جب یہ عجیب واقعہ پیش آیا اور صفدر مرزا نے مجھے محبت کی ان لطیف اور پُرکشش دھڑکنوں سے دوچار کر دیا جس سے میں آج تک ناآشنا تھی۔ یوں لگتا تھا کسی نے مجھے وادیٔ طلسم و خواب میں دھکیل دیا ہے جہاں ہلکی ہلکی دُھند اُڑ رہی ہے اور میرے آس پاس قوسِ قزح کی سی کمانیں اور جھلملیاں تیرتی پھرتی ہیں۔

معلوم نہیں جب لڑکی کے ساتھ اظہارِ محبت کیا جاتا ہے یا اسے دل نوازی کا کوئی موقع پیش آتا ہے، جیسے مجھے پیش آیا تھا تو وہ کیا محسوس کرتی ہے؟ میں نے تو یہی محسوس کیا تھا کہ میرے پورے جسم پر ایک کیف انگیز اور راحت بخش خواب سا طاری ہو گیا ہے جو خواب بھی تھا اور نہیں بھی۔ کیونکہ محبت خواب اور حقیقت کے درمیان کی کیفیت کا نام ہے۔

ایک دن پہلے صفدر مرزا نے مالتی اور سوسن کی جھاڑیوں سے نکل کر اچانک میرا راستہ کاٹا اور بڑی جرأت کا مظاہرہ کر کے میری کلائی پر ہاتھ ڈال دیا تھا اور آج جب وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ ان کی گستاخی لائقِ سزا ہے یا نہیں؟ انہوں نے ملاقات کا آغاز زلف و خنجر کی قدیم رسم سے کیا تھا۔ اب میں انہیں کس طرح بتاتی کہ پہلی گستاخی پر اگر وہ سزاوارِ محبت ہو ہی گئے تھے تو دوسری گستاخی نے انہیں میرا حق دار بنا دیا تھا۔ کیونکہ محبت میں سزا نہیں ہوتی، صرف جزا ہوتی ہے۔ کچھ گلہ ہوتا ہے یا پھر صلہ ہوتا ہے۔

جب انہیں یہ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی کہ میں نے ان کی محبت کو قبول کیا ہے یا نہیں اور مجھے یہ بتانے کی حاجت نہ تھی کہ میں انہیں اپنا رفیقِ سفر منتخب کر چکی ہوں، ہمارے درمیان ایک حسین معاملہ خود بہ خود طے ہو گیا تھا اور زلف و خنجر کی ایک ہی جست میں گویا ہم درجنوں فاصلے طے کر آئے تھے۔

اس شام بھی ہمارے درمیان کچھ زیادہ گفتگو نہیں ہوئی، پھر بھی حجاب کا وہ پردہ جو ایک اجنبی نوجوان اور ایک اجنبی لڑکی کے درمیان حائل ہوتا ہے، جاتا رہا تھا۔ اب ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی نہیں رہے تھے۔ ہمارے صادق جذبوں میں یکسانی اور یکجہتی پائی جاتی تھی۔ انہوں نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور شام کے بڑھتے اور پھیلتے اندھیرے میں کچھ دیر ٹہلتے رہے۔ میں نے اپنا ہاتھ نہیں چھڑایا۔ ان کی گرفت بھی مضبوط تھی۔ اچانک وہ ہاتھ دبا کر کہنے لگے۔ ''لالہ رخ! جو باتیں ہم اپنی زبانوں پر نہیں لا سکے، وہ ہمارے اندر ہو رہی ہیں اور ایک روز باہر بھی آئیں گی۔''

میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کون سی باتیں؟''

''ہمارے مرتبہ و مقام کی باتیں۔ شہزادیوں اور عام لوگوں کے درمیان بڑے فاصلے ہوتے ہیں۔ ہو سکتا ہے،

ہمارے ملنے جلنے کی خبر نہ ہو جائے جو مجھے غیر معمولی کردار کی ایک مغل شہزادی کے روپ میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اگر کسی کی باتوں سے کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے تو ان کی باتوں سے میں نے یہی اندازہ لگایا تھا کہ وہ صفدر مرزا کے منصوبے کی کامیابی پر مشکوک تھے۔ خود صفدر مرزا نے بھی مجھے بتایا کہ وہ ایک اہم کام سرانجام دینے والے ہیں۔ جس کے بعد ان کی حیثیت بہت نمایاں ہو جائے گی۔

میں جانتی تھی وہ کون سا اہم کام سرانجام دینے آئے ہیں اور منتظر تھی کہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں اور ایک نامور آدمی بن جائیں تو ابا جانی سے ان کا ذکر کرو۔ لیکن افسوس! صفدر مرزا وہ کارنامہ سرانجام نہ دے سکے اور ماموں اورنگ مرزا کی یہ بات سولہ آنے درست ثابت ہوئی کہ قسمت صفدر مرزا سے زیادہ تیز رفتار اور جلد گردش کرنے والی طاقت ہے جو ان سے پہلے اپنا کام کر کے نکل جائے گی۔

بالکل یہی ہوا۔ وہ شہزادہ حیدر مرزا کا جو منصوبہ لے کر آئے تھے اس کا پہلا مرحلہ یہ تھا کہ اودھ کے معاملے میں دہلی اور لکھنؤ مل کر کمپنی سرکار کی مزاحمت کریں تا کہ اس پر انگریز کا قبضہ و تسلط نہ ہو سکے۔ اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر خود بھی یہ چاہتے تھے کہ دہلی اور لکھنؤ کو انگریز کی غلامی سے بچا لیا جائے لیکن ان میں انگریز کے خلاف مزاحمت کرنے کی نہ طاقت تھی نہ حوصلہ۔ ''مشترکہ کارروائی'' کا منصوبہ تیسری طاقت (ایران) کی شمولیت کی شرط پر تیار ہوا تھا جو پوری نہ ہو سکی تھی۔ اس لیے صفدر مرزا اودھ کے معاملے میں بادشاہ کو انگریز کی مشترکہ مزاحمت پر آمادہ نہ کر سکے۔ جون 1856ء میں کسی مزاحمت کے بغیر اودھ کا الحاق سرکارِ انگلشیہ سے ہو گیا۔ نواب واجد علی شاہ کو گرفتار کر کے کلکتہ بھیج دیا گیا اور برائے نام شہزادہ برجیس قدر کو حضرت محل کی نگرانی میں حکمراں بنا دیا گیا۔ یہاں صرف اتنا ہی ذکر مناسب ہے کہ مرزا سراج الدین بہادر شاہ ظفر الحاقِ اودھ کے خلاف کچھ بھی نہیں کر سکے تھے جو واجد علی شاہ کے پیچھے پیچھے خود بھی رنگون پہنچنے والے تھے۔

الحاقِ اودھ کا واقعہ دربارِ لکھنؤ کی شکست اور صفدر مرزا کی ناکامی کے لیے کافی تھا۔ جس کے بعد میں ابا جانی ولی عہد بہادر کے روبرو اپنی پسند کا اظہار کرنے سے ڈرتی اور ہچکچاتی رہی کیونکہ صفدر مرزا کی حیثیت بہت کمزور ہو گئی تھی۔ حتیٰ کہ تین ماہ کی مہلت گزر گئی جو صاحب عالم نے مجھے اپنی پسند کا اظہار کرنے کے لیے دی تھی اور جس کے ختم ہو جانے کے بعد مجھے ان کا فیصلہ قبول کرنا تھا۔

یہ تھی وہ عجیب و غریب صورتِ حال جس نے دل پر ایک بوجھ ڈال دیا تھا۔ میں نے ابا جانی سے کچھ کہنے کے بجائے کچھ نہ کہنا بہتر سمجھا لیکن خود کو محبت کی شکست سے بچانے کے لیے صفدر مرزا سے چوری چھپے ملتی رہی جن کا اب دہلی سے نکلنا اور لکھنؤ واپس جانا ممکن نہیں رہا تھا۔ کیونکہ وہاں مرزا حیدر اور مرزا نجف کے وظیفے انگریز نے بند کر دیئے تھے اور اودھ کی اسلامی سلطنت پر اس کا کنٹرول کچھ اور مضبوط ہو گیا تھا۔ تاہم اہل دہلی کو اس بات کا شدید صدمہ تھا کہ کمپنی کی حکومت نے اودھ کا الحاق کر کے دہلی پر قبضہ کرنے کی بنیاد رکھ دی ہے اور یہ صدمہ صاحب عالم ولی عہد بہادر کو بھی تھا جو یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ کوئی آدمی خدا کی گرفت سے نہیں بھاگ سکتا، اودھ کے المیے پر بڑے دل برداشتہ اور غمگین رہتے تھے۔

اس واقعے کے بعد وہ خود بجھ کے رہ گئے اور عجیب بات یہ ہوئی کہ ابا جانی نے نہ کبھی مجھ سے میری پسند کی بابت پوچھا نہ کبھی مرزا مینڈھو کی سفارش کا ذکر مناسب سمجھا اور اسی طرح دن گزرتے چلے گئے لیکن ہم آسمان سے

میں ان کی زبان سے یہ بات سن کر حیرت زدہ سی رہ گئی کہ لکھنؤ اور دہلی کی قسمت پھرنے سے مرزا مغل کی مراد اعلیٰ حضرت کے بھتیجے مرزا حیدر کا وہ خفیہ منصوبہ تھا جو کچھ عرصہ قبل تیار کیا گیا تھا اور جس کی خبر چند خاص آدمیوں کے علاوہ کسی کو نہیں۔ پھر ماموں اورنگ مرزا نے کچھ اور بھی کہا اور ان کا ایک ایک لفظ چھچھوندر کی طرح ناچتا اور میری سماعت سے ٹکراتا دل و دماغ میں اُترتا چلا گیا۔ اور یہ کہا انہوں نے۔

''صاحب عالم کا خیال ہے، شہزادہ حیدر مرزا نے صفدر مرزا کو لکھنؤ کا ایلچی بنا کر یہاں بھیجا ہے اور بہت جلد اعلیٰ حضرت بہادر شاہ ظفر کو فرنگی کے خلاف مشترکہ کارروائی پر تیار کرلیں گے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں، تقدیر صفدر مرزا سے زیادہ تیز رفتار ہے اور جب تک وہ بوڑھے بادشاہ کو مشترکہ کارروائی پر آمادہ کریں گے، تقدیر اپنا کام کر کے نکل جائے گی۔ ویسے بھی شاہِ ایران کی ضمانت کے بغیر، بادشاہ مشترکہ کارروائی پر آمادہ نہیں ہوں گے۔ نہ صفدر مرزا اب لکھنؤ واپس جاسکیں گے۔''

انہوں نے جتنی مرتبہ صفدر مرزا کا نام لیا، میرے دل میں اتنے ہی دھماکے ہوئے۔ میں تو سن چکی تھی کہ وہ شہزادہ حیدر سے قریبی تعلق رکھتے اور کئی سال لکھنؤ میں رہے ہیں لیکن یہ علم نہ تھا کہ لکھنؤ کے ایلچی بن کر یہاں آئے ہیں اور ان کی آمد کا مقصد اعلیٰ حضرت کو انگریز کے خلاف مشترکہ کارروائی پر آمادہ کرنا ہے۔ یہ معاملہ ماموں مرزا کی باتوں سے کھلا۔ حیرت اس بات پر بھی کہ وہ صفدر مرزا کے بارے میں مجھ سے زیادہ جانتے تھے جو شہزادہ حیدر کی طرف سے لکھنؤ کے ایلچی بن کر آئے تھے۔

❀......❀......❀

میں نے کہا تھا 1856ء میں ''الحاق اودھ'' کا واقعہ پہلے اور ولی عہد بہادر مرزا فتح الملک کا سانحہ بعد میں پیش آیا تھا لیکن میں اپنے ایک مقصد کی خاطر واقعات کی ترتیب بدل دوں گی۔ اس لیے اودھ کے قصے کو، جو انجام تک پہنچنے والا تھا، یہیں چھوڑ کر ولی عہد بہادر کے ذکر پر آتی ہوں جنہیں اچانک میری شادی کی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ کیونکہ میں اٹھارہ برس کی ہوچکی تھی اور ان کے نزدیک شادی کی عمر سے تجاوز کر چکی تھی۔

شاید اس میں بھی قدرت کی کوئی مصلحت پنہاں تھی کہ جس دن انہوں نے مجھے طلب کیا تھا اور میری مرضی یا پسند دریافت کی تھی، اسی شام کو حیرت انگیز طور پر صفدر مرزا سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور ایسی تھی وہ ملاقات جو کسی قصے کہانی میں بیان ہوتی اور کتابِ تقدیر میں لکھ دی جاتی ہے۔ لیکن جیسا میں نے پہلے بھی ذکر کیا تھا، میری اور صفدر مرزا کی محبت کو اگر کوئی خطرہ لاحق تھا تو صرف نواب مینڈھو مرزا کی طرف سے تھا، جو اپنی بات پر اَڑ جانے اور اسے پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر پیچھے ہٹنے والے آدمی نہیں تھے۔

میرا خیال تھا ضرور انہوں نے میرے لیے کسی مغل شہزادے کی سفارش کی ہوگی۔ جبکہ صفدر مرزا کی حیثیت، دربارِ لکھنؤ کے ایک ایلچی سے زیادہ نہیں تھی۔ اگرچہ اُمیدِ غالب یہی تھی کہ ابا جانی میری پسند کو ترجیح دیں گے تاہم یہ اندیشہ بلکہ خطرہ بھی دل میں سیندھ لگا کر بیٹھ گیا تھا کہ اگر انہیں بھی نواب مینڈھو مرزا کی سفارش سے دستبردار ہونا مشکل ہوگیا تو کیا ہوگا؟

میں نے اس خطرے کا ذکر صفدر مرزا سے کرنا مناسب نہ سمجھا۔ ان سے میل جول شروع ہوگیا تھا لیکن کبھی کبھار چوری چھپے ملاقات ہوتی تھی۔ یہ احتیاط خاص طور پر اس لیے ملحوظ رکھی تھی کہ کہیں ماموں اورنگ مرزا کو

(20)

دہلی مرحوم کا انجام

دہلی مرحوم کی کہانی لالہ رخ کی زبانی اس جگہ آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے کہ فلاکت زدہ شہزادی لالہ رخ اپنے والد صاحب عالم ولی عہد بہادر مرزا فخر کی وفاتِ حسرت آیات کے بیان کے درمیان اس قدر جذباتی ہو گئی تھی کہ اس کی آنکھیں مسلسل برس رہی تھیں اور آہوں اور سسکیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ شہزادی نے آخری جملہ زبان سے ادا کرنے کے بعد ایک لمبی سانس لی پھر خاموش ہو کر نظریں زمین کی جانب کر لیں۔

وقائع نگار کا بیان ہے کہ جب شہزادی پر یہ عالم طاری ہوا تو مجھے گمان گزرا کہ وہ والد کی طبعی یا غیر طبعی موت کے حادثہ سے نڈھال ہو گئی ہے۔ اس لیے اس نے اسے چھیڑنا مناسب نہ سمجھا اور اس کے دوبارہ حواسوں میں آنے کا انتظار کرنے لگا۔ لیکن جب پانچ دس منٹ گزر جانے کے بعد بھی شہزادی نے سر نہ اٹھایا تو وہ پریشان ہو گیا۔ آخر اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ''شہزادی!''

مگر شہزادی کی طرف سے کوئی جواب نہ ملا تو اس نے ذرا بلند آواز میں پکارا۔ ''شہزادی لالہ رخ!''

جب اس کا بھی جواب نہ ملا تو وہ سخت پریشان ہو گیا اور اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے پیدا ہونا شروع ہوئے اور اس نے گھبرا کر کھڑے ہونے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ گھبراہٹ میں اس کا پیر زمین پر بچھی پھٹی دری میں اٹک گیا اور وہ جھٹکا کھا کر شہزادی لالہ رخ کی طرف جھک گیا۔ اس کے نتیجے میں اس کا ہاتھ شہزادی کے سر سے ٹکرایا اور پھر...... اور پھر شہزادی لالہ رخ ایک طرف کو لڑھک گئی۔ وہ کہتا ہے کہ میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی اور میں اپنے کاغذات تھامتا اس قبر نما کوٹھڑی سے باہر نکل آیا۔ وہاں مجھے شہزادی سے بھی زیادہ ایک بوڑھا نظر آیا۔ میں نے لرزتے لہجے میں اسے بتایا۔

''جلدی اندر جاؤ۔ خاتون بے ہوش ہو گئی ہیں۔''

وہ بوڑھا بغیر کچھ پوچھے تیزی سے کوٹھڑی کی طرف لپکا اور میں ایک لمحہ ضائع کیے بغیر اس شکستہ گھر سے بھاگتا ہوا نکلا۔ آپ مجھے خود غرضی اور اس خلافِ انسانیت حرکت پر ضرور لعنت ملامت کریں گے لیکن میں ایسا کرنے پر مجبور تھا اس لیے کہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مظلوم اور مصیبت زدہ شہزادی قیدِ زندگی سے آزاد ہو گئی ہے۔ اب اگر میں وہاں ٹھہرا رہتا تو ظاہر تھا کہ مجھ سے ضرور پوچھ گچھ ہوتی اور شہزادی کی یہ کہانی جو میں نے اس کی زبان میں قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی، شاید آپ تک نہ پہنچ پاتی۔

شہزادی لالہ رخ نے دہلی مرحوم کی کہانی کی جزئیات تک اس خوبی اور خوش سلیقگی سے بیان کیا کہ کوئی گوشہ

نازل ہونے والی قیامت سے بے خبر تھے جو ناگہاں زمین پر جھپٹتی ہے۔

وہ قیامت الحاقِ اودھ کے صرف ایک ماہ بعد 10 جولائی 1856ء کو آسمان سے اچانک ہم پر جھپٹ پڑی۔ دہلی میں ہیضہ پھیل رہا تھا۔ صاحب عالم ولی عہد بہادر کی طبیعت بھی اچانک بگڑ گئی تھی اور ان کے معالج حکیم محمد تقی خان علاج کر رہے تھے۔ سہ پہر کو حالت زیادہ خراب ہوگئی۔ میں بی مغلانی، ماموں اور نگ مرزا اور عنبری کو ساتھ لے کر شوکت محل بیگم کے قصر کی جانب بھاگی۔ صاحب عالم نے مجھے دیکھا لیکن ان کی نگاہ بکھر رہی تھی۔ جیسے کسی کی نظر لگ گئی ہو۔

شوکت محل کے والد مرزا الٰہی بخش نے اجابت کی خاطر انہیں پچکاری دلوائی تھی لیکن اس سے بھی کوئی فائدہ نہ ہوا۔ شام کے چھ بجے آسمان ہم پر ٹوٹ پڑا اور صاحب عالم ولی عہد بہادر مرزا فخر الدین فتح الملک دنیا سے کُوچ کر گئے۔ میں غش کھا کر وہیں گر پڑی۔

کہتے ہیں کہ ان کی موت ہیضے سے واقع ہوئی مگر لال قلعے کی کئی حویلیوں میں یہ سرگوشیاں بھی سنی گئیں جو بالآخر دہلی کے کُوچوں اور بازاروں میں پھیل گئیں کہ اعلیٰ حضرت کی لاڈلی حرم زینت محل نے جو اپنے فرزند مرزا جواں بخت کے ولی عہد نہ بن سکنے پر مرزا فخر الدین فتح الملک سے ناراض تھیں، حکیم تقی خان سے مل کر انہیں زہر دلوا دیا تھا اور ان کی موت اسی زہر سے واقع ہوئی تھی۔ اس الزام کی اگرچہ کبھی تصدیق نہ ہو سکی لیکن میرے ذہن میں یہ وہم آج تک دور نہیں ہو سکا کہ ابا جانی فردوس آشیانی کی وفات کے بارے میں ہونے والی سرگوشیاں اور چہ مگوئیاں اپنے مفہوم سے بالکل ہی خالی نہ تھیں۔

❁......❁......❁

والے اوباش، کسی کی تمیز نہ کی۔ انگریزوں کو قتل کرنے کی اس قدر جلدی تھی کہ انہیں کسی کے کیس پر غور کرنے، کسی کی فریاد سننے، کسی کے دلائل اور واقعات کی حقیقتوں کا اعتراف کرنے کی نہ انہیں فرصت تھی اور نہ وہ اسے درخور اعتنا سمجھتے تھے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حیرہ کے بادشاہ نعمان بن منذر نے ایک ''یوم غضب'' مقرر کیا تھا چنانچہ اس دن اسے جو بھی نظر آتا وہ خواہ کتنا ہی صاحب حیثیت یا مقربِ بارگاہِ شاہی ہو، ان کا سر قلم کر دیا جاتا تھا مگر باقی دنوں میں کوئی بھی قتل نہ کیا جاتا۔ مگر انگریز نے ''یوم غضب'' کو ایک دن تک محدود نہیں کیا بلکہ ان کا ''یومِ غضب'' ہفتوں اور مہینوں تک طویل ہو گیا اور اس عرصہ میں قاتل کے سامنے جو شخص آیا اس کو سر سے محروم کر دیا گیا۔

1857ء کی جنگ آزادی کے سلسلہ میں جو لوگ اس جنگ میں شریک تھے یا جن پر شبہ تھا انہیں گرفتار کر کے اس طرح پھانسی دی گئی کہ اس کے تصور سے کلیجہ منہ کو آتا ہے۔ مشہور ہے گوڑ گاؤں کے مجسٹریٹ نے درختوں میں لٹکا کر لوگوں کو پھانسی دی تھی۔ جو لوگ دہلی پہنچے تھے ان کے گلوں میں بھی رسیاں پڑ گئیں۔ پھانسی دینے والے حلال خوروں کو پیروں کی ٹاٹ بانی جوتیاں اور سروں کے بنارسی دوپٹے صبح سے شام تک اتنی تعداد میں حاصل ہوتے تھے کہ انہیں سر پر اٹھا کے لے جانا مشکل ہوتا تھا۔

جان لارنس کی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ ایک دیسی دکاندار نے اپنی دکان کے آگے چند کرسیاں رکھوا دی تھیں۔ وہاں آ کر انگریز بیٹھے چرس پیتے تھے اور پھانسی پانے والوں کے نزع کا تماشا دیکھتے تھے۔ پھر چلتے وقت دکاندار کو کرسیوں کا کرایہ دے جاتے تھے۔ اگر پھانسی دیتے وقت کوئی میم ادھر نکل آتی تو وہ دہشت ناک منظر دیکھ کر اپنی ٹوپی اتار کر منہ کے سامنے کر کے اپنا چہرہ چھپا لیتی تھی۔

نواب جھجر اور راجہ بلب گڑھ کو اس جرم پر پھانسی دی گئی کہ جب کوئی انگریز بھاگ کر ان کے پاس جاتا اور پناہ مانگتا تو وہ اس کو پناہ دینے سے انکار کر دیتے تھے۔ چنانچہ انہیں گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھایا گیا۔ اسی طرح نواب جنگ خاں کے بھتیجے محمد علی نے اپنی حفاظت کے لیے مکان کے دروازے بند کر لیے تھے۔ کچھ گورکھے اور یورپین سپاہی لوٹ مار کرتے وہاں پہنچے اور دروازہ کھولنے کا حکم دیا۔

اس دارو گیر میں سرسید احمد خاں کے ماموں وحیدالدین خاں نماز پڑھتے ہوئے کسی سپاہی کی گولی سے شہید ہوئے۔ استاد ذوق کے بیٹے فوق کو بھی پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ سینکڑوں آدمیوں کو بلاوجہ پھانسی دی گئی۔ پھانسی کا بازار ایسا گرم تھا کہ اس بھٹی میں زخمی اور سو سو سال کے بوڑھے بھی خاکستر ہو کر رہ گئے۔ بعض لوگوں کو اس وجہ سے بھی پھانسی دی گئی کہ وہ جنرل بخت سے کیوں ملتے تھے۔ اس طرح سینکڑوں بے تحقیق سولی پر چڑھ گئے اور لاشوں سے کنویں بھر گئے تھے۔

ان تمام حقائق کے اظہار کے باوجود دہلی مرحوم کی کہانی اپنی تکمیل کو اس وقت تک نہیں پہنچتی جب تک تاجدارِ ہند مغل شہنشاہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کے مقدمے اور ان کے ملک بدر کیے جانے کے اگر تفصیلی نہیں تو کم از کم مختصر حالات سے قارئین کرام کو آگاہ نہ کیا جائے۔ اس لیے ہم آپ کو لال قلعہ دہلی لیے چلتے ہیں۔

❁......❁......❁

باقی نہ رہ گیا تھا۔ انہوں نے اپنی ذاتی داستان بھی مکمل کر دی تھی۔ اگر شہزادی کو یہ حادثہ پیش نہ آتا تو شاید وہ اپنے جیون ساتھی یعنی صفدر پیا یا صفدر مرزا کے بارے میں مزید کچھ تفصیل بتاتی مگر اس کے بتانے یا نہ بتانے سے اس کہانی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ صفدر مرزا نے لالہ رخ کو پسند کیا تھا اور لالہ رخ نے ان کی پُر خلوص محبت کو اپنے سینے سے لگا لیا تھا۔ مگر پھر حالات اس قدر دگر گوں ہو گئے کہ ان کی دھوم دھام سے شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اس سے یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی کہ وہ دونوں ساتھ تھے۔ انہوں نے ضرور عقد کر لیا ہوگا۔ انہیں کسی کی اجازت کی ضرورت نہ تھی۔ لالہ رخ کی والدہ (مغلانی) اور ماموں اورنگ مرزا بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ دونوں ان دونوں کی خوشیوں اور غموں میں اپنی آخری سانس تک ساتھ رہے ہوں گے۔ ان کے ساتھ دو وفادار کنیزیں مہرو اور عنبری بھی تھیں۔ اس دور کی کنیزیں اس قدر وفادار ہوتی تھیں کہ وہ مرتے دم تک ہر حال میں اپنے آقا کے ساتھ رہتی تھیں۔ پس وہ بھی اس کٹھن زمانے میں ان کے ساتھ ہی رہی ہوں گی۔

ہاں ایک بات اور قابل غور ہے وہ یہ کہ شہزادی لالہ رخ نے بڑے اعتماد سے کہا تھا کہ وہ اس خاکستر کی ایک چنگاری کی صورت میں ہے اور اگر قدرت نے اس میں طاقت پیدا کی تو وہ بدیسی آقاؤں (انگریزوں) کا تختہ اُلٹ کر برصغیر میں ایک بار پھر سلطنتِ مغلیہ کا پرچم لہرائے گی۔ مگر اُس کی یہ آرزو اس صورت میں پوری نہ ہو سکی جس کا اظہار شہزادی لالہ رخ نے کیا تھا۔ پھر بھی اس کا یہ خواب اس طرح ضرور پورا ہوا کہ بدیسی آقا برصغیر سے نکل جائیں اور یہاں کے دیسی باسیوں کی حکومت قائم ہو۔

شہزادی لالہ رخ کی یہ آرزو پوری ہوئی۔ انگریزوں کو برصغیر سے جانا پڑا مگر وہ خوشی سے نہیں گئے۔ انہیں نکالنے کے لیے ہزاروں مجاہدوں نے شہادت کا لباس پہنا۔ ہزاروں دُلہنوں کے آنچل کھینچے گئے۔ ہزاروں بیوہ ہوئیں۔ لاکھوں بچے یتیم ہوئے۔ 1857ء کی شہزادی لالہ رخ کی یہ چنگاری بھڑکتی اور خون مانگتی رہی۔ سراج الدولہ، سلطان ٹیپو، سعید احمد شہید جیسے جیالے سر سے کفن باندھ کر مکار بدیسیوں سے ٹکراتے اور اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے رہے۔ بالاکوٹ اور جلیانوالہ باغ کی سرزمین شہیدوں کے خون سے گل بوٹے کھلاتی رہی اور آزادی کی خونی دیوی ان کے گلوں میں یہ ہار ڈالتی رہی۔

ظالم اور مظلوم کی اس کھلی جنگ میں گولیاں اور پھانسیاں خوب خوب سربلند ہوئیں اور انہوں نے بلند ہونے والے سروں کو ہمیشہ کے لیے سرنگوں کر دیا۔ فاتح کی سفاکی، شقاوت قلبی اور خون آشامی کا مظاہرہ میدانِ جنگ میں کم اور شہر کی گلیوں اور چوراہوں پر زیادہ ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں مقابلہ کرنے والے اس بے دردی سے قتل نہیں کیے جاتے جتنی سفاکی سے وہ عوام قتل عام سے دوچار ہوتے ہیں جن بے چاروں نے جنگ میں ایک سرے سے حصہ لیا ہی نہیں۔

دہلی کی فتح کے بعد انگریزوں نے اس طرح قتل عام شروع کیا جس طرح چنگیز خاں اور ہلاکو خاں کی فوجیں کیا کرتی تھیں۔ مگر منگول وحشی ہونے کے باوجود جن کی معافی کا اعلان کر دیتے تھے ان پر ہاتھ نہیں اٹھایا کرتے تھے۔ مگر انگریز نے اس اصول کا بھی خاتمہ کر دیا۔ کیونکہ انہوں نے یہ قتل عام، عام معافی کے اعلان کے بعد اور ملکہ وکٹوریہ (اس وقت کی انگلستان کی ملکہ) کے منشور کے اعلان کے بعد کیا اور ملکہ کے منشور کی بھی دھجیاں اُڑا دیں۔

جن لوگوں کو قتل کیا گیا ان میں امیر، فقراء، بے اثر، با اثر، جاگیردار، بوریہ نشیں اور بازاروں میں گھومنے

آنسوؤں کے اتنے پہلو ہیں کہ نہ تو داستان گو میں اس قدر قوتِ گویائی ہے کہ وہ بیان کر سکے اور نہ سننے والے میں اتنی تاب ہے کہ وہ اپنی بے تابی پر قابو پا سکے۔ اس لیے طوالت کو اختصار کا جامہ پہنایا جا رہا ہے۔ پھر بھی یہ خیال رہے کہ یہ داستان نہیں بلکہ داستان کا صرف ٹکڑا ہے۔

قیدی بادشاہ

سر جان لارنس کے حکم سے بادشاہ کی تحقیقاتِ جرائم کے لیے ایک کمیشن 25 جنوری 1858ء کو مقرر کیا گیا جس میں غلام عباس بادشاہ کا وکیل اور میجر ایف جی، گورنمنٹ کا وکیل تھا۔ اس کمیشن کا اجلاس دربارِ خاص میں ہوتا تھا جس میں بادشاہ قیدیوں کی طرح آتا تھا۔ اس کے لیے ایک پلنگڑی ڈال دی گئی تھی جس پر وہ کبھی بیٹھتا اور کبھی لیٹ جاتا تھا۔ اس کے جرموں کی شہادت دینے کے لیے اس کے بعض چپڑاسی اور چوبدار آتے تھے اور اس کو قیدی کر کے خطاب کرتے تھے۔

فوجی کمیشن

انگریزی فوجی کمیشن کی کارروائی 27 جنوری 1858ء جو بمقام دہلی بحکم میجر جنرل پینی سی بی کمانڈنگ افسر اور حسب ہدایت سر جان لارنس چیف کمشنر پنجاب اس غرض سے منعقد ہوئی کہ اس قسم کے جو قیدی پیش ہوں ان کا بیان لیا جائے۔ اس کمیشن کا پریذیڈنٹ لیفٹیننٹ کرنل ڈلرس (توپ خانہ) تھا اور ممبران میں میجر پامر (توپ خانہ) جوریڈمنڈ (رجمنٹ) میجر سائزر، کپتان اوتھن اور مسٹر جیمز مرفی تھے۔

وکیل سرکار

ممبر ایف۔جے۔ بیریٹ۔ ڈپٹی جج، ایڈووکیٹ جنرل۔

پہلے دن کی کارروائی

7 جنوری 1858ء کو دن کے گیارہ بجے دہلی کے دربارِ خاص میں اجلاس منعقد ہوا۔ پریذیڈنٹ، ممبران و ترجمان و ڈپٹی جج، ایڈووکیٹ جنرل موجود تھے۔ عدالت قائم کرنے اور منعقد کرنے اور لیفٹیننٹ کرنل کے پریذیڈنٹ مقرر کرنے کے بعد احکام پیش کیے گئے اور سنائے گئے۔

ان افسروں کے نام جو عدالت میں کام کرنے کے لیے مقرر ہوئے تھے قیدی کو سنائے گئے۔

طلب دعویٰ

سوال: ”قیدی (جو بادشاہ ہے) پریذیڈنٹ یا کوئی اور افسر جو فوجی کمیشن میں اجلاس کرے گا اس کے سلسلہ میں اپنے مقدمہ میں کچھ عذر ہے؟“

جواب: ”نہیں۔“

(21)

بہادر شاہ کا مقدمہ

یہ لال قلعہ ہے۔

تیموری جاہ وجلال اور شان وشوکت کا مرکز۔

یہاں پہلے پہلے شاہ جہان اعظم کا پرچم لہرایا تھا جس کے دبدبہ اور طنطنہ کا یہ عالم تھا کہ بڑے بڑے ملوک اور سلاطین اس کے نام سے لرزہ براندام ہو جاتے تھے۔ یہیں عالمگیر اورنگ زیب حکومت پر متمکن ہوا تھا جس کی ہیبت اور سطوت کی یہ کیفیت تھی کہ دیارِ غیر کے عالی مرتبت امراء لرزاں اور ہراساں اس کے حضور میں حاضر ہوتے تھے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور عالمگیر کی اولاد نے شکوہ خسروی کی زندگی بسر کی اور آج اس لالہ قلعہ میں خاندانِ تیموری کا آخری تاجور اور عظیم مغل سلطنت کا آخری فرمانروا جس کا خطاب تھا:

فروغ خاندانی عالی شان گورگانی چراغ دودمان نشان صاحب قرانی حضرت قدر قدرت رایت خورشید رایت آسمان رفعت مدام صولت کسریٰ چشم فریدوں سطوت جمشید کاؤس دستگاہ سکندر شان دارا دربان سلیمان نگیں سلطنت مکیں مہر پرچم کواکب چشم کوہ وقار سراج الدین محمد ابوظفر بہادر شاہ دہلی خلد اللہ ملک وسلطنت۔

وہی تاجدارِ ہند خاک بسر فرنگی عدلت کے کٹہرے میں بے یار و مددگار ملزم کی حیثیت سے حاضر ہے۔ آج نہ اس کے گرد فوج وسپاہ ہے اور نہ نمک خواروں اور مصاحبوں کا جم غفیر...... میلے کپڑے، پریشان بال، نہ کوئی ہمدم نہ دمساز، نہ رفیق نہ یاور، نہ غمگسار نہ چارہ ساز۔ وہ ہے اور اس کی تمنائے ناکام۔ وہ ہے اور نوشتۂ تقدیر۔ آج اس کی قسمت کا فیصلہ وہ کرر ہے ہیں جو اس کے محکوم وتابعدار تھے۔ جو اس کے نمک خوار اور ملازم تھے۔ جو اس کے حضور میں اس طرح حاضر ہوتے تھے جیسے ایک شاہ کجکلاہ کے دربار میں ایک چاکر حاضر ہوتا ہے۔ آج وہ ملزم ہے، باغی ہے، غدار ہے۔ جو اس کی درازیٔ عمر اور ترقیٔ اقبال کے دعا گو تھے، آج وہ اس کے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔

یار اغیار ہو گئے اللہ

انقلابات ہیں زمانہ کے

یہ بڑی دل دوز روداد ہے مگر اسے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تاریخ کی ایسی کڑی ہے جس کے بغیر جنگ آزادی 1857ء کی تاریخ مکمل ہی نہیں ہوسکتی۔ ہم بچشم پُرنم یہ داستان بھی پڑھ لیں۔ اس مقدمہ کی اگر پوری تفصیل بیان کی جائے تو ایک ضخیم کتاب بن جائے گی۔ بلاشبہ اس داستان میں عبرت، بصیرت، آہوں اور

کارروائی 29 جنوری 1858ء بروز جمعہ۔

دربارِ خاص میں اس دن پھر عدالت منعقد ہوئی۔ صدر، ممبران، ترجمان اور ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل موجود تھے۔ قیدی عدالت میں لایا گیا اور غلام عباس بطور معاون کے لایا گیا۔ ترجمان نے اصل کاغذات فارسی میں ملاحظہ کیے اور جس کا ترجمہ جج ایڈووکیٹ نے دوسرے دن پڑھا تھا یعنی نمبر 56 تک۔ غلام عباس اب بطور گواہ قرار دیا گیا۔ جج ایڈووکیٹ نے بیان لیا۔

سوال: 11 مئی 1857ء کی صبح تم کہاں تھے جب مفسد رسالے میرٹھ سے آئے تھے؟''

جواب: ''میں اسی دربارِ خاص کے دروازے پر تھا۔''

سوال: ''جو کچھ تم نے اس موقع پر دیکھا بیان کرو۔''

جواب: ''صبح تقریباً آٹھ بجے میں نے سنا کہ کمپنی کے رسالہ کے پانچ یا چھ سوار آئے اور بادشاہ کے خلوت خانہ کے پاس کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے بے تحاشا غل مچایا۔ جس پر بادشاہ نے اپنے خواص میں سے ایک کو حکم دیا کہ دیکھو یہ غل کیسا ہے؟ ان میں سے ایک جھروکے میں گیا۔ یہ سواروں سے کچھ باتیں کر کے بادشاہ کے پاس واپس آ گیا۔ میں بادشاہ کے ساتھ ان کے خلوت خانہ میں گیا اور پھر میں حسب الحکم کپتان ڈگلس کو لے آیا۔ بادشاہ نے کپتان سے استفسار کیا کہ ان کو کچھ اس معاملہ کی خبر ہے یا نہیں؟ نیز یہ کہ فوج کیوں آئی ہے اور کہا کہ فوراً مناسب بندوبست ہونا چاہئے۔ کپتان ڈگلس نے درخواست کی کہ وہ نیچے کے دروازے سے جا کر باغیوں سے بات کریں۔ لیکن بادشاہ نے ایسا نہ ہونے دیا کہ مبادا باغی ان کو مار ڈالیں اور بادشاہ نے کہا کہ اگر تم بات کرنا چاہتے ہو تو جھروکہ میں سے کر لو۔ اس کے بعد ڈگلس دربارِ خاص کے کمروں اور شاہی کمروں کے درمیان کے برآمدے میں آئے اور ادھر سے اس مقام کو دیکھا جدھر باغی جمع تھے۔ میں کپتان صاحب کے ساتھ کٹہرے تک آیا۔ کپتان ڈگلس نے سواروں سے کہا کہ اس طرف مت آؤ۔ یہ بادشاہ کی محل سرا ہے اور اس طرف تمہارا آنا ان کی بے عزتی ہے۔ اس پر سب چلے گئے۔ کپتان ڈگلس نے کہا قلعہ اور شہر کے دروازے فوراً بند ہو جائیں مبادا یہ لوگ شہر میں گھس آئیں۔ اس کے بعد کپتان ڈگلس انتظام کرنے چلے گئے اور میں اور حکیم احسن اللہ خان دربارِ خاص کے اس کمرے میں آ بیٹھے۔ ابھی ایک گھنٹہ ہوا تھا کہ ڈگلس صاحب کا ملازم دوڑا آیا اور رقعہ حکیم صاحب کو دے کر کہا کہ صاحب یاد فرماتے ہیں۔ حکیم صاحب کے کہنے پر میں ان کے ساتھ گیا۔ جو آدمی ہم کو لینے آیا تھا، اس نے کہا کہ کپتان صاحب مسلخ خانہ میں ہیں مگر ہم جب وہاں پہنچے تو وہ واپس جا چکے تھے۔ اس وقت ہم نے دیکھا کہ دریا گنج کی جانب گہرا دھواں اٹھ رہا ہے اور کچھ راہ گیروں سے معلوم ہوا کہ باغی شہر میں گھس آئے ہیں اور انہوں نے بنگلہ میں آگ لگا دی ہے۔ ہم قلعہ کے لاہوری دروازے کے گرد جہاں ڈگلس صاحب کی فرودگاہ تھی، گئے۔ اس جگہ معلوم ہوا کہ کپتان صاحب تیسرے کمرے میں ہیں اور درمیانے درجہ میں مسٹر فریزر صاحب تھے۔ حکیم صاحب، کپتان صاحب سے ملنے چلے گئے۔ میں فریزر صاحب کے کہنے پر ان کے ساتھ آ گیا۔ انہوں نے مجھے حکم دیا کہ میں بادشاہ سلامت سے جا کر کہوں کہ کپتان ڈگلس صاحب کے مکان کی حفاظت کی خاطر دو توپیں اور کچھ سپاہ پیادہ بھیج دیں۔ فریزر صاحب اور ان کے ہمراہ جو انگریز تھے، زینے سے اُترے۔ فریزر صاحب کے ہاتھ میں غلاف دار تلوار تھی اور دوسرے صاحب کے ایک ہاتھ میں پستول اور دوسرے میں بندوق تھی۔ میں جلدی سے فریزر

پریذیڈنٹ، ممبران وتجمان، ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل نے حلف اٹھایا۔ کل گواہوں کو باہر کر دیا گیا۔ الزامات پڑھے گئے اور حسب ذیل الزامات درجِ مثل ہوئے۔

الزامات

باوجود سلطنت ہند کے پنشن خوار ہونے کے 10 مئی اور یکم اکتوبر 1857ء کے درمیان زمانہ میں مختلف اوقات میں اس نے محمد بخت خاں توپ خانہ رجمنٹ کے صوبہ دار اور مختلف اشخاص، ایسٹ انڈیا کمپنی کی فوج کے ہندوستانی کمیشن افسروں اور نامعلوم سپاہیوں کو سلطنت کے خلاف غدر و بلوہ کرنے کے لیے امداد دی اور اعانت کی۔

10 مئی اور یکم اکتوبر 1857ء کے درمیانی زمانہ میں مختلف اوقات پر بمقام دہلی اپنے بیٹے مرزا مغل، رعیت و حکومت برطانیہ مذکور دیگر نامعلوم اشخاص باشندگانِ دہلی وصوبہ ممالک مغربی وشمالی ہند کو جو حکومت برطانیہ ہند کی رعایا تھے، سلطنت کے خلاف بلوہ کرنے اور لڑنے کی جرأت اور امداد دی اور اعانت کی۔

درصورت رعایا حکومت برطانیہ ہونے کے حق اطاعت کا خیال نہ کیا اور بمقام دہلی 11 مئی 1857ء یا اس کے قریب کی کسی تاریخ میں سلطنت سے نمک حرامی کر کے اپنے تئیں بادشاہ وشہنشاہ ہند ظاہر کیا اور دغابازی سے دہلی پر بے ضابطہ قبضہ کر لیا اور علاوہ ازیں 10 مئی اور یکم اکتوبر کے درمیانی عرصہ میں مختلف اوقات میں مثل نمک حراموں کے مرزا مغل و محمد بخت خاں رجمنٹ صوبیدار توپ خانہ و دیگر نامعلوم مفسدہ پردازوں کے ساتھ سلطنت کے برخلاف سرکشی کرنے اور لڑائی لڑنے میں مفسدانہ سازش اور انفاق کیا نیز سلطنت برطانیہ ہند کے انہدام اور غارت کرنے اور اپنے مفسدانہ منصوبے پورے کرنے کے لیے مسلح فوج کو جمع کیا اور سلطنت برطانیہ مذکور کے خلاف لڑنے کے لیے روانہ کیا۔

یہ کہ 16 مئی 1857ء یا کسی قریب کی تاریخ بمقام دہلی قلعہ کی چار دیواریوں کے اندر 49 آدمیوں کو قتل کروا دیا اور قتل کرنے میں مدد دی جن میں خاص کر انگریز عورتیں، بچے اور دوغلے انگریز شامل تھے۔ مزید برآں 10 مئی اور یکم اکتوبر کے درمیانی عرصہ میں مختلف سپاہیوں اور اشخاص کو انگریز افسروں اور دیگر انگریز رعایا کو جن میں عورتیں اور بچے شامل تھے، قتل کرنے کی جرأت دی اور اعانت کی اور اس کام کے لیے قاتلوں کو ملازمت، ترقی اور خطاب دیئے اور وعدہ کیا۔ نیز یہ کہ ہندوستان کے خود مختار دیسی حکمرانوں کو احکامات دیئے کہ انگریزوں کو جب کبھی اپنی حدود میں دیکھیں تو قتل کر ڈالیں۔ یہ فعل بھی یا اس کا جز ہندوستان کی قانونی کونسل کے ایک 16 مقتدرہ 1857ء کے مطابق جرمِ عظیم ہے۔

دستخط ایف۔ جے۔ میرٹ میجر
ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل ووکیل سرکار۔

❁......❁......❁

سوال: ''محمد بہادر شاہ! جو الزامات تمہارے خلاف قائم کیے گئے ہیں تم ان کے مجرم ہو یا نہیں؟''

جواب: ''مجرم نہیں ہوں۔''

شرط پر قیدی دیئے گئے کہ ان پر محافظ ان ہی میں سے رکھے جائیں اور بادشاہ نے ان کو ایک کمرے میں قید کر کے ان کے کھانے کا انتظام اپنے توشہ خانہ سے کیا۔ شام کو میں نے اپنے گھر جانا چاہا تو سامنے دروازے پر رسالے کے اور شہر میں رجمنٹوں کے سپاہی تھے۔ میں گھوڑے پر سوار ہو کر گھر آیا۔

دوسری صبح معلوم ہوا کہ رات کو جو توپیں چلنا شروع ہوئی تھیں وہ دیسی توپ خانہ بادشاہ کی سلامی میں سر کی تھیں یا کسی وجہ سے۔ پھر میں دیوانِ خاص میں حکیم احسن صاحب سے ملا اور دریافت کیا کہ بادشاہ نے اس بے چینی کو رفع کرنے کا کوئی بندوبست کیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ بادشاہ نے ایک اونٹنی سوار کے ذریعہ ایک خط لیفٹیننٹ کرنل کے پاس آگرہ روانہ کیا ہے۔ پندرہ دن کے بعد میں نے پھر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ اونٹنی سوار بغیر جواب کے واپس آ گیا ہے۔ بادشاہ کا خط لیفٹیننٹ کرنل کو مل گیا ہے اور انہوں نے جواب کا وعدہ کیا ہے۔

پہلے دن کے واقعہ کے بعد سے میں نے قلعہ میں جانے کی باقاعدہ حاضری ترک کر دی۔ میں تیسرے چوتھے دن جاتا اور محض بادشاہ کو سلام کر کے واپس آ جاتا۔ چنانچہ اور واقعات کے بعد گفتگو کرنے کی نوبت نہ آئی۔

بیان حسن عسکری کا

پیرزادہ حسن عسکری عدالت میں طلب ہوئے اور انہیں حلف دیا گیا۔

سوال: ''کیا بلوہ کے زمانہ میں تم دہلی میں تھے؟ اگر تھے تو کیا شغل تھا؟''

جواب: ''ہاں میں دہلی ہی میں تھا اور پیری مریدی کیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ جب بادشاہ بیمار ہوئے تو مجھے بلایا گیا تھا۔ جب میرے دم کرنے سے بادشاہ کو فائدہ ہوا تو مجھے اکثر بلایا جانے لگا مگر اس سے مجھے بے آرامی ہوئی تھی۔ ایک دن میں نے بادشاہ سے عرض کیا کہ حضور مجھے بار بار نہ بلایا کریں۔ انہوں نے جواب دیا کہ جب تک میں سخت بیمار نہ ہوں گا تم کو نہیں بلاؤں گا۔

سوال: ''کیا تم شیدی قنبر شاہی ملازم سے واقف ہو؟''

جواب: ''میں شاہی ملازموں میں سے دو تین حبشیوں کو جانتا ہوں۔ ان میں شیدی قنبر نام کا کوئی ملازم نہ تھا۔''

سوال: ''اس عدالت میں اظہار ہوا ہے کہ تم نے شیدی قنبر شاہی ملازم کو بادشاہ کی طرف سے خطوط دے کر ایران بھیجا تھا۔ اس کا تمہارے پاس کیا جواب ہے؟''

جواب: ''مجھے اس معاملہ میں قطعاً خبر نہیں۔''

سوال: ''عدالت میں یہ بھی اظہار ہوا ہے کہ تم کو قوتِ پیش گوئی حاصل ہے۔ تم خوابوں کی تعبیر بتاتے ہو اور تم نے خدا سے ہم کلام ہونے کا حیلہ اور صاحب معجزہ ہونے کا بھی دعویٰ کیا تھا جس کی تصدیق قیدی نے خود بھی کی ہے۔ اس کا جواب تمہارے پاس کیا ہے؟''

جواب: ''خدا کو گواہ کر کے کہتا ہوں میں نے اس طرح کی باتوں کا حیلہ کبھی نہیں کیا۔''

سوال: ''کس وجہ سے تم بادشاہ پر دم کیا کرتے تھے؟ تمہارا خیال ہے کہ دم سے صحت حاصل ہوتی ہے؟''

جواب: ''ہماری کتابوں میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کے لیے دعا کر کے اس پر دم کرے تو اس سے فائدہ ہو گا۔''

صاحب سے پہلے بادشاہ کے پاس پہنچا اور ان کو کپتان فریزر کا پیغام دیا۔ انہوں نے فوراً دو توپیں اور پیادہ سپاہ کا ایک دستہ ڈگلس کی فرودگاہ پر بھیجا۔

حکیم احسن اللہ کا قصہ

''اس وقت حکیم صاحب پہنچے اور کہا کہ دو پالکیاں بھیج کر ان میموں کو بلا لیجئے، جو ان کے یہاں پناہ گیر ہیں تا کہ ان کو محل سرا میں چھپایا جا سکے۔ بادشاہ نے حکیم صاحب سے انتظام کرنے کے لیے کہہ کر خاصہ کے آدمیوں کو دو پالکیاں باغ کی طرف سے کر کے وہاں روانہ کیں تا کہ باغی ان کو نہ دیکھ سکیں۔ بادشاہ یہ دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے کہ ان کے حکم کی تعمیل بھی ہو رہی ہے یا نہیں۔ حکیم صاحب بھی وہیں کھڑے تھے۔ کچھ دیر بعد ان میں ایک آدمی واپس آیا۔ یہ دس بجے سے کچھ پہلے کا وقت تھا۔ حکیم صاحب نے فوراً دو آدمیوں کو کپتان ڈگلس کی خیریت معلوم کرنے کو بھیجا اور ان لوگوں نے آ کر بتایا کہ نہ صرف ڈگلس صاحب بلکہ کپتان ڈگلس اور ان کے ساتھ دوسرے لوگ جو رہتے تھے، سب کے سب قتل کر دیئے گئے ہیں اور دو میمیں بھی قتل ہو گئی ہیں۔ یہ سن کر بادشاہ اندر چلے گئے اور میں اور حکیم صاحب پریشانی کے عالم میں پھر دیوانِ خاص میں آئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد دو کمپنیاں جو حفاظت پر تھیں، مفسدہ رسالے کے ساتھ دیوانِ خاص کے سامنے والے میدان میں جمع ہو گئیں اور خالی کارتوس چلانے اور غل مچانے لگیں۔ بادشاہ یہ سن کر باہر آئے اور خاصہ کے آدمیوں سے کہا کہ ان کو خاموش ہونے کو کہیں۔ پھر ہندوستانی افسر آگے بڑھے اور انہوں نے دریافت حال کیا۔ اس پر مفسدہ لوگوں نے بتایا کہ انہیں کارتوس منہ سے کاٹنے کے لیے کہا گیا تھا۔ اس لیے مقصد یہ تھا کہ ہندو مسلمان اپنے مذہب سے گمراہ ہو جائیں۔ کیونکہ کارتوس میں سؤر اور گائے کی چربی لگی ہوتی تھی۔ اس پر مشتمل ہو کر پہلے انہوں نے میرٹھ کے انگریزوں کا قتل کیا پھر بادشاہ کی حفاظت کے لیے یہاں چلے آئے۔ یہ سن کر مفسدہ لوگ جو میرٹھ سے آئے تھے، اوپر کمرے میں آ گئے اور کہا کہ جب تک بادشاہ ہمارے ساتھ نہ ہو گا ہم بے سردار ہوں گے اور اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

بادشاہ کا جواب

اس پر بادشاہ کرسی پر بیٹھ گئے اور سپاہی اور افسر غرضیکہ کل یکے بعد دیگرے آگے بڑھے۔ سب بادشاہ کے سامنے آ کر کہتے تھے کہ ہمارے سر پر ہاتھ رکھیے اور بادشاہ ایسا ہی کرتے۔ جب ہجوم زیادہ ہو گیا تو میں چلا آیا۔ لوگ زور زور سے باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بادشاہ اپنے کمرے میں چلے گئے۔ سواروں نے گھوڑے صحن میں بند کر دیئے اور اپنی اپنی جگہ منتخب کر لی اور قلعہ کے چاروں طرف پہریدار مقرر کر کے میں احسن اللہ خاں کے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔ قریب چار بجے بڑی سرنگ اُڑنے کی خبر آئی اور میگزین کی طرف بڑی خاک اُڑتی نظر آئی۔ جو لوگ وہاں تھے انہوں نے بتایا کہ مفسدوں نے حملہ کر دیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہاں کے مقیم انگریزوں نے ہی یہ کارروائی کی تھی۔ شام کو معلوم ہوا کہ مفسدوں نے آٹھ عورتیں، بچے پکڑے اور ان کے قتل کی درخواست کی۔ مگر بادشاہ نے کہا قیدیوں کو میرے حوالے کر دو۔ میں ان کو اپنی حفاظت میں رکھوں گا۔ چنانچہ اس

لاکھ سالانہ اسے زمینوں اور مکانوں بھی وصول ہوتا تھا۔''

قیدی نے جرح سے انکار کیا اور گواہ واپس کیا گیا۔

(نوٹ) اس جگہ گواہوں نے بادشاہ کے لیے''اِس''،''اُس'' اور''اسے'' کہہ کر ان کی جس قدر تحقیر اور بے عزتی کی ہے اس پر جس قدر غم کیا جائے وہ کم ہے۔

جرح جج ایڈووکیٹ

سوال: ''کیا تمہیں ہندوستانی فوج کی بغاوت (جنگ آزادی) کی کچھ اصلیت معلوم ہے؟''

جواب: ''کوئی دو سال پیشتر بادشاہ دہلی گورنمنٹ کی جانب سے بد دل ہو گیا تھا اور گورنمنٹ کی وقعت اس کے دل سے جاتی رہی تھی۔ جس کی تفصیل یوں ہے کہ مرزا حیدر شکوہ اور مرزا فرید پسران مرزا خاں بخش پسر مرزا سلیمان شکوہ لکھنؤ سے آئے تو انہوں نے حسن عسکری سے مل کر آمادہ کیا کہ ایک نامہ شاہِ ایران کو بھیجا جائے جس میں یہ لکھا جائے کہ انگریزوں نے بادشاہ کو قید کر لیا ہے اور اس کی وہ عزت نہیں رہی جو تھی اور ولی عہد کی تخت نشینی کی کوئی اُمید نہیں رہی اور نہ اُمید ہے کہ ولی عہد کے علاوہ کوئی اور شہزادہ ولی عہد کیا جائے۔ اس خط سے منشا یہ تھا کہ باہمی ملاقات خط و کتابت قائم ہو جائے۔ شیدی قنبر اس کام کے لیے مقرر ہوا اور نواب محبوب علی خاں کی معرفت اس کو سو روپیہ زادِ راہ دے کر ایران روانہ کیا گیا۔ اس کے بعد مرزا حیدر اور ان کے بھائی چلے گئے اور بادشاہ کے دور کے عزیز مرزا نجف اور مرزا ابلاقی پسر مرزا شرف الدین اور مرزا آغا جان کے ہاتھ اس قسم کی تحریر بادشاہ کے پاس بھیجی۔ تین سال کا عرصہ ہوا کہ دہلی کے انگریز سپاہی مرزا علی اور وحید خاں کے ذریعہ سے بادشاہ سے مل گئے تھے۔ مرزا علی کا یہ کام تھا کہ جس قدر درخواستیں آئیں وہ بادشاہ و برو پیش ہوں اور بادشاہ ہر ایک کو اس وقت ایک تحریر دیتے تھے جن میں پہلے آنے والوں کے نام بالترتیب ہوتے تھے اور ایک رومال بطور نشانی دیا جاتا تھا۔ ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ انہوں نے بعد تحقیقات بادشاہ کو منع کر دیا کہ وہ انگریزی سپاہیوں کو اپنا مرید نہ بنائیں۔ بادشاہ اور فوج میں تعلقات پیدا ہونے کی یہی تاریخ ہے۔

بغاوت سے بیس روز پیشتر خبر آ گئی تھی کہ میرٹھ میں فوج غدر کرنے والی ہے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ وہ غدر کرنے کے بعد دہلی ہی میں آئیں گے۔ رسالے والے سب سے پہلے قلعہ کے جھروکے کے نیچے آ کے کھڑے ہوئے اور انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ ہم نے جس قدر انگریز میرٹھ میں تھے، سب کو قتل کر دیا ہے اور جتنے یہاں ہیں ان کو قتل کر دیں گے اور اب آپ ہمارے بادشاہ ہیں اور جس قدر انگریز ہندوستان میں تھے سب تہہ تیغ کر دیئے گئے ہیں۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ آئندہ سے فوج تابع فرمان ہے۔

بادشاہ نے اس کا یہ جواب دیا تھا کہ تمہارا یہی ارادہ تھا تو تم کو ہر ایک بات کے لیے تیار ہونا چاہئے۔ اور اگر تم تیار ہو تو اس معاملہ کا کل انتظام اپنے ہاتھ میں لو۔ یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ مفسد شہر میں گھس آئے۔ بادشاہ کے خاص ملازم ان سے جا ملے اور قادر داد خاں ایک قابلی نے مسٹر فریزر کو قتل کر دیا اور پیدل سپاہیوں نے شاہی ملازموں کے اشارے سے افسر گارد قلعہ کے مکان پر چڑھ کر اس کا بھی خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد جو انگریز شہر میں ان کے ہاتھ لگا، قتل ہوا۔ ایک دن یہ ڈھنڈورا پٹا کہ خدا شہنشاہِ عالم ہے اور بہادر شاہ اس ملک کے بادشاہ اور ان کا

سوال: ''کیا تم نے بادشاہ سے اپنا یہ خواب بیان کیا تھا کہ مغرب سے یا کسی طرف سے ہندوستان میں سیلاب آیا ہے اور طغیانی کی وجہ سے زمین برباد ہوگئی ہے۔ اس سے بادشاہ کو فروغ ہوگا اور انگریز تباہ ہوں گے؟''

جواب: ''خدا جانتا ہے کہ میں نے کبھی ایسا خواب دیکھا اور نہ بیان کیا۔ البتہ قلعہ والوں میں سے اکثر لوگوں نے مجھ سے اس قسم کے خواب بیان کیے اور میں نے انہیں بتایا کہ یہ توہمات ہیں۔ مجھ کو خواب پر اعتقاد نہیں ہے۔''

سوال: ''دہلی سے تم کب گئے اور جب تک پولیس نے تمہارا کھوج نہیں نکالا، تم کیوں چھپے رہے؟''

جواب: ''جب یہ شہرت ہوئی کہ شہر پر حملہ ہونے والا ہے تو شہر والوں نے جوق در جوق باہر جانا شروع کر دیا۔ میں ان کے ساتھ باہر چلا گیا۔ اوّل میں درگاہ نظام الدین میں رہا اس کے بعد قطب صاحب میں۔ پھر وہاں سے گڑھی پر سرو گیا جہاں بیمار ہوگیا۔ اس کے بعد اور مقامات سے ہوتا ہوا موضع لکھنوتی پہنچا جہاں یہ خبر ملی کہ گنگوہ میں میری تلاش ہو رہی ہے۔ میں نے خود وہاں جانے کا اپنے دل میں قطعی فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ میں وہاں گیا۔ وہاں آنے کی خبر اُڑی اور میں گنگوہ کے قریب ہی تھا کہ مجھے سپاہیوں نے امام صاحب کے مقبرے سے نماز پڑھتے ہوئے گرفتار کر لیا۔''

قیدی نے جرح سے انکار کیا اور گواہ واپس ہوا۔

جرح جج ایڈووکیٹ

سوال: ''جن وجوہ سے بادشاہ دہلی گورنمنٹ انگریزی کی رعیت اور پنشن خوار بنا ان کے متعلق تم عدالت کو کچھ اطلاع دے سکتے ہو؟''

جواب: ''غلام قادر روہیلہ نے جب شاہ عالم بادشاہ دہلی کی آنکھیں نکالیں اور اس کی بے عزتی کی تو 1788ء میں بادشاہ کو اپنے قابو میں کر لیا۔ 1803ء میں جب لارڈ میک نے علی گڑھ پر قبضہ کر کے دہلی پر حملہ کیا تو بادشاہ کے اختیارات صرف دہلی کے اندر ہی اندر تھے۔ وہ مثل بندی کے تھا اور لارڈ میک نے حملہ کر کے دہلی مرہٹوں سے چھین لیا۔ اس وقت شاہ عالم نے انگریزوں کی پناہ میں آنے کی درخواست کی اور 14 ستمبر کو جو 1857ء کے واقعہ میں اور زیادہ یادگار تاریخ بن گئی ہے، انگریزی فوج شہر میں داخل ہوئی۔ اس وقت سے بادشاہانِ دہلی انگریزوں کے پنشن خوار بنے اور 1837ء کے بعد بادشاہ کے اختیارات صرف قلعہ (لال قلعہ) تک رہ گئے اور وہ محض اپنے ملازموں کو خطابات اور خلعت عطا کر سکتے تھے۔ دوسروں کے لیے اسے منع کر دیا گیا تھا۔

سوال: ''کیا قیدی کے لیے مسلح آدمیوں کی تعداد محدود کر دی گئی تھی؟''

جواب: ''قیدی نے لارڈ آکلینڈ سے درخواست کی تھی کہ وہ جس قدر مناسب سمجھیں اسی قدر مسلح آدمیوں کی تعداد رکھیں اور نواب گورنر جنرل نے حکم دیا تھا کہ جس قدر آدمیوں کی تنخواہ اپنی پنشن سے دے سکتے ہو اسی قدر رکھ لو۔''

سوال: ''بلوہ (جنگ آزادی) کے وقت قیدی کو کتنی تنخواہ ملتی تھی؟''

جواب: ''اس کے لیے ایک لاکھ روپے ماہانہ کی پنشن منظور ہوئی تھی جس میں سے ننانوے ہزار تو اسے دہلی میں دے دیئے جاتے تھے اور باقی ایک ہزار اس کے خاندان والوں کو لکھنؤ میں ملتے تھے۔ اس کے علاوہ ڈیڑھ

اور دریچوں کے نیچے جمع ہو کر غل مچا رہے ہیں۔ میں نے دروازے بند کرنے کا حکم دیا۔ باغیوں نے بتایا کہ کارتوس کے اوپر سؤر اور گائے کی چربی لگی ہوئی ہے اس لیے ہم نے انہیں چلانے سے انکار کر دیا اور میرٹھ کے انگریزوں کو ہم قتل کر آئے ہیں۔ پھر میں نے قلعہ کے افسر گارڈ کو بلایا۔ اس نے خود باغیوں سے بات کرنے کی خواہش کی مگر میں نے دروازے نہ کھولے تو اس نے کٹہرے میں کھڑے ہو کر باغیوں سے کچھ باتیں کیں اور پھر انتظام کرنے کا کہہ کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد گارڈ اور فریز رصاحب نے دو پالکیاں منگوائیں کہ میمیں جو گارڈ کے گھر میں تھیں ان کو محل سرا میں چھپا دیا جائے۔ پالکیاں بھیج کر میں نے توپیں روانہ کرنے کا حکم دیا۔ ابھی پالکیاں روانہ ہی ہوئی تھیں کہ ان سب کے قتل ہونے کی اطلاع ملی۔

تھوڑی ہی دیر میں باغی دربارِ خاص میں گھس آئے اور انہوں نے اپنے سنتری مقرر کر دیئے۔ میں نے ان سے التجا کی کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ تم خاموش تماشا دیکھتے جاؤ۔ اس وقت ہم اپنی جانوں پر کھیل رہے ہیں، جو کر سکتے ہیں وہ ضرور کریں گے۔ میں اپنی جان کے خوف سے زنان خانہ میں چلا گیا۔ شام کے قریب کچھ مفسد میموں اور بچوں کو پکڑ کر لائے۔ لیکن میں نے خوشامد کر کے انہیں باز رکھا اور وہ اس وقت اس شرط پر مان گئے کہ ان کو اپنے پہرے میں رکھیں گے اور اس کے بعد بھی انہوں نے انہیں دو مرتبہ قتل کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کو بمشکل روکا۔ پھر آخر انہوں نے ان کو قتل کر ڈالا۔ اس قتل کے لیے میں نے کوئی حکم نہیں دیا۔ ممکن ہے مرزا سلطان یا مرزا مغل نے جو میرے خواص میں ہیں، میرا نام لے دیا ہو۔ مگر مجھے یقین نہیں اور یہ بھی کہ بغیر میرے حکم کے مسلح سپاہی اس قتل میں شریک تھے مگر میں نے انہیں اب کوئی حکم نہیں دیا تھا۔ قتل کے بعد کے متعلق کچھ علم نہیں۔ اگر ملازموں نے کیا تو اپنی مرضی سے کیا ہوگا۔ میں حلفیہ کہتا ہوں کہ میں نے مرزا صاحب یا دوسرے لوگوں کے لیے قتل کا کوئی حکم نہیں دیا۔ گواہوں کے بیانات غلط ہیں۔ مرزا مغل اور مرزا سلطان باغیوں سے ملے ہوئے تھے۔ ممکن ہے انہوں نے ایسا حکم دیا ہو۔ پھر باغی مرزا مغل، مرزا خیر سلطان اور مرزا ابوالباقر کو میرے پاس لائے کہ ہم ان کو اپنا افسر بنانا چاہتے ہیں لیکن میں نے ان کی درخواست نامنظور کر دی تو مرزا مغل بگڑ کر اپنی ماں کے پاس چلے گئے اور میں خاموش ہو گیا اور پھر طرفین کی رضامندی سے مرزا مغل سپہ سالار مقرر ہوئے۔

میری مہر اور دستخط کے بارے میں صاف بات یہ ہے کہ جس دن بغاوت ہوئی، اس دن انہوں نے مجھے بھی اپنا قیدی بنا لیا۔ جس طرح اس وقت تمہارے بس میں ہوں اس طرح اس وقت ان کے قابو میں تھا۔ انہوں نے مجھ سے اپنے احکام پر جبراً مہر لگوائی۔ کبھی وہ مسودے لاتے، کبھی صاف احکام لاتے اور مسودے دفتر میں چھوڑ کے مجھ سے دستخط کراتے۔ اسی لیے مختلف مسودے اس میں شامل ہیں۔ اکثر انہوں نے مجھ سے سادہ لفافوں پر مہر لگوائی۔ مجھے معلوم نہیں ان میں کیسے کیسے خط اور کس کس کے نام بھیجے۔ ان میں کہیں یہ فہرست بھی شامل ہے جو کسی نے مکند لال کے نام بھیجی تھی۔ اس میں یہ بات صاف لکھی کہ کتنے کتنے احکام کس نے کہاں کہاں دیئے تھے۔ چنانچہ صاف ظاہر ہے کہ جس نے جہاں چاہا احکام دیئے اور مجھ سے دستخط کروا لیے اور مجھے احکام کے مضمون تک نہ بتائے۔

لیکن میں اور میرا اسکتر (سیکرٹری) جانوں کے خوف سے کچھ نہ کہہ سکتے تھے۔ جب کبھی سپاہی، مرزا مغل یا

حکم بالاتر ہے۔

دوسرے دن یعنی 12 مئی کو جب میرٹھ کے سوار اور دہلی کے رسالے ملے۔ بادشاہ نے تخت پر بیٹھ کر وزیر محبوب علی خاں کو کل فوج کی دعوت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ فوج میں شیرینی تقسیم ہوئی اور افسروں کو روپے بھی دیئے گئے۔ 1842ء سے پیشتر بادشاہ چاندی کے تخت پر بیٹھ کے جو دربارِ خاص میں رہتا تھا، انعام دیتے تھے مگر اس کے بعد ایجنٹ جنرل نے اس رسم کو بند کر دیا اور تخت کو اُٹھوا کر بادشاہ کے خلوت خانے کے راستے میں رکھوا دیا۔ 12 مئی 1857ء کو بادشاہ نے اس تخت کو منگوا کر اس پر بیٹھ کر دربار کیا۔

سوال: ''کیا 11 مئی سے پیشتر فوج نے بادشاہ کے سامنے کچھ تجاویز پیش کی تھیں؟''

جواب: ''مجھے تجاویز کے کھلم کھلا پیش کرنے کی تو خبر نہیں مگر شاہی دربانوں میں تذکرہ تھا کہ فوج بغاوت کر کے قلعہ میں داخل ہوگی اور بادشاہ کی حکومت پھر قائم ہو جائے گی اور قدیم ملازموں کے رُتبوں اور تنخواہوں میں اضافے ہوں گے۔''

شہادت حکیم احسن اللہ خاں

لارڈ ایلن کے عہد میں جس وقت سے بادشاہ کو نذر دینا بند ہوا، بادشاہ ہر وقت اُداس رہا کرتے تھے۔ انہوں نے اس معاملہ کے لیے ولایت میں تحریک کی۔ وہ اس سبب اپنی بد دلی ظاہر کرتے رہے۔ بعد میں گورنمنٹ نے جب ان کی یہ خواہش کی کہ ان کا چھوٹا بیٹا جواں بخت، باوجود اس کے یہ طے پا چکا تھا کہ سب سے بڑا لڑکا مرزا فتح الملک (مرزا فخرو) ان کے بعد گدی نشین ہوگا، ولی عہد بنا دیا جائے مگر انگریز سرکار نے ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ کی تو انہیں زیادہ رنج ہوا۔ کچھ عرصہ بعد مرزا حیدر، مرزا خاں بخش پسر مرزا سلیمان شکوہ اپنے بھائی مرزا مراد کے ساتھ لکھنؤ سے دہلی آئے۔ وہ پہلے بادشاہ سے ملاقات کیا کرتے تھے۔

سب سے پہلے انہوں نے بادشاہ کو یہ سمجھایا کہ میں نے ان شہزادوں کو گورنمنٹ کے دفتر میں اپنا ایجنٹ مقرر کیا ہے۔ ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر نے اس انتظام کو اس وجہ سے منظور نہیں کیا کہ اس فرض کے لیے پہلے کبھی شہزادے مقرر نہیں ہوئے تھے۔ پھر یہ شہزادے بادشاہ کی مہر ثبت کر کے چند کاغذات اپنے ہمراہ لے گئے۔ وہ بلا ٹوک محلاتِ شاہی میں آیا کرتے تھے۔

بادشاہ کے باغیوں کے لیے پہلے سے کوئی تیاری نہیں تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ میں نے اور غلام عباس وکیل نے بادشاہ سے کہا کہ قلعہ کے کمانڈنگ گارڈ اور ایجنٹ لیفٹیننٹ گورنر نے دو توپیں مع توپچیوں کے اور دو پالکیاں میموں کو لانے کے واسطے منگوائی ہیں تو بادشاہ نے بلا عذر تعمیل کرنے کے لیے حکم دے دیا تھا۔

جوابِ دعویٰ

جج ایڈووکیٹ نے قیدی کا حسب ذیل جواب دعویٰ پڑھا:

''میں حسب ذیل واقعات پیش کرتا ہوں۔

بلوہ سے پہلے مجھے بلوہ کے متعلق کوئی خبر نہ تھی۔ صبح آٹھ بجے مجھے خبر ملی کہ باغی سوار شہر میں داخل ہو گئے ہیں

مندرجہ بالا بیان میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے۔ نہ کوئی بات سچائی کے خلاف ہے۔ اس بات کو خدا جانتا ہے اور وہی میرا گواہ ہے۔ جو کچھ لکھا گیا ہے بالکل صحیح ہے اور اس سے زیادہ مجھے کچھ معلوم نہیں۔ میں ابتدا میں حلف اٹھا چکا ہوں کہ جو کچھ کہوں گا سچ کہوں گا اور یہی میں نے کیا ہے۔

دستخط بہادر شاہ

بحث جج ایڈووکیٹ

صاحبان! میں الزام کے متعلق آپ کے مشاہدات کو ختم کرتا ہوں۔ اب آپ کا یہ کام رہ گیا ہے کہ آپ آخری فیصلہ سے قیدی کو عزلت اور تنہائی میں ان کا اعزاز جو ایک تخت سے اُترے ہوئے بادشاہ کے لیے زیبا ہیں، مستحق قرار دیں یا اس کو صفحۂ تاریخ کے بڑے ملزموں میں جگہ دیں۔ یہ ظاہر کرنا بھی آپ ہی کا کام ہے کہ سلطنتِ تیمور کے اس آخری بادشاہ کو جو عمر و بدقسمتی کے سبب خمیدہ پشت ہیں مگر اپنی تکالیف اور قوم کے مصائب کے سبب مستقل قامت ہے، آج اپنا محل اور قلعہ چھوڑنا ہو گا۔ یہ شاندار دربارِ عام کی عمارت، انصاف کے اعلیٰ مدارج کا معبد اس فیصلہ سے اس درجہ کو حاصل کر چکا ہے جس میں موجودہ وکل زمانوں کی بابت یہ تحریر کیا جائے گا کہ بادشاہ جرم کی وجہ سے قید میں جاتے ہیں اور ایک خاندان کی برس ہا برس کی شان وشوکت ایک دن میں صفحۂ روزگار سے ناپید کر دی جاتی ہے۔

غدر پر برہمن اور مسلمانوں میں بے غرضانہ اتفاق تھا۔ فوج میں لباس کے سبب وہ ہمیشہ بھائی بھائی تھے۔ وہ ایک دوسرے کے تہواروں میں اکثر شریک ہوا کرتے تھے اور اس اتفاق پر گورنمنٹ کی چشم پوشی کا یہی نتیجہ ہوتا تھا۔ میں وہ تمام باتیں جس کے سبب یہ مصیبت پیش آئی، اس جگہ بیان نہیں کرنا نہیں چاہتا، شاید بے محل ہونے کے سبب نامنظور کی جائیں۔ مگر میرا خیال ہے کہ کارتوس کے معاملہ میں بات نے طول نہیں پکڑا بلکہ سپاہیوں میں پہلے ہی سے اس معاملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں اور تمام ملک اور خاص کر مسلمانوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ میرے نزدیک جو معاملات ظاہر ہوئے انہیں مسلمانوں کی سازش سے موسوم کرنا چاہئے۔ اس سے خاص منشا یہ تھا کہ انگریزوں کی طرف سے بد دلی پھیلا دیں۔ جھوٹی خبریں اُڑا کر گورنمنٹ کی مہربانیوں پر افترا پردازی کر کے انقلاب اور بلوہ کے لیے لوگوں کو آمادہ کریں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا کہ اس کی ابتدا قیدی اور اس کے معتمدوں سے ہوئی ہے جو اس کے راز کے معاملات میں شریک ہوا کرتے تھے مثلاً حسن عسکری وغیرہ۔ میرے خیال میں کوئی آدمی اس بات میں شبہ نہیں کر سکتا کہ شیدی قنبر کو خطوط دے کر فارس اور قسطنطنیہ کے بادشاہوں کے پاس ایلچی بنا کر بھیجا گیا۔ ان کے دوبدو تخت نشینی کی التجا کرنا قیدی کی خاص سازش تھی جو ضمناً سال کے بلوے اور خوفناک نتیجوں میں ثابت ہوئی۔

مئی 1857ء سے ٹھیک دو سال پہلے قنبر کا روانہ ہونا اور جن دنوں بلوہ ہوا اس کا واپس آنے کا وعدہ کرنا قابل لحاظ بات ہے۔ اگر ہم اس بات کا مسلمانوں کی پیشین گوئی سے مقابلہ کریں کہ جنگ پلاسی کے واقع ہونے کے ٹھیک ایک صدی بعد انگریزوں کی حکومت ہندوستان سے جاتی رہے گی تو ہمیں دوبارہ ہندوستان کی حکومت حاصل کرنے کے متعلق ان کے تعصب کا یقین ہو سکتا ہے۔

مرزا خیر سلطان کوئی درخواست میرے پاس لاتے تو اپنی مرضی کے احکام اپنے ساتھ لاتے تھے اور کہتے تھے کہ اس پر بھی دستخط کرو اور دھمکی دیتے تھے کہ جو شخص ہماری مرضی پر نہ چلے گا، پچھتائے گا۔ جان کے خوف سے میں کچھ کہہ بھی نہ سکتا تھا۔ ساتھ ہی اس کے وہ میرے مشیروں حکیم احسن اللہ خاں، محبوب علی خاں اور زینت محل بیگم کو انگریزوں سے سازش رکھنے کا الزام دیتے اور کہتے تھے کہ ہم ان کو اس حرکت پر مار ڈالیں گے۔

پس انہوں نے ایک دن حکیم صاحب کا مکان لوٹ لیا اور قتل کے ارادے سے پکڑ لیا۔ مگر ان کی منت سماجت پر انہیں قید میں رکھا۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مرزا مغل کو تخت نشیں کرنے کے لیے وہ مجھے تخت سے اتار دیں گے۔ یہ امر غور طلب ہے کہ میں کس طرح مطمئن ہو سکتا تھا اور میرے اختیارات کتنے تھے۔ افسرانِ فوج اس قدر گستاخ ہو گئے تھے کہ انہوں نے کہا کہ زینت محل کے انگریزوں سے دوستانہ تعلقات ہیں۔ ان کو ہمیں دیجیے کہ ہم انہیں قید میں رکھیں۔ اگر میرا اس وقت اختیار ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ احسن اللہ خاں اور محبوب علی خاں قید ہو جاتے اور حکیم صاحب کا گھر لٹ جاتا۔

باغیوں نے ایک مجلس قائم کی ہوئی تھی جس میں ہر چیز پر بحث ہوتی اور جو قرارداد منظور ہو جاتی اس پر عمل ہوتا تھا۔ مگر میں ان کی مجلس میں کبھی شریک نہیں ہوا۔ اس پر انہوں نے بعض لوگوں کو لوٹا بلکہ بازار لوٹ لیے۔ جس کو چاہا قتل کیا، جس کو چاہا قید کیا۔ شہر کے جس شخص کے پاس مال اچھا دیکھا وہ ضبط کر لیا۔ جو کچھ تھا باغی فوج کے ہاتھ میں تھا۔ میں کیا کر سکتا تھا۔ مجھے بے خبری میں آ کر گرفتار کر لیا۔ مجھ پر کچھ ایسا خوف طاری ہو گیا کہ جو وہ کہتے تھے، میں کرتا تھا۔ پھر ملازموں کی بھی جان بخشی کی امید نہ تھی اور میں تو شاہی پر گدائی کو ترجیح دینے لگا تھا اور چاہتا تھا کہ گیروے کپڑے پہن کر پہلے قطب صاحب کو جاؤں پھر اجمیر شریف ہو کر کعبۃ اللہ چلا جاؤں مگر فوج نے جانے نہ دیا۔

باغیوں نے شہر کو لوٹا اور خزانے کو بھی لوٹ لیا مگر میں نے ان سے نہ ایک پیسہ مانگا اور نہ انہوں نے مجھے دیا۔ ایک دن وہ زینت محل بیگم کا مکان بھی لوٹنے گئے مگر کامیاب نہ ہوئے۔

یہ بات غور کرنے کے قابل ہے کہ اگر میرے پاس اختیارات ہوتے تو وہ مجھ سے میری بیوی کو قید کرنے کے لیے کیسے مانگتے؟ وہ تو ایک غریب آدمی کی بیوی کو بھی نہیں مانگ سکتے تھے۔

قنبر حبشی نے مکہ جانے کی رخصت حاصل کی تھی۔ میں نے اسے ایران نہیں بھیجا۔ میں نے کوئی خط شاہِ ایران کو نہیں بھیجا ہے۔ محمد درویش والی درخواست میری تحریر نہیں کہ اس پر اعتبار کیا جائے۔ اگر میرے یا حسن عسکری کے کسی دشمن نے بھی یہ درخواست بھیجی ہو تو قابل اعتبار نہیں۔

باغی فوج نے کبھی میرا ادب نہیں کیا۔ وہ جوتیاں پہنے ہوئے دربارِ خاص میں اور دار الریاضت میں پھرا کرتے تھے۔ جس حالت میں انہوں نے اپنے آقاؤں کو قتل کیا، اسی طرح انہوں نے مجھے قید کیا۔ مجھ پر ظلم کیے اور میرا نام بدنام کرنے کے لیے جو کچھ چاہا کیا۔ انہوں نے افسروں کو لوٹ لیا اور بارود وغیرہ لوٹ لیا تو میں کس طرح بغیر گولہ بارود لڑ کر انسداد کر سکتا تھا؟ پہلے سوار رسالے میرے بس میں ہوتے تھے۔ جب وہ جھروکوں کے پاس آئے میں نے ان کو فوراً بند کرا دیا تھا اور قلعہ کے کمانڈنگ افسر کو اطلاع کرا دی تھی۔

اس کے بعد جو کچھ کیا وہ میں نے جان کے خوف سے کیا۔ چند ملازم بھی اپنی جان کے خوف سے رکھے۔

کہ اگر کچھ نواب اور راجہ، بادشاہ کو فوجیں دیں تو وہ ایک دم فتح حاصل کر لیں گے۔

مسلمان ہی سب کچھ تھے

اگر ہم مختلف حالات پر جو دورانِ تحقیقات دریافت ہوئے ہیں، قدیم زمانہ کے متعلق نظر ڈالیں تو یہی معلوم ہوگا کہ اس تمام کارروائی میں مسلمان ہی سب کچھ تھے اور مسلمانوں کا صاحب مکاشفہ، صاحب معجزہ، واعظ، مسلمان بادشاہ اور اس کے معین و رفیق، مسلمانوں کی نتیجہ خیز خفیہ سفارت، ایران و ترکی مسلمان قوتوں کے پاس ہمارے زوال کے متعلق مسلمانوں کی پیشین گوئیاں، مسلمان سلطنت کا ہمارے بعد ہونا، مسلمان قاتلوں کے ہاتھ سے بے رحمانہ قتل، اسلامی طرز کے لیے مذہبی لڑائی، بڑی مدد دینے والے اسلامی مطالبے اور بغاوت کرنے والے مسلمان سپاہی ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مذہب پر نہ کوئی الزام دیا گیا اور نہ اس کی تائید کی گئی۔ اگر انہوں نے کہیں سر اُٹھایا بھی ہوگا تو محض اپنے مفسد مسلمان ہمسایوں کی حکم براری کی وجہ سے۔

بہادر شاہ مجرم ہے

مظلوم شہنشاہِ ہند کے مقدمہ میں سرکارِ انگلشیہ اور اس کے بے ایمان کارکن آپ ہی مدعی اور آپ ہی منصف تھے۔ پھر بھلا کسی جائز فیصلہ کی کیا امید کی جاسکتی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ ایک طویل کارروائی اور ایک طویل عرصہ کے بعد عدالت نے اپنا فیصلہ صادر کیا جو انصاف کے قطعی منافی تھا۔ اس فیصلہ کو آئینِ انسانیت اور شرافت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ کرسیٔ انصاف پر چند غاصب بیٹھے تھے۔ تلوار ان کے ہاتھ میں تھی، فوج ان کے قبضۂ اقتدار میں تھی۔ سیم و زر کے انبار ان کے آگے لگے تھے۔ مظلوم اور مقہور بادشاہ نے یہ فیصلہ سنا اور جیسے زبانِ حال سے کہا:

''آپ جو چاہیں کریں، آپ کی بن آئی ہے۔''

فیصلہ

مرقومہ دہلی 9 مارچ 1858ء

دستخط

این۔ جے۔ بیرٹ میجر

(ڈپٹی جج، ایڈووکیٹ جنرل، وکیلِ سرکار)

عدالت اپنی تجویز پر غور کے لیے بند ہوئی

تجویز:

جو شہادت عدالت کے روبرو ہے اس کی رائے یہ ہے کہ قیدی محمد بہادر شاہ معزول شدہ بادشاہ ان کل اور جز الزامات کا جو اس پر لگائے گئے، مجرم ہے۔

دستخط: ایم ڈاس لیفٹیننٹ جنرل، پریذیڈنٹ

دستخط: ایف۔ جے بیرٹ میجر (ڈپٹی جج ایڈووکیٹ جنرل)

ہم اپنے آپ میں نہیں رہتے

جب ہم ان مسلمانوں کی نہ صرف حرکات کو بلکہ نفرت کو جو ان کی درخواستوں سے ثابت ہوتی ہے، جو اسی دنیا پر ختم نہیں ہوتی بلکہ آخرت میں بھی ہمارے لیے دائمی تکلیف ثابت ہوتی ہے تو ان کے بعض کو خیال کرتے ہوئے ہم اپنے آپ میں نہیں رہتے۔ سامع یہ خیال کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کیا انگریزوں کے خلاف ایسے خیالات رکھنے والے ہزاروں اور لاکھوں ہیں۔ میں ان لوگوں کا ذکر نہیں کرتا جو بات سن کر فوراً رائے قائم کریں اور انہیں میری رائے کی ضرورت نہ ہو۔ مگر ہمیں مس الول سے معلوم ہوا کہ محرم میں انہوں نے مسلمان عورتوں کو مسلمانوں کی کامیابی اور انگریزوں کے غارت ہونے کی دعائے مانگتے ہوئے دیکھا تھا لیکن عورتوں اور بچوں کی ظالمانہ موت اور تکلیف سے بھی ان کے کینہ کی آگ نہ بجھی اور ان کے دلوں میں ذرا بھی رحم پیدا نہ ہوا کیونکہ ہمیں مقامی اخبار کے ذریعہ معلوم ہوا کہ جس وقت قتل کا واقعہ پیش آیا تو دو سو مسلمان حوض سے لگے کھڑے تھے اور قیدیوں کو نہایت غلیظ گالیاں دے رہے تھے۔ اگر ایسی بات کی اچھی طرح تصدیق نہ ہوتی تو اس سخت کینہ کا یقین نہ کرتا۔

مسلمانوں کا ذکر

اس میں، میں نے ان واقعات کو پیش نظر رکھا ہے جن سے یہ معلوم ہوا ہے کہ خاص کر مسلمانوں کی وجہ سے فساد، سازش اور 1857ء کے واقعات پیش آئے اور دہشت ناک آفات واقع ہوئیں۔ اس میں حتی الوسع اس بات کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ قیدی ہندوستان میں اسلامی پیشوا ہونے کی حیثیت سے اس سازش کو ترتیب میں خواہ بطور پیشوا یا بطور رفیق مذہب کس قدر تعلق رکھتا تھا۔ ہندوؤں کو بالعموم بلوہ کرنے اور فوج کو بالخصوص بغاوت پر آمادہ کرنے میں ہندوستانی مطابع اور مسلمانوں نے جو کچھ حصہ لیا ہے اس کا بھی میں تذکرہ کر چکا ہوں اور ان واقعات کی مزید تصدیق سے یہ بات صاف ظاہر ہو جائے گی کہ مسلمانوں ہی کی نمبر 3 لائٹ کیولری نے پریڈ کے میدان میں کارتوس لینے سے انکار کیا تھا۔ ان میں سے پچاسی یعنی بیشتر مسلمان تھے۔

کپتان ماٹبنو ہم سے بیان کرتا ہے کہ انبالہ ڈپو میں جہاں تک کارتوس کے واقعہ کا تعلق تھا مسلمان سپاہی اس کا مضحکہ اُڑاتے تھے اور اس طرح ہم کو معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے بغیر کسی عذر کے کھلم کھلا بغاوت پر کمر باندھی۔ ان کی بناوٹی تکلیفوں میں کچھ کمی نہ آئی اور انہوں نے ہمارے خلاف بلوہ کرنے پر اتفاق کر لیا اور ہندوؤں جوش دلا کر اپنے ساتھ ملانے کی ترغیب دی۔ اس سلسلہ میں ہمارے پاس شہادت ہے اور اس سلسلہ میں ہندوؤں کے ساتھ تو ذرا بھی ہمدردی نہیں تھی اور نہ ہندوؤں نے اس کے دریافت کرنے کی کوشش کی۔

ہم نے جو شہادت بار بار نقل کی ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بیڈن کی لڑائی کے بعد ہی معاملات کے پہلو بدل لینے پر انہوں نے بہت افسوس ظاہر کیا تھا۔ مسلمانوں کو دھوکا دینے پر لعنت ملامت کی اور اس بات پر مشکوک معلوم ہوتے تھے کہ کیا واقعی انگریزوں کا ہمارے مذہب میں مداخلت کرنے کا منشا تھا۔ بہت سے ہندو سپاہیوں نے اس وقت یہ اظہار کیا کہ اگر جاں بخشی ہو جائے تو وہ بخوشی سرکاری ملازمت کرنے واپس چلے جائیں گے۔ برخلاف اس کے مسلمان اس بات پر جمے ہوئے تھے کہ انگریز کی نوکری سے شاہی ملازمت بدرجہا بہتر ہے اور یہ

نہ لائے۔

بادشاہ کے مرتبہ کو دیکھو۔ آج انہیں اپنی جان بخشی کا سوال زبان پر لانا پڑا۔ اللہ اکبر! بادشاہ کو چپ چاپ قلعہ میں پہنچا دیا گیا۔ گو ہڈسن، بادشاہ کی گرفتاری کا بیڑا اُٹھا کر اور ان سے اجازت لے کر گیا تھا مگر جنرل صاحب کے خیال میں نہ تھا کہ یہ اتنا مشکل کام اتنی آسانی سے پورا ہو جائے گا۔

جاتے ہیں تیرے کوچہ سے قاتل خفا نہ ہو

دہلی سے بہادر شاہ ظفر کی رخصتی کا نقشہ ایک شعلہ بیان ادیب اس طرح کھینچتا ہے:

جب وہ ساعت آئی کہ بدنصیب بادشاہ جنگی پہرے میں دہلی سے وداع ہوا تو خلقت منہ اندھیرے سے سڑکوں پر آ بیٹھی۔ یہ وہ صبح تھی، جب ماؤں نے شیر خوار اور معصوم بچوں پر اپنا دودھ حرام کیا اور جب تک اپنے بادشاہ کو آنسوؤں کے حلقہ میں خدا کے سپرد نہ کیا، چولہوں میں آگ نہ سلگائی۔

رونے والوں میں ہزاروں اس کے اپنے نمک خوار اور سینکڑوں وہ تھے، جو اس کے باپ دادا کی دی ہوئی جاگیروں سے روٹی کھا رہے تھے۔ باوجود سخت انتظام کے راستہ مخلوق سے پٹا پڑا تھا۔ کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس سے آنسوؤں کی بارش نہ ہو رہی ہو۔ بادشاہ ڈولی میں سوار تھا۔ دو بیویاں تاج محل اور زینت محل اور دو لڑکے جواں بخت اور عباس شاہ ساتھ تھے۔ گوروں کا پہرہ تھا۔ لوگ اگرچہ گوروں سے خوفزدہ تھے لیکن خلقت اپنے بادشاہ کی اس قدر مشتاق تھی کہ تمام خوف وہراس بھول گئی اور پروانوں کی طرح اس شمع پر گری۔

بادشاہ نے ڈولی کے پردے اُٹھا دیئے۔ آنکھیں سفید داڑھی پر آنسو گرا رہی تھیں۔ دونوں ہاتھ آسمان کی طرف تھے۔ اس طرح جلا وطن ہونے والا بادشاہ دہلی والوں کو خدا کے سپرد کر رہا تھا۔ المختصر پھر دنیا کی وہ ہولناک ساعت، جب جہاں آباد نے اپنے ناشاد اور نامراد بادشاہ کو وداع کیا، ختم ہوئی۔ بیگم تاج محل کلکتہ سے واپس آئی اور بد بخت بادشاہ رنگون روانہ ہوا۔

واجد علی شاہ سے ملاقات

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں
تو آہِ گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

اس سلسلہ میں ایک داستانِ عبرت اور ملاحظہ ہو۔ جس وقت بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو بہ جرمِ بغاوت دہلی سے رنگون جانے کا حکم ہوا تو واجد علی شاہ، معزول بادشاہ اودھ نے وائسرائے ہند کی معرفت بہادر شاہ ظفر کو دعوت نامہ بھیجا۔ بادشاہ ظفر نے دعوت نامنظور کی مگر یہ لکھا کہ چند منٹ کے لیے جہاز سے اُتر کر تم سے مٹیار برج (جہاں واجد علی شاہ قید تھے) میں ملوں گا۔

چنانچہ تاریخ مقرر پر وائسرائے اور تمام پہریدارانِ برطانیہ، مٹیار برج میں جمع ہوئے کہ وہ معزول بادشاہ کی ملاقات کا منظر دیکھیں۔ جب بہادر شاہ ظفر جہاز (وہ پانی کے جہاز سے سفر کر رہے تھے) اُتر کر مٹیار برج کی حدود میں داخل ہوئے تو واجد علی شاہ باوجود بھاری بھرکم ہونے کے ان کے استقبال کو آئے اور سر نیاز جھکا کر اکیس بار

میں اس تجویز کو مستحکم کرتا ہوں۔

دستخط: این۔ پینی میجر جنرل
مورخہ 2 اپریل 1858ء
کیمپ سہارن پور

جلا وطنی

اس فیصلہ کے نتیجے میں بہادر شاہ کو جلا وطنی کا حکم ہوا اور وہ اپنے دو بیٹوں جواں بخت اور عباس شاہ اور دو بیویوں زینت محل اور تاج محل کے ساتھ برما روانہ کر دیئے گئے۔ مصیبت کے ان ایام میں ملکہ تاج محل نے شوہر سے بے وفائی کی اور کلکتہ سے واپس چلی آئی۔

جب بادشاہ دہلی سے ایک ڈولی میں بیٹھ کر گوروں کے پہرے میں منزل بہ منزل روانہ ہوا تو ان لوگوں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی جو اس کے باپ دادا کی بخشی ہوئی اراضی سے اب تک روٹی کھاتے چلے آ رہے تھے۔

بہادر شاہ کے دہلی سے جانے کے بعد ایک عرصہ تک بادشاہ کی ان باتوں کا ذکر ہوتا رہا۔ مثلاً جب کوئی ہندو دربار میں جا کے شکوہ کرتا کہ مسلمان اسے تنگ کرتے ہیں تو بادشاہ مسلمانوں کو ہدایت کرتا کہ ہندوؤں کو نہ ستاؤ کیونکہ جیسے تم میری ایک آنکھ ہو ایسے ہی ہندو دوسری آنکھ ہیں۔ جب دہلی کے سپاہ نے دہلی کے مہاجنوں اور مسلمان تاجروں کو بہت تنگ کیا تو بادشاہ نے کہا کہ میرا سامان اور میری بیوی کے تمام زیورات لے جاؤ اور اپنے کام میں لاؤ مگر میرے شہریوں کو تنگ نہ کرو۔

چیف کمشنر، بہادر شاہ کو سزا دیتا ہے

چیف کمشنر پنجاب نے بہادر شاہ کے بارے میں حکم صادر کیا کہ معزول بادشاہ کو سمندر پار جلا وطن کیا جائے۔ وہ ایسے جزیرے یا مقام پر قیام کرے جہاں اسے وہاں کے مسلمانوں سے الگ رکھا جائے۔ بہادر شاہ کی بیوی زینت محل اور بیٹے جواں بخت پر کوئی جرم ثابت نہ ہو سکا۔ جواں بخت کی عمر اس وقت سترہ سال تھی لیکن چیف کمشنر نے ان کے لیے حکم دیا کہ وہ چاہیں تو بادشاہ کے ساتھ جلا وطن ہوں یا پھر بنگال کے جنوبی علاقے میں قیدیوں کی طرح رہیں۔

17 اکتوبر 1858ء کو انگریزوں نے جمعہ کے دن بادشاہ کو بال بچوں سمیت کلکتہ بھیج دیا۔

انگریز ڈرتے تھے

اپنی فتح کے بعد بھی ظالم اور بدطینت انگریز مسلمانوں اور بہادر شاہ سے خوف زدہ تھے۔ سارے کا سارا مقبرہ بادشاہ کے ہمراہیوں اور مسلح سپاہیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوتا تھا مگر انگریزوں کی تقدیر یاور تھی۔ کل پچاس سواروں نے جا کر بادشاہ کو گھیر لیا اور سارا مجمع کائی کی طرح پھٹ گیا۔ سواروں نے بادشاہ سے سپردگی کا اصرار کیا۔ بادشاہ حد درجہ دل برداشتہ اور نڈھال ہو چکے تھے۔ انہوں نے خاموشی سے خود کو ان کے حوالہ کر دیا۔ خدا کسی پر یہ وقت

کیا کیا پہلو دیکھے ہیں ہم نے اس پھلواری میں
اب جو پھولے پھول اس میں کچھ اور ہی اس میں باسے ہیں
دنیا ہے یہ رین بسیرا بیت گئی سب باقی تھوڑی ہے
ان سے کہہ دو سو جاویں نیند کے جوجو ماتے ہیں

دوسری غزل

یہ غزل بھی رنگون کی یادگار ہے۔ جذبات کی کتنی صحیح عکاسی ہے۔

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکوں وہ میں ایک مشتِ غبار ہوں
میرا رنگ روپ بگڑ گیا ، میرا حُسن مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اُجڑ گیا ، میں اُسی کی فصلِ بہار ہوں
پئے فاتحہ کوئی آئے کیوں ، کوئی چار پھول چڑھائے کیوں
کوئی آ کے شمع جلائے کیوں ، میں وہ بے کسی کا مزار ہوں

وفات

غرض قید خانہ کے ایک تنگ و تاریک کمرے میں وہ موت کا انتظار کرتے تھے۔ چہل قدمی یا ہوا خوری کے لیے بھی کم ہی نکلتے تھے۔ وہ اپنا بیشتر وقت یادِ خدا، تسبیح و استغفار میں صرف کرتے تھے۔ آخر ان کی دعا قبول ہوئی اور وہ 7 نومبر 1862ء کو قیدِ فرنگ اور قیدِ حیات دونوں سے آزاد ہو گئے۔

مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دُور

شہنشاہِ ہند پہ جب دیارِ غیر میں سکرات کا عالم طاری ہوا تو ان کے پاس سوائے زینت محل، بیٹے جواں بخت اور ان کی بیوی اور ایک خورد سال بچی کے اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ حکام کی اجازت سے تجہیز و تکفین کر کے اس بنگلہ کے احاطہ میں دفن کر دیا۔ کچی قبر تھی۔ ایک درخت سرہانے لگا تھا، اسی سے ایک عرصہ تک مرقد پہچانا جاتا تھا۔

وفادار بیوی

ملکہ زینت محل کچھ عرصہ اسی بنگلہ میں مقیم رہیں۔ پھر انہیں حکماً دوسرے مکان میں منتقل کر دیا گیا۔ ملکہ بڑی وفادار تھیں۔ پانچ سال تک انہوں نے بھی انگریزوں سے کوئی امداد قبول نہ کی۔

مگر مجبور ہو کر 1868ء میں پانچ سو روپے پنشن منظور کر لی۔ اتنا ہی وظیفہ جواں بخت کا بھی مقرر ہوا۔ شہزادے نے غربت اور بے کسی کے عالم میں مولیس (ملک برما) میں 1884ء میں انتقال کیا۔ ان کی قبر کا آج تک کسی کو پتہ نہیں چلا۔

سلام کیا۔ شہنشاہِ دہلی نے ان کا سلام لیا پھر دونوں اشکبار ہو گئے اور دیر تک رقت طاری رہی۔

برٹش حکام نے اس طریقِ سلام کو حیرت کی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس وقت شہنشاہ اور بادشاہ دونوں دولت برطانیہ کے قیدی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ انگریز مؤرخین اگرچہ بہادر شاہ کو ''یکے از رعایائے سرکار'' کہتے ہیں لیکن یہ ایک ایسا غلط دعویٰ ہے جسے تسلیم نہیں کیا جا سکتا۔ کون کہہ سکتا ہے کہ بہادر شاہ ظفر میں تیمور اور بابر کا نسلی خون شامل نہیں۔ ظفر بلاشبہ سلطنتِ مغلیہ کے آخری شہنشاہ تھے اس لیے شاہِ اودھ نے آقا کا جس حیثیت سے استقبال کیا اور کورنش بجالائے، وہ اس کا مستحق تھا۔

اس طرح بہادر شاہ، وائسرائے کو ''یکے از ملازمان کوئین وکٹوریہ'' سمجھتے تھے اور رسمی طریقہ سے ملتے تھے۔ چنانچہ بہادر شاہ نے وائسرائے سے مصافحہ تک نہیں کیا۔

قیدِ فرنگ اور وفات

1858ء کا سال ختم ہونے تک بابر، اکبر کا آخری وارث رنگون پہنچا۔ جہاز سے اُترتے ہی انہیں گوروں نے اپنے پہرے میں لے لیا اور بندرگاہ سے صدر بازار کے ایک دومنزلہ مکان میں لے جایا گیا جو پرانے گھڑ دوڑ کے بعد ان کے قریب موجود سڑک دائل روڈ پر واقع تھا۔ اس بنگلہ کے گرد گوروں کا پہرہ بہادر شاہ کی زندگی تک قائم رہا اور تمام اخراجات کے لیے صرف چھ سو روپے ماہانہ ملتے تھے۔ غیرت مند بادشاہ نے انگریز سرکار سے کسی امداد کی استدعا نہیں کی اور فاقہ کشی اور غربت کی زندگی گوارا کی۔ ملکہ زینت کے پاس کچھ زیورات باقی تھے۔ وہی معاش کا ذریعہ رہے اور بدنصیب زندگی کی آخری سانسیں افلاس اور تنگ دستی میں گزار دیں۔

بہادر شاہ کی شاعری اور قیدِ فرنگ

مظلوم بادشاہ کا شاعری کا شوق رنگون میں بھی باقی رہا۔ ان کی بعض دردناک نظمیں قید خانہ کی چہار دیواری سے نکل کر دہلی تک پہنچیں۔ اور اب بھی سخن فہموں کے دل و دماغ میں محفوظ ہیں اور ان میں سے بہت کم شائع ہو سکی ہیں۔ ان کی ایک نظم ایڈیٹر صلائے عام تک پہنچی تھی اور اس کے اشعار دہلی والوں کی زبان پر آ گئے تھے۔ وہ نظم نعت میں بطور مناجات کے تھی اور اس میں مدینہ منورہ میں موت حاصل ہونے کی تمنا کا اظہار تھا۔

غربت کدۂ رنگون کے اشعار

کہا جاتا ہے کہ مندرجہ ذیل غزل بہادر شاہ کی ہے۔ اس کی زبان کچھ مختلف معلوم ہوتی ہے مگر ان کے پہلے دیوان میں ایک غزل اسی طرز کی موجود ہے۔ اس لیے درج کی جا رہی ہے۔

غزل

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں باسے ہیں
جائیں گے اب کون نگر کوئن میں اب ہراسے ہیں

ملکہ زینت محل قلعہ کی عیش وعشرت کا غم واندوہ سے کفارہ ادا کر کے 17 جولائی 1886ء میں انتقال کر گئیں اور اسی پرانے بنگلہ میں شوہر کی قبر کے برابر دفن کی گئیں۔

نشانِ قبر بھی مٹ گیا

بنگلہ کا وہ احاطہ، جہاں مظلوم شہنشاہِ ہند اور ملکۂ ہند مدفون تھے وہ ایک یورپین مسٹر ڈاسن کی ملکیت ہو گیا۔ انہیں مزار پر فاتحہ پڑھنے والوں اور چراغ جلانے کے لیے آنے والوں کی آمدورفت ناگوار گزری۔ انہوں نے مقبرے کا راستہ بند کر دیا۔ مرقد کے ایک طرف ٹینس کھیلنے کا کورٹ تھا اور دوسری طرف گھوڑے سدھانے کا چکر۔ چند دنوں میں قبروں کا نشان بھی مٹ گیا اور روشن ضمیر ظفر کی پیشین گوئی پوری ہوئی ۔

پس مرگ قبر پہ اے ظفر کوئی فاتحہ بھی کہاں پڑھے
وہ جو کوئی قبر کا تھا نشاں اسے ٹھوکروں سے اُڑا دیا

بیسویں صدی کے آغاز میں عبدالسلام نامی ایک عقیدت مند آخری تاجدارِ ہند کا مزار ڈھونڈتے ہوئے اس احاطہ تک پہنچے۔ بیری کا درخت وہاں اس وقت بھی موجود تھا۔لوگوں نے بتایا کہ اس درخت کے قریب ہی بادشاہ اور ملکہ کی قبریں فرض کر لینا چاہئیں۔ اس عقیدت مند نے بے شمار خطوط حکومتِ برما کو لکھے۔ اخباروں میں مضامین شائع کرائے۔ پھر ہندوستان سے لندن تک دردمندوں کے دل دہلا کے رکھ دیئے تب جا کے اس مقام پر انگریزی زبان میں ایک کتبہ نصب کیا گیا۔اس کا ترجمہ اس طرح ہے:

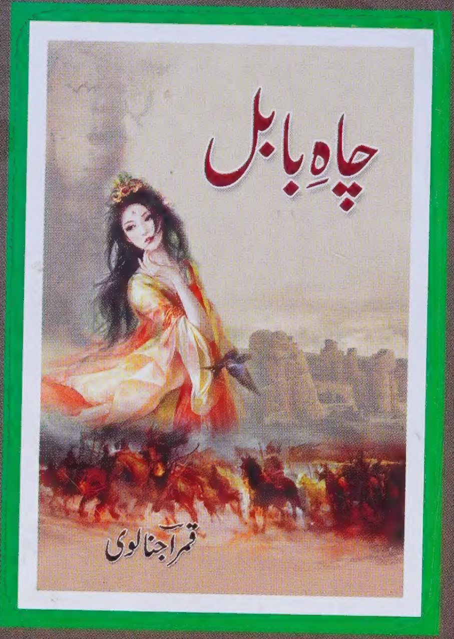
''دہلی کا معزول بادشاہ بہادر شاہ 7 نومبر 1862ء کو رنگون میں مرا اور اس جگہ کے قریب دفن ہوا۔''

کچھ دوڑ دھوپ کے نتیجے میں اس کتبہ پر زینت محل کا نام اور تاریخ وفات بھی لکھ دی گئی۔ کچھ اور کوشش کے بعد حکومتِ برما نے قبر کا نشان بنانے کی اجازت دے دی۔اب دونوں قبروں پر ایک تعویذ بنا دیا گیا ہے۔ چاروں طرف لوہے کا جنگلا اور ٹین کا سائبان ہے۔ بہادر شاہ کے پوتے سکندر بخت نے قبر کی مجاوری اختیار کر لی تھی۔

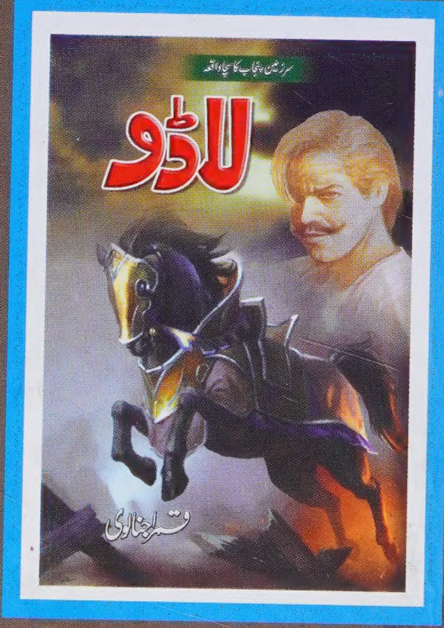
مولوی نذیر احمد کے بیٹے بشیرالدین نے اپنی تصنیف فرامین سلاطین میں مظہرالدین شیرکوٹی کے حوالے سے جو رنگون میں بہادر شاہ کے پسماندگان سے ملے تھے،لکھا ہے:

''لکڑی کے ایک معمولی مکان میں ستر برس کی ضعیفہ رہتی ہیں، جن کا نام رونق زمانی بیگم ہے۔ یہ جواں بخت کی بیٹی ہیں اور بہادر شاہ کی پوتی ہیں۔ دارا بخت کا تخت وتاج تاراج ہونے کے غم میں انہوں نے شادی نہیں کی۔ سکندر بخت ان کے بھانجے اپنی پھوپھی رونق زمانی بیگم کے ساتھ رہتے ہیں۔ رونق زمانی بیگم کو ڈیڑھ سو روپیہ ماہانہ وظیفہ سرکار سے ملتا ہے۔ دونوں اس میں گزر کرتے ہیں اور وضعداری کا یہ حال ہے کہ اپنے دادا بہادر شاہ کے بعض ملازمین کو اب تک علیحدہ نہیں کیا۔

(تمت بالخیر)









مکتبہ القریش
سرکلر روڈ چوک اردو بازار لاہور
فون: 042-37668958
042-37652546
ISBN
9 789693 80337X